خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
JULY 200

کہنی سُنتی، مدیر ۱۶
ہمارے نام، نادرہ خاتون ۳۰۶
کرن کرن روشنی، ادارہ ۱۷

آپ سے کیا پردہ

طریقہ محفل میں بات کرنے، انشاجی ۲۲

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے، امت الصبور ۳۰۴

مجھ سے ملیئے

باتیں شگفتہ بھٹو سے، شاہین رشید ۲۴

انٹرویو

وصی شاہ کا گھر، شہلا نرگس ۲۹
نوید رانا سے مُلاقات، شاہین رشید ۲۹۸

ناول

کوئی لمحہ گلاب ہو، نگہت عبداللہ ۳۶
تھوڑا سا آسمان، عمیرہ احمد ۲۱۴

مکمل ناول

یہ لمحے تیرے نام کریں، فائزہ افتخار ۱۵۴

ناولٹ

گمشدہ لمحوں کا حساب، عالیہ بخاری ۶۲
تتلی کو زندہ رہنے دو، نزہت شبانہ حیدر ۱۰۰
اپنے مَن میں ڈوب کر، سیما مناف ۱۲۶
شریکِ سفر، زہرہ ممتاز ۲۴۶

افسانے

مگر دل اُداس ہے، اقبال بانو ۹۴
محبت آگ کی صورت، رخسانہ نگار ۱۲۰
صندل کی خوشبو، سعدیہ چوہدری ۱۹۴
جستجو، کاشفہ حسین ۲۳۷
آنچل کی چھاؤں، سعدیہ رئیس ۱۹۸

نظمیں، غزلیں

نظم، اعتبار ساجد ۲۸۲
غزل، سید اطہر علی نایاب ۲۸۲
نظم، انیلا شمیم کرن ۲۸۱
غزل، تاجدار عادل ۲۸۱

رنگا رنگ پھول

ان روز و شب میں، فرحت اشتیاق ۲۹۱
ایک رنگا رنگ سلسلہ، شگفتہ جاہ ۲۸۴
اِس ماہ میں، سائرہ غلام نبی ۲۹۶
خبریں وبریں، عینی عمران ۳۱۴
صدا باقی ہے، سائرہ غلام نبی ۳۰۳
کلیاں شگوفے، ہاجرہ عبدالقہار ۳۱۰

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے، خالدہ جیلانی ۲۸۸

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان ۳۱۸

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے، امت الصبور ۳۲۰

Ph 7721777
7726617

جولائی 2003
جلد 32 شمارہ 3
قیمت 35 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
500 روپے

پبلشر آذر ریاض (عمران محمود) نے ابن حسن پرنٹنگ پریس
سے چھپوا کر شائع کیا، مقامِ اشاعت: بی/۹۱ علامہ اقبال ٹاؤن، کراچی

مدیرہ

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

موجودہ ترقی یافتہ دور میں سائنس و ٹیکنالوجی نے جہاں انسانی شعور و ذہن کو وسعت دی ہے اور بنی نوع انسان کو بہت سی آسانیاں اور سہولتیں فراہم کی ہیں وہیں تیسری دُنیا کے ترقی پذیر ممالک کے لیے بہت سے اقتصادی اور معاشی مسائل بھی پیدا کیے ہیں۔ آبادی کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ ان مسائل میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مغرب نے ان مسائل کا بروقت ادراک کر کے اپنے ہاں علم و آگہی کو فروغ دیا اور ان مسائل پر قابو پالیا۔ ان کے عروج کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ علم ہی ان کی ترقی کی بنیاد ہے جبکہ علم و ہنر سے محرومی کی وجہ سے ہم زوال سے دوچار ہیں اور اپنی بنیادی ضروریات بھی فراہم نہیں کر پا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے پناہ وسائل سے نوازا ہے لیکن ہم ان سے فیض یاب اسی صورت میں ہو سکتے ہیں جب موجودہ دور کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنے شعور، سوچ اور فکر کو ترقی دیں۔ تاکہ کامیابی کی شاہراہ پر قدم رکھ سکیں۔

بہنوں سے درخواست،

ہماری بہت سی بہنیں "کرن کرن روشنی" "رنگا رنگ پھول" کے سلسلوں کے لیے احادیث بھجواتی ہیں۔ بہتوں سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں احادیث یا قرآنی آیات کا ترجمہ نہ بھجوائیں — ہم اس سلسلے میں احتیاط کے پیشِ نظر صحاح ستہ سے احادیث خود نقل کرتے ہیں تاکہ کسی غلطی کا امکان نہ رہے۔

ناولٹ نمبر،

خواتین ڈائجسٹ کی روایت رہی ہے کہ اگست کا شمارہ ناولٹ نمبر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس بار بھی حسبِ روایت اگست کا شمارہ ناولٹ نمبر ہوگا۔ مصنفین سے درخواست ہے کہ اپنے ناولٹ جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شاملِ اشاعت ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- فائزہ افتخار کا مکمل ناول "یہ لمحے تیرے نام کریں"،
- سیما مناف، عالیہ بخاری، نزہت شبانہ حیدر اور زہرہ ممتاز کے ناولٹ،
- اقبال بانو، رخسانہ نگار، سعدیہ چوہدری اور کاشفہ حسین کے افسانے،
- نگہت عبداللہ اور عمیرہ احمد کے ناول،
- کلاسیک شعراء کے کلام پر مبنی ایک نیا سلسلہ "صدا باقی ہے"،
- مشہور شاعر، اداکار اور ڈراما نگار وصی شاہ کا گھر،
- ٹی وی فنکارہ شگفتہ بھٹو سے باتیں،
- معروف اداکار نوید رانا سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کے لیے ہمیں آپ کے خطوط کا انتظار رہے گا۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

"قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی سات مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

محمد کی آل کی روزی

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اے اللہ! محمد کی آل کی روزی ضرورت کے موافق رکھ۔"

(صحیح مسلم)

جنت کی اکثریت

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا، وہاں دیکھا تو اس کے اندر اکثر وہ لوگ ہیں جو (دنیا میں) مسکین ہیں اور امیر مال دار لوگ روکے گئے ہیں (یعنی جو جنتی ہیں، وہ حساب و کتاب کے لیے روکے گئے ہیں) اور جو دوزخی ہیں ان کو تو دوزخ میں جانے کا حکم ہو چکا اور میں نے دوزخ کے دروازے پر کھڑا ہو کر دیکھا تو وہاں عورتیں زیادہ ہیں۔"

(صحیح مسلم)

دنیا میں شوق نہ کرنے کے متعلق

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بازار میں سے گزرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی عالیہ کی طرف سے مدینہ میں آ رہے تھے اور لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک طرف یا دونوں طرف تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بھیڑ کا بچہ چھوٹے کان والا مردہ دیکھا، اس کا کان پکڑا، پھر فرمایا۔

"تم میں سے یہ ایک درہم میں کون لیتا ہے؟"

لوگوں نے کہا۔ "ہم ایک درہم میں بھی اس کو لینا نہیں چاہتے۔ (یعنی کسی چیز کے بدلے) اور ہم اس کو کیا کریں گے۔"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم چاہتے ہو کہ یہ تمہیں مل جائے؟"

لوگوں نے کہا۔ "اللہ کی قسم! اگر یہ زندہ ہوتا تب بھی اس میں عیب تھا کہ اس کے کان بہت چھوٹے

ہیں پھر یہ مردہ ہے' اس کو کون لے گا؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ کی قسم! دنیا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ ذلیل ہے جیسے یہ تمہارے نزدیک۔"

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے۔"

(صحیح مسلم)

دنیا کے مال کا بیان

سیدنا عمرو بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بحرین کی طرف وہاں کا جزیہ لینے کو بھیجا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین والوں سے صلح کر لی تھی اور ان پر سیدنا علاء بن حضرمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاکم مقرر کیا تھا پھر سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ مال بحرین سے لے کر آئے اور یہ خبر انصار کو پہنچی تو انہوں نے فجر کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو انصار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ کر تبسم فرمایا پھر فرمایا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تم نے سنا کہ ابو عبیدہ بحرین سے کچھ مال لے کر آئے ہیں (اور تم اسی خیال سے آج جمع ہوئے کہ مال ملے گا)"

انہوں نے کہا۔ "بیشک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "خوش ہو جاؤ اور اس بات کی امید رکھو جس سے خوش ہو گے تو اللہ کی قسم مجھے تم پر فقیری کا ڈر نہیں لیکن مجھے اس کا ڈر ہے کہ کہیں دنیا تم پر کشادہ ہو جائے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر کشادہ ہوئی تھی پھر ایک دوسرے سے زیادہ شوق کرنے لگو جیسے اگلے لوگوں نے شوق کیا تھا اور وہ (شوق) تمہیں ہلاک کر دے جیسے ان لوگوں کو ہلاک کیا تھا۔"

(صحیح مسلم)

دنیا اور آخرت

سیدنا مستورد اخی بنی فہر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ کی قسم دنیا آخرت کے سامنے ایسے ہے جیسے تم میں سے کوئی یہ انگلی دریا میں ڈالے (اور یحییٰ نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا) پھر دیکھے کہ کتنی تری دریا میں سے لاتا ہے۔" (تو جتنا پانی انگلی میں لگا رہتا ہے' وہ گویا دنیا ہے اور وہ دریا آخرت ہے۔ یہ نسبت دنیا کو آخرت سے ہے اور چونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت دائمی باقی ہے' اس واسطے اس سے بھی کم ہے)

(صحیح مسلم)

شکر کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔

"بنی اسرائیل کے لوگوں میں تین آدمی تھے۔ ایک کوڑھی سفید داغ والا' دوسرا گنجا' تیسرا اندھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ان کو آزمائے تو ان کے پاس فرشتہ بھیجا' پس وہ سفید داغ والے کے پاس آیا پھر اس نے کہا۔

"اس سے پوچھا) "تجھے کون سی چیز بہت پیاری ہے؟"

اس نے کہا۔ "اچھا رنگ اور اچھی کھال اور مجھ سے یہ بیماری دور ہو جائے جس کے سبب سے لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فرشتے نے اس پر ہاتھ ملا' پس اس کی بدصورتی دور ہوئی اور اس کو اچھا رنگ اور اچھی کھال دی گئی۔ فرشتے نے پوچھا۔

"تجھے کون سا مال بہت پسند ہے؟" اس نے کہا "اونٹ یا گائے۔" (راوی حدیث اسحاق بن عبداللہ کو

شک ہے کہ اس نے اونٹ مانگا یا گائے لیکن سفید داغ والے یا گنجے نے ان میں سے ایک نے اونٹ کہا اور دوسرے نے گائے)۔ پس اس کو دس مہینے کی گابھن اونٹنی دی پھر کہا۔ "اللہ تعالیٰ تیرے واسطے اس میں برکت دے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر فرشتہ گنجے کے پاس آیا۔ پس کہا کہ (اس سے پوچھا) "تجھے کون سی چیز بہت پسند ہے؟"

اس نے کہا کہ "اچھے بال اور یہ بیماری جاتی رہے جس کے سبب سے لوگ مجھ سے نفرت کھاتے ہیں۔" پھر اس نے اس پر ہاتھ ملا' پس اس کی بیماری دور ہو گئی اور اس کو اچھے بال ملے۔

فرشتے نے کہا۔ "تجھے کون سا مال بہت پسند ہے؟"

اس نے کہا۔ "گائے۔" پس اس کو گابھن گائے ملی۔ فرشتے نے کہا۔

"اللہ تعالیٰ تیرے مال میں برکت دے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "پھر فرشتہ اندھے کے پاس آیا پس کہا کہ تجھے کون سی چیز بہت پسند ہے؟"

اس نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ آنکھ میں روشنی کر دے تو میں اس کے سبب سے لوگوں کو دیکھوں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر فرشتے نے اس پر ہاتھ ملا' پس اس کو اللہ نے روشنی دی۔ فرشتے نے کہا۔

"تجھے کون سا مال بہت پسند ہے؟"

اس نے کہا۔ "بھیڑ بکری۔" تو اس کو گابھن بکری ملی۔

پھر اونٹنی اور گائے بیائی اور بکری بھی جنی۔ پھر ہوتے ہوتے سفید داغ والے کے جنگل بھر اونٹ ہو گئے اور گنجے کے جنگل بھر گائے بیل ہو گئے اور اندھے کے جنگل بھر بکریاں ہو گئیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدت کے بعد وہی فرشتہ سفید داغ والے کے پاس اپنی پہلی صورت اور شکل میں آیا' پس اس نے کہا۔ "میں محتاج آدمی ہوں اور سفر میں میرے تمام اسباب کٹ گئے (یعنی تدبیریں جاتی رہیں اور مال اور اسباب نہ رہا) پس آج میرے لیے اللہ کی مدد کے سوا اور اس کے بعد تیری مدد کے بغیر منزل پر پہنچنا ممکن نہیں ہے' میں تجھ سے اس کے نام پر مانگتا ہوں جس نے تجھے شہرا رنگ اور ستھری کھال دی اور مال اونٹ دیے' ایک اونٹ دے جو میرے سفر میں کام آئے۔"

اس نے کہا۔ "مجھ پر لوگوں کے بہت حق ہیں۔" (یعنی قرض دار ہوں یا گھر بار کے خرچ سے زیادہ مال نہیں جو تجھے دوں) پھر فرشتہ نے کہا۔ "البتہ میں تجھے پہچانتا ہوں' بھلا کیا تو محتاج کوڑھی نہ تھا؟ کہ لوگ تجھ سے نفرت کرتے تھے پھر اللہ نے اپنے فضل سے تجھے یہ مال دیا۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں نے تو یہ مال اپنے باپ دادا سے پایا ہے جو کئی پشت سے نقل ہو کر آیا۔"

فرشتے نے کہا۔ "اگر تو جھوٹا ہو تو اللہ تجھے ویسا ہی کر ڈالے جیسا تو پہلے تھا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "پھر فرشتہ گنجے کے پاس اپنی اسی صورت اور شکل میں آیا اور اس سے کہا جیسا سفید داغ والے سے کہا تھا اس نے بھی وہی جواب دیا جو سفید داغ والے نے دیا تھا۔ فرشتے نے کہا۔ "اگر تو جھوٹا ہو تو اللہ تجھے ویسا ہی کر ڈالے جیسا تو تھا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "پھر فرشتہ اندھے کے پاس اپنی اسی شکل اور صورت میں گیا پھر فرشتے نے کہا۔ "میں محتاج آدمی ہوں اور مسافر ہوں اور میرے سفر میں میرے سب وسیلے اور تدبیریں کٹ گئیں پس مجھے آج منزل پر اللہ کی مدد اور اس کے بعد تیری مدد کے بغیر پہنچنا مشکل ہے۔ پس میں تجھ سے اس اللہ کے نام پر ایک بکری مانگتا ہوں جس نے تجھے آنکھ دی تاکہ وہ میرے سفر میں کام آئے۔"

اس نے کہا۔ "بے شک میں اندھا تھا تو اللہ نے

مجھے آنکھ دی۔ تو ان بکریوں میں سے لے جا جتنا تیرا جی چاہے اور بکریوں میں سے چھوڑ جا جتنا تیرا جی چاہے۔ اللہ کی قسم آج جو چیز تو اللہ کی راہ میں لے گا' میں تجھے مشکل میں نہ ڈالوں گا۔" (یعنی تیرا ہاتھ نہ پکڑوں گا) پس فرشتے نے کہا۔

"اپنا مال رہنے دے۔ تم تینوں آدمی صرف آزمائے گئے تھے' پس تجھ سے تو اللہ تعالیٰ راضی ہوا اور تیرے دونوں ساتھیوں سے ناخوش ہوا۔"

(صحیح مسلم)

صبر کا بیان

سیدنا خالد بن عمیر عدوی کہتے ہیں کہ (امیر بصرہ) عتبہ بن غزوان نے ہمیں خطبہ سنایا تو اللہ تعالیٰ کی تعریف کی اور ثناء کی پھر کہا۔ "بعد حمد و صلوۃ کے معلوم ہو کہ دنیا نے ختم ہونے کی خبر دی اور دنیا میں سے کچھ باقی نہ رہا مگر جیسے برتن میں کچھ بچا ہوا پانی رہ جاتا ہے جس کو اس کا صاحب بچا کر رکھتا ہے اور تم دنیا سے ایسے گھر کو جانے والے ہو جس کو زوال نہیں تو اپنی زندگی میں نیک عمل کر کے جاؤ' اس لیے کہ ہم سے بیان کیا گیا کہ پتھر جہنم کے اوپر کے کنارے سے ڈالا جائے گا اور ستر برس تک اس میں اترتا جائے گا اور اس کی تہہ کو نہ پہنچے گا۔ اللہ کی قسم جہنم بھری جائے گی۔ کیا تم تعجب کرتے ہو؟"

اور ہم سے بیان کیا گیا۔ "جنت کے دروازے کی طرف سے لے کر دوسری طرف کنارے تک چالیس برس کی راہ ہے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ دروازہ لوگوں کے ہجوم سے بھرا ہوا ہو گا اور میں نے اپنے کو دیکھا کہ میں سات شخصوں میں سے ساتواں شخص تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور ہمارا کھانا کچھ نہ تھا' سوائے درخت کے پتوں کے۔ یہاں تک کہ ہماری باچھیں زخمی ہو گئیں۔ (بوجہ پتوں کی حرارت اور سختی کے) میں نے ایک چادر پائی اور اس کو پھاڑ کر دو ٹکڑے کیے' ایک ٹکڑے کا میں نے تہبند بنایا اور دوسرے ٹکڑے کا سعد بن مالک نے۔ اب آج کے روز کوئی ہم میں سے ایسا نہیں ہے کہ کسی شہر کا حاکم نہ ہو اور میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھوں لیکن اللہ کے نزدیک چھوٹا ہوں اور بے شک کسی پیغمبر کی نبوت (دنیا میں) ہمیشہ نہیں رہی بلکہ نبوت کا اثر (تھوڑی مدت میں) جاتا رہا یہاں تک کہ اس کا آخری انجام یہ ہوا کہ وہ سلطنت ہو گئی تو تم قریب پاؤ گے اور تجربہ کرو گے ان امیروں کا جو ہمارے بعد آئیں گے۔" (کہ ان میں دین کی باتیں جو نبوت کا اثر ہے' نہ رہیں گی اور وہ بالکل دنیادار ہو جائیں گے۔)

آل مال اور عمل

(صحیح مسلم)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مردے کے ساتھ تین چیزیں (قبرستان میں) جاتی ہیں پھر دو لوٹ آتی ہیں اور ایک رہ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کے گھر والے اور مال اور عمل جاتے ہیں۔ تو گھر والے اور مال تو لوٹ آتے ہیں اور عمل اس کے ساتھ رہ جاتا ہے۔" (پس عمل پوری رفاقت کرتا ہے' اسی کے لیے انسان کو کوشش کرنی چاہیے کہ بال بچے' مال دولت یہ سب جینے تک کے ساتھی ہیں' مرنے کے بعد کچھ کام کے نہیں اور ان میں دل لگانا بے عقلی ہے۔)

(صحیح مسلم)

قناعت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس شخص کو دیکھو جو تم سے (مال اور دولت میں اور حسن و جمال میں اور بال بچوں) میں کم ہے اور اس کو مت دیکھو جو (ان چیزوں میں) تم سے زیادہ ہے۔ اگر ایسا کرو گے تو اللہ کی نعمت کو اپنے اوپر حقیر نہ سمجھو گے۔"

(صحیح مسلم)

اللہ کا پسندیدہ بندہ

سیدنا عامر بن سعد کہتے ہیں کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے اونٹوں میں تھے' اتنے میں ان کا بیٹا عمر آیا (یہ عمر بن سعد وہی ہے جو سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لڑا اور جس نے دنیا کے لیے اپنی آخرت برباد کی)۔

جب سیدنا سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو دیکھا تو کہا اس سوار کے شر سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔"

پھر وہ اترا اور بولا کہ تم اپنے اونٹوں اور بکریوں میں اترے ہو اور لوگوں کو چھوڑ دیا' وہ سلطنت کے لیے لڑ رہے ہیں" (یعنی خلافت اور حکومت کے لیے)۔

سیدنا سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے سینے پر مارا اور کہا کہ چپ رہ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ اس بندے کو دوست رکھتا ہے جو پرہیزگار ہے' مال دار ہے' ایک کونے میں چھپا بیٹھا ہے' فساد اور فتنے کے وقت اور دنیا کے لیے اپنا ایمان نہیں بگاڑتا۔"

افسوس ہے کہ عمر بن سعد نے اپنے باپ کی نصیحت کو فراموش کیا اور دنیا کی طمع میں آخرت گنوائی۔ نووی رحمتہ اللہ نے کہا کہ مال دار سے مراد یہ ہے کہ اس کا دل غنی ہو اور قاضی نے کہا کہ مال دار سے ظاہری معنی مراد ہیں۔

(صحیح مسلم)

ریا کا بیان

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص لوگوں کو سنانے کے لیے نیک کام کرے گا اللہ تعالیٰ بھی قیامت کے دن اس کی ذلت لوگوں کو سنائے گا اور جو شخص ریا کرے گا اللہ تعالیٰ بھی اس کو دکھلائے گا۔" (یعنی صرف ثواب دکھلائے گا مگر ملے گا کچھ نہیں تاکہ صرف حسرت ہی حسرت ہو یا اس کا حشر لوگوں کو دکھائے گا)

(صحیح مسلم)

کلمۂ کفر

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ "بندہ ایسی بات کہہ بیٹھتا ہے جس کی وجہ سے آگ میں اتنا اتر جاتا ہے جیسے مشرق سے مغرب تک۔" (جیسے کسی مسلمان کی شکایت یا مخبری حاکم وقت کے سامنے یا تہمت یا گالی یا کفر کا کلمہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا شریعت کے ساتھ مذاق۔ پس انسان کو چاہیے کہ زبان کو قابو میں رکھے' بے ضرورت بات نہ کرے۔)

(صحیح مسلم)

مومن کے لئے بھلائی

"سیدنا صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مومن کا بھی عجب حال ہے' اس کا ثواب کہیں نہیں گیا۔ یہ بات سوائے مومن کے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اگر اس کو خوشی حاصل ہوئی تو وہ شکر کرتا ہے اس میں بھی ثواب ہے اور جو اس کو نقصان پہنچا تو صبر کرتا ہے اس میں بھی ثواب ہے۔"

مسلمان کی مدد

"کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے غم کو ہلکا کرے گا تو اللہ اس کے غم کو ہلکا کرے گا۔"

اور فرمایا۔ "ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں' اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان بیمار پڑے تو اس کی عیادت کرے۔"

(ابوداؤد)

ابنِ انشا

آپ سے کیا پردہ

طریقہ محفل میں بات کرنے کا

محفل میں اجنبیوں سے کیسے بات کی جائے' ہمسائیوں پر روش اخلاقی کا کیسے سکّہ جمایا جائے۔ اس کے گر یا تو بخشند خدائے بخشندہ ورنہ ڈیل کارنیگی کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے اور کسب کمال کر کے عزیز جہاں ہونے کی کوشش کیجئے۔ مختصر لفظوں میں مقبولیت کا نسخہ زریں یہ ہے کہ مخاطب سے ڈھب اور دلچسپی کی بات کرو۔ اپنے ذوق یا دلچسپی سے علاقہ مت رکھو۔

شروع میں ہمیں بھی یہ بھید معلوم نہ تھا۔ ہمارے محلّے میں سامنے کے گھر میں غلّے اور تیل کے بیجوں کے مشہور آڑھتی روپیہ پیسہ بھائی بہام کر والے رہتے تھے۔ ہم جب اس مکان میں آئے تو انہوں نے بڑے خلوص سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ان کی اہلیہ بھی محلّے میں ہمارے گھر والوں کو ہی پسند کرتی تھیں اور جب کبھی دونی چونی مانگنی ہو یا گھر میں گھی تیل ختم ہو یا سلائی کی مشین چاہیے ہوتی تو ہمیں سے رجوع کرتی تھیں۔ ہم بھی سیٹھ صاحب کی خوشنودی کے لیے اپنی سی ہر کوشش کرتے تھے۔

پہلی اتوار آئی تو ان کو دو غزلیں سنائیں' دوسرے اتوار ایک قصیدہ گوش گزار کیا۔ تیسرے اتوار ہم نے ان کے لیے ایک طویل مختصر افسانہ تیار کر رکھا تھا جو ایک طرح سے تحلیل نفسی کا شاہکار تھا لیکن سیٹھ صاحب نہ آئے۔ آخر ہم ان کے گھر جا کر سنا کر آئے۔ اس کے بعد جانے کیا ہوا کہ انہوں نے نہ صرف ہمارے ہاں آنا بند کر دیا بلکہ ہم جیب میں اپنے ایک عزیز کی شادی کا سہرا رکھ کر ان سے ملنے گئے تو انہوں نے اندر سے کہلوا دیا کہ "نہیں ہیں سیٹھ صاحب لاڑکانہ گئے ہیں۔"

کچھ اسی قسم کی واردات ہمارے دوسرے پڑوسی کے ساتھ ہوئی۔ وہ ٹریکٹروں کی ایک کمپنی میں مکینیکل انجنیئر ہیں یا شاید فورمین ہیں۔ معلوم ہوا جالندھر کے ہیں جس کو علمی ادبی ذوق کی بنا پر شیراز ہند کہا جاتا تھا۔ اسی رعایت سے ہم نے علیک سلیک کے بعد پہلے تو جالندھر کے ہندوستان میں رہ جانے پر ان سے تعزیت کی۔ اس کے بعد اپنا تازہ فارسی کلام سنایا۔

ہمارے تعلقات میں سرد مہری تو اسی روز آ گئی لیکن دوسری بار جو ہم نے اقبال کے فلسفۂ خودی کے ماخذ پر بحث چھیڑی تو نہ جانے کیا ہوا کہ اُٹھ کے اندر چلے گئے اور پھر سڑک پر ملتے بھی تو دوسرے فٹ پاتھ پر ہو لیتے۔ ہم نے اپنے اقبال پرست دوستوں سے پوچھا بھی کہ یارو فلسفہ میں ایسی کیا بات ہے لیکن کوئی ہمیں مطمئن نہ کر سکا۔ اس کے بعد ہم نے ڈیل کارنیگی کی کتابیں پڑھیں۔

یہ قباحت موضوعاتِ گفتگو کی' اصل میں ہم مردوں کے ساتھ زیادہ ہے۔ خواتین میں تو امیر ہوں یا غریب۔ پی ایچ ڈی یا ان پڑھ' پنجابی کہ دکنی' گفتگو کے بندھے ٹکے اصول' آداب اور موضوعات ہیں۔

☆ اے بہن! یہ ٹیکہ بہت خوبصورت ہے' کتنے کا بنا؟

☆ اے آپا! یہ کپڑا کتنے کا ہے۔ لنڈی کوتل سے منگایا ہو گا؟

☆ ماشاءاللہ کتنے بچے ہیں؟

☆ آپ بالوں میں کون سا تیل لگاتی ہیں؟

☆ یہ نیل پالش کون سی ہے باجی؟

☆ اری رضیہ! تم نے "مسٹر اللہ دتہ" دیکھی؟ اس میں نیلو کا کام پسند آیا۔

☆ ہائے اللہ کتنے اچھے سلیپر ہیں۔ کہاں سے لیے؟

ہم مردوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ ہم نے قیافے سے دریافت کیا کہ ہماری داہنی طرف جو بزرگ لانبی مونچھوں والے بیٹھے ہیں یہی چوہدری خیر دین جنجوعہ ہیں ان کی سہیلی کے میاں۔ ان کا تفصیلی تعارف بھابھی نے فون ہی پر کرا دیا تھا۔ لہٰذا ہم نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"اب کے گنے کی فصل تو آپ کے ہاں خوب ہوئی۔"

وہ بھونچکے سے ہو کر بولے۔

"جی...... کیا فرمایا؟"

ہم نے دوسرا سوال داغا۔

"البتہ کھالوں پر جنگ کی وجہ سے اثر پڑا ہو گا؟"

اس پر وہ چپ رہے۔ ہم نے جانا کہ اپنے تجارتی بھید کو بھید ہی رکھنا چاہتے ہیں لہٰذا ہم نے موضوع نمبر تین لیا۔

"شلجموں کے لیے کون سی ولایتی کھاد موزوں رہتی ہے۔ ہم نے اپنے لان میں شلجم بوئے ہیں۔"

اس گفتگو کی بھنک بھابھی کے کان میں پڑی تو وہ بھاگی آئیں اور بولیں۔

"یہ آپ کن سے بات کر رہے ہیں۔ یہ تو مشہور مرثیہ نگار شعلہ بنارسی ہیں' میرے بھانجے کے ہم زلف۔ یہ دوسرے میرے تایا زاد بھائی کرنل حبیب اللہ اور یہ میری سہیلی کے میاں چوہدری خیر...... ارے یہ تو سو گئے۔ ابھی اٹھیں گے تو ان سے بات کرنا۔"

اس روز کی محفل میں چوہدری خیر دین کے خراٹوں کی گونج میں ہم نے دو غزلیں شعلہ صاحب کو سنائیں' تین قصیدے اور ایک شہرِ آشوب سے انہوں نے یہ قرض اتارا۔ کرنل صاحب کو ہم نے کچھ دیر بکتر بند گاڑیوں کے اسرار و رموز میں الجھایا۔ اس کے بعد ان کا ہاتھ دیکھ کر ان کے گھوڑے کی اگلی ریس جیتنے کی خوشخبری دی اور جب چوہدری خیر دین جنجوعہ استراحت سے فارغ ہوئے تو سلسلہ کلام کو یوں مربوط کیا کہ ولایتی کھاد سے نیشکر کی اقسام جدید تک آنے اور بی۔ ڈی کے تازہ ترین الیکشنوں سے بدیں عنوان گریز کیا کہ رشوت خوری اور بد عنوانی کرنے والوں کی کھال میں بھُس بھروا دینا چاہیے۔ یہاں سے سر رشتہ کے مسئلے پر تقریر کی۔ پھر بھُس کی کمیابی کے اسباب بیان کیے۔ آخر میں کچھ ذکر افریقہ اور مشرق وسطی کے حالیہ انقلابوں اور ویت نام کا بھی ہوا۔ گفتگو کے خاتمے تک وہ ہمیں اپنے ہاں سے کھانڈ کی بوری ریویو کے لیے بھجوانے کا وعدہ کر چکے تھے اور کھالوں کی رنگائی کے سلسلے میں ہم ان کا مشیرِ اعزازی بننے کی ہامی بھر چکے تھے۔

یہاں ہم گزارش کریں گے کہ اس تحریر کو خود ستائی پر محمول نہ کیا جائے۔ من آنم کہ من دانم' جس طرح پرانے زمانے میں علوم مجلسی میں یہ شامل تھا کہ ہر شریف زادے کو ہزار دو ہزار اشعار اساتذہ کے ازبر ہونے چاہئیں۔ کچھ اسی قسم کی یہ سائنس ہے جن صاحبوں کو مزید معلومات درکار ہوں ہمارے ادارہ علوم مجلسی (رجسٹرڈ) میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ دس روپے کا منی آرڈر آنے پر پراسپیکٹس مفت بھیجا جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

ڈرامہ سیریل جیت کی ریل

شگفتہ بھٹو سے باتیں

شاہین رشید

۱۔ مجھے شگفتہ بھٹو کہتے ہیں۔

۲۔ اصلی نام؟
عشرت بھٹو۔

۳۔ گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟
میرا نک نیم ہے مگر میں بتاؤں گی نہیں کیونکہ پھر سب وہی استعمال کرنے لگیں گے۔ چھوٹے بہن بھائی مجھے آپی کہتے ہیں۔

۴۔ سن پیدائش / جائے پیدائش؟
۱۰ جنوری / خیرپور۔

۵۔ میرا قد؟
پانچ فٹ پانچ انچ۔

۶۔ بہن بھائیوں کی تعداد / میرا نمبر؟
چار بھائی، چار بہنیں۔ میرا نمبر دوسرا ہے۔

۷۔ میرا ستارہ؟
کیپری کورن۔

۸۔ تعلیمی قابلیت؟
ابھی تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ جب تعلیم مکمل کروں گی تو پھر آپ کو بتاؤں گی۔

۹۔ شادی کے کب ارادے ہیں؟
ابھی کچھ پتا نہیں ہے ویسے میری امی تو یہی کہتی ہیں کہ خدا کرے تمہیں کوئی پسند آجائے اور تم شادی کرلو۔

۱۰۔ ٹی وی پہ متعارف کرانے کا سہرا؟
اقبال سعید انصاری۔

۱۱۔ وہ پروگرام جو وجہ شہرت بنا؟
انگارے جو ۱۹۹۸ء میں آن ایر آیا تھا۔

۱۲۔ پہلا چیک کتنے کا ملا اور کیا کیا؟
تین ہزار پانچ سو کا تھا اور ہم کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے سب کھا پی کر اڑا دیے۔

۱۳۔ کس مرد فنکار کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟
کوئی خاص نہیں۔ جو اچھا پرفارم کرے۔

۱۴۔ پسندیدہ کمپیئر / پسندیدہ نیوز کاسٹر؟
معین اختر / عشرت فاطمہ میری ہم نام۔

۱۵۔ زندگی کا یادگار لمحہ؟
نویں جماعت میں تھی تو ایک سانپ کو مارا تھا۔

۱۶۔ اگر پولیس کے خوف سے ڈاکو لوٹی ہوئی رقم میری کار میں رکھ کر فرار ہو جائیں تو؟
نہ پولیس کو بتاؤں گی نہ کسی اور کو بلکہ اصلی مالک کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی۔ کیونکہ اس رقم پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔

۱۷۔ زندگی میں کس شخصیت کی کمی محسوس ہوتی ہے؟
والد کی۔

۱۸۔ میں دلبرداشتہ ہو جاتی ہوں؟
جب ملک کے خراب حالات دیکھتی ہوں۔

۱۹۔ کیا عشق کے بغیر زندگی نامکمل ہے؟
میری تو عشق کے بغیر بہت اچھی زندگی گزر رہی ہے۔

۲۰۔ میں معاف کر دیتی ہوں؟
ایک حد تک۔ اگر بات کی نوعیت معافی والی ہو تو۔

۲۱۔ مجھے ترس آتا ہے؟
اُن لوگوں پر جو اتنے بے بس ہوتے ہیں کہ کوئی ان کی بے عزتی کر رہا ہوتا ہے مگر وہ جواب نہیں دے پاتے۔

۲۲۔ آٹوگراف بک میں کیا لکھتی ہوں؟
یہ منحصر ہے کہ آٹوگراف کون مانگ رہا ہے۔

۲۳۔ میرے ڈراموں کی تعداد؟
سچ پوچھیں تو مجھے یاد نہیں کیونکہ اردو میں تو اتنے سیریل نہیں کیے جتنے سندھی کے سیریلز کیے ہیں۔

۲۴۔ اگر میں قومی اسمبلی کی ممبر ہوتی تو؟
تو جس حلقے سے کامیاب ہوتی اُس کے مسائل حل کرتی اور عورتوں کے حقوق کے لیے لڑتی۔

۲۵۔ اگر میں وزیراعظم ہوتی تو پہلا کام کیا کرتی؟
پورے ملک کو سنوار دیتی۔

۲۶۔ زندگی کا کوئی مسئلہ جسے فوری طور پر حل کرنا چاہتی ہوں؟
ایک مسئلہ۔ مسائل ہی مسائل ہیں۔ کشمیر کے مسئلے کو حل کرتی۔

۲۷۔ اگر مجھے الہ دین کا چراغ مل جائے تو کون سی تین خواہشات کروں گی؟
ڈھیر سارا پیسہ مانگوں گی۔ ایک اچھی سی کالونی بنواؤں گی بلکہ اُسے ہی بنانے کو کہوں گی اور تیسری خواہش یہ کہ ہمارے ملک میں پانی کا مسئلہ حل ہونا چاہیے۔

۲۸۔ میری جاسوسی پہ کسی کو مامور کیا جائے تو میری شخصیت کے بارے میں پہلا انکشاف کیا ہوگا؟
ارے یہ تو کافی بور لڑکی ہے۔

۲۹۔ جب ڈیپریشن ہوتا ہے تو کیا کرتی ہوں؟
نماز پڑھتی ہوں یا چپ چھپ کر رو لیتی ہوں۔

۳۰۔ پسندیدہ مشروب / پسندیدہ کھانا؟
لیمن اسکواش / فرائیڈ فش۔

۳۱۔ شدید بھوک میں کیا کرتی ہوں؟
دل چاہتا ہے ساری دُنیا کا کھانا آجائے اور میں لوٹ پڑوں۔

۳۲۔ گھر کے کاموں سے میری دلچسپی؟
بہت زیادہ ہے لیکن ملازموں کی وجہ سے کرتی نہیں۔ گھر کی ڈیکوریشن کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔

۳۳۔ گھر والوں کی کون سی بات میرا موڈ خراب کر دیتی ہے؟
جب چھوٹے بہن بھائی میرا کہنا نہیں مانتے۔

۳۴۔ ماں ناراض ہو جائے تو؟
تو بھوک مر جاتی ہے۔ میں ماں کو ناراض نہیں کر سکتی کہ ماں کو تو ایک نظر محبت سے دیکھنے پر نہ جانے کتنی نیکیوں کا اجر ملتا ہے۔

۳۵۔ مہمانوں کی اچانک آمد پر کھانا پکانا پڑ جائے تو؟
پکاؤں گی کیونکہ ہماری روایات میں یہ شامل ہے کہ کوئی کھانے کے وقت آجائے تو اُسے خالی پیٹ نہیں بھیجتے۔

۳۶۔ کیا میں اچھی کک ہوں؟
بالکل ہوں لیکن میں نے کئی سالوں سے نہیں پکایا۔ اٹالین اور چائنیز مجھے پسند ہیں اور میں اپنے کک سے کھانا پکوا لیتی ہوں اور سیکھ بھی لیتی ہوں کہ مجھے شوق ہے۔

۳۷۔ چاندنی رات ہو اور سمندر کا کنارا، اچانک کوئی خوفناک جانور آجائے تو؟
ماروں گی اور وہ مجھ سے ڈر کر بھاگ جائے گا۔

۳۸۔ پہلی ملاقات میں شخصیت کی کس چیز کا جائزہ لیتی ہوں؟
اگر مرد ہے تو خواتین کا کتنا احترام کرتا ہے اور

لڑکی ہے تو کتنی ڈیسنٹ ہے۔

۳۹۔ میرے نزدیک سائنس کی بہترین ایجاد؟
کمپیوٹر۔ موبائل فون۔

۴۰۔ مجھے غصہ آتا ہے؟
اب بہت آتا ہے لوگوں کا رویہ دیکھ کر۔

۴۱۔ ایک وسوسہ جو مجھ پر طاری رہتا ہے؟
نہیں، مجھے کوئی وسوسہ نہیں ہے۔ بس اس بات سے ڈر لگتا ہے کہ لوگوں کے آگے یعنی دوسرے ممالک کے سامنے جو ہمارا امیج خراب ہو رہا ہے اُس کے کیا نتائج سامنے آئیں گے۔

۴۲۔ حکومتِ پاکستان اگر کوئی عہدہ دینا چاہے تو کون سا عہدہ قبول کروں گی؟
سوشل ورکر کا۔ تاکہ خواتین کو اُن کے حقوق دلاؤں۔

۴۳۔ بڑھاپا کیسے گزاروں گی؟
مجھے نہیں لگتا کہ بڑھاپے تک پہنچوں گی لیکن اگر اللہ نے بڑھاپے تک پہنچایا تو پھر سعودی عرب میں اللہ اللہ کر کے گزاروں گی۔

۴۴۔ زندگی کا وہ لمحہ جس کا تصور آج بھی خوفزدہ کر دیتا ہے؟
والد صاحب کا انتقال۔ اُس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ قیامت کیا ہوتی ہے۔ میرے والد کا ۲۰۰۹ء میں انتقال ہوا۔

۴۵۔ میرا قیمتی سرمایہ؟
میری فیملی۔

۴۶۔ بچھڑے لوگوں میں کون شدت سے یاد آتا ہے؟
والد صاحب۔

۴۷۔ کبھی ایک جگہ سے دو مرتبہ دھوکا کھایا؟
دو مرتبہ؟۔ پوچھیں کتنی مرتبہ دھوکا کھایا۔

۴۸۔ اگر مجھے کسی سنسان ویران جگہ بھیجا جائے تو کسے ساتھ لے جانا پسند کروں گی؟
کوئی نہیں۔ ویسے اُن لوگوں کو لے جاؤں گی جو اُن جگہوں سے واقف ہوں گے۔

۴۹۔ ایک غلطی جس پہ میں شرمندہ ہوں؟
ایک نہیں انسان تو خطا کا پتلا ہے۔

۵۰۔ مجھے مزا آتا ہے؟
جب اچھے دوست ساتھ ہوں۔

۵۱۔ میری تین خوبیاں جو بہت نمایاں ہیں؟
مجھے نہیں معلوم۔ میرے قریبی لوگوں سے پوچھیں۔

۵۲۔ پسندیدہ کھیل / کھلاڑی / موسم؟
کوئی نہیں / کوئی نہیں / سردیاں، برسات۔

۵۳۔ غصے کے وقت کیا کرتی ہوں؟
میں منہ پر بات کر کے غصہ نکال لیتی ہوں لیکن سامنے اگر احترام والی شخصیت ہو تو پھر اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیتی ہوں۔

۵۴۔ بارہ مہینوں میں کون سا مہینہ اچھا لگتا ہے؟
برسات کا مہینہ۔

۵۵۔ میری پسندیدہ عادت؟
کیئرنگ بہت ہوں۔ دوسرے کا خیال رکھتی ہوں۔

۵۶۔ آئینہ کیا بتاتا ہے؟
کہ اللہ نے مجھے مکمل انسان بنایا ہے۔

۵۷۔ کس جانور سے خوف آتا ہے؟
چھپکلی اور لال بیگ سے گھن آتی ہے۔ ویسے تو بڑے بڑے جانوروں سے خوف تو آتا ہی ہے۔ میں تو سانپ مار چکی ہوں اس لیے سانپ سے خوف نہیں آتا۔

۵۸۔ مردوں میں کون سی خصوصیات اچھی لگتی ہیں؟
تعلیم یافتہ ہوں۔ روشن خیال ہوں۔ عورتوں کا احترام کرتے ہوں۔

۵۹۔ آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو کیا کرتی ہوں؟
تہجد پڑھتی ہوں۔

۶۰۔ وہ رشتہ جس نے مجھے تکلیف دی؟
کوئی نہیں ہے۔

۶۱۔ پوری دُنیا میں میری عزیز ترین دوست؟
میری ماں۔

۶۲۔ چوبیس گھنٹوں میں کون سا وقت اچھا لگتا ہے؟
وہ وقت جب میں اپنے کمرے میں ہوتی ہوں۔

۶۳۔ طالب علمی کے زمانے میں کس مضمون سے نفرت تھی؟
میتھ سے۔

۶۴۔ کس ملک پر حکومت کرنا چاہتی ہوں؟
امریکہ۔

۶۵۔ زندگی کا وہ ایک لمحہ جس نے میری زندگی بدل دی؟

شوبز میں میری آمد۔ میں وہ ہو گئی جو میں نہیں تھی۔

۶۶۔ پسندیدہ اخبار؟ / میگزین / صحافی؟
جو سچی خبریں چھاپیں / جو دلچسپ ہوں جیسے آپ کا ڈائجسٹ / مت پوچھیں لوگ ناراض ہو جائیں گے۔

۶۷۔ کاش کوئی میرے بارے میں کہے کہ؟
کہ یہ اچھا کام کرتی ہے۔ ویسے اس کی امید کم ہے کیونکہ لوگ بُرائیاں زیادہ کرتے ہیں۔ اچھائیاں کم۔ برائیاں کرنا آسان کام ہے۔

۶۸۔ میری زندگی کا خوبصورت ترین دن؟
وہ دن جب میری والدہ خود سے آکر مجھے پیار کریں گی۔ میری والدہ بہت شرمیلی ہیں۔ ہم اُن کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ دُور بھاگتی ہیں پتا نہیں کیوں۔

۶۹۔ میری کس عادت سے گھر والے بیزار رہتے ہیں؟
بلاوجہ غصے سے۔

۷۰۔ میں بھول جاتی ہوں؟
کچھ عرصہ قبل بھلکڑ ہو گئی تھی۔ امی نے بادام کھلائے تو ٹھیک ہوئی۔

۷۱۔ کس کی خاطر جان بھی قربان کر سکتی ہوں؟
امی کی خاطر۔

۷۲۔ دوبارہ زندگی ملے تو کیا بننا پسند کروں گی؟
میں ان باتوں پر یقین نہیں کرتی۔

۷۳۔ اگر میرا تین کروڑ کا پرائز بانڈ نکل آئے تو؟
پھر تو میں بے ہوش ہو جاؤں گی اور دو دن بعد ہوش میں آؤں گی۔ ویسے نکلنے دیں پھر سوچوں گی۔

۷۴۔ کون سی چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟
کوئی نہیں۔ مجھے تو سگریٹ کے دھویں سے الرجی ہے۔

۷۵۔ صبح سویرے بیدار ہوتے ہی کسے دیکھنا پسند کرتی ہوں؟
کسی کو نہیں۔ نماز پڑھتی ہوں۔

۷۶۔ جب تنہا ہوتی ہوں تو خیال آتا ہے؟
کہ کاش مجھے اس ملک کی باگ ڈور مل جائے۔

۷۷۔ رقم کو محفوظ کرنے کا بہترین ذریعہ؟
رقم رکھنے کے لیے یا جمع کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ خرچ کرنے کے لیے ہوتی ہے اس لیے میں تو خرچ کر دیتی ہوں۔

۷۸۔ شدید تکان کے باوجود کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہوں؟
پُرفضا مقام پر۔

۷۹۔ انسان کے سر میں غرور کب سماتا ہے؟
جب اُسے وہ چیز مل جائے جس کا وہ مستحق نہیں ہوتا۔

۸۰۔ اگر ایک دن پہلے اپنی موت کا علم ہو جائے تو؟
میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لیے مجھے اب موت سے خوف نہیں آتا۔ میں ایک مرتبہ ہوائی جہاز میں سفر کر رہی تھی۔ راستے میں موسم خراب ہونے کی وجہ سے جہاز ڈولنے لگا۔ اور یوں لگا کہ اب گرا کہ گرا۔ مگر پھر اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا اور سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔

۸۱۔ زندگی کی ایک خواہش جس کے پورا ہونے تک میں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟
حج کروں اور سعودی عرب میں رہوں۔

۸۲۔ صبح سویرے اُٹھتے ہی کس چیز کی طلب ہوتی ہے؟
برش کرنے کے بعد چائے کی اور پانی کی۔

۸۳۔ ایک نیکی جو گلے پڑ گئی؟
بہت سی نیکیاں ہیں۔ کیا کیا بتاؤں۔

۸۴۔ کوئی تین چیزیں جنہیں لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتی؟
گاڑی کا لائسنس، بیگ اور کار کی چابی۔

۸۵۔ بچپن کا وہ کھلونا جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے؟
ایک گڑیا اور ایک گڈا۔

۸۶۔ اپنے چہرے کے خدوخال میں کیا اچھا لگتا ہے؟
کبھی غور نہیں کیا۔ دیگر لڑکیوں کی طرح آئینہ دیکھنے اور سنورنے کا شوق نہیں ہے۔

۸۷۔ پسندیدہ پھل / پھول / خوشبو؟
چیکو اور پپیتا / گلاب / گلاب۔

۸۸۔ زندگی کے وہ دن جو میں چاہتی ہوں کہ لوٹ آئیں؟

کوئی مجھ سے سب کچھ لے لے مگر بچپن لوٹا دے۔

۸۹۔ کوئی سواری جسے استعمال کرنے سے پیدل چلنا بہتر سمجھتی ہوں؟
رکشہ۔ شور بہت کرتا ہے۔

۹۰۔ اگر میری ملاقات شیطان سے ہو جائے تو؟
شیطان مجھے دیکھ کر بھاگ جائے گا کہ یہ تو بہت ہی پاگل لڑکی ہے۔

۹۱۔ چودھویں کا چاند دیکھ کر میں سوچتی ہوں؟
کاش تم میں یہ داغ نہ ہوتا تو تم کتنے اچھے ہوتے۔

۹۲۔ پسندیدہ سواری / لوک فنکار / تہوار؟
اپنی کار / عابدہ پروین / عیدیں۔

۹۳۔ خوشی کے لمحات میں خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہوں؟
منحصر ہے کہ خوشی کیا ہے۔ ویسے ہلا گلا کرتی ہوں۔

۹۴۔ کتنی زبانوں پر عبور حاصل ہے؟
تھوڑی پنجابی، اردو، سرائیکی، بلوچی، سندھی۔

۹۵۔ انسان اور جانور میں بہت سی صفات مشترک ہیں آپ نے کسی سے کوئی سبق سیکھا؟
چیونٹی سے سبق سیکھا ہے۔ وہ اپنا راستہ نہیں چھوڑتی۔

۹۶۔ میرا ذریعۂ معاش؟
اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ مجھے کمانے کی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی میں شوہر سے کما لیتی ہوں۔

۹۷۔ میری آئیڈیل شخصیت؟
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔

۹۸۔ میں کس حد تک رومینٹک ہوں؟
کسی بھی حد تک نہیں۔ مجھے تو کوئی سین بھی کرنا پڑ جائے تو میرے جسم کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۹۹۔ اگر میری شہرت کو زوال آ جائے تو؟
ہم تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ بڑے بڑے بادشاہوں کو زوال آئے اور شوبز میں تو اُتار چڑھاؤ ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔

وصی شاہ کا گھر

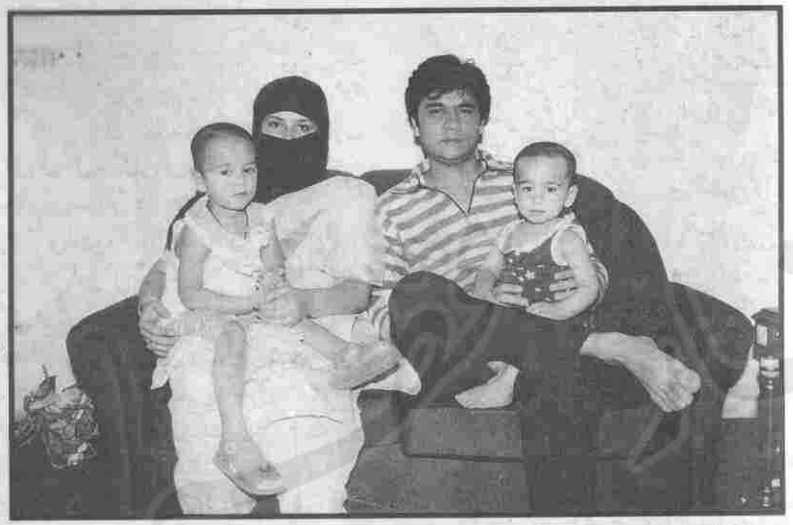

شہلا نرگس

عاشر عظیم کا سیریل "دھواں" رؤف خالد کے کشمیر کے موضوع پر لکھے ہوئے سنجیدہ سیریلز اور پھر وصی شاہ کا "آہن" لاجواب سیریل تھے ان ڈراموں کو عوام نے دلچسپی — سے دیکھ کر یہ ثابت کیا کہ وہ سنجیدہ موضوعات پر دکھائے جانے والے سیریلز کو بھی دلچسپی — سے دیکھتے ہیں جن دنوں یہ سیریلز دکھائے گئے' لوگ اپنا کاروبار بند کر کے ٹی وی کے آگے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ مگر بعد میں ان باصلاحیت لوگوں سے اتنا کام نہیں لیا گیا' جس سے استفادہ کر کے ہم نئی نسل کے ذہنوں کو بدل سکتے تھے' بلکہ وصی شاہ کا کہنا ہے کہ آج کے دور میں جب سیریل چل رہا ہوتا ہے تو اس کے بڑے چرچے ہوتے ہیں ادھر سیریل بند ہوا ادھر شہرت کا در بھی بند ہو گیا لیکن میں وصی کی رائے سے اتفاق نہیں کرتی کیونکہ ان تینوں لکھنے والوں نے اگرچہ کم لکھا مگر عوام کے ذہنوں میں وہ آج بھی موجود ہیں اور جب بھی ان کے سیریلز کا ذکر ہوتا ہے تو ان کی کارکردگی' ان کی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔

ڈرامہ سیریل "آہن" کے رائٹر اور شاعر وصی شاہ کی کتاب "آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔" کا پہلا ایڈیشن ایک اندازے کے مطابق پچاس ہزار سے زیادہ تعداد میں شائع ہوا تھا جو پاکستان میں ایک ریکارڈ ہے' وصی شاہ کا کہنا ہے کہ یہ قدرت کا مجھ پر خاص کرم ہے کہ پروین شاکر اور احمد فراز کے بعد بطور شاعر میری کتاب نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی پھر اس مجموعے کی ایک نظم کنگن کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ آج تک لوگوں کو لفظ بہ لفظ یاد ہے۔

وصی نے خود بھی آہن میں مرکزی رول کیا تھا۔

اگرچہ یہ ان کا پہلا سیریل تھا مگر ان کا کام دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ انہوں نے اس سے پہلے اداکاری نہیں کی ۔وصی نے یہ سیریل پاکستان آرمی کے لیے لکھا تھا پھر انہوں نے "مجرم" لکھا اور اس کی ہدایت کاری کے فرائض بھی سرانجام دیے۔ یہ ان کا پہلا طویل دورانیے کا ڈرامہ تھا جسے لوگوں نے بہت پسند کیا اس کے بعد "محبت ہوتے ہوتے" لکھا "سمندر چاہتوں کا" بھی سیریل ہی تھا۔ لیکن جتنی شہرت "آہن" کو ملی تھی بعد میں کسی دوسرے سیریل کو نہیں مل سکی۔ یہی سوال لے کے ہم وصی کے پاس گئے اور ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔

ج "کسی ادیب کا سارا لکھا ہوا، کسی فنکار کی تمام تر پرفارمنس اور کسی شاعر کی تمام نظمیں قابل تعریف نہیں ہوتیں بس ان میں سے کوئی ایک دو کتابیں، ایک آدھ ڈرامے میں اداکاری اور کوئی ایک آدھ نظم ہی اسے زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیتی ہے پھر ساری عمر اس جدوجہد میں گزر جاتی ہے کہ اس شہرت کو کیونکر برقرار رکھا جائے اور اس ناتے وہ تگ و دو کرتا ہے جو میں بھی کر رہا ہوں۔ آنے والے سیریلز اور انفرادی ڈرامے ایسے بھی ہیں جو مجھے پہلے کی طرح کامیابیوں سے ہمکنار کریں گے۔"

س "موجودہ مصروفیات کیا ہیں اور ان سیریلز اور ڈراموں کے نام بتائیں گے۔ جن پر آپ کام کر رہے ہیں؟ اور جن سے آپ کو اچھی امیدیں وابستہ ہیں؟"

ج "آرمی کے لیے "ستارۂ جرات" پر کہانیاں لکھنے کا معاملہ زیر غور ہے اور مجھے امید ہے کہ اگر یہ معاملہ طے ہو گیا تو ایک بار پھر میں ٹی وی کے ذریعے عوام کا فیملی ممبر بن جاؤں گا۔ اس کے علاوہ کئی سیریلز اور موویز ہیں۔ زاہد میاں کے لیے ایک فلم کا اسکرپٹ لکھ رہا ہوں۔ انہوں نے بڑے اچھے اچھے سیریلز بنائے ہیں اس فلم کا نام ہے "میں محبت اور تم" ہے۔ دوسرا اسکرپٹ ظفر پٹ کے لیے لکھا ہے، جنہوں نے سیریل لگن بنایا تھا، اب فلم والے سیریلز اور سیریلز بنانے والے فلمیں بنانے کی طرف توجہ دینے لگے ہیں اور اس وجہ سے میں اچھی توقع رکھتا ہوں کہ انشاء اللہ فلموں میں بھی مثبت تبدیلیاں آئیں گی۔

آج کل جیو چینل پر میرا سیریل "خطا" دکھایا جا رہا ہے۔ یاسین ملک کا "سمندر چاہتوں کا" تقریباً مکمل ہے۔ اسے میں نے ہی تحریر کیا ہے۔ اور اس میں کام بھی کر رہا ہوں۔

"مجھے صندل کر دو" راحیل راؤ صاحب کے لیے لکھا ہے۔ یہ سیریل ایک سو پچاس اقساط پر مشتمل ہے۔ کراچی کے اسکیم بھٹی کے لیے "اب جی نہیں لگتا" لکھا ہے۔ دیبا بیگم کے لیے تیرہ قسطوں کا ایک سیریل لکھا ہے۔ یاور حیات کا پچاس اقساط پر مشتمل سیریل جسے اصغر ندیم سید نے لکھا ہے، اس میں اہم کردار ادا کر رہا ہوں یہ تو ہیں انڈر پروڈکشن۔ اس کے علاوہ کچھ آفرز ہیں جن پر کام شروع نہیں کیا۔"

س "وصی شاعری، اداکاری اور رائٹر ہونے کے علاوہ بھی اور کچھ مشاغل ہوں گے؟"

ج "مجھے آرٹ کے ہر شعبے سے دلچسپی ہے، مجھے موسیقی سے بھی لگاؤ ہے اور میں نے اس کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے بلکہ آڈیو کیسٹ بنانے کا معاملہ بھی زیر غور ہے۔ اخبارات اور مختلف رسائل و جرائد کے لیے شاعری کرتا رہتا ہوں۔ میں نے عراق، امریکہ جنگ کے سانحہ پر بھی لکھا جو مختلف اخبارات میں شائع ہوا۔"

س "آہن" لکھنے کا تجربہ کیسا رہا، اس میں کام کرنے اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے آپ نے کتنی تگ و دو کی؟ اس کا بنیادی خیال کیا تھا۔"

ج "آئیڈیا منظور ہو جانے کے باوجود کوئی اسے ریکارڈ کر کے پیش کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اپنی تحریروں کے ذریعے قومی خدمت کروں۔ یہی سوچ کر میں نے چند حساس مسائل پر لکھ کر پاکستان آرمی کو اسکرپٹ بھجوا دیا۔ یہ میرا خواب تھا جس کے لیے میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور دوسروں کو بھی دعا کرنے کی

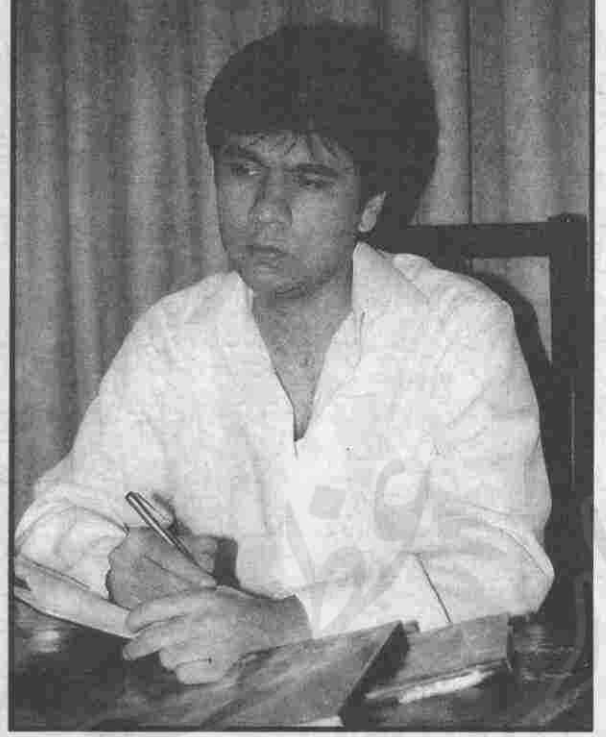

تاکید کی خوش قسمتی سے میری والدہ کی دعاؤں کے طفیل میرا آئیڈیا منظور ہو گیا، پھر مسئلہ اسے شوٹ کرنے کا تھا مگر کسی نے رسپانس نہیں دیا۔ بہت کوشش کے بعد میں اسے اسلام آباد سینٹر سے پیش کروانے میں کامیاب ہوا۔ یہ سیریل میری زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے اسے پیش کرنے کے لیے بہت تگ و دو کی اور دعائیں مانگیں اللہ تعالیٰ نے میرا مان رکھ لیا۔ میں سمجھتا ہوں ہر شعبے میں پائی جانے والی کھینچا تانی کے باوجود ٹیلنٹ کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ جن حالات میں اس فیلڈ میں آنے کے لیے میں نے اپنے لیے راستہ ہموار کیا۔ وہ دشوار ضرور تھا مگر ہر نوجوان جس میں ٹیلنٹ ہوتا ہے۔ وہ اپنے لیے جگہ بنانے میں کامیاب ضرور ہو جاتا ہے۔ میں نے جس اعتماد کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس کے نتیجے کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مجھے کم عمری میں ہی بہت نوازا ہے۔ جس وقت "آہن" اسلام آباد سینٹر سے دکھایا جا رہا تھا۔ اس وقت ناظرین یہ بھول جاتے تھے کہ وہ ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھے ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔ ناظرین کے عمدہ رسپانس نے ہی مجھے اس بات کا احساس دلایا تھا۔ یہ ایک مکمل سیریل تھا۔ جس کا مقصد معاشرے کی اصلاح کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔"

س "آہن" کا مرکزی خیال کیا تھا؟"

ج "اس وقت معاشرے میں جو مختلف طرح کے اجتماعی اور انفرادی دباؤ برسرعمل ہیں، میں نے آہن میں اس کی منظر کشی کی تھی۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ تخریب کاری کا ہے، ملک دشمن اپنے مقاصد کے لیے جس طرح وطن دشمنی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور جس طرح بے گناہ انسانی جانوں کو تلف کیا جا رہا ہے، یہ

اہم ترین سماجی مسئلہ ہے۔ اس کے مستقل حل کے لیے ابھی تک کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا گیا جس سے یہ سنگین جرم ختم کیا جاسکے۔ یہ ایک بد ترین سماجی برائی ہے اس کا قلع قمع بہت ضروری ہے آہن کی کہانی ان ہی جرائم پیشہ افراد کی گندی ذہنیت کی عکاسی تھی، جو اپنی گھناؤنی حرکتوں سے پوری قوم کی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔"

س "آہن" آپ کا پہلا سیریل تھا لیکن اس میں آپ کی پرفارمنس جاندار تھی۔ کیا اس میں کام کرنے سے پہلے آپ نے کوئی ٹریننگ لی تھی؟"

ج "جی ہاں آہن میں کام کرنے سے پہلے ہماری پوری ٹیم کو کمانڈو تربیت دی گئی باقاعدہ سب کچھ سکھایا گیا۔ یہ ایک ٹیکنکل قسم کی تربیت تھی۔ جو ہم نے اداکاری سے پہلے حاصل کی۔ ظاہر ہے کسی بھی کام کو کرنے سے پہلے اس کے بارے میں ضروری مشاہدہ اور جانکاری کام میں بہتری پیدا کرتی ہے۔ پھر پروڈیوسر نے بھی ہمیں بہت زیادہ گائیڈ کیا اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار یا سبکی محسوس نہیں ہوتی — کہ میں نے اپنے سینئرز سے ہی سیکھا۔"

"جس طرح عاشر عظیم اور رؤف خالد نے چند ایک Plays ہی لکھے، حالانکہ انہوں نے جن موضوعات پر کام کیا ان سے مزید استفادہ کی ضرورت تھی کہ ان سے زیادہ سے زیادہ لکھوایا جاتا، مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ آج کل ٹی وی ڈراموں کا موجودہ معیار بھی زوال پذیر ہے تو اس کی وجہ کیا ہے اور لوگوں کی کثیر تعداد غیر ملکی چینلز کی طرف کیوں متوجہ ہو رہی ہے؟"

ج یہ سوال تو حکام بالا سے کرنے کا تھا کہ وہ اچھے لکھنے والوں کو کم کم چانس کیوں دیتے ہیں۔ رہا سوال غیر ملکی چینلز کا تو ظاہر ہے اتنے چینلز کی موجودگی میں چوائس مشکل ہو جاتی ہے، یہ درست نہیں کہ ہمارے ہاں کے ڈرامے زوال پذیر ہیں، البتہ یہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے جیسے معیاری ڈرامے نہیں بنائے جا رہے۔

عاشر عظیم اور رؤف خالد بلاشبہ بہت اچھے رائٹر ہیں اور ان جیسے لوگوں کو اس فیلڈ میں رہ کر اپنے کام کو منوانا ہوگا جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں نے بڑی تگ و دو سے یہ مقام بنایا ہے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے بھی مسلسل محنت کر رہا ہوں۔

میں نے جب محسوس کیا کہ میری مشکلات ختم ہو رہی ہیں تو میرا سر جھک گیا۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اور آپ ہی آپ میرے اندر عجز و انکساری آگئی۔

س "آہن" ان ایئر گیا تو سب نے میرے کام کی تعریف کی میری کارکردگی کو سراہا، مگر کسی نے مجھے اتنا بڑا رول کرنے کی دوبارہ آفر نہیں دی۔ پھر میں نے خود کو بطور رائٹر مصروف کر لیا، اب آفر ملتی ہیں تو میرے پاس کام اتنا ہے کہ میں انکار کر دیتا ہوں۔"

"اس سے قبل کہ ہم وصی سے کچھ اور پوچھتے ہم نے ان کی کتاب "آنکھیں بھیگ جاتی ہیں" میں شائع ہونے والی نظم (لاسٹ کال) سننے کی فرمائش کی۔

یہ "کنگن" کے عوض موبائل فون کی شرط لگانے والا قصہ کیا ہے؟

ج ہمارے ایک دوست عباس تابش، ان سے کسی نے کہا۔ وصی تمہارا دوست ہے اس سے اس کی نظم کنگن لکھوا کر دو۔ ان دونوں آہن سیریل چل رہا تھا اور کنگن اس سیریل میں شامل تھی۔

میں نے نظم لکھ دی۔ اگلے دن اس دوست کے ہاتھ میں موبائل تھا۔ کہنے لگا۔ کسی لڑکی نے فرمائش کی تھی کہ وصی سے نظم لکھوا کر دو تو گفٹ کے طور پر موبائل دوں گی۔ تو میں نے نظم دے کر موبائل جیت لیا۔"

س "زارا (بیوی) کے ساتھ شادی سے پہلے زبردست افیئر چلا تھا؟

ج "، چلا تھا اور خوب چلا تھا۔" انہوں نے فراخدلی سے اعتراف کیا۔" قہقہہ۔

س "پھر انہیں حاصل کرنے میں کیا دشواریاں پیش آئیں؟"

ج "کوئی زیادہ نہیں۔"

س "آپ نے جسے چاہا وہ آپ کو مل گئی تو پھر کیا محسوس کرتے ہیں، کیا پہلے جیسی گرمجوشی برقرار ہے یا تعلقات میں ٹھہراؤ آچکا ہے۔"

ج "پہلے جیسی گرمجوشی برقرار ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ من چاہا ساتھی ملنے پر آپ کو ذہنی، قلبی سکون ملتا ہے اور زارا ہے بھی اتنی اچھی کہ میرے گھر کو ہر لحاظ سے خوب صورت بنا کر رکھ دیا ہے۔ آپ بھی دعا کریں کہ میری خوشیاں برقرار رہیں ہم دونوں بہت مزے میں ہیں۔"

س "سنا ہے کافی شاعری آپ اپنے اپنی محبوبہ کے لیے لکھی تھی، تو کیا اب بیوی کے لیے بھی کچھ لکھ رہے ہیں؟"

ج "زبردست (قہقہہ) کچھ سیکرٹس ہوتے ہیں۔ ساری باتیں تو نہیں بتائی جاسکتی ہیں لیکن مجھے یہ اعتراف کرنا اچھا لگے گا کہ میری کافی شاعری صرف زارا کے لیے ہے اب جو نئی کتاب آرہی ہے۔" مجھے صندل کر دو۔" اس میں بھی کچھ نظمیں زارا کے لیے لکھی ہیں جو میری شریک زندگی ہے۔"

س "اور باقی نظمیں کس کے لیے لکھی ہیں؟"

ج قہقہہ....

زارا وصی شاہ

س "وصی سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

ج "اسلام آباد ہمارے ہی گھر میں... یہ وہاں آئے تھے پھر آنا جانا شروع ہو گیا۔"

ج وصی نے ان کی بات کاٹ دی "نہیں بھئی! ہماری جوڑی آسمان پر بنی تھی۔ ہم سب سے پہلے آسمان پر ہی ملے ہوں گے۔" (قہقہہ)

س "بچے کتنے ہیں؟"

ج "میرے دو بچے ہیں" زارا نے جواب دیا" ایک بیٹی جس کا نام دعا ہے اور ایک بیٹا جس کا نام احمد ہے۔"

س "شادی میں تمام رسمیں ہوئی ہوں گی؟"

ج "جی ہاں سب رسمیں ہوئی تھیں۔"

س "رونمائی میں وصی نے آپ کو کنگن دیے ہوں گے؟"

ج "نہیں انہوں نے مجھے انگوٹھی دی تھی۔"

س "محبت کی شادی میں جو رکاوٹیں آیا کرتی ہیں وہ آئی تھیں۔"

ج "میری سسرال میں ایک نند ہے اور ایک ساس صاحبہ۔ وصی اکلوتے ہیں سب ہی ان سے محبت کرتے ہیں اس لیے کسی نے بھی اس شادی پر اعتراض نہیں کیا۔ سب ہی محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

س وصی کیا آپ کی سالگرہ یا ویڈنگ اینی ورسری کا دن یاد رکھتے ہیں۔"

ج "اکثر بھول جاتے تھے پھر میرے غصہ کرنے کی وجہ سے اب یاد رکھنے لگے ہیں۔

س "تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا ہوگا؟"

ج "دونوں طرف سے ہوتا ہے۔"

س "سالگرہ مناتے ہیں؟"

ج "ہاں مناتے ہیں لیکن گھر میں مختصر سی ڈنر پارٹی ارینج کرتے ہیں۔ کسی کو بلاتے نہیں ہیں" وصی شاہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

" دراصل میں چاہتا ہوں ایسے موقعوں پر ہم دونوں ہوں تیسرا کوئی نہ ہو اور یہ دن ہم گھر میں یا ہوٹل میں جا کر مناتے ہیں، گھومتے پھرتے ہیں۔ کچھ انجوائے کرتے ہیں۔"

س "زارا آپ نماز پڑھتی ہیں اپنے دن کا آغاز کتنے بجے کرتی ہیں؟"

ج "میں باقاعدگی کے ساتھ نماز نہیں پڑھتی۔ وصی باقاعدہ پڑھتے ہیں چونکہ کام سے فارغ ہو کر وصی رات کو دیر سے آتے ہیں تو مجھے بھی اسی حساب سے اٹھنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ بچے چھوٹے ہوں تو نیند آنی جانی چیز ہے، بعض اوقات رات کو بھی کافی مرتبہ اٹھنا پڑتا تھا۔ اب بڑے ہو رہے ہیں تو ان کی ذمہ داری بھی بڑھ رہی ہے۔ بہر حال میرے اٹھنے کا خاص وقت نہیں ہے

حالات کے مطابق کبھی جلدی اور کبھی دیر سے سو کر اٹھتی ہوں۔"

س "وصی کہتے ہیں کہ کنگن انہوں نے آپ کے لیے لکھی تھی!"

ج "یہ کہتے ہیں تو صحیح کہتے ہوں گے حالانکہ کتاب کی اشاعت کے بعد ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ مجھ سے بھی یہی کہتے ہیں ـــــ شاید اسی وقت ان کی میں 'خیالی محبوبہ ہوں گی (قہقہہ)۔"

س "تو آپ نے ان کے کہنے پر یقین کرلیا۔"

ج "اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔"

س "وصی اتنے مصروف ہیں۔ بزنس کرتے ہیں رائٹر ہیں تو آپ کو مناسب وقت نہیں دے پاتے ہوں گے۔ اس سے آپ کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟"

ج "پہلے تو بہت غصہ آتا تھا۔ ان سے ناراض بھی ہو جاتی تھی 'کل کئی دن کے بعد گھر لوٹے ہیں۔ مشاعرے میں گئے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی مصروفیات کا جب اندازہ ہوا تو میں نے غصہ کرنا چھوڑ دیا کیونکہ مجھے پتہ ہے 'یہ ساری محنت وہ اس گھر کے لیے اور ہمارے لیے ہی کر رہے ہیں پھر فضول میں جلنے کڑھنے کا فائدہ اور میرے رویے سے جو انہیں ٹینشن ہو گی تو ان کا کام بھی متاثر ہو گا۔ سو میں نے خود کو سمجھا لیا ہے۔"

س "ان کی فون کالز جو لڑکیاں کرتی ہیں۔ آپ پریشان ہوتی ہوں گی؟"

ج "نہیں گھر کا نمبر تو تبدیل کروالیا ہے اور موبائل پر ان کے ساتھ بات کرنے کا مجھے پتہ نہیں 'لیکن میں پریشان نہیں ہوتی 'مجھے اتنا پتہ ہے کہ وصی صرف ہمارے ہیں۔"

س "گھر کے اخراجات کس کے پاس ہوتے ہیں؟"

ج "ساس کے پاس۔"

س "اور آپ؟"

ج "مجھے جتنی طلب یا ضرورت ہوتی ہے مل جاتی ہے یعنی اتنی رقم مل جاتی ہے بلکہ اچھا ہے گھر کی ذمہ داری بھی انسان کو خاصا تھکا دیتی ہے 'مجھے خاصا سکون رہتا ہے کہ حساب کتاب نہیں کرنا پڑتا۔"

س "کچن کون سنبھالتا ہے؟"

ج "زیادہ تر میں ہی سنبھالتی ہوں اور گھر کی آرائش تزئین بھی ہم مل کر کرلیتے ہیں۔"

س "شاپنگ کون کرتا ہے۔"

ج "شاپنگ ہم دونوں ہی کرتے ہیں۔"

س "کھانے میں وصی کیا پسند کرتے ہیں؟"

ج "ماش کی دال جو بھی اچھا پکاؤں شوق سے کھاتے ہیں۔"

س "وصی کے اپنی سسرال کے ساتھ تعلقات کیا اب بھی پہلے جیسے ہیں؟"

ج "جی ہاں بلکہ بہت اچھے تعلقات ہیں 'امی تو شروع سے انہیں بہت پسند کرتی ہیں اور یہ بھی انہیں بزرگوں جیسا مان دیتے ہیں وہ گھر آجائیں تو بہت عزت کرتے ہیں۔"

س "آپ کے گھر میں کتنے افراد ہیں؟"

ج "سسرال میں تو امی یعنی ساس اور ایک نند کے علاوہ میں وصی اور دو بچے ہیں ہماری امی کی طرف ہم سات بہن بھائی ہیں ابو کی ڈیتھ ہو چکی ہے 'میں تیسرے نمبر پر ہوں (وصی سے)

س "ہم نے وصی سے سوال کیا زارا کی اچھی بری عادتوں کے بارے میں بتائیں؟"

ج "زارا میں بے شمار خوبیاں ہیں وہ ہر لحاظ سے گھریلو ہے اور تمام ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھاتی ہے اس کے خوش اسلوبی سے کام کرنے کی جتنی خوشی مجھے ملتی ہے 'اتنی ہی میری فیملی کو بھی۔ گھر کے علاوہ زارا پر بچوں والدہ اور بہن کی ذمہ داری بھی ہے اور وہ کبھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں غفلت نہیں کرتی۔ خوبیوں کے علاوہ کئی خامیاں بھی ہیں تو ایک خامی جو مجھے اچھی نہیں لگتی۔ وہ میری مصروفیت پر تنقید ہے کہ کم کام کریں ہمیں وقت دیں حالانکہ اس میں بھی دیکھوں تو خوبی کا پہلو نکلتا ہے کہ اسے میرا خیال ہے۔ میری روٹین نٹ ہے اس کے باوجود وہ برداشت کرتی

بقیہ صفحہ 312 پر

نگہت عبداللہ

کوئی لمحہ گلاب ہو

بیگم آفندی ایک لوئر مڈل گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے والدین کی مخالفت مول لے کر دولت کی خاطر جیلان آفندی سے دوسری شادی کی تھی۔ جیلان آفندی کی پہلی بیوی زینب سے ایک بیٹا اسفندیار اور بیٹی گڑیا تھی۔ بیگم آفندی کا ایک ہی بیٹا شہریار تھا۔ بیگم آفندی نے پہلی بیوی (زینب) کو راستے سے ہٹانے کے لیے کھانے میں زہر شامل کر دیا مگر خانساماں نے ایسا کرتے دیکھ لیا اور زینب کو بتا دیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر بچوں کو لے کر گھر سے غائب ہو گئی۔ جیلان آفندی بچوں کی جدائی برداشت نہ کر سکے۔ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا اور ساری دولت بیگم آفندی کے ہاتھ آ گئی۔ وقت گزرتا گیا۔ بیگم آفندی کا بیٹا شہریار جوان ہو گیا۔ کچھ عرصے سے اسفندیار انہیں فون پر دھمکیاں دے رہا تھا۔

اعزاز احمد کی پانچ اولادیں تھیں، دو بیٹے اور تین بیٹیاں۔ سب سے بڑے سلطان احمد ایم۔کام کر کے بینک میں ملازم تھے۔ ان کی شادی راحیلہ سے ہوئی تھی جو انہیں لے کر علیحدہ ہو گئی تھی۔ ان کے بعد رابعہ تھی جسے اپنے بے پناہ حسن کا بے حد غرور تھا۔ اس کی شادی اس کی پسند سے ڈاکٹر عفان کے ساتھ ہوئی تھی۔ مگر جلد ہی اسے پتا چلا کہ ڈاکٹر عفان کی ایک بیوی پہلے ہی گاؤں میں موجود ہے تو وہ گھر چھوڑ کر میکے چلی آئی۔ ڈاکٹر عفان کی مفاہمت کی کوششوں کے باوجود واپس جانے پر راضی نہ ہوئی اور ماڈلنگ شروع کر دی۔

اعزاز احمد کی تیسری بیٹی فائقہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ مزاج کی بھی بہت اچھی تھی۔ اسے اپنے ماموں کے بیٹے عظام کے ساتھ خاص انسیت تھی۔ اس نے گھر کے حالات کے پیش نظر بیگم آفندی کے دفتر میں ملازمت کر لی۔ بیگم آفندی کا بیٹا شہریار اس سے محبت کرنے لگا مگر اسے بلڈ کینسر تھا اس لیے وہ فائقہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور بیگم آفندی ہر صورت اس کی شادی کروانا چاہتی تھیں۔ ان ہی دنوں فائقہ کے والد کا ایک خطرناک ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ علاج کے لیے رقم کی ضرورت پڑی تو بیگم آفندی نے ایک سادہ کاغذ پر دستخط کروا کر فائقہ کو منہ مانگی رقم دی اور بعد میں شہریار سے شادی کا مطالبہ کر دیا۔

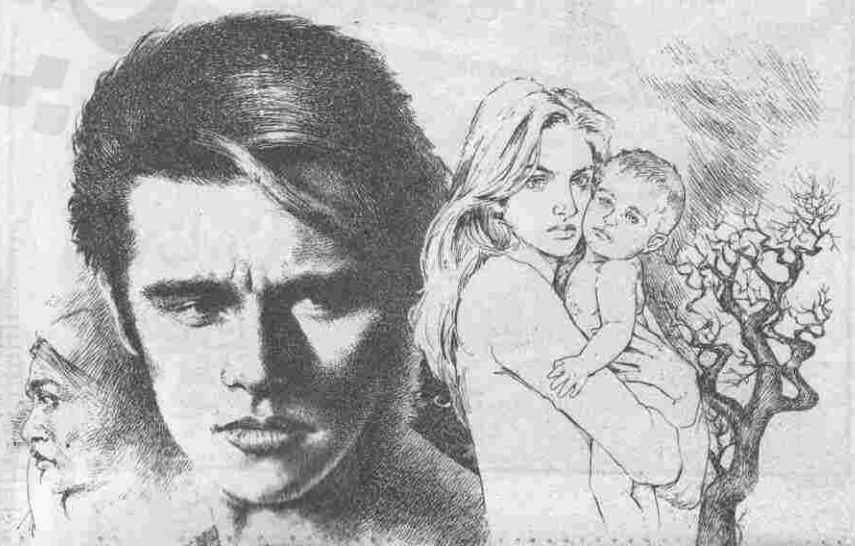

فائقہ خود بھی شہریار کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کی شادی شہریار سے ہو گئی۔ شادی کے بعد بھی بیگم آفندی کا رویہ فائقہ کے ساتھ تحکمانہ تھا۔

فائقہ امید سے ہو گئی تھی کہ شہریار کو ٹریننگ کے لیے لندن جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو فائقہ نے ضد کی کہ وہ بھی ساتھ جائے گی۔ فائقہ کی ضد پر شہریار نے بیگم آفندی سے فائقہ کو ساتھ لے جانے کی بات کی جس پر مشتعل ہو کر بیگم آفندی نے شہریار کو بتایا کہ فائقہ اس سے محبت نہیں کرتی بلکہ محض پیسے کی خاطر اس نے شہریار سے شادی کی ہے اور اس بات کا ثبوت ان کے پاس موجود ہے۔ شہریار اس اطلاع پر بکھر کر رہ گیا۔ فائقہ کی یقین دہانیوں نے اس کو مزید الجھا دیا۔ اس نے اپنے وکیل ابرار قریشی سے رابطہ کیا تو انہوں نے اسے اس کے والد کا خط دیا۔ جس میں انہوں نے بیگم آفندی کی تمام تر سفاکیوں کو بے نقاب کیا تھا اور شہریار کو اس سے بچ کر رہنے کی ہدایت کی تھی۔ پے در پے ان انکشافات نے شہریار آفندی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

اور وہ لندن ٹریٹمنٹ کے لیے گیا تو وہاں ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے وصیت کی کہ اسے پاکستان نہ لایا جائے بلکہ وہیں دفنا دیا جائے۔ بیگم آفندی نے لندن جا کر اس کی آخری رسومات ادا کیں۔

شہریار نے جانے سے پہلے فائقہ سے کہا تھا کہ وہ بچے کو لے کر اس کی ماں سے دُور چلی جائے۔ فائقہ نے ایسا ہی کیا۔ اس نے جانے سے پہلے اپنے ماموں زاد عظام بھائی کو فون کیا تھا۔ فائقہ اپنی ہر مشکل اور ہر مسئلہ ان سے شیئر کیا کرتی تھی۔ مگر اس نے اپنے اس ارادے سے انہیں بھی آگاہ نہیں کیا۔ ریل میں اس کی طبیعت خراب ہو گئی تو ایک ہمدرد خاتون نے اس کی دیکھ بھال کی اور اسے اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ ان کی ایک بیٹی الیشبہ اور ایک بیٹا راحل بھی ان کے ساتھ تھا۔ ان کے بیٹے کو فائقہ کو ساتھ لانے پر سخت اعتراض تھا مگر اس کی والدہ نے اسے خاموش کروا دیا۔

۲۳
تیئسویں قسط

"بدنامی ہو گی۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔ "حوالات جا کر تو بڑی نیک نامی ہوئی ہے نا۔"

عظام بے بسی سے اسے دیکھنے لگے تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولی تھی۔

"اب بدنامی صرف ہماری نہیں ہو گی۔"

☆ ☆ ☆

بچہ جس طرح ہلبلا کر رو رہا تھا اس سے وہ اور الیشبہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ دونوں باری باری اسے ٹہلا کر تھک گئی تھیں لیکن بچہ کسی طرح چپ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اماں بھی گھر پر نہیں تھیں۔ محلے میں کسی کے انتقال پر گئی تھیں، ورنہ وہی بتاتیں کہ بچے کو کیا تکلیف ہے۔ پیٹ میں یا کان میں درد پھر فوراً اپنا نسخہ آزماتیں، جبکہ ان دونوں کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"الیشبہ! اماں کو بلا لاؤ۔" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"اماں تو دور گئی ہیں باجی! چلو اسے بھائی کے پاس لے جاتے ہیں۔ وہ دوا دے دے گا۔" الیشبہ نے کہا تو وہ فوراً بولی۔

"تم لے جاؤ۔"

"میں اکیلی تو نہیں جا سکتی۔"

"کیوں، تم نے تو بتایا تھا کلینک قریب ہے۔"

"ہاں قریب ہے، پر میں گھر سے اکیلی نہیں نکلتی۔ تم ساتھ چلو۔" الیشبہ نے کہتے ہوئے اپنی چادر اٹھائی تو وہ

پریشانی میں بس اس قدر بولی۔

"تمہارا بھائی....."

"کیا کہے گا بھائی، ہم بچے کی دوا لینے جا رہے ہیں، گھومنے تو نہیں جا رہے۔ چلو۔"

الیشبہ نے اسے آگے دھکیلا تو وہ بچے کی وجہ سے چل تو پڑی لیکن اندر سے بہت ڈری ہوئی تھی کہ کہیں سب کے سامنے وہ اسے ذلیل نہ کر دے۔ اس جھگڑے سے کچھ بعید نہیں تھا۔ بہرحال کلینک میں پہلے ہی بہت رش تھا، وہ الیشبہ کے ساتھ خواتین کے حصے میں بیٹھی تو کلاس ڈور سے وہ سامنے نظر آنے لگا جو پوری توجہ سے ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکے کو چیک کر رہا تھا، وہ بلا ارادہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر الیشبہ سے بولی۔

"سنو، بچے کو تم اندر لے جانا۔"

"تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو؟" الیشبہ نے ٹوکا تو وہ جز بز ہو کر بولی۔

"پتا نہیں۔"

"اچھا میں بھائی سے کہتی ہوں، پہلے اسے دیکھ لے۔" الیشبہ بچے کو دیکھتے ہوئے بولی جو باہر کی ہوا لگنے سے غنودگی میں چلا گیا تھا۔

"اسے بھی لے جاؤ۔" اس نے پھر منت سے کہا تو الیشبہ کو جیسے رحم آ گیا۔ اس کی گود سے بچہ لے کر چلی گئی تو اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے اس کی نظر راحل پر پڑی جو بہت غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

"یا اللہ!" وہ بری طرح سہم گئی۔ ٹانگیں تھی کانپنے لگی تھیں۔ بمشکل دوپٹے کو سر سے آگے تک کھینچ کر اس کی طرف سے چہرہ چھپا لیا۔

"باجی!" کچھ دیر بعد الیشبہ نے آ کر اسے پکارا تو اس نے ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا پھر فوراً کھڑی ہو گئی۔

"بچہ کہاں ہے؟"

"ادھر بھائی کے پاس، جاؤ وہ تمہیں بلا رہا ہے۔" الیشبہ نے کہا تو وہ پھر پریشان ہو گئی۔

"کیوں۔"

"جاؤ گی تو پتا چلے گا ناں۔" الیشبہ شاید اس کی ڈانٹ سن کر آئی تھی، جب ہی جھنجلا کر بولی تو وہ "تم بھی چلو" کہتے کہتے رہ گئی اور ساری ہمتیں یکجا کر کے اس کے کمرے کی طرف بڑھی، تب بھی اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ البتہ آواز کی سرزنش پر قابو پا گئی تھی۔

"کیا بات ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ بند مٹھی ہونٹوں پر جمائے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھے گیا تو سلگ کر کہنے لگی۔

"اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو، میں بچے کو دکھانے لائی ہوں، اگر تمہیں برا لگا ہے تو میں کسی اور ڈاکٹر کے پاس۔"

"شٹ اپ۔" اس نے ہونٹوں سے مٹھی ہٹا کر دانت پیسے۔ "خبردار جو کہیں اور گئیں تو، اٹھاؤ بچے کو اور سیدھی گھر جاؤ، میں وہیں آ کر تم سے بات کروں گا۔"

"کیا بات؟" اس نے بچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے رک کر پوچھا پھر اس کے تیور دیکھ کر جلدی سے بچے کو اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔

"بس الیشبہ! اب میں زیادہ دن یہاں نہیں رہوں گی، کل سے ہی گھر کی تلاش شروع کر دوں گی۔ گھر کیا، ہمارے لیے ایک کمرہ کافی ہو گا۔" اس نے گھر آتے ہی الیشبہ سے کہا پھر پوچھنے لگی۔

"کرائے پر ایک کمرہ تو مل جاتا ہو گا ناں۔"
"مجھے نہیں پتا۔ لو یہ بچے کو دودھ پلاؤ' میں جب تک ہانڈی روٹی کر لوں۔ اماں بھی جا کر بیٹھ گئی ہے۔"
الیشبہ روٹھے لہجے میں بولتی اس کے سامنے بچے کی دوا ڈال کر جانے لگی تو اس نے روک کر پوچھا۔
"سنو' تم سے کیا کہہ رہا تھا؟"
"کون؟"
"تمہارا بھائی' کیا تم پہلے کبھی اس کے کلینک نہیں گئیں جو وہ ناراض ہو رہا تھا۔"
"میرے جانے پر نہیں' وہ تمہیں دیکھ کر ناراض ہو رہا تھا۔ تم نے چادر بھی تو نہیں لی تھی۔ کہہ رہا تھا یہ کوئی شہر نہیں ہے جہاں لڑکیاں دوپٹے میں پھرتی ہیں۔" الیشبہ بھائی کی ناراضی کا سبب بتا کر پوچھنے لگی۔
"باجی! تم لاہور سے آئی ہو یا کراچی سے؟"
"میں پریشانی میں چادر لینا بھول گئی۔" وہ اس کا سوال نظر انداز کر گئی۔ "یہ بھی ایسے رو رہا تھا جیسے پتا نہیں۔"
"ہاں' بھائی کہہ رہا تھا اس کے پیٹ میں مروڑ ہے' دوا پلا دو اور دوسری وہ لیتا آئے گا۔"
الیشبہ کہہ کر چلی گئی تو اس نے چمچ میں دوا نکال کر سوئے ہوئے بچے کے منہ میں ڈال دی جس سے وہ پھر رونے لگا۔ وہ اسے سینے سے لگا کر ٹہلنے لگی۔
کچھ دیر میں بچہ سکون سے ہو گیا تو اس کے اندر بے سکونی سما گئی۔ راحل کی باتوں سے زیادہ اس کا لہجہ سوچتے ہوئے وہ بری طرح سنگ کر بڑبڑانے لگی تھی۔
"میں بہت جلدی اپنا کہیں انتظام کر لوں گی پھر دیکھوں گی وہ کیسے اس طرح بات کرتا ہے۔ "سیدھی گھر جاؤ' میں وہیں آ کر تم سے بات کروں گا۔"
"کیا بات کرے گا' یہی کہ میں صرف دوپٹے میں کیوں باہر نکلی۔ میری مرضی' وہ کون ہوتا ہے مجھے ٹوکنے والا۔ اس کے گھر میں ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اس کی پابند ہو گئی۔"
"کیا ہوا بچے کو؟" اماں کی اچانک آمد سے وہ اچھل پڑی پھر انہیں دیکھ کر سنبھلتے ہوئے بولی۔
"پیٹ میں مروڑ تھا' ہم اس کی دوا لے آئے ہیں۔"
"ہاں' بتایا ہے الیشبہ نے۔ اب تو سو رہا ہے۔" اماں نے اس کی گود سے بچہ لیتے ہوئے کہا پھر بیٹھ کر اسے ہر طرف سے چھو کر دیکھنے لگیں تو وہ بچے کا بستر ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔
"بہت رویا ہے' پریشان کر کے رکھ دیا۔"
"ہاں تو بچے ایسے آرام سے تو نہیں پل جاتے' بہت تنگ کرتے ہیں۔"
"اماں!" وہ بستر ٹھیک کر کے سیدھی ہوئی تو کہنے لگی۔ "آپ نے کہا تھا کہ آپ خود میرا کہیں انتظام کر دیں گی' مجھے کسی اچھی جگہ ایک کمرہ کرائے پر دلا دیں۔"
اماں بہت سادگی سے اسے دیکھنے لگیں' بولیں کچھ نہیں تو اس نے قریب بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔
"آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے اماں! میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ ایک احسان اور کر دیں۔"
"چل ہٹ' میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔" اماں نے ناراضی سے ٹوکا۔
"یہ آپ کی بڑائی ہے لیکن میں مزید آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ آپ پلیز منع نہیں کریں' مجھے جلدی۔۔۔"
وہ منت سے بولتے ہوئے ایکدم خاموش ہو کر نچلا ہونٹ کاٹنے لگی کیونکہ وہ جانے کب دروازے میں آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے دیکھنے پر اندر آ کر بولا۔

"اماں! آپ بچے کو لے کر اس کمرے میں جاؤ۔"
"کیوں؟" اماں نے کچھ نا سمجھی سے اسے دیکھا۔
"مجھے اس سے کچھ بات کرنی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تو اماں ناگواری سے بولیں۔
"کیا بات کرنی ہے میرے سامنے کر۔۔۔"
"آپ کے سامنے بات نہیں ہو سکتی۔ بس آپ جاؤ۔" وہ تیز ہو کر بولا تو اس نے فوراً" اماں کے پاس بیٹھ کر ان کا بازو تھام لیا۔
"نہیں اماں! آپ نہیں جانا' مجھے اس کی کوئی بات نہیں سننی۔"
"اماں! اٹھو ناں۔" وہ زور سے دھاڑا تو اماں نے پریشان ہو کر اسے دیکھا پھر اس کا ہاتھ تھپک کر بولیں۔
"تو کیوں ڈرتی ہے' کھا نہیں جائے گا یہ تجھے۔ سن لے کیا کہتا ہے۔" پھر اس سے بولیں۔ "آرام سے بات کرنا۔"
"آپ جاؤ تو۔"
اماں اسے تسلی دیتے ہوئے بچے کو لیے ہوئے جیسے ہی کمرے سے نکلیں اس نے دروازہ بند کر دیا پھر اس کی طرف پلٹ کر چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا۔
"اب بتاؤ' کون ہو تم اور کہاں سے آئی ہو؟"
"اور اگر نہ بتاؤں تو۔" وہ جی کڑا کر کے بولی تھی۔
"تو میں تمہیں سیدھا بیگم جیلان آفندی کے پاس لے جاؤں گا۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا تو وہ چکرا گئی۔
"ک۔۔۔ کیا۔۔۔ کون۔۔۔ میں نہیں جانتی۔"
"تم نہیں جانتیں۔" اس نے شرٹ کا بٹن کھولا اور اندر سے اخبار کھینچ کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "دیکھو' اس میں تمہارا اشتہار لگا ہے۔"
"اشتہار۔" اس کے ہاتھوں میں اخبار لرزنے لگا تھا۔ بہت ڈرتے ڈرتے سر جھکایا تو نظر اپنی تصویر پر پڑی جس کے نیچے لکھا تھا۔
"بیگم جیلان آفندی کی بھولا پتہ۔"
"میرے خدا!" وہ اس سے آگے دیکھ ہی نہیں سکی اور اخبار ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔
"منہ چھپانے سے کچھ نہیں ہو گا' تمہاری اصلیت پتا چل گئی ہے۔" وہ پہلے طنز سے بولا پھر ایکدم لہجہ بدل کر کہنے لگا۔
"میں نے تم سے پہلے روز بھی کہا تھا کہ اگر تم سچ بتا دو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں اور اب پھر کہہ رہا ہوں۔ سچ بتا دو' میں ہر ممکن تمہاری مدد کروں گا۔"
وہ دھیرے دھیرے ہاتھ آنکھوں سے نیچے کھسکا کر اسے دیکھنے لگی۔
"میں ابھی وعدہ نہیں کر رہا' سچائی جاننے کے بعد فیصلہ کروں گا۔ اگر تم حق پر ہوئیں تب میں اپنی جان سے بڑھ کر تمہاری حفاظت کی ذمہ داری قبول کروں گا لیکن اگر تم نے مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو۔" وہ وارننگ کے انداز میں شہادت کی انگلی اٹھا کر خاموش ہو گیا تو وہ بے بسی سے بولی۔
"تمہیں اگر میری مدد کرنی ہے تو یوں بھی کر سکتے ہو' سچائی جاننے پر زور کیوں دے رہے ہو۔"
"کیونکہ میں آنکھ بند کر کے تم پر بلکہ کسی پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا۔" اس نے کہا تو وہ چیخ کر بولی۔
"تمہیں کیسے معلوم ہو گا کہ میں سچ کہہ رہی ہوں یا جھوٹ۔"

"سچ اور جھوٹ کی پہچان ہے مجھے۔" وہ کہہ کر سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا تو وہ سر جھکا کر کتنی دیر اپنے ناخنوں کو دیکھتی رہی۔ اندر ہی اندر الجھ رہی تھی۔

"دیکھو، یہاں سے نکل کر تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ واپس وہیں پہنچا دی جاؤ گی جہاں سے بھاگی ہو اور آگے تم سوچ سکتی ہو، تمہاری ساس تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔"

"وہ میرا بچہ لینا چاہتی ہیں۔" وہ بے اختیار کہہ کر ہونٹ بھینچ گئی تو اس نے کیوں کا سوال نہیں اٹھایا، خاموشی سے انتظار کرنے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ یوں گویا ہوئی جیسے اپنے آپ سے بول رہی ہو۔

جیلان ماربل انڈسٹریز میں جاب سے شروع ہوئی تھی اور پھر سارے حالات و واقعات پوری سچائی سے بیان کرتی چلی گئی۔ صرف اس خوف سے کہ کہیں وہ اسے بیگم آفندی کے پاس نہ لے جائے۔

وہ بہت خاموشی سے اسے دیکھ اور سن رہا تھا جس کے ہونٹوں سے الفاظ ٹوٹ کر نکل رہے تھے، جبکہ آنسو تسلسل سے بہہ نکلے تھے۔

وہ بار بار ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ رہی تھی اور جب خاموش ہوئی تو اسے یوں دیکھنے لگی جیسے وہ اس کا مذاق اڑائے گا لیکن وہ تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔

وہ کچھ دیر پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

"میں نے ساری حقیقت تمہیں بتا دی ہے، اب تمہاری مرضی۔ یقین کرو نہ کرو لیکن اتنا ضرور کرنا کہ یہ ساری باتیں صرف اپنے تک رکھنا۔"

"ہوں۔" اس کے سینے میں رکی سانس بند ہونٹوں سے ٹکرائی تو وہ اپنے آپ چونکا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر کچھ دیر اس طرح بیٹھا رہا پھر ہاتھ نیچے گرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تو وہ آنسوؤں بھری آنکھوں سے اس کے پیچھے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔

اس نے گلاس تھام لیا لیکن ہونٹوں تک لے جانے سے قاصر رہی۔

"آئی ایم سوری، میں نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اگر تم پہلے دن بتا دیتیں تو... خیر، اب فکر نہیں کرو۔ جس خدا کے بھروسے پر نکلی تھیں، سمجھ لو اسی نے مجھے تمہارا محافظ بنایا ہے۔" راحل نے معذرت کے ساتھ کہا تو وہ ممنونیت سے بولی۔

"میں تمہارا احسان..."

"نہیں، کوئی احسان نہیں۔" وہ فوراً ٹوک کر کہنے لگا۔ "بس اتنی احتیاط کرنا کہ گھر میں اماں کی ملنے جلنے والی خواتین آئیں تو ان کے سامنے مت جانا۔"

تب ہی دروازہ کھلا دیکھ کر اماں اندر آ گئیں اور پہلے راحل سے بولیں۔

"کر لی بات۔" پھر اسے دیکھتے ہی پریشان ہو کر بگڑنے لگیں۔ "کیا کہہ دیا تو نے اسے، میں نے کہا بھی تھا آرام سے بات کرنا۔"

"مجھ سے نہیں ہوتی آرام سے بات۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تو اماں اس کے پاس بیٹھ کر پچکارنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

بیگم آفندی ہر قسم کے حالات سے نمٹنا جانتی تھیں۔ کبھی کوئی بات ان کی توقع کے خلاف ہو بھی گئی تو بس

تھوڑی دیر کو پریشان ہوئیں' اس کے بعد اپنی حکمت عملی سے صورتِ حال اپنے حق میں لے آئی تھیں لیکن فائقہ کی گمشدگی کے اشتہار نے انہیں بری طرح چکرا دیا تھا کیونکہ بات سارے میں پھیل گئی تھی اور کل سے ان کے سب جاننے والے انہیں مسلسل فون کر کے فائقہ کا معلوم کر رہے تھے۔ جس سے وہ اور پریشان ہو گئی تھیں۔ جب ہی یہ سوچ نہیں پائیں کہ انہیں اس صورتِ حال سے کیسے نمٹنا چاہیے۔ یہ تو وہ سمجھ گئی تھیں کہ یہ جرات رابعہ نے کی ہے جو ان کے گھر آ کر کہہ گئی تھی کہ وہ ان کی ایر کلاس میں ان کا اشتہار لگوا دے گی اور اس پر عمل کر کے اس نے ان کے اندر ایسی آگ لگا دی تھی جس کے شعلوں میں وہ رات بھر جھلستی رہی تھیں لیکن فوری طور پر انہوں نے رابعہ کے خلاف اقدام کا سوچا بھی نہیں کیونکہ پہلے انہیں اپنی ساکھ کی فکر تھی۔

اس وقت ناشتے کی ٹیبل پر وہ گرم چائے گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے اسی فکر میں تھیں کہ فون کی بیل پر انہوں نے بغیر چونکے ریسیور اٹھا لیا اور بقیہ چائے حلق سے اتار کر بولیں۔

"ہیلو۔"

"السلام علیکم۔" دوسری طرف اسفندیار تھے۔

انہوں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

"میں کل سے ٹرائی کر رہا ہوں لیکن ہر بار آپ کا نمبر بزی تھا۔" اسفندیار نے جتا کر کہا۔ وہ ابھی بھی خاموش رہیں۔

"میرا خیال ہے' لوگ آپ سے ہمدردی جتانے کا موقع گنوانا نہیں چاہتے ہوں گے۔"

"شٹ اپ' مطلب کی بات کرو۔" غصے سے ان کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔

"مجھے آپ سے کچھ مطلوب نہیں ہے' صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی بہو بیگم کی گمشدگی کا اشتہار لگوا کر آپ کیا ثابت کرنا چاہتی ہیں۔" اسفندیار نے پوچھا تو وہ دانت پیس کر بولیں۔

"تمہیں اس سے بھی کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیوں نہیں' اشتہار میں میرے باپ کا نام لکھا ہے اور میں اپنے باپ کی نیک نامی پر دھبہ برداشت نہیں کر سکتا۔" اسفندیار کا اشارا ان کی طرف تھا اور وہ سمجھ کر ہی تلملائی تھیں لیکن فوراً" کچھ کہہ نہیں سکیں تو وہ پوچھنے لگا۔

"ویسے آپ کی بہو کہاں سے غائب ہوئی ہیں' آئی مین گھر سے یا....."

"سنو' یہ میرا گھریلو معاملہ ہے' تمہیں اس میں دلچسپی لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"اور جو سینکڑوں لوگ دلچسپی لے رہے ہیں وہ۔"

"شٹ اپ۔" انہوں نے فون پٹخ دیا اور بالکل غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگیں۔ جب کسی حد تک غصے کو دبانے میں کامیاب ہو گئیں تب انہوں نے فائقہ کے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔

"ہیلو۔" ادھر سے عثمان نے فون اٹھایا تھا۔

"اعزاز صاحب سے بات کراؤ۔" انہوں نے کہا تو عثمان نے بے دھیانی میں پوچھا تھا۔

"جی' آپ کون؟"

"میں فائقہ کی ساس ہوں۔" انہوں نے پہلی بار' وہ بھی طنزیہ انداز میں فائقہ سے اپنا رشتہ بتایا تھا۔

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

پھر کچھ دیر بعد ابو کی آواز آئی تھی۔

"جی بیگم صاحبہ!"

"اعزاز صاحب! فائقہ سے آپ کا کیا رشتہ ہے۔" انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب؟۔" ابو سمجھے نہیں کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔

"دیکھیں اعزاز صاحب! فائقہ آپ کی بیٹی ہے اور ہمیشہ رہے گی' جبکہ مجھ سے اس کا رشتہ شہریار کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا پھر آپ نے اشتہار میں میرا حوالہ کیوں دیا۔" وہ بہت ضبط سے اور ٹھہر ٹھہر کر بولی تھیں۔

"میں معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ! یہ غلطی میری بیٹی رابعہ سے سرزد ہوئی ہے۔" ابو نے عاجزی سے کہا۔

"یہ محض غلطی نہیں ہے اعزاز صاحب! رابعہ نے جان بوجھ کر میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔ آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔ میری تو اس کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے اور میں کیوں اس سے دشمنی رکھوں گی۔ میرے برابر کی تو نہیں ہے وہ۔ نہ عمر میں' نہ حیثیت میں۔"

ابو کی عاجزی اور معافی مانگنے سے وہ اس انداز سے بات کرنے لگی تھیں جیسے انہیں رابعہ کی اس حرکت سے بہت دکھ ہوا ہو پھر بھی اپنی بڑائی جتانے سے باز نہیں آئیں۔

"جی آپ بجا فرما رہی ہیں۔ یقین کریں' میں خود بہت پریشان ہوں۔" ابو نے کہا تو وہ گہری سانس کے ساتھ کہنے لگیں۔

"پریشانی کی بات تو ہے۔ پتا نہیں وہ لڑکی کہاں چلی گئی۔ مجھے تو زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ پتا نہیں کہاں کس حال میں ہو گی۔ اللہ اسے اپنی امان میں رکھے۔ کیا کیا سوچا تھا میں نے۔ شیری کا بچہ ہو گا تو ہم سب مل کر بڑی خوشی منائیں گے۔" دوسری طرف ابو خاموش رہ گئے تھے۔

"او کے اعزاز صاحب! میں اپنی طرف سے کوشش کر رہی ہوں' باقی آپ دعا کریں۔" انہوں نے الوداعی انداز میں کہہ کر فون رکھ دیا پھر چیئر دھکیل کر اٹھتے ہوئے دانت پیسنے لگی تھیں۔

"ابھی ایک بیٹی کو رو رہے ہیں۔ سب کے لیے رلا دوں گی۔" پھر لاؤنج میں آ کر وہیں سے چیخیں۔ "رشید۔"

"جی بیگم صاحب!" رشید بھاگا آیا تھا۔

"ڈرائیور کو بلاؤ۔" وہ کہہ کر صوفے میں دھنس گئیں اور بیک پر سر رکھ کر خود کو ریلیکس کرنے لگیں۔

کچھ دیر بعد رشید ڈرائیور کو ساتھ لے کر آیا تو انہوں نے رشید کو جانے کا اشارا کیا اور نظریں ڈرائیور پر جما دیں۔

"کوئی غلطی ہو گئی بیگم صاحب؟" ڈرائیور ان کی تیز نظروں سے پریشان ہو گیا تھا۔

"نہیں' ابھی تک تو ٹھیک جا رہے ہو۔" انہوں نے کہا تو وہ فوراً" بولا۔

"آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی جی۔"

"مجھے تم پر بھروسا ہے اور اسی لیے میں تم سے بات کر رہی ہوں۔" وہ کہہ کر قصداً" سوچنے لگیں پھر کچھ دیر بعد اسے دیکھ کر بولیں۔

"مجھے کسی ایسے آدمی کا پتا بتاؤ جو میرا ہر کام کر سکے رازداری سے اور اس کے لیے میں اسے منہ مانگی رقم دوں گی۔"

ڈرائیور ان کی بات سمجھ کر سوچنے لگا تو قدرے رک کے انہوں نے پوچھا۔

"جانتے ہو کسی ایسے آدمی کو؟۔"

"جی۔" ڈرائیور نے ڈرتے ڈرتے جی کہا تھا۔

"کون ہے؟" انہوں نے فوراً پوچھا۔

"آپ ہی کی فیکٹری میں ملازم ہے' شہباز۔" ڈرائیور نے بتایا تو انہوں نے ایک پل میں اپنی فیکٹری کے تمام ملازمین کو سوچ ڈالا پھر اگلے پل ان کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔

"شہباز۔"

"جی بیگم صاحبہ! کیا حکم ہے۔" ڈرائیور نے ان کے ہونٹوں کی جنبش سے سمجھ کر پوچھا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا کر بولیں۔

"کچھ نہیں، تم جاؤ۔"

ڈرائیور چلا گیا تو کچھ دیر یکسوئی سے سوچنے کے بعد وہ فیکٹری کے نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ جب تک اس خوف میں تھی کہ جانے کب اس گھر سے جانے کو کہہ دیا جائے تو آگے وہ کہاں جائے گی۔ تب تک وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکی تھی۔ ہر رات نیند آنے تک وہ اپنے اگلے ٹھکانے کی فکر میں مبتلا رہتی تھی لیکن اب جبکہ راحل نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرلی تھی تو جہاں اسے اطمینان ہوا تھا وہاں سب گھر والے یاد آنے لگے تھے اور وہ ایک ایک کا ردِعمل بھی سوچنے لگی تھی کہ اس کے گھر چھوڑ آنے کا کس کس پر کیا اثر ہوا ہوگا اور اس کی تلاش میں کون کون سرگرداں ہوگا۔ یہ ساری باتیں سوچتے ہوئے اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا اور اس رات نیند آنے تک وہ تکیے میں منہ چھپا کر روتی رہی تھی۔

صبح اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے منہ دھوتے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا' اس کے بعد وہ اماں کا سامنا کرنے سے کترانے لگی۔ گو کہ صبح آنکھ کھلتے ہی اس نے سوچا تھا کہ بہت دن مہمانوں کی طرح رہ چکی' اب اسے گھر کے کام کاج میں اماں اور الشبہ کا ہاتھ بٹانا چاہیے لیکن اب اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ اماں بہت جلدی پریشان ہوجاتی تھیں۔ یوں بھی وہ ہر وقت اس کا چہرہ دیکھتی رہتی تھیں۔ پتا نہیں انہیں اس کے چہرے میں کیا نظر آتا تھا۔ کتنی بار وہ پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔ بہرحال اس وقت وہ کچن میں تو نہیں تھی لیکن بچے کو صاف ستھرا کرنے کے بعد کمرے کی صفائی میں لگ گئی تھی۔

راحل کو گو کہ دس بجے کلینک جانا تھا لیکن اٹھتا صبح سویرے تھا اور اس وقت سے الشبہ کو پکارنے لگتا تھا۔ جب تک وہ اٹھ نہیں جاتی تھی' وہ پکارے جاتا پھر دونوں میں تکرار شروع ہوجاتی۔ الشبہ کا کہنا تھا کہ رزلٹ آنے تک وہ عیش کرلے پھر جب کالج جانے لگے گی تو وہی روٹین شروع ہوجائے گی لیکن وہ نہیں مانتا تھا اور اماں ان دونوں کی تکرار میں بالکل خاموش رہتی تھیں۔ شاید عادی ہوچکی تھیں اور وہ اگر عادی نہیں ہوئی تھی' تب بھی کچھ نہیں کہہ سکتی تھی' اس لیے دھیان ہی نہیں دیتی تھی۔ ابھی بھی وہ صفائی کرنے میں لگی ہوئی تھی' جب الشبہ آکر بولی۔

"باجی! چلو ناشتا کرلو۔"

"ہیں۔" وہ حیران ہوگئی کیونکہ اب تک راحل کی وجہ سے اسے کمرے ہی میں ناشتا ملتا تھا۔

"میں بچے کو لے جا رہی ہوں' تم آجاؤ۔" الشبہ بچے کو اٹھا کر جانے لگی تو وہ پکار کر بولی۔

"سنو' میں بعد میں کرلوں گی۔"

"نہیں' بھائی کہہ رہا ہے۔ ناشتے کھانے میں سب کے ساتھ بیٹھا کرو۔ چلو' نہیں تو وہ ناراض ہوگا۔" الشبہ نے بھائی کا کہہ کر اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ ناچار دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھتے ہوئے الشبہ کے ساتھ ہی کمرے سے نکل آئی اور پہلے واش بیسن پر جا کر ہاتھ دھوئے پھر آکر اماں کے ساتھ لگ کر یوں بیٹھی کہ براہِ راست اس کی نظروں کا سامنا نہ ہو۔

اور وہ جیسے انتظار میں تھا' اس کے بیٹھتے ہی کہنے لگا۔

"اماں! اس سے بھی کچھ کام وام کروایا کرو' بیٹھ بیٹھ کر موٹی ہوگئی تو پھر اس کے اپنے گھر والے اسے نہیں پہچانیں گے۔"

"چپ کر کے ناشتا کر۔" اماں نے ٹوک دیا تو وہ اس سے پوچھنے لگا۔

"سنو' تمہارا نام کیا ہے؟"

"نشاء۔" اس سے پہلے الشبہ بول پڑی تو وہ ڈانٹنے لگا۔

"میں نے تجھ سے پوچھا ہے' بڑی دادی بنتی ہے۔" پھر اس سے بولا۔ "تم بتاؤ۔"

"فائقہ۔" وہ جب سب بتا چکی تھی تو نام کیوں چھپاتی۔

"ہائیں۔" الشبہ اچھل پڑی۔ "باجی! تم نے مجھے تو نشاء بتایا تھا۔"

"ہاں نشاء بھی لیکن اصل نام فائقہ ہے۔" اس کے سٹپٹانے پر اماں پھر ڈانٹنے لگیں۔

"تم لوگ ناشتا کرو گے کہ نہیں' خالی باتیں کیے جاتے ہو۔"

"میں فائقہ سے ناشتے ہی کا پوچھنا چاہتا ہوں اماں! کہ وہ کیا پسند کرتی ہے۔ آپ زبردستی اسے پراٹھا کھلا دیتی ہو۔" اس نے اماں سے کہتے ہوئے آخر میں اسے دیکھا تو وہ جلدی سے بولی۔

"میں سب کھا لیتی ہوں' میرا مطلب ہے پراٹھا بھی۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ کہہ کر کھانے میں یوں مصروف ہوا کہ پھر ادھر ادھر دیکھا ہی نہیں جس سے اسے بھی کھانے میں آسانی ہوگئی تھی۔

پھر ناشتا کرتے ہی اس نے الشبہ کے ساتھ مل کر دسترخوان سمیٹا' اس کے بعد سیدھی کمرے میں آبیٹھی اور اپنے لیے کوئی مصروفیت سوچتے ہوئے کڑھنے لگی کہ اب وہ گھر سے نکل بھی نہیں سکتی۔ بیگم آفندی نے اشتہار لگوا کر اس کے لیے راستے بند کردیے تھے۔

"لیکن ماما!" وہ اچانک ٹھٹھکی تھی۔ "ماما! اشتہار کیسے لگوا سکتی ہیں' اس سے تو خود ان کی بدنامی ہوئی ہوگی تو کیا ابو نے۔" وہ الجھنے لگی لیکن بیگم آفندی اور ابو کے علاوہ کسی اور کا سوچ ہی نہیں سکی۔ بس ان ہی دونوں میں ذہن الجھ رہا تھا۔

"باجی! اماں کہہ رہی ہیں' اس کے کپڑے نکال رکھو' وہ آکر اسے نہلا دے گی۔" الشبہ نے آکر بچہ اس کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا تو وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

"سبزی گوشت لینے۔" الشبہ نے بتایا پھر اس کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ "ایک بات بتاؤ باجی! کل بھائی نے کمرہ بند کر کے تم سے کیا باتیں کی تھیں۔"

"کیوں؟" اس نے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر الشبہ کو دیکھا تو وہ اصرار سے بولی۔

"بتاؤ ناں۔"

"کیا بتاؤں۔" وہ محض اسے چھیڑ رہی تھی۔

"وہی جو تم نے بھائی سے کہا ہے اور وہ ایکدم بدل گیا۔" الشبہ نے کہا تو وہ سٹپٹا گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"کیوں' وہ تم سے خار نہیں کھاتا تھا اور ابھی پتا ہے' اماں سے کہہ رہا تھا کہ تمہارا خیال رکھے اور مجھے بھی ڈانٹا کہ میں تمہیں تنگ نہ کروں۔ میں کب تنگ کرتی ہوں تمہیں۔" آخر میں الشبہ نے یوں منہ پھلایا جیسے اس نے شکایت کی ہو۔

"ارے نہیں' تم تو بہت اچھی' بہت پیاری ہو۔ تنگ تو میں نے تم سب کو کیا ہے۔" اس نے الشبہ کی ٹھوڑی

چھو کر کہا تو وہ پھر اسی بات پر آ گئی۔
"اچھا بتاؤ بھائی سے کیا باتیں ہوئی تھیں۔"
"کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ اس نے وہی پوچھا تھا کہ میں کون ہوں' کہاں سے آئی ہوں اور میں نے سچ بتا دیا۔ شاید میرے سچ بولنے پر ہی اسے رحم آ گیا جو کہنے لگا۔ اب تم یہیں رہنا اور ظاہر ہے جب اس نے خود رہنے کو کہا ہے تو پھر اپنا رویہ بھی بدلے گا۔" اس نے سہولت سے بتا کر کہا تو الیشبہ بہت سادگی سے پوچھنے لگی۔
"کہاں سے آئی ہو تم؟"
"کراچی سے۔"
"ہائے کراچی۔" الیشبہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر انتہائی شوق سے کہا۔
"تم گئی ہو کبھی؟"
"نہیں لیکن مجھے بہت شوق ہے' وہاں سمندر بھی ہے ناں۔"
"ہاں۔"
"بھائی ہمیشہ کہتا تھا کہ جب میں میٹرک کر لوں گی تب مجھے کراچی لے جائے گا اور وہ تو تیار ہے' پر اماں نہیں مانتی۔"
"اماں کیوں نہیں مانتیں۔" وہ دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"کہتی ہیں' بہت دور ہے اور وہاں کوئی رشتہ دار بھی نہیں ہے جس کے پاس جا کر ہم رہیں۔" الیشبہ نے کہا' تب ہی اماں آ گئیں۔ دونوں ہاتھوں میں تھیلے اٹھائے' سینے میں شرابور۔
"ہائے اماں! کیا کیا لے آئی۔" الیشبہ نے فوراً" اٹھ کر ان کے ہاتھوں سے تھیلے لے لیے۔
"پنکھا تیز کر' بہت گرمی ہے۔" اماں نے چادر اتارتے ہوئے کہا پھر خود ہی پنکھا تیز کر کے لیٹ گئیں۔
الیشبہ تھیلوں کا جائزہ لینے لگی تھی۔
اس نے جلدی سے بچے کو بستر پر لٹایا اور الیشبہ کے ہاتھ سے برف کا شاپر لے کر کچن میں چلی گئی اور کولر میں ٹھنڈا پانی بنا کر اماں کے لیے گلاس بھر کر لے آئی۔
"ہیں' یہ الیشبہ کو خیال نہیں آیا۔" اماں اٹھ کر اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے بولیں۔
"میں سوٹ دیکھ رہی ہوں' اماں! یہ کس کے ہیں۔" الیشبہ نے تھیلے میں سے سارے سوٹ نکال کر چارپائی پر ڈال دیے۔
"دو تیرے ہیں' دو فائقہ کے اور ایک میرا۔" اماں نے بتایا تو جہاں الیشبہ خوش ہوئی' وہاں وہ پریشان ہو گئی۔
"اماں! میرے پاس کپڑے ہیں۔"
"ہاں' اتنے سے بیگ میں کتنے کپڑے ہیں۔ گرمی میں موٹے کپڑے پہنے پھرتی ہو' ابھی یہ سی کر پہن لو۔ الیشبہ تو سی دے باجی کو۔" اماں نے اسے ٹوکتے ہوئے الیشبہ سے کہا تو وہ فوراً" بولی۔
"سی دوں گی' سب کے سی دوں گی' کاکے کے بھی فراک بنا دوں گی۔"
"فراک کیوں' یہ کوئی لڑکی ہے۔"
"اماں اچھا لگے گا ناں' گول گپا۔" الیشبہ نرمی سے بچے کے گال چھونے لگی تو جواب میں وہ غوں غاں کرنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

بچہ بھوک سے رو رہا تھا اور ادھر وہ دودھ ٹھنڈا کرنے میں لگی ہوئی تھی پھر جلدی سے فیڈر میں ڈال کر اس

کمرے میں آگئی جہاں الیشبہ بچے کو بہلا رہی تھی اور پہلے اس نے دھیان نہیں دیا۔ جب بچے کو گود میں لے کر بیٹھی اور اس کے منہ سے فیڈر لگا دی تب کمرہ دیکھ کر ٹپٹا گئی کیونکہ یہ راحل کا کمرہ تھا۔ اس سے پہلے وہ اس کمرے میں نہیں آئی تھی اور ابھی بھی بے دھیانی میں آگئی تھی۔ تو بچے کے دودھ پینے تک بیٹھنا پڑا۔

الیشبہ بڑے انہماک سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

وہ سرسری انداز میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

کمرہ بہت کشادہ نہیں تھا اور نہ ہی بہت چھوٹا۔ ایک طرف سنگل بیڈ' اس کے ساتھ صوفہ سیٹ' سامنے ٹی وی' دوسری طرف کمپیوٹر اور دیوار گیر ریک میں موٹی موٹی کتابیں۔ وہ ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ الیشبہ پکار کر بولی۔

"باجی! دیکھو کتنی پیاری لڑکی ہے۔"

وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوئی اور اسکرین پر رابعہ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں یکلخت دھندلا گئیں۔ لگا تھا جیسے مدتوں بعد کسی اپنے کی شکل دیکھی ہو اور بس ایک جھلک ہی دیکھ پائی تھی' اس کے بعد تو پلکیں جھپکتی رہ گئی اور جب دھند چھٹی اشتہار بدل چکا تھا پھر وہ دوبارہ اس انتظار میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔

ڈرامہ شروع ہو چکا تھا' الیشبہ ڈرامہ دیکھنے کے ساتھ وقفے وقفے سے اس سے بھی کچھ کہہ لیتی تھی لیکن وہ اب کچھ نہیں سن رہی تھی۔ ٹی وی پر نظریں جمائے وقفے کے انتظار میں تھی تاکہ اشتہار میں رابعہ کو دیکھ سکے اور جب وقفہ آیا تو اسی وقت راحل بھی آگیا جسے دیکھ کر پہلے اس نے وہاں سے اٹھنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر انجان سی بن کر بیٹھی رہ گئی۔

"کوئی خاص پروگرام آرہا ہے۔" راحل نے ٹی وی پر نظر ڈالتے ہوئے کسی ایک کو مخاطب کیے بغیر پوچھا۔

"ڈرامہ' بس ختم ہونے والا ہے۔" الیشبہ نے جلدی سے کہا کہ کہیں وہ اسے کسی کام سے نہ اٹھا دے۔

"اور اماں کہاں ہیں۔" راحل نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نماز پڑھ رہی ہیں۔"

"کبھی تو بھی نماز پڑھ لیا کر' ہر وقت ڈرامے دیکھتی رہتی ہے۔" وہ عادت کے مطابق الیشبہ کو ٹوکنے لگا۔

"بھائی! بس چپ کرو ناں۔" الیشبہ نے جھنجلا کر کہا تو وہ اٹھ کر ٹی وی کے پاس چلا گیا۔

"میں اسے بند کر رہا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بے اختیار بولی تھی۔

"ہیں! تم بھی ڈرامہ دیکھ رہی ہو۔" راحل نے اسے دیکھ کر تعجب سے کہا تو وہ جز بز سی ہو کر بولی۔

"کیوں' میرے دیکھنے پر پابندی ہے کیا؟۔"

وہ کندھے اچکا کر واپس اسی جگہ جا بیٹھا تو وہ جو رابعہ کو دیکھنے کو بے چین ہو رہی تھی' اس خیال سے ٹی وی کی طرف سے دھیان ہٹا دیا کہ کہیں پھر نہ اس کی آنکھیں بھیگ جائیں اور کمپیوٹر کی طرف اشارا کر کے اس سے پوچھنے لگی۔

"یہ کون سا ماڈل ہے۔"

"پینٹیم تھری' تم اگر اسے استعمال کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔" اس نے جتا کر کہا تو وہ قصداً" ذرا سا ہنس کر بولی۔

"نہیں' میں نے تو یونہی پوچھ لیا۔"

"تم نے اس میں کوئی کورس وغیرہ کیے ہیں۔"

"ہاں' اس کے بعد ہی جاب ملی تھی۔"

وہ دونوں بہت نارمل انداز میں باتیں کرنے لگے تھے' جبکہ الیشبہ ڈرامہ دیکھنے میں مصروف تھی۔

"اور اب تو میں جاب بھی نہیں کر سکتی۔" اس نے جس قدر مایوسی سے کہا' وہ اسی قدر بے نیازی سے بولا۔

"کیا ضرورت ہے۔"

"کیوں' آخر میں کب تک ایسے بیٹھی رہوں گی۔ شاید ماما نے ایڈ لگوایا ہی اس لیے ہے کہ جب میں تنگ آجاؤں تو واپس ان کے پاس چلی جاؤں۔" اس نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"فکر نہیں کرو' تم کبھی تنگ نہیں آؤگی۔ تمہیں جب جس چیز کی ضرورت پڑے بلا جھجک کہہ دینا۔" وہ اپنی بات ختم کر کے دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ وہ پکار کر کہنے لگی۔

"سنو' میں تم سے یہی کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے' میرے پاس اتنا کچھ ہے جس سے میری اور بچے کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔"

"خواہ ساری دنیا تمہاری ہو لیکن جب تک تم میرے گھر میں ہو' میری ذمہ داری ہو۔ کیا میں نے تم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ اگر تم حق پر ہوئیں تو میں اپنی جان سے بڑھ کر تمہاری حفاظت کروں گا۔ یقین کرو' اگر مجھے تمہاری سچائی پر ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو میں اسی وقت تمہیں نکال باہر کرتا لیکن اب میں اپنے وعدے کا پابند ہوں۔" اس کے ٹھوس لہجے پر وہ سر جھکا کر بولی۔

"لیکن میں کیا کروں' مجھے بہت عجیب سا لگتا ہے۔ آج اماں میرے لیے کپڑے بھی لے آئیں۔"

"سب کچھ لائیں گی' جیسے الیشبہ کی ضروریات کے علاوہ خواہشات بھی پوری کی جاتی ہیں' بلکہ مجھے شاید تمہارا زیادہ خیال کرنا پڑے گا' تمہاری حیثیت کے مطابق۔"

اس نے کہا تو وہ بے اختیار سر اونچا کر کے اسے دیکھنے لگی۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا' تم جس شخص کی بیوہ ہو' وہ کوئی معمولی آدمی تو نہیں تھا' مل اونر تھا اور اس مل اونر کے بچے نے اگر اس جھونپڑے میں جنم لیا ہے تو اس سے اس کی حیثیت کم نہیں ہوگی۔ یہ بڑا ہو کر اپنے باپ کی جگہ لے گا' تم نے اسے یہی سمجھانا' یہی سکھانا ہے' انڈراسٹینڈ۔"

وہ اسے باور کرا کے کمرے سے نکل گیا تو وہ ششدر سی اس کے پیچھے دیکھتی رہ گئی۔

اور اس رات اس نے اپنے دل کی ہر گلی سے پہرے ہٹا دیے تھے اور تمام رات ان گلیوں میں بھٹکتی رہی تھی' جہاں محبتیں یوں ٹوٹ کے برسی تھیں کہ ان کی سوندھی سوندھی مہک کا سرور ابھی بھی اس کی رگ و پے میں اتر رہا تھا۔

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبح فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن' آبھی گئی وصل کی رات

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر عفان نے اس روز رابعہ کی بدتمیزی سے ضد میں آکر سوچا تھا کہ وہ آئندہ اس کے گھر نہیں جائیں گے لیکن اخبار میں فائقہ کی گمشدگی کا اشتہار دیکھ کر وہ حقیقتاً" پریشان ہو گئے تھے۔ اخبار بھی کچھ دن پہلے کا تھا۔ انہوں نے تاریخ دیکھ کر دنوں کو شمار کیا تو انہیں تعجب ہوا کہ اس روز ابو اور امی میں کسی نے بھی انہیں نہیں بتایا تھا اور اسی لیے وہ اس وقت ان کے پاس جانے کے بجائے سلمان کے گھر آگئے تھے۔

"اوہو' عفان بھائی! کیسے راستہ بھول گئے؟" راحیلہ نے انہیں دیکھتے ہی تعجب کا اظہار کیا تو وہ قصداً" انجان بن

کر بولے۔
"السلام علیکم۔"
"وعلیکم السلام۔" راحیلہ جواب کے ساتھ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ سلمان بول پڑے۔ "جاؤ پہلے چائے وائے لے کر آؤ۔" ڈاکٹر عفان نے قصداً چائے کو منع نہیں کیا کیونکہ وہ اکیلے میں سلمان سے بات کرنا چاہتے تھے اور جیسے ہی راحیلہ کچن میں گئی' کہنے لگے۔
"میں نے ابھی کچھ دیر پہلے اخبار میں بیگم جیلان آفندی کی بہو کا اشتہار دیکھا ہے' فائقہ ہی ہے یا کوئی اور۔"
"فائقہ۔" سلمان سر جھکا کر بس اس قدر بولے تھے۔
ڈاکٹر عفان کتنی دیر تک انہیں دیکھتے رہے جیسے ان کی سمجھ میں نہ آرہا ہو۔
"لیکن کیسے؟"
"پتا نہیں عفان بھائی! ہم خود نہیں سمجھ پا رہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے اسے لاپتہ ہوئے اور ابھی تک اس کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اس اشتہار کو بھی کتنے دن ہو گئے ہیں۔" سلمان بے بسی سے بول رہے تھے۔
"حیرت ہے' مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔"
ڈاکٹر عفان نے کہا تب ہی راحیلہ چائے لے کر آگئی اور ان کی بات سن کر پوچھنے لگی۔
"کیا نہیں بتایا؟"
ڈاکٹر عفان جواب دینے کے بجائے سلمان کو دیکھنے لگے تو وہ بھی انجان بن کر بات بدل گئے۔
"کرن کیا کر رہی ہے؟"
"وہ آرام سے بیٹھی کھیل رہی ہے۔" راحیلہ نے بتایا پھر چائے کا کپ ڈاکٹر عفان کو تھماتے ہوئے بظاہر چھیڑنے کے انداز میں بولی۔
"آپ کی بیوی تو آج کل ٹی وی پر نظر آتی ہے' آپ نے دیکھے ہیں اس کے اشتہار۔"
"ہوں۔" ڈاکٹر عفان نے جز بز ہو کر فوراً" چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا تو سلمان نے اشارے سے راحیلہ کو منع کیا کہ وہ اس موضوع کو نہ چھیڑے لیکن وہ کہاں باز آنے والی تھی۔ اسے تو یوں بھی رابعہ کے خلاف بولنے کا موقع چاہیے ہوتا تھا۔
"میرا خیال ہے' وہ آپ سے الگ ہی اس لیے ہوئی تھی تاکہ جو مرضی کرتی پھرے۔ کوئی اچھا شوق تو نہیں ہے جس کے لیے اس نے بسا بسایا گھر چھوڑ دیا اور اب تو اس کے مزاج ہی نہیں ملتے' ہواؤں میں اڑنے لگی ہے۔ آپ بھول جائیں کہ وہ کبھی آپ کے پاس واپس آئے گی' اس فیلڈ میں تو آدمی آگے ہی آگے نکلتا چلا جاتا ہے' پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ شہرت اور دولت کا نشہ ہوتا ہی ایسا ہے۔"
"جی۔ لیکن مجھے زیادہ فکر فائقہ کی ہے۔" ڈاکٹر عفان نے مجبوراً" فائقہ کا ذکر چھیڑا اور راحیلہ اس پر بھی شروع ہو گئی۔
"ہاں' آپ نے سنا اس بیچاری کے ساتھ کتنا برا ہوا۔ بڑے لوگوں میں شادی کرنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ رشتے ہمیشہ اپنے جیسے لوگوں میں کرنے چاہئیں۔ میں نے تو بھئی سبق سیکھ لیا میں اپنی بیٹی کو کبھی اتنے بڑے گھر میں نہیں بیاہوں گی بلکہ میں تو اس کی شادی ہی نہیں کروں گی۔"
"آپ لوگوں نے اس سلسلے میں' آئی مین فائقہ کی تلاش کے سلسلے میں اور کیا اقدام کیا ہے۔" ڈاکٹر عفان نے سلمان کو دیکھ کر پوچھا لیکن ان سے پہلے راحیلہ بول پڑی۔

"یہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔ بیگم آفندی بہت پاور فل عورت ہیں اور وہ تو الٹا ان لوگوں کو الزام دے رہی ہیں کہ انہوں نے فائقہ کو کہیں چھپایا ہے۔"
"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" سلمان نے راحیلہ کو گھورتے ہوئے کہا لیکن وہ یکسر نظر انداز کر کے مزید ڈرامائی انداز میں کہنے لگی۔
"میں آپ کو بتاؤں عفان بھائی! یہ لوگ تو مانتے نہیں ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ فائقہ کی ساس نے اسے مروا دیا ہے۔"
"جی!" ڈاکٹر عفان نے پریشان ہو کر سلمان کو دیکھا تو وہ بمشکل غصہ دبا کر بولے۔
"یہ بکواس کر رہی ہے۔"
"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں عفان بھائی! یہ پیسے والے لوگ ایسے ہی کرتے ہیں۔ بیگم آفندی نے اس ڈر سے کہ کہیں فائقہ یا اس کا بچہ ان کی جائیداد کے دعوے دار نہ ہو جائیں' ان کا پتا ہی صاف کر دیا۔ آپ دیکھیے گا' کچھ دنوں میں یہ حقیقت سامنے آجائے گی۔" راحیلہ اپنی بات پر اڑ کر یقین سے بول رہی تھی۔ "ورنہ آپ بتائیں وہ کہاں جا سکتی ہے۔ رابعہ کی طرح تو وہ تھی نہیں' وہ تو بیچاری سیدھی سادی۔ اگر ساس کے گھر سے نکلتی بھی تو ابو کے پاس آجاتی۔ سوچنے کی بات ہے ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا ہے' اگر وہ زندہ ہوتی تو۔۔۔"
"بس خاموش ہو جاؤ۔" اس بار سلمان غصے سے دھاڑے تھے۔
راحیلہ بڑبڑاتے ہوئے چائے کی ٹرے اٹھا کر چلی گئی تو ڈاکٹر عفان نے یوں گہری سانس کھینچی جیسے اس کے جانے پر شکر کر رہے ہوں پھر اٹھتے ہوئے بولے۔
"چلیں سلمان بھائی! باہر چلتے ہیں۔"
"ہاں' یہاں تو بات کرنا عذاب ہے۔" سلمان فوراً" اٹھ گئے اور دونوں گھر سے باہر آکر کھڑے ہوئے' تب ڈاکٹر عفان کہنے لگے۔
"راحیلہ بھابھی بہت بولتی ہیں' اس لیے شاید ان کی باتوں کو اہمیت نہیں دی جاتی لیکن اگر سنجیدگی سے سوچیں سلمان بھائی! تو وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔ آئی مین یہ جائیداد وغیرہ کا چکر بہت برا ہوتا ہے' آپ کو اسٹینڈ لینا چاہیے۔"
"کیا کریں عفان بھائی! ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ امی' ابو اتنے پریشان ہیں' میں تو انہیں تسلی بھی نہیں دے سکتا۔" سلمان نے بے بسی سے کہا۔
"جی' ابھی کچھ دن پہلے میں ابو کے پاس گیا تھا۔ شاید اسی پریشانی میں وہ۔۔۔" ڈاکٹر عفان کچھ کہتے کہتے خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگے تھے۔
"کچھ کہا ابو نے آپ سے؟" سلمان نے ٹوکا تو وہ چونک کر بولے۔
"نہیں' مجھے تو نہیں لیکن رابعہ کو ڈانٹ رہے تھے۔"
"رابعہ نے اور پریشان کر رکھا ہے' آپ اس پر سختی کیوں نہیں کرتے' بیوی ہے آپ کی۔" سلمان نے کہا تو وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔
"اسی لیے تو خاموش ہوں کہ میں اس سے تعلق نہیں توڑنا چاہتا۔ اگر میں نے سختی کی تو وہ ضد میں جانے کیا کر بیٹھے۔"
"ہاں' ضدی بھی تو بہت ہے۔"
"ٹھیک ہو جائے گی' آپ اس کی فکر نہ کریں۔" ڈاکٹر عفان نے گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے کہا تو سلمان پوچھنے

لگے۔

"آپ جا رہے ہیں۔"

"جی۔ میں فائقہ کا معلوم کرنے آیا تھا' اللہ کرے وہ جہاں ہو' خیریت سے ہو۔"

"ہم بھی یہی دعا کرتے ہیں۔"

"مجھے اجازت دیجیے اور ہاں' فائقہ کے بارے میں کچھ پتا چلے تو پلیز مجھے ضرور بتائیے گا۔" ڈاکٹر عفان نے کچھ شاکی ہو کر کہا پھر فوراً" گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"بیگم صاحبہ! اخباروں میں اشتہار تو آپ لگوا ہی چکی ہیں' اب اگر باقاعدہ رپورٹ درج کروا دیں تو مجھے کارروائی میں آسانی ہوگی۔" ایس پی جنید خان نے کہا تو بیگم آفندی قصداً" عاجز سی ہو کر بولیں۔

"نہیں' نہیں خان صاحب! مجھے کورٹ کچہری کے چکروں میں نہیں پڑنا۔"

"پھر آپ بتائیں۔ میں کیا کروں' بغیر کورٹ سے ریمانڈ حاصل کیے میں کسی پر زیادہ سختی نہیں کر سکتا اور ہاں' میں نے ایک اور کیس بنا کر آپ کی بہو بیگم کے کزن عظام کو اریسٹ کیا تھا۔" جنید خان کی بات ابھی جاری تھی کہ بیگم آفندی نے بے صبری سے بات کاٹ دی۔

"پھر۔"

"پھر کیا بیگم صاحبہ! وہ تو بہت شریف آدمی ہیں' آپ کو ان پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔" جنید خان نے کہا تو وہ ناگواری سے بولیں۔

"میں نے اس پر شبہ تو نہیں ظاہر کیا تھا بلکہ جو حقیقت تھی' وہی بتائی تھی کہ میری بہو نے جانے سے پہلے اسے فون کیا تھا۔ بہرحال کیا وہ ابھی بھی آپ کی حراست میں ہے۔"

"جی نہیں' ان کے لیے اگلے دن ہی ڈی سی صاحب کا فون آگیا تھا۔" جنید خان نے بتایا تو وہ تعجب سے بولیں۔

"اچھا! اتنی سورس ہے اس کی' کیا کرتا ہے۔"

"پتا نہیں جی' میں نے زیادہ انکوائری نہیں کی تھی۔ اگر آپ باقاعدہ رپورٹ....."

"نہیں' نہیں خان صاحب! ابھی آپ اس معاملے کو یہیں روک دیں۔ میں اس ہفتے لندن جا رہی ہوں' جب واپس آؤں گی' تب دیکھیں گے۔" بیگم آفندی نے منع کرتے ہوئے کہا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔"

"میرا بیٹا وہیں مدفون ہے۔" بیگم آفندی خود ہی بتانے لگیں۔ "جب اس کی یاد بہت ستاتی ہے تو میں وہیں چلی جاتی ہوں۔ ادھر جب سے اس کی بیوی لاپتہ ہوئی ہے' وہ ہر روز میرے خواب میں آتا ہے۔ بہت محبت کرتا تھا وہ اس سے' پتا نہیں کہاں چلی گئی۔ میں شیری سے کیا کہوں گی۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"حوصلہ رکھیں بیگم صاحبہ! آپ تو ماشاءاللہ بہت باہمت خاتون ہیں۔" جنید خان یہی کہہ سکا۔

بیگم آفندی کچھ دیر خاموش رہیں' یوں جیسے خود پر قابو پا رہی ہوں پھر اسے دیکھ کر بولیں۔

"ٹھیک ہے خان صاحب! میں پھر لندن سے واپسی پر آپ سے رابطہ کروں گی۔"

"جی بہتر۔" جنید خان اٹھ کھڑا ہوا پھر جاتے جاتے رک کر پوچھنے لگا۔ "آپ کو اندازاً" کتنے دن لگیں گے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ جب شیری آنے دے گا' تب ہی آؤں گی۔" انہوں نے کہا تو جنید خان کو ان کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا۔ کچھ بولا نہیں' البتہ ترحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔

بیگم آفندی اس کے جاتے ہی سر جھٹک کر مسکرائیں پھر پہلے منیجر طاہر صاحب کو فون کر کے اپنی لندن کے لئے سیٹ کنفرم کروانے کو کہا اس کے بعد شہباز کا موبائل نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

چند لمحوں بعد شہباز اپنے موبائل پر جیسے ان کا نمبر دیکھ کر بولا تھا۔

"یس میڈم!"

"کیا معلوم کیا تم نے اب تک؟" انہوں نے پوچھا تو شہباز ٹیپ کی طرح شروع ہو گیا تھا۔

"میں نے دونوں کے بارے میں معلوم کر لیا ہے میڈم! بڑی کا نام رابعہ ہے بہت خوبصورت ہے وہ۔ ایک اشتہاری کمپنی کے مالک توصیف عالم کے ساتھ زیادہ نظر آتی ہے اور اس کے اشتہاروں میں کام بھی کرتی ہے۔ دوسری کا نام سوہنی ہے کالج میں پڑھتی ہے صبح آٹھ بجے اپنے محلے کی ایک لڑکی کے ساتھ کالج جاتی ہے اور دو بجے اسی کے ساتھ واپس آتی ہے۔"

"ہوں۔" انہوں نے پُرسوچ انداز میں "ہوں" کی آواز نکالی پھر اسی انداز میں بولیں۔ "لیکن رابعہ کی تو شادی ہو گئی تھی اور اس کا شوہر غالباً ڈاکٹر تھا۔"

"میں نے اس کی پچھلی زندگی کا معلوم نہیں کیا میڈم! آپ کہیں تو۔۔۔"

"نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے فوراً ٹوک کر کہا تو وہ پوچھنے لگا۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے۔"

"رابعہ کو بھول جاؤ وہ بہت تیز لڑکی ہے اس نے کہیں تمہیں دیکھا تو نہیں۔" انہوں نے پوچھا تو وہ فوراً بولا۔

"نہیں میڈم!"

"ٹھیک ہے بہت محتاط رہنا۔ میں اسی ہفتے لندن جا رہی ہوں پھر وہاں سے تمہیں فون کروں گی تب تم سوہنی کو لے جانا اور جتنے دن چاہے اپنے پاس رکھنا لیکن ایک بات یاد رکھو اس دوران ایک دن بھی ڈیوٹی سے غیر حاضر مت ہونا سمجھے۔"

"جی۔"

"اب میں تمہیں لندن سے فون کروں گی۔" انہوں نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور جو کچھ شہباز سے کہہ چکی تھیں اسے سوچتے ہوئے دل ہی دل میں رابعہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔

"مجھ سے دشمنی مول لینے کا نتیجہ اب تم بھگتو گی۔ بہت شوق ہے ناں تمہیں اخباروں میں اشتہار لگوانے کا تو اب اپنی بہن کا اشتہار لگوانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہونہہ نان سنس۔" وہ تنفر سے سر جھٹکتی اٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنے کمرے میں آ کر ابھی انہوں نے لباس تبدیل کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ ملازمہ آ کر بولی۔

"بیگم صاحبہ! وہ رامش صاحب آئے ہیں۔"

"کیوں؟" ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے کیونکہ انہیں رامش کا فائقہ کے حق میں بولنا سخت ناگوار گزرتا تھا۔ شہریار کے بعد بس کچھ دن ہی انہوں نے اسے برداشت کیا تھا پھر یوں رویہ بدلا کہ اس نے خود ہی آنا چھوڑ دیا تھا اور اب بھی وہ جانتی تھیں کہ وہ فائقہ ہی کا معلوم کرنے آیا ہو گا اس لیے پہلے اسے ٹالنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر ملازمہ سے اسے بٹھانے کا کہہ کر خود ڈریسنگ روم کا رخ کیا اور قصداً لباس تبدیل کرنے میں دیر لگائی پھر جب لاؤنج میں آئیں تو اسے دیکھتے ہی بولیں۔

"کہاں چلے گئے ہو تم کبھی فون بھی نہیں کرتے۔"

رامش اٹھ کھڑا ہوا تھا بس انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

"بیٹھو۔" انہوں نے بیٹھنے کے بعد اسے بیٹھنے کا اشارا کیا۔

"آپ کیسی ہیں ماما!" رامش نے قدرے رک کر پوچھا تو وہ گہری سانس کے ساتھ بولیں۔

"بس زندہ ہوں زندگی تو شیری کے ساتھ تھی اب تو کچھ پتا نہیں چلتا۔"

"فائقہ کہاں چلی گئی؟" رامش نے اب بھی رک کر پوچھا تھا۔

"کیا بتاؤں بیٹا! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لڑکی اچانک کہاں غائب ہو گئی۔ سارا شہر ڈھونڈ لیا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ اخباروں میں اشتہار بھی تم نے دیکھا ہو گا۔"

"جی۔"

"اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا کہیں سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔" انہوں نے مایوسی سے کہا تو وہ تعجب سے بولا۔

"عجیب بات ہے وہ تو اچھی خاصی سمجھ دار لڑکی تھی۔"

"ہاں اور میں نے اسے پابند بھی نہیں کیا تھا۔ آئی مین شیری کے بعد میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ جہاں اس کا دل چاہے رہے یہاں یا اپنے ماں باپ کے پاس اور وہ اپنی مرضی سے میرے پاس رہ رہی تھی۔ اس پر اس کے ماں باپ کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا پھر اچانک پتا نہیں اس نے کیا سوچ لیا تھا جو کسی کو کچھ بتائے بغیر چلی گئی۔ بیوقوف نے یہ بھی نہیں سوچا کہ شیری کے بعد میری زندگی میں ایک بس وہی ہے۔" وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئیں پھر آزردگی میں گھر کر بولنے لگی تھیں۔

"شیری کا تو ہمیں پتا تھا کہ وہ جانے والا ہے اور اس کی شادی میں نے کی ہی اس لیے تھی کہ اس کے بعد میں بالکل تنہا نہ رہ جاؤں لیکن شاید میرے مقدر میں تنہائی ہی لکھی تھی۔ کاش میں نے شیری کو شادی کرنے پر مجبور نہ کیا ہوتا تو اس تنہائی کے لیے بھی پہلے سے تیار ہوتی اب تو وقت کٹتا ہی نہیں میں جا رہی ہوں شیری کے پاس۔"

"جی۔" رامش چونکا تھا۔

"ہاں میں اسی ہفتے لندن جا رہی ہوں۔" وہ یوں بولیں جیسے ان کا ہر شے سے جی اچاٹ ہو گیا ہو۔

"آپ مایوس نہ ہوں ماما! وہ آ جائے گی۔" رامش نے تسلی دی تو وہ مایوسی سے بولیں۔

"کہاں سے آ جائے گی۔"

"آپ دیکھیے گا جس طرح وہ اچانک گئی ہے اسی طرح کسی دن اچانک آ جائے گی۔"

"اللہ کرے۔" انہوں نے گہری سانس کھینچی پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔ "تم چائے پیو گے؟"

"ایک بات پوچھوں ماما! آپ برا تو نہیں مانیں گی۔" رامش نے چائے کا سنا ہی نہیں تھا۔

بیگم آفندی سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"کیا فائقہ نے پیسے کی خاطر شیری سے شادی کی تھی۔" اس نے پوچھا تو وہ ایک لحظہ کو ٹھٹھکی تھیں۔

"یہ تم سے کس نے کہا؟"

"شیری نے۔ ایک بار اس نے کچھ سرسری ذکر کیا تھا اس وقت وہ بہت ڈسٹرب لگ رہا تھا۔ شاید اسے بھی اسی روز معلوم ہوا تھا۔" رامش یاد کرتے ہوئے بول رہا تھا۔

"ہاں۔" بیگم آفندی نے ہاں کی صورت پھر گہری سانس کھینچی پھر اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"کچھ ایسا ہی معاملہ تھا تم تو جانتے ہو شیری! شادی پر آمادہ ہی نہیں تھا اور جب میرے بہت اصرار پر آمادہ ہوا تو اس شرط پر کہ پہلے سے اس کی بیماری کا بتا دیا جائے تو ایسی صورت میں کوئی بھی تیار نہیں ہوا پھر میں نے آخری کوشش کے طور پر فائقہ سے بات کی تھی کیونکہ شیری اسے پسند کرتا تھا اور میرا خیال تھا کہ فائقہ کے دل میں بھی اس کے لیے جگہ ہو گی اور ایسا تھا تو لیکن شیری کی بیماری کا سن کر اس نے بھی شادی سے صاف انکار کر دیا تھا پھر

میری بہت منتوں کے بعد وہ بھاری رقم کے عوض آمادہ ہوئی تھی۔"

"حیرت ہے۔" رامش واقعی حیرت زدہ تھا۔

"یہ دنیا ہے بیٹا! یہاں لوگ مجبوریوں سے صرف فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔" وہ دکھ سے بولیں۔

"پھر ماما! آپ اس کے لیے پریشان کیوں ہیں؟"

"کیا کروں بیٹا! وہ شیری کی محبت ہے اور شیری کے بچے کی ماں۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ اس کے ساتھ کچھ برا ہو' اس لیے وہ جب تک اپنے گھر نہیں پہنچ جاتی' مجھے چین نہیں آئے گا۔" آخر میں ان کے دل کی بات کسی بھی صورت زبان پر آگئی تھی۔

"آپ کو کیا لگتا ہے' وہ خود سے کہیں گئی ہے یا..... میرا مطلب ہے یہ اغوا کا کیس بھی تو ہو سکتا ہے۔" رامش نے کہا تو وہ نفی میں سر ہلا کر بولیں۔

"نہیں' اگر ایسا ہوتا تو کوئی فون وغیرہ آتا' دو مہینے ہو گئے ہیں۔"

"دو مہینے۔"

"ہاں' اس کے گھر والے الگ پریشان ہیں اور میں تو اب یہی دعا کرتی ہوں کہ وہ جہاں ہو' خیریت سے ہو۔"

"اللہ بہتر کرنے والا ہے۔" رامش کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا ماما! میں چلتا ہوں۔"

"اچھا۔ کبھی فون ہی کر لیا کرو۔" انہوں نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔

پھر جیسا کہ انہوں نے اسی ہفتے لندن جانے کا طے کر لیا تھا تو سیٹ کنفرم ہونے تک فیکٹری اور ماربل انڈسٹریز کے تمام ضروری کام جلدی جلدی نمٹانے لگیں۔ بقیہ معاملات اپنے منیجر طاہر صاحب کو سمجھا دیے اور پھر اپنے جانے سے کچھ دیر پہلے انہوں نے فائقہ کے ابو کو فون کیا تھا۔

"اعزاز صاحب! میں لندن جا رہی ہوں۔" انہوں نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

"خیریت۔" ابو نے پوچھا تو وہ آزردگی سے بولیں۔

"بس شیری بہت یاد آتا ہے' کچھ عرصہ اس کے قریب رہوں گی تو شاید صبر آجائے۔" ابو خاموش رہے تھے۔

"میں نے آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ اگر اس دوران فائقہ کی کوئی اطلاع ملے تو پلیز مجھے....."

"سوری بیگم صاحبہ! مجھے فائقہ کی طرف سے کسی اطلاع کی آرزو نہیں ہے۔" ابو نے ان کی بات پوری ہونے سے پہلے کہہ کر فون بند کر دیا تو انہوں نے تلملا کر ریسیور پٹخا تھا۔

☼ ☼ ☼

اماں پڑوس میں قرآن خوانی میں گئی ہوئی تھیں اور الیشبہ کھانا پکانے میں مصروف تھی۔

اس نے تھپک تھپک کر زبردستی بچے کو سلا دیا پھر نہانے کے ارادے سے جلدی سے چارپائی کے نیچے سے اپنا بیگ کھینچ کر کپڑے نکالے تھے کہ ساتھ ایک تصویر ہاتھ میں آگئی جسے دیکھتے ہوئے پھر اسے گردوپیش کا ہوش نہیں رہا تھا۔ یہ اس کی اور شہریار کی تصویر تھی جس میں دونوں آنے والے وقت سے بے نیاز ایک دوسرے کی قربت میں بے پناہ خوش تھے اور ان خوشیوں کو سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں پھر بھی اس نے پلکیں نہیں جھپکیں اور انگلی کی نرم پوروں سے اس کے ایک ایک نقش کو چھونے لگی۔

"شیری! کہاں چلے گئے تم اور دیکھو میں کہاں آگئی۔ یہ سب تو نہیں سوچا تھا میں نے۔" وہ بہ زبان خاموشی اس سے بولنے لگی تھی اور اسے احساس تک نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں میں دھند کی جگہ سیلاب اتر آیا تھا جس نے سارے بند توڑ ڈالے تھے۔

"اتنی دور کیوں بس گئے تم' کہیں آس پاس ہوتے تو میں ہر روز تمہاری تربت پر اپنی محبتوں کے دیپ جلاتی۔ لوگ مجھے دیوانی کہتے' پتھر مارتے اور میں....." اس کا دل درد سے پھٹنے لگا تھا اور حلق سے گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز بھی نکلنے لگی تھی پھر بھی اسے احساس نہیں ہوا۔ چونکی اس وقت جب عقب سے راحل نے جھک کر اس کے ہاتھوں پر سے تصویر اٹھا لی تھی۔

"تم۔" وہ جھٹکے سے اٹھی تھی۔ "تم کب آئے؟"

"ابھی۔" راحل کی نظریں تصویر پر تھیں۔ "یہ تمہارا شوہر ہے۔"

"ہاں۔" وہ تصویر جھپٹنا چاہتی تھی لیکن راحل بالکل غیر محسوس طریقے سے ذرا سا رخ موڑ کر دو قدم آگے بڑھ کر بولا۔

"ویری ہینڈسم' کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟"

"شیری۔ شہریار آفندی۔"

"شہریار آفندی۔" اس نے دہرایا پھر اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ "روتی کیوں ہو' تمہارے آنسو اسے واپس تو نہیں لے آئیں گے۔"

"اگر ایسا ممکن ہوتا تو میری آنکھیں سمندروں کو مات دے جاتیں۔" اس نے کہہ کر پھر تصویر لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس بار وہ تصویر اسے تھما کر بولا۔

"اسے چھپا رکھو' میرا مطلب ہے اماں کو مت دکھانا۔ ہر وقت یہ کہہ کر روتی رہیں گی کہ کیسا سوہنا جوان مٹی میں جا سویا اور تم..... تم بھی مت رووٴ۔"

وہ خاموشی سے نیچے بیٹھ گئی اور تصویر بیگ میں رکھ کر بیگ بند کیا لیکن پھر اسے بیٹھتے دیکھ کر دوبارہ زپ کھول کر ایک چھوٹا البم نکال لیا اور اسے تھما کر بولی۔

"یہ دیکھو۔"

راحل البم کھولنے لگا تھا کہ الیشبہ کی آواز سن کر فوراً البم جیب میں رکھ لی اور اسے دیکھا تو وہ بھی بیگ چارپائی کے نیچے دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف پشت کر کے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔

"توبہ توبہ۔ کیسی گرمی ہے۔" الیشبہ بولتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تھی پھر راحل کو دیکھ کر تعجب سے پوچھنے لگی۔ "بھائی! آپ کب آئے ہو۔"

"ابھی، اماں کہاں ہیں؟" راحل نے مختصر جواب کے ساتھ پوچھا۔

"قرآن خوانی میں گئی ہیں۔"

"تو نہیں گئی۔"

"نہیں، باجی اکیلی ہوتی ہے ناں، اماں آجائیں گی تو پھر میں مہندی میں جاؤں گی۔" الیشبہ نے کہا تو وہ پوچھنے لگا۔

"کس کی مہندی میں؟۔"

"شہناز کی، باجی کو بھی لے جاؤں گی۔ چلوگی ناں باجی!" الیشبہ نے اس سے پوچھا لیکن وہ فوراً بول پڑا۔

"کوئی ضرورت نہیں اسے لے جانے کی۔"

"کیوں، سارا وقت بیچاری گھر میں بیٹھی رہتی ہے اور کوئی اتنی دور تھوڑی جانا ہے۔" الیشبہ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"بات دور نزدیک کی نہیں ہے۔ تمہاری سہیلی ہے، تم جاؤ، تمہیں تو میں منع نہیں کر رہا۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تو الیشبہ منہ پھلا کر بولی۔

"تو اسے کیوں منع کرتے ہو۔"

"بحث مت کیا کرو، پوچھ لو اس سے۔ جانا ہے تو لے جانا۔" وہ کہتا ہوا اٹھ کر چلا گیا تو الیشبہ خوش ہو گئی۔

"چلوگی ناں باجی؟"

"میں..... نہیں۔" وہ اس کی طرف پلٹ کر بولی۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"ہائے باجی! تمہاری تو آنکھیں لال سرخ ہو رہی ہیں۔" الیشبہ اس کا چہرہ دیکھتے ہی تشویش سے بولی۔

"کہا نا، طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو بھائی سے دوا لے لو نا۔"

"لے لوں گی، تم ناراض نہیں ہونا، میں پھر کسی دن تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"شادی میں چلنا، میں تمہیں اپنی بہت ساری سہیلیوں سے ملواؤں گی۔" الیشبہ نے کہا تو وہ محض اس کا دل رکھنے کی خاطر بولی۔

"اچھی بات ہے، اب تم بچے کے پاس بیٹھو، میں نہانے جا رہی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کپڑے اٹھا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

پھر اماں کے آتے ہی الیشبہ تیار ہو کر اپنی سہیلی کی مہندی میں چلی گئی تو وہ بچے کو لے کر اماں کے پاس آنگن میں آبیٹھی۔ جہاں راحل پانی کا پائپ لیے آنگن میں چھڑکاؤ کرنے کے ساتھ ایک پرانا گیت بڑے بھونڈے انداز میں گا رہا تھا۔

آگ لگی تن من میں دل کو پڑا تھامنا
رام جانے کب ہوگا سیاں جی کا سامنا

وہ اس کے گانے پر بے ساختہ ذرا سا ہنسی تھی پھر اماں سے بولی۔

"اماں! اب اس کی شادی کر دیں۔"

"یہ مانے تب ناں، میں تو کہہ کہہ کر تھک گئی، اس کے ساتھ کے چار چار بچوں کے باپ بن گئے ہیں اور یہ ابھی تک ایسے ہی پھر رہا ہے۔" اماں نے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

"کیا کہتا ہے۔"

"کہتا ہے، پہلے الیشبہ کی کروں گا، نہیں تو میری بیوی سے ہر روز لڑے گی۔"

"کوئی نہیں، وہ تو اتنی اچھی ہے۔ ادھر رو ٹھتی ہے، ادھر مان جاتی ہے۔" اس نے بہت محبت سے الیشبہ کی تعریف کی۔

"ہاں بس، اس کی اپنی مرضی نہیں ہے۔ ایسے ہی بہانے کرتا ہے۔" اماں نے کہا پھر اس کی ٹھوڑی چھو کر بولیں۔ "تو بھی الیشبہ کے ساتھ چلی جاتی، دل بہل جاتا۔"

"یہ کہاں بیٹھنے دیتا اماں!" اس نے بچے کا بہانہ کیا۔

"تو، یہ میرے پاس رہ جاتا۔" اماں نے کہا تب ہی راحل پائپ لپیٹتے ہوئے آگیا اور اماں سے پوچھنے لگا۔

"الیشبہ کب آئے گی؟۔"

"ابھی تو گئی ہے اور اتنی جلدی نہیں آئے گی۔ شہناز کی اماں کہہ رہی تھیں، وہ خود ہی چھوڑ جائیں گی۔"

"چلو میری چھٹی ہوئی۔" وہ کہہ کر واپس پلٹ گیا تو اماں بھی نماز کے لیے اٹھ گئیں۔

اس نے بچے کو بستر پر لٹا دیا اور گہری سانس کھینچ کر گیلی مٹی کی سوندھی مہک اپنی اندر اتارنے لگی۔ تب ہی ہوائی جہاز کی آواز پر اس نے فوراً بچے کے سینے پر ہاتھ رکھا کہ کہیں وہ ڈر نہ جائے پھر جہاز کو دیکھتے ہوئے کھو سی گئی۔

"پتا ہے، رات میں نے خواب میں کیا دیکھا۔"

"کیا۔"

"تمہارا جہاز۔"

"میرا جہاز۔"

"ہاں، جسے تم بہت اونچا اڑانا چاہتی ہو، ستاروں کی کہکشاؤں میں سفر کرتا ہوا وہ جانے کس منزل کی جانب رواں تھا۔"

"پھر۔"

"پھر تم نے مجھے پکارا تھا۔"

"پھر۔"

"پھر میں کہاں تھا، شاید آسمان پر۔"

"پھر۔"

"میں نے تمہاری آواز سنی تھی اور تمہاری طرف دوڑا بھی تھا۔"

"پھر۔"

"پھر پتا نہیں۔ شاید میری آنکھ کھل گئی تھی۔" وہ اس تک نہ پہنچ سکنے پر کس قدر دل گرفتہ لگ رہا تھا۔

اس کی نظریں آسمان پر بھٹکنے لگیں، جو دھیرے دھیرے اپنا رنگ کھو رہا تھا۔ اس کا دل چاہا، اتنی زور سے شیری کو پکارے کہ اس کی آواز آسمانوں پر گونجنے لگے اور وہ جہاں کہیں ہو ساری حدیں پھلانگتا ہوا چلا آئے۔

(باقی آئندہ)

عالیہ بخاری

گم شدہ لمحے کا احساس

ناولٹ

ایک چھوٹے سے تولیے کی مدد سے اوون کی گرم ٹرے انہوں نے کھینچ کر باہر نکالی۔

ایک درمیانے سائز کا اسفنج کیک اور بسکٹس تیاری کے آخری مراحل میں تھے۔ چھری کی نوک سے چیک کر کے انہوں نے اپنا اطمینان کیا اور پھر دونوں چیزیں باہر نکال لیں۔

دروازے پر بیل ہو رہی تھی۔

وہ جانے ہی لگی تھیں کہ ماہین کو اپنے کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر رک گئیں۔

آنے والی زینت آپا تھیں۔

"وعلیکم السلام آ! جیتی رہو' پڑھائی ہو رہی ہے۔ امتحان بھی تو قریب آ گئے ہیں' خوب محنت کرو۔ ماں کی ساری زندگی تو بس تم دونوں بہنوں کے دم سے......"

وہ عادتاً" بڑی تفصیل سے بات کیا کرتی تھیں۔

شائستہ کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ دو چھوٹی بچیوں کے ساتھ زندگی کے جس کٹھن راستے کو انہوں نے تنہا پاپیادہ طے کیا تھا' اس کا سب سے زیادہ احساس زینت آپا ہی کو تھا جن سے صرف دیرینہ پڑوسی ہونے کا ناتا تھا۔

"تم نے تو بہت اہتمام کر لیا بھئی! اتنا زیر بار ہونے

کی کیا ضرورت تھی، آج تو پہلی ملاقات ہے، خدا کرے کہ بات بن جائے۔"

کچن میں داخل ہوتے ہی سارا اہتمام ان کی نظر میں آگیا تھا، سو نصیحت لازمی ٹھہری۔

"کچھ ایسا خاص نہیں آپا! یہ تو بس ایسے ہی۔" شائستہ کے لہجے میں انکساری سے زیادہ احساس کمتری کی جھلک تھی۔

جب سے تین چار بار آنے والے رشتوں نے میرا کو مسترد کیا تھا، یہ احساس کمتری خود بخود در آیا تھا۔ زینت آپا کو واقعی افسوس ہو رہا تھا۔ یہ چھولے، دہی بڑے، کباب، پھل اور یہ کیک اور بسکٹس۔

انہیں ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو رہا تھا کہ بوتیک سیلز کاؤنٹر پر سارا دن کھڑے رہنے کے بعد ملنے والی تنخواہ کا کتنا حصہ اس شام کی چائے پر خرچ ہوا ہوگا۔

"ذرا چیک تو کریں، کیسے بنے ہیں۔"

شائستہ اصرار کرنے لگیں تو زینت آپا ہنستے ہوئے بولیں۔

"بغیر چیک کیے بتا سکتی ہوں کہ ہر چیز زبردست ہوگی۔ پوری بلڈنگ میں شہرہ ہے تمہارے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کا۔ میں تو اس لیے منع کرتی ہوں، ابھی اتنا خرچ نہ کرتیں۔ یاد نہیں پچھلی مرتبہ آنے والے کتنی دیدہ دلیری سے ساری پلیٹیں صاف کر گئے اور پھر بڑی بے مروتی سے انکار کہلوا دیا۔" بات ختم کرتے کرتے انہیں تھوڑے سے بے تکے پن کا احساس ہوا۔

بھلا کسی تکلیف دہ بات کا تذکرہ بھی کیا ضروری ہے۔

"سب اپنی تقدیر کا کھاتے ہیں آپا! اور یہ تو تقدیر کے فیصلے ہیں۔ نہیں ہوگی میرا کی قسمت وہاں۔ ویسے یہ لوگ تو کافی اچھے لگ رہے ہیں، آپ کی دوست اچھی طرح جانتی ہیں نا۔"

وہ ایک دم ہی بڑی پُر امید سی نظر آنے لگیں۔ امید تو زینت آپا کو بھی تھی مگر لوگوں کا بھی کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔

"بس اللہ پر بھروسا رکھو اور یہ فروٹ سیٹ تم نے کب لیا، بے حد خوبصورت ہے۔" انہوں نے دانستہ بات بدلی۔

"یہ تو بہت پرانا ہے آپا! میرا کے ابو کوئٹہ سے لائے تھے، ان کی چوائس بہت اچھی ہوتی تھی ہمیشہ۔ ساری اچھی کراکری ان ہی کی لائی ہوئی ہے گھر میں۔"

خوبصورت یادوں کی سنہری چمک ان کے چہرے پر پھیلنے لگی۔

فروٹ سیٹ واقعی اچھا تھا، زینت آپا شائستہ بیگم کی ہمیشہ سے مداح تھیں۔ تعریف و توصیف میں کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیتی تھیں۔

انہیں شائستہ اس وقت بھی بہت بھاتی تھیں، جب وہ اپنی ساس اور شوہر کے ساتھ شادی شدہ زندگی کے ابتدائی سال اس چھوٹے سے فلیٹ میں گزار رہی تھیں اور اب بھی جب وہ دو بیٹیوں کے ہمراہ بیوگی کے طویل عرصے کو بتا چکی تھیں۔ زینت آپا کو گہرا دلی لگاؤ ان سے محسوس ہوا کرتا تھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔

ہاتھ کی کڑھائی والے کشن اور میٹس وہی تھے جو محض عید، بقر عید یا کسی خاص مہمان کی آمد پر نکالے جاتے تھے۔ ڈرائنگ روم سے باہر چھوٹے سے لاؤنج کا کچھ حصہ ڈائننگ ایریا کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ چار کرسیوں کے ساتھ چھوٹی سی گول ٹیبل پر جھالر والا ٹیبل کلاتھ اور اس پر پیچ ورک کے دل کش میٹس نظر آ رہے تھے۔ دیواروں پر خوبصورت وال ہینگنگز، گہرے سرخ پینٹ کیے ہوئے گملوں میں مسکراتے منی پلانٹ اور سب سے بڑھ کر گھر کے مکینوں کی صفائی پسندی... جس کا احساس آنے والوں کو گھر میں قدم رکھتے ہی ہو جاتا تھا۔

سارے گھر میں حسن و ترتیب کا جادو بولتا نظر آتا تھا۔ اجلی پوشی کی اتنی خوبصورت مثال کم از کم زینت آپا کی نظر میں دوسری نہیں تھی۔

"آج خاص طور پر بوتیک سے چھٹی کی، مسز خاور تو مان بھی نہیں رہی تھیں۔ شادیوں کا سیزن ہے نا! بڑا رش رہنے لگا ہے مگر میری مجبوری سن کر مان گئیں۔ کہنے لگیں کہ "میرا کی شادی کے سوٹ یہیں سے ڈیزائن کروانا۔"

زینت آپا کو معلوم تھا کہ انہیں میرا کی شادی کا کس قدر ارمان ہے، سو مسکرا کر سنتی رہیں پھر بڑے رسان سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، بس تم اپنا حوصلہ برقرار رکھو۔ میرا اور ماہین دونوں ہی ابھی چھوٹی ہیں، تم اتنا مت گھبراؤ۔"

ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ شائستہ نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ کہنا ہی چاہ رہی تھیں کہ میرا کے آنے کی وجہ سے خاموش ہو گئیں۔ زینت آپا کو سلام کرتے ہوئے وہ فریج میں سے پانی کی بوتل نکالنے لگی۔

زینت آپا کا دھیان اس کے روز مرّہ کے پہنے کپڑوں کی طرف تو گیا مگر اس کے چہرے پر پھیلے تناؤ کو وہ محسوس نہ کر سکیں، اس لیے بڑے اطمینان سے نصیحت کر گئیں۔

"میرا بیٹا! کوئی دوسرا سوٹ پہن لو استری کر کے، یہ تو کچھ میلا میلا سا لگ رہا ہے۔"

میرا جو وہیں ڈائننگ چیئر پر پانی کا گلاس ہاتھ میں تھامے بیٹھی تھی، جواب دیے بغیر گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پینے لگی۔

زینت آپا نے قدرے حیرت کے ساتھ شائستہ کی طرف دیکھا تو وہ بے چاری شرمندہ سی ہو گئیں۔ کہتیں بھی کیا؟ میرا کے موڈ کو ان سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا، بار بار کے مسترد کیے جانے نے اس کی خود اعتمادی کو ٹھیک ٹھاک ٹھیس پہنچائی تھی۔

یہ سب اسی کا ردّ عمل تھا۔

آج صبح سے گھر کی ساری مصروفیات سے علی الاعلان لاتعلقی کا اظہار کیے وہ اپنے کمرے تک ہی محدود تھی۔

شائستہ کو اس کے احساسات کا اندازہ بھی تھا اور اس سے بڑھ کر رنج بھی۔ پر کیا کرتیں زمانے میں کچھ دستور ہی ایسا چل پڑا ہے کہ درجنوں لڑکیاں مسترد کیے بغیر لوگوں کو چین ہی نہیں آتا۔

زینت آپا نے اپنی بات دہرائی تو وہ گلاس میز پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہیں آنٹی! ایسے کچھ برے بھی نہیں ہیں۔" وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مگر اس بار اس لاپروا لہجے سے جھلکتی تپش زینت آپا تک بھی پہنچ گئی مگر وہ کم از کم ان لوگوں میں نہیں تھیں، جنہیں دوسروں کی کمزوری کا سرا پکڑ کر بات لمبی کرنے کا شوق ہو۔ سو اٹھتے ہوئے بولیں۔

"کوئی بات نہیں۔ بچی ہے، محسوس کر گئی ہے۔ تم بھی اب نہا دھو لو، میں بھی کپڑے وغیرہ تبدیل کر لوں، وہ لوگ بس گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں پہنچ ہی جائیں گے۔"

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے معروف ناول

★ دل پھولوں کی بستی ـــ نگہت عبداللہ ـــ 400/-
★ جو چلے تو جہاں سے گزر گئے ـــ ناہا ملک ـــ 150/-
★ وہ خبطی سی دیوانی سی ـــ آسیہ سلیم قریشی ـــ 400/-
★ طائر لاہوتی ـــ رفعت سراج ـــ 550/-
★ ایمان امید اور محبت ـــ عمیرہ احمد ـــ 180/-
اور
★ خواتین کا گھریلو انسائیکلوپیڈیا ـــ 600/-

خوبصورت سرورق، آفسٹ پیپر، خوبصورت چھپائی، دیدہ زیب مضبوط جلد

شائع ہو گئے ہیں

مسئول ایجنٹ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی

لاہور میں:
• لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور • سلطان نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ لاہور
• عظیم اینڈ سنز، اردو بازار، لاہور • اسلامیہ کتب خانہ، اردو بازار، لاہور

راولپنڈی میں
اشرف بک ایجنسی، کمیٹی چوک، راولپنڈی

حیدر آباد میں
مہران نیوز ایجنسی، حیدر آباد

وہ اسی طرح دوسروں کا دل بڑھاتی تھیں، شائستہ مشکور سی ہوتی، ان کے ساتھ دروازے تک آئیں۔ چند فٹ کے فاصلے پر سامنے والا فلیٹ زینت آپا کا تھا۔

نیچے سے سمیع آرہا تھا، زینت آپا کا اکلوتا بیٹا..... اسے کچھ عرصہ پہلے ہی کسی فرم میں جاب ملی تھی۔

وہ اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا تو زینت آپا بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گئیں۔

اپنے خوش شکل اور خوش مزاج بیٹے کو دیکھ کر انہیں یوں ہی ایک خیال بار بار ستانے لگتا تھا۔

"کاش کہ وہ میرا کو اپنی بہو بنا سکتیں۔" مگر یہ بس خیال ہی تھا جس کے اظہار کی بھی اجازت نہیں تھی۔ سمیع کے ابا اس کی بات اپنی بہن کی نک چڑھی بیٹی سے کئی سال پہلے طے کر چکے تھے۔

سمیع کے ابا ایسے ہی تھے جیسے عام طور پر ان کی نسل کے سب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ اصول پسند اور...... اپنی کہی گئی کسی بات سے روگردانی کی اجازت انہوں نے کبھی کسی کو نہیں دی تھی اور بیوی کو تو بالکل بھی نہیں۔

انہیں تو کچھ کہنے، منوانے کی عادت ہی نہیں پڑ سکی تھی، بس بے چاری آج کل کی لڑکیوں کو حیرت سے دیکھا کرتی تھیں جو چار دن میں ہی.....

میرا کے لیے آنے والے رشتے کی خبر یہاں بھی سب کو تھی، معمولی سے نقوش والے قدرے فربہ لڑکے کی تصویر، زینت آپا کے توسط سے ہی شائستہ کے گھر پہنچی تھی۔ سمیع کی نگاہ سے بھی وہ تصویر گزری تھی۔ اس وقت ماں کے منہ سے وہاں ہونے والے اہتمام کا تذکرہ سن کر تھوڑی سی بیزاری کے ساتھ بولا۔

"آپ بھی معلوم نہیں کہاں شائستہ آنٹی کو پھنسوا رہی ہیں، وہ لڑکا تو ذرا بھی میرا کے جوڑ کا نہیں لگتا۔"

بات تھی بھی سچ۔ زینت آپا نے بھی تھوڑی سی ہاں میں ہاں ملا دی اور ساتھ میں تھوڑی سی میرا کی شکل صورت کی تعریف بھی کر ڈالی۔

یہ معلوم نہیں تھا کہ ابا جو بظاہر سامنے اخبار پھیلائے بیٹھے ہیں۔ ادھر ہی کان لگائے ہوئے ہیں، وہیں سے کڑک دار آواز میں بولے۔

"تم ماں بیٹے کو کیا تکلیف ہے آخر، لڑکیوں کی شادی میں یہ نخرے نہیں چلتے جو مل جائے وہی غنیمت سمجھنا پڑتا ہے۔"

سمیع کو ان کے کھردرے لہجے پر کبھی کبھی غصہ سا آنے لگتا تھا مگر ہمیشہ کچھ کہنے سے گریز کر جاتا۔ اس وقت بھی اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ زینت آپا کو البتہ دیر تک سننا پڑا۔

ان کے لگے بندھے خیالات حالانکہ اب ازبر ہو چکے تھے اور ان خیالات پر کاربند رہنے کا عملی ثبوت وہ اپنی چاروں بیٹیوں کی اناپ شناپ شادیوں کی شکل میں دے بھی چکے تھے۔

مگر یہ آموختہ دہراتے رہنا، اب ان کے معمولات کا حصہ بن چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

آنے والے مہمان بڑے کروفر والے تھے۔

لڑکے کی والدہ، دو بہنیں، ایک بھابھی اور چار بچے۔

زینت آپا کی سہیلی جن کی معرفت یہ لوگ آئے تھے، وہ بھی ساتھ تھیں۔ چھوٹا سا ڈرائنگ روم ایک دم ہی تنگ پڑتا محسوس ہونے لگا۔

شروع کے پندرہ بیس منٹ تو سیڑھیاں چڑھنے اور گرمی کی شکایت کرنے میں ہی گزر گئے۔ شائستہ بے چاری شرمندہ سی سنتی رہیں۔

تیسری منزل کے فلیٹ میں رہنا تو یقیناً" ان ہی کا قصور تھا، پر شام کے اس آخری پہر میں جو ہوا کچھ کچھ بند سی ہوتی محسوس ہو رہی تھی، اس کے ازالے کے لیے ان کے ڈرائنگ روم میں اے سی بھی نہیں تھا۔

اس خاندان کے مرد کافی سالوں سے سعودیہ میں ملازمتیں کر رہے تھے اور ان کی محنت شاقہ کے سارے ہی ثبوت موجود تھے۔

خواتین کے چمکتے ہوئے چہرے، جسموں پر سجے بے حد قیمتی زیورات اور انتہائی بدتمیز بچے.....

"ہر سال جب بھی عمرے پر جاتی ہوں، بیٹے ڈھیروں سونا، چوڑیاں، کڑے ساتھ کر دیتے ہیں۔ میں بھی سوچتی ہوں اتنا بڑا خاندان ہے۔ بہوئیں، بیٹیاں، جتنا بھی ہو کم ہے۔"

والدہ محترمہ نے نہ جانے کس بات میں سے بات نکال کر سنایا۔

شائستہ نے مسکرا کر "ماشاءاللہ" بھی کہا مگر ان کی پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔ ابھی ان کے پاس فخر جتانے کے لیے بہت کچھ تھا۔

"ہمارے بھی دو اپارٹمنٹ ہیں گلشن میں، چار چار کمروں والے۔ دو بیٹے اب واپس پاکستان آرہے ہیں، وہ اپنی فیملی کے ساتھ وہاں شفٹ ہو جائیں گے پھر آگے کی پلاننگ سناتے سناتے کچھ خیال آیا تو بڑی بے نیازی سے بولیں۔

"یہ آپ کا ایریا کچھ عجیب سا نہیں ہے، نہ فلیٹوں کے آگے باؤنڈری وال، نہ کار پارکنگ گاڑی سے اترو تو بس دکانوں کے بیچ میں سے سیڑھیوں پر چڑھ جاؤ۔"

شائستہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔ صورت حال واقعی ایسی ہی تھی، شہر کے پوش علاقوں میں بنے لگژری اپارٹمنٹس سے اس پرانی بلڈنگ کا کوئی جوڑ نہیں تھا جس کا بیرونی حصہ ٹریفک کے اگلتے دھوئیں اور مکینوں کے قلیل وسائل کے سبب سیاہ پڑ چکا تھا۔ انہیں زیادہ فکر میرا کی طرف سے تھی، گھر چھوٹا تھا اور آنے والے اظہار خیال بلند آواز میں کرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔

ماہین جو مہمانوں کے خیال سے ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔ اب بچوں کو کنٹرول کرنے میں مصروف تھی مگر کوئی کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

"بیٹی! تو آپ کی یہ بھی بہت پیاری ہے، بڑی والی کو بھی بلوائیے نا۔"

یہ غالباً" پہلی بات تھی جس نے شائستہ کے دل کو سہارا دیا۔ اشارہ کرتی نگاہ سے انہوں نے ماہین کو دیکھا مگر اس کے چہرے پر پھیلا تذبذب میرا کے موڈ کی عکاسی کر رہا تھا۔ ماں کی نگاہوں میں اصرار دیکھ کر وہ ایک اور کوشش کے لیے پھر بہن کی طرف چلی گئی۔

زینت آپا نے حالات کو تھوڑا سا موافق جان کر وہی ساری باتیں دہرانا شروع کر دیں جو ان کی محبت کا تقاضا تھیں۔

شائستہ بیگم کا سلیقہ، شرافت، ان کی محنت اور ہمت جس کی بدولت انہوں نے زندگی کی گاڑی کو کھینچا تھا مگر لوگوں کے پاس اب شاید وقت ہی نہیں رہا ہے کہ وہ ذرا رک کر ان اعلا انسانی اوصاف کی تعریف میں دو الفاظ ہی کہہ سکیں یا پھر شاید ان کے پاس قدر و منزلت کا پیمانہ ہی دوسرا ہے۔

"ویسے کچھ عجیب سا نہیں لگتا، یوں کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر کپڑے فروخت کرنا۔ آپ کوئی دوسری جاب بھی تو کر سکتی تھیں نا آنٹی! اچھی، باعزت سی۔" یہ رائے ان خاتون کی بہو نے ٹھیک اس وقت دی جب میرا بڑے بیزار سے موڈ میں کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ماہین آخر کار اسے لانے میں کامیاب ہو گئی تھی، شائستہ اس سے نگاہیں چرا گئیں۔

"کبھی کبھی دل کو سنبھالنا کتنا ناممکن سا لگنے لگتا ہے۔" انہوں نے بڑی بے بسی کے ساتھ سوچا۔

اچھی بات یہ ہو گئی کہ کچھ دیر کے لیے سب کی توجہ میرا کی طرف ہو گئی۔

وہ تھی بھی اتنی ہی پیاری، گھر کے پہنے ہوئے عام سے کپڑوں میں بھی وہ ان سب میں نمایاں لگ رہی تھی۔

وہ لوگ آئے بھی دراصل میرا کی خوبصورتی کا سن کر ہی تھے۔

"کون سے کالج سے گریجویشن کیا ہے؟ کیا کیا مشاغل ہیں؟" وغیرہ وغیرہ۔

میرا بہرحال بڑی رسانیت سے ان کے ہر سوال کا جواب دے رہی تھی پھر بھی اس کی کم سخنی انہیں کھل گئی۔

"لگتا ہے آپ کو زیادہ گھلنے ملنے کی عادت نہیں ہے۔" ان میں سے ایک، جو سب سے زیادہ بول رہی تھی، کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”دراصل میں یہ بچیاں کہیں آتی جاتی تو ہیں نہیں، بس کالج اور گھر تک ہی رہی ہیں۔ خاندان کے جو دو چار گھر ہیں وہ بھی لاہور میں ہیں۔“

زینت آپا جو ان لوگوں کی طرف سے اب تک کھٹک چکی تھیں، فوراً ہی مدد کو آئیں۔

”ویسے جن لڑکیوں کی مدرز جاب کر رہی ہوتی ہیں وہ تو بہت بولڈ ہوتی ہیں۔“ جس کی بات رد ہوئی تھی، کچھ کھسیا کر بولی۔

ماہین چائے اور لوازمات لے آئی تھی۔ اتنا اہتمام دیکھ کر خود بخود ہی اپنی اہمیت کا احساس دوچند ہونے لگا۔ بچے جو اس چھوٹے سے گھر میں اودھم مچاتے پھر رہے تھے، فوراً ہی ٹیبل کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔

نہیں، نہیں۔ کہتے ہوئے بھی پلیٹیں لبالب بھری گئیں اور گنجائش سے زیادہ ہونے کی بنا پر آدھی آدھی بچا بھی دی گئیں۔

”یہ لیجئے نا آپ!“ شائستہ کو گو اب ان لوگوں سے کوئی اچھی امید باقی نہیں رہی تھی، پھر بھی آداب مہمان داری نباہ رہی تھیں۔

”اچھا جی! معذرت چاہتے ہیں، آپ کا اتنا وقت خراب کیا۔“

اس رکھائی بھرے لہجے میں کہے جانے والے جملے میں ہی ان کا جواب پوشیدہ تھا۔

بنا کسی پُرتپاک مظاہرے کے رخصت ہونے والوں نے زینت آپا کی سہیلی کی سیڑھیوں پر ہی ٹھیک ٹھاک خبر لے ڈالی۔

”کچھ سوچ سمجھ کر تو لانا تھا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ چلو باپ سر پر نہیں مگر کچھ تو چھوڑا ہوگا، یہاں اس گھر میں تو رشتے داروں کو لایا بھی نہیں جا سکتا۔“

وہ بے چاری ہکا بکا سی ان کی شکل دیکھے جا رہی تھیں، جنہوں نے بڑی معصومیت سے محض ”اچھی لڑکی“ اور ”شریف لوگوں“ کی ہی فرمائش کی تھی۔

ادھ کھائے کیک کے ٹکڑوں اور چھولے دہی بڑے اور کبابوں کے ٹکڑوں کو سمیٹتے ہوئے شائستہ بڑی دکھی سی ہو رہی تھیں۔

”معلوم نہیں رزق کی بے حرمتی کرتے ہوئے لوگوں کو اللہ کیوں نہیں یاد رہتا۔“

ماہین بھی خاموشی سے ان کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ گھر میں صرف برتنوں کے کھنکھنے کی آواز گونج رہی تھی یا ماہین آتے جاتے ان سے کوئی بات پوچھ لیتی۔ ورنہ ایک تھکی تھکی سی خاموشی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔

سارے دن کی بے نتیجہ مصروفیت کا انجام بہت اداس کیے دے رہا تھا۔ زیادہ احساس اپنی معمولی مالی حیثیت کا تھا۔

”کیا جس کے ہاتھ میں چار پیسے ہوں، اسے دوسروں کی بے عزتی کرنے کا یوں ہی سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔“

اپنے آپ میں الجھی وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئیں تو داخل ہوتے ہی چونک گئیں۔ میرا ابھی تک سائیڈ والے صوفے پر اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی جس پر وہ اسے چھوڑ کر گئی تھیں۔ فرش پر رکھے فلور کشن پر نگاہیں جمائے، چہرے پر تناؤ کے آثار لیے وہ بڑی گہری سوچ میں تھی۔

لمحے بھر کے لیے شائستہ کے دل سے باقی ساری باتیں نکل گئیں۔ پیسوں کا ضیاع، رگ رگ میں سماتی تھکن، کم مائیگی۔

سامنے صرف میرا کا پریشان وجود تھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھیں اور اس کے خوبصورت چہرے کے گرد جھولتی بالوں کی لٹوں کو پیار سے سمیٹتے ہوئے بولیں۔

”کیا بات ہے بیٹا! اس طرح خاموش کیوں بیٹھی ہو۔“ میرا کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی اور اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سی سرخی اور بڑی گہری اجنبیت تھی۔ بیزاری سے ان کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تو شائستہ کو رنج کے ایک اور احساس نے آگھیرا۔

”اتنا محسوس نہیں کرتے بیٹا! ہر شخص اپنی ذہنیت کے مطابق ہی بات کر سکتا ہے۔ اگر اس طرح دل پر لگا کر......“

”بس رہنے دیں آپ اپنا سبق، بہت پڑھ لیا ہے ہم نے۔“ ایک دم ان کی بات کاٹ کر وہ قدرے تیز آواز میں بولتی کھڑی ہو گئی۔ ”لوگوں کا کیا قصور، وہ تو جو دیکھیں گے وہی کہیں گے۔ ایک سیلز وومن کی بیٹی کو گارڈ آف آنر تو پیش کرنے سے رہے۔ آپ کی نوکری، یہ بوسیدہ فلیٹ، ہمیں سر اٹھا کر چلنے کے قابل چھوڑا ہے آپ نے۔“

شائستہ متحیر سی اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ مزاج میں تندی اور تھوڑی سی بغاوت تو اس کے اندر شروع سے ہی تھی مگر اتنا غصہ، اتنے شکوے اس نے کب جمع کر لیے تھے، پتا ہی نہیں چل سکا تھا۔

”یہ تنگ سا زینہ چڑھ کر آنے والے آپ کی ہنرمندی کی نمائش دیکھنے نہیں آتے۔ انہیں کوئی غرض نہیں کہ آپ ساری دوپہر انڈے، میدہ پھینٹنے میں ہلکان ہوئی ہیں۔ ان کے گھروں میں آرائش اور ذائقوں کے معیار ہماری سوچ سے بھی بلند ہیں۔ آپ تو نہ جانے کس دنیا میں رہ رہی ہیں۔“

”بس کرو میرا!“ ماہین اس سے محض سال بھر ہی چھوٹی تھی اور اس کی آواز سن کر کمرے میں آچکی تھی۔ ”بدتمیزی مت کرو، ختم کرو بات کو پلیز۔“

میرا کو فی الحال بہن کی درخواست بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اس کی برداشت کی حد بھی بس یہیں تک ہی تھی۔ اندر ہی اندر جو لاوا کئی دن سے پک رہا تھا، اس کو نکاسی کا راستہ ملا تو اس نے وہ کچھ بھی کہہ ڈالا جو اسے کبھی نہیں کہنا چاہیے تھا۔

ماں کے پل پل کا خراج ادا کر کے جیسے جانے والی زندگی کو منٹوں میں دو کوڑی کا کر کے وہ یہ اعلان کرتے ہوئے اپنے اور ماہین کے مشترکہ کمرے کی طرف چلی گئی کہ ”کسی کو اس کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اپنی زندگی کا ہر فیصلہ خود اور صرف خود کرے گی۔“

شائستہ بیگم کے اگلے بہت سے دن اس کے کہے گئے جملوں کی گونج میں اس ساری مسافت کا حساب کتاب کرنے میں ہی نکل گئے۔ جس کا شاید کچھ بھی حاصل نہیں تھا۔ گھر کے ماحول میں اداسی کا رنگ گھلتا رہا۔

میرا ہنوز اکھڑی اکھڑی سی تھی۔

ماہین سے تو پھر بھی بات کر لیتی تھی مگر شائستہ اسے مخاطب کر بھی بیٹھتیں تو اتنی سرد مہری سے جواب دیتی کہ بس۔

معمولات بھی اس کے کچھ عجیب سے ہو رہے تھے۔ شائستہ دن میں چند بار بوتیک سے فون کر کے گھر کا احوال معلوم کر لیا کرتی تھیں۔ آج کل عام طور پر صرف ماہین ہی ملا کرتی تھی، میرا کی چند سہیلیاں ایک اسٹاپ کے فاصلے پر ہی رہتی تھیں، اس کا زیادہ وقت وہیں گزر رہا تھا۔

شائستہ کو یہ سب اچھا تو بالکل نہیں لگ رہا تھا مگر اس کا دل بہلنے کے خیال سے خاموش تھیں۔ یہ گمان بھی نہ تھا کہ اس روز اپنی زندگی سنوارنے کا جو اعلان وہ کر چکی ہے، اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ چونکیں وہ اس دن جب وہ علی الصبح ان کے ساتھ ساتھ ہی اٹھ گئی۔

جب سے اس کا گریجویشن مکمل ہوا تھا، وہ سویرے اٹھنے کی عادت بھولے ہوئے تھی۔

اس خلاف معمول پر جب تک انہیں واش روم سے پانی گرنے کی آواز آتی رہی، وہ کچھ الجھن سی محسوس کرتی رہیں۔

میرا نہا کر نکلی تو سیدھی کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر آئی تو بالکل تیار تھی۔

ہلکے آسمانی کاٹن کے خوبصورت سوٹ میں لائٹ سی لپ اسٹک کے ساتھ وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ ان کے دل نے بے ساختہ ہی ”ماشاءاللہ“ کہا۔

”میں نے جاب کر لی ہے امی! روزی کے ابو کے دوست ہیں، ان کی فرم میں۔“

کئی دن بعد اس نے انہیں خود سے مخاطب کیا۔ شائستہ جو اس کے لیے چائے کا کپ بنا کر اس میں چمچہ چلا رہی تھیں' اس اطلاع پر بری طرح گڑبڑا گئیں۔

"کون سی فرم ہے' کس چیز کی فرم ہے' مجھے بتائے بغیر کیسے فیصلہ کر لیا تم نے' اتنی بڑی ہو گئی ہو۔"

"بتا تو دیا ہے۔" اس نے چائے کا کپ ان کے ہاتھ سے لے کر ایک گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا اور بیگ میں سے ایک کارڈ نکال کر انہیں تھماتے ہوئے بولی۔

"یہ رہا کارڈ' ایڈریس' فون نمبر سب کچھ لکھا ہوا ہے' آپ کی تسلی کے لیے۔"

اسے دیر ہو رہی تھی' اتنی بات کا وقت بھی شاید مشکل سے نکالا تھا۔ چائے کا کپ ویسے کا ویسا چھوڑ کر وہ تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف مڑ گئی۔

شائستہ اس کے پیچھے پیچھے آئیں بھی مگر وہ سیڑھیاں اتر چکی تھی۔

ہاتھ میں پکڑے کارڈ پر نگاہ ڈالی' کسی ایڈورٹائزنگ فرم کا کارڈ تھا' اس فیلڈ کے بارے میں ان کی معلومات صفر تھیں' سوچ کچھ آئیڈیا نہیں ہوا کہ اچھی ہے یا بری۔

سڑک کی طرف کھلنے والی چھوٹی سی بالکونی کی طرف آئیں تو میرا سڑک کراس کر کے دوسری طرف جاتی نظر آئی۔ روٹ کی بس اسی طرف سے ملا کرتی تھی۔

اگلے چند منٹ جب تک وہ بس میں بیٹھ کر چلی نہیں گئی' وہ جھلملاتی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ جتنی آیات یاد تھیں' سب ہی پڑھ کر میرا پر دم کر ڈالیں۔ معلوم نہیں اس کی نگاہ بھی سڑک کے اس پار اس ملگجی سی عمارت کی تیسری منزل پر کھڑی اس تنہا اور بے بس ماں پر پڑی تھی یا نہیں۔

☆ ☆ ☆

سمیع کے ابا کا موڈ کل رات سے خراب تھا اور اس خرابی کا اثر ہمیشہ ہی براہ راست دو ہی ہستیوں پر پڑتا تھا۔

سمیع اور زینت آپا!

بات کا سرا کہیں سے بھی شروع ہوا ہو تان ہمیشہ یہیں آکر ٹوٹا کرتی تھی۔ اس بار بھی یہی ہوا۔

کل رات قریبی عزیزوں میں ولیمہ کی دعوت تھی' ابا ایسی تقریبات میں بڑے شوق سے جایا کرتے تھے۔ انہیں پرانی یادیں تازہ کرنے اور نئے اعتراضات کھڑے کرنے کا سنہری موقع مل جاتا تھا۔

سمیع ایسے ہنگاموں سے گھبرانے کے باوجود بھی دامن نہ بچا پاتا۔ کافی سال پہلے جو پرانی سی سوزوکی ایف ایکس ابا نے خریدی تھی' اسے چلانے کی ذمہ داری سو فیصد اسی کی تھی۔

ان کے خاندان کی شادیوں میں تاحال مکس گیدرنگ کا طریقہ رواج نہ پا سکا تھا پھر بھی لوگوں کا ادھر سے ادھر آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ سمیع اپنے چند ہم عمر لڑکوں کے ساتھ ہی بیٹھا رہا۔ روایتی سے ہنگاموں کے ساتھ شادی کا فنکشن اختتام پذیر ہونے لگا تو وہ لوگ بھی چلنے کے لیے گاڑی میں آبیٹھے۔ ابا کی ناراضی کی اطلاع پہلے پہل وہیں ملی۔

"اس قدر بدلحاظ اور اوچھی لڑکی پالی ہے شہناز نے' مجھے تو اس کا اندازہ ہی نہیں تھا۔" شہناز ان کی وہی بہن تھیں جن کی دختر نیک اختر کو شرف پسندیدگی بخشا جا چکا تھا۔

آگے بھی اعتراضات ہی اعتراضات تھے۔ اس کا کچھ زیادہ ہی جدید طرز کا لباس' مستقل باہر کی طرف کھڑے رہ کر اونچے اونچے قہقہے اور سب سے بڑھ کر ابا کو سلام نہ کرنا۔

خود کو سلام کروانے کے معاملے میں وہ بڑے حساس تھے۔ پسندیدہ اور ناپسندیدہ لوگوں کی لسٹ میں کمی بیشی عموماً اس ایک خطا کی بنا پر ہوتی رہتی تھی۔

"غضب خدا کا' ماموں نہ سہی' چلو ہونے والا سسر سمجھ کر ہی سلام کر لیتی مگر نہیں جناب۔۔۔ صاف نظر انداز کر گئی۔ برہان بھائی نے تو فوراً" ہی جتایا کہ یہی ہے نا شہناز کی بیٹی جس سے سمیع کی بات طے کر رکھی ہے' مت پوچھو کتنا شرمندہ ہوا ہوں۔"

کسی کو بھی نہیں پڑی تھی کہ "پوچھ" کر اپنی شامت بلواتا مگر وہ اگلی صبح پھر سے یہی قصہ چھیڑے

بیٹھے تھے۔ اس بار زینت آپا کی کوتاہیاں بھی شامل تھیں۔

"ساری کمزوری تمہاری ہے۔ تمہیں اپنی عزت ہی نہیں کروانی آتی کبھی' اسی لیے لوگوں نے بھی پروا کرنی چھوڑ دی ہے ورنہ مجال ہے....." کوئی دروازے پر بیل دے رہا تھا۔

چھٹی کا دن تھا' سمیع گھر پر ہی تھا۔

دروازے کی طرف جاتے ہوئے وہ بیزاری بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ "آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے پھوپھی کو فون کر کے کیوں نہیں کہہ دیتے۔"

بیٹے کا مشورہ انہیں بڑا صائب لگا مگر فی الوقت توجہ گھر کے داخلی دروازے کی طرف مبذول ہو گئی تھی' اندر آنے والی ماہین تھی۔

انہیں سلام کرتے ہوئے وہ سیدھی زینت آپا کی طرف چلی گئی۔

ابا کو یہ گھرانہ بہت پسند تھا۔ پرانا پڑوس تھا اور ان لوگوں کا ہر دور وہ دیکھ چکے تھے۔ شائستہ کے صبر' ایثار اور شرافت کی انہیں بڑی قدر بھی تھی مگر اپنے مثبت خیالات کا اظہار وہ کم کم ہی کیا کرتے تھے۔

میرا کو دو چار بار شام ڈھلے انہوں نے آتے دیکھا تو چونکے ضرور مگر زینت آپا یا سمیع سے براہ راست پوچھنا کسر شان تھا۔

ماہین جو مختصر سی بات زینت آپا سے کرنے آئی تھی' کر کے واپس جانے لگی تو ان سے رہا نہ گیا۔

"آج کل میرا نظر نہیں آتی' کہیں گئی ہوئی ہے کیا۔"

ماہین تھوڑا سا ٹھٹکی اور پھر دھیرے سے بولی۔

"میرا نے جاب کر لی ہے خالو! ایڈورٹائزنگ فرم میں۔"

"اچھا!" ابا کچھ چپ سے ہو گئے' مزید تبصرے سے گریز ہی کیا۔

وہ دو ایک لمحے منتظر نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔

سمیع نے ایک ہلکا سا سایہ اس کے چہرے پر اترتے دیکھا۔ ابا کی خاموشی کو وہ یقیناً" ان کی ناگواری کا اظہار سمجھ رہی تھی۔

سمیع کو ابا کا رویہ اکثر جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتا تھا۔ کیا تھا جو دو لفظ محض ماہین کا دل بڑھانے کے لیے ہی کہہ دیتے" آخر صبح سے بھی تو مستقل بولے ہی جا رہے تھے مگر وہ یونہی انجان سے بن کر سامنے رکھا اخبار کھول کر بیٹھ گئے۔

"بہت اچھی اور شہر کی لیڈنگ ایڈورٹائزنگ فرموں سے ایک ہے۔ میرا ایک دوست بھی وہیں جاب کرتا ہے' بہت اچھی تنخواہ دے رہے ہوں گے وہ اسے۔" ایک پھیکی سی مسکراہٹ ماہین کے لبوں پر آئی۔

"ہمیں اس کی تنخواہ کی ضرورت تو نہیں سمیع بھائی! لیکن بس میرا کی مرضی۔"

"اچھی سوچ ہے میرا کی' خود انحصاری بہترین چیز ہے۔ انسان کو پُراعتماد بناتی ہے' جینے کا ڈھنگ....."

سمیع کو ماہین اور شائستہ آنٹی کی رنجیدگی کی خبر اپنی والدہ کی زبانی مل چکی تھی' اسی احساس کو زائل کرنے کے لیے وہ کچھ اچھی اچھی باتیں زائد ہی کر گیا۔ ابا کا بھی خیال نہیں رہا جو اخبار کی اوٹ میں چھپے بیٹھے سب سن رہے تھے۔

ماہین پر اس کی باتوں کا برا خوشگوار اثر ہوا۔ کئی دن سے گھر کے گھٹے گھٹے ماحول کا اثر چھٹنے لگا' تو ہنستے ہنستے بولی۔

"آپ وکالت اچھی کر لیتے ہیں سمیع بھائی! اس طرف کیوں نہیں توجہ دیتے۔" سمیع بھی مسکرا دیا۔

ماہین چلی گئی تو ابا نے اخبار تہ کر کے ایک طرف رکھا اور کچھ الجھے الجھے انداز میں زینت بیگم کی طرف دیکھ کر بولے۔

"میرا کے لیے اس دن جو کسی رشتے کا ذکر ہو رہا تھا' اس کا کیا بنا۔ کیا شائستہ نے انکار کر دیا وہاں۔"

زینت بیگم بری طرح چونکیں' سمیع کی شرٹ میں بٹن لگاتے ہوئے سوئی بھی انگلی میں چبھ گئی' بات تھی بھی ایسی۔

ابا بھی اپنے گھریلو معاملات میں بھی ان سے اس

طرح نارمل ٹون میں گفتگو نہیں فرماتے تھے' ان کی ساری باتیں یا تو "تنبیہہ" کے انداز میں ہوتیں یا "شکایت" کے۔

زینت بیگم کو سٹپٹایا سا دیکھ کر انہوں نے اپنی بات دہرائی تو وہ جلدی جلدی ساری بات سنا گئیں۔ پوری بات بڑے تحمل سے سن کر وہ ذرا حیرت سے بولے۔

"کمال ہے' اتنی اچھی لڑکی اور ایسی ناقدری کی باتیں' سمجھ میں نہیں آتا لوگوں کو ہو کیا گیا ہے۔ چار پیسے ہاتھ میں آ جائیں تو کیا اخلاقی اقدار کا پاس بھی ختم ہو جاتا ہے۔"

"جی ہاں' جیسے جاوید کے شارجہ جانے کے بعد پھوپھی کے گھر والوں نے آپ کی عزت کرنی چھوڑ دی۔"

سمیع نے بڑی سادگی کے ساتھ انہیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا تو انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔ پر اس کے چہرے پر طنز کے کوئی آثار نہ دیکھ کر ذرا مطمئن ہو کر بولے۔

"کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہو ورنہ یہی شہناز تھی جس نے تمہارا رشتہ لینے کے لیے میری کیسی کیسی منتیں کی تھیں اور یہی صاحبزادی نصرت ماموں' نصرت ماموں کرتی آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں۔"

اس بار سمیع کی باری تھی' حیرت سے منہ کھولے وہ انہیں تکتا رہ گیا۔

زندگی میں پہلی بار ابا اس آسانی سے اس کے ساتھ متفق ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی میں بیڈ پر پھیلی میرا کی تازہ شاپنگ پوری طرح چمک رہی تھی۔

سلے' ان سلے کپڑے' امپورٹڈ کاسمیٹکس' چند نئے شوز اور وغیرہ وغیرہ۔ ایک لمبی بحث کے بعد چند لمحوں کی خاموشی کا وقفہ در آیا تھا۔

"یہ سب کچھ اب میرے پروفیشن کا حصہ ہے ماہین! اور اس میں آخر غلط کیا ہے۔"

"تمہاری جو مرضی آئے وہ کرو اور کر بھی رہی ہو۔" ماہین نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ "صرف اتنی گزارش ہے کہ امی کو اور ٹینشن مت دو' کم از کم گھر ہی ذرا جلدی آ جایا کرو' امی کا کتنی بار فون آ چکا ہے۔"

میرا سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا وارڈ روب کھول کر کپڑوں کے پیکٹ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "امی کو اگر فکر ہوتی نا تو وہ خود کبھی بھی اتنی اتنی دیر تک اپنے بوتیک پر نہ رہا کرتیں مگر انہیں ہمیشہ ہم دونوں سے زیادہ اپنی جاب کی فکر رہی ہے۔"

"میرا!" ماہین کو اس کی بات بے حد بری لگی۔ "امی نے اسی جاب سے ہم دونوں کو پالا ہے میرا! اور وہ کبھی بھی غیر ضروری ایک منٹ بھی باہر رہنا پسند نہیں کرتیں۔ مسز خاور نے انہیں آج کل زیادہ بزی کیا ہوا ہے کیونکہ ان کے بوتیک کی دوسری برانچ کھل رہی ہے۔ تم ان کے متعلق کتنے غلط انداز سے سوچتی ہو۔"

جو کچھ وہ کہہ رہی تھی' میرا کے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ امی کا ایثار' ان کی محنت' قربانیاں وغیرہ وغیرہ۔ یہ ماہین کو ہی شوق تھا کہ وہ ان سب باتوں کو دہرا دہرا کر تازہ رکھنے کا اہتمام کرتی تھی' سو بڑی بے نیازی سے بولی۔

"تم لاؤنج میں چلی جاؤ' میں لائٹ بند کر کے سوؤں گی۔ کئی روز سے بہت کم نیند لے رہی ہوں' کمپلیکشن بھی خراب ہو رہا ہے اور آنکھوں کے گرد حلقے بھی پڑنے لگے ہیں۔"

ماہین نے ایک نظر اس کے خوبصورت اور فریش چہرے پر ڈالی۔

اس کی بیان کردہ دونوں شکایتوں کی علامت تک بھی نظر نہیں آ رہی تھی مگر اس کی تصحیح کرنے کے بجائے وہ خاموشی سے لائٹ آف کر کے لاؤنج میں آ بیٹھی۔

امی کے آنے میں ابھی بھی تقریباً" گھنٹہ' پون گھنٹہ باقی تھا اور ماہین کے پاس آج کل میرا کے رویے کے بارے میں سوچتے رہنے کے علاوہ دوسری کوئی مصروفیت نہیں تھی۔

اپنے اردگرد سے تھوڑی سی لاپروا اور سخت دل تو وہ شروع سے ہی تھی مگر اب جو یہ اجنبیت کی موٹی سی دیوار وہ اپنے چاروں طرف اٹھا رہی تھی' وہ بڑی ہی پریشان کن تھی اور اس سے بھی زیادہ پریشان کن بات تھی' اس کا ہر وقت روپوں سے بھرا بیگ..... وہ بڑے دھڑلے سے پیسہ خرچ کر رہی تھی۔ گھر میں ایک روپیہ بھی خرچ کیے بغیر وہ صرف اپنی خواہشوں کے بارے میں حساس ہو رہی تھی۔

ابھی پچھلے ہفتے اس کے بیگ میں ذاتی موبائل کا اضافہ ہوا تھا اور بلندیٔ خیال کی آگے بھی کوئی حد نہیں تھی۔

"شاندار سی گاڑی اور سی سائیڈ پر اپارٹمنٹ..... دیکھنا بہت جلد دونوں چیزیں میرے پاس ہوں گی۔"

ماہین کے ساتھ جو بھی مختصر سا وقت گزرتا تھا' اس میں یہ بات وہ ضرور دہراتی اور اس گوئی میں "ہمارے" کا لفظ کبھی بھی شامل نہیں ہوتا۔

ماہین خوفزدہ سی اس کی شکل تکے جاتی۔

"آخر اس کے ہاتھ ایسا کون سا شارٹ کٹ لگ گیا ہے' جس کے آسرے پر وہ اتنے بڑے بڑے دعوے کرنے لگی ہے۔"

اس وقت بھی دماغ اسی ادھیڑبن میں مصروف تھا۔ امی کو میرا کے ارادوں سے باخبر کرنے سے وہ اب تک پرہیز ہی کر رہی تھی۔ وہ پہلے ہی اس کے انداز اور خودسری سے عاجز نظر آ رہی تھیں۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

"امی شاید کچھ جلدی فارغ ہو گئی ہیں۔" یہی سوچ کر وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی' پر وہاں زینت آپا تھیں' جو امی کا پتا کرنے آئی تھیں۔

"شائستہ آئی نہیں ابھی تک' فون تو آگیا تھا نا اس کا یا نہیں۔"

ماہین نے انہیں اطمینان بھی دلایا مگر وہ کچھ دیر بیٹھنے کے خیال سے ہی آئی تھیں۔

"تم اکیلی ہو' دل گھبرا رہا ہو گا' میں رک جاتی ہوں شائستہ کے آنے تک۔"

ماہین انہیں شکر گزار نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ دل اس کا واقعی گھبرا رہا تھا' تنہائی کے خیال سے نہیں' میرا کی باتوں سے۔ زینت آپا کے پاس ہمہ وقت بہت سے موضوع تیار ملتے تھے۔

میاں کے سامنے وہ جتنی خاموش رہتی تھیں' اس کی کسر یہیں پوری ہوتی تھی۔

سمیع کی پھوپھی نے ابا کی شکایتوں کے جواب میں بڑی سرد مہری کا مظاہرہ کیا تھا۔ ماہین کے سامنے یہ ساری تفصیل وہ امی کو تقریباً روز ہی سنایا کرتی تھیں' پر اس وقت ایک بار پھر سننی پڑ گئی۔

زینت آپا نے جس خلوص اور محبت سے اب تک ساتھ دیا تھا' اس کے آگے یہ چھوٹے موٹے ایڈجسٹمنٹ کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

"خالہ! آپ سمیع بھائی کی شادی کہیں اور کر دیں' کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر۔"

ماہین نے ان کی آزردگی کو محسوس کرتے ہوئے ان کے دل کی بات کہہ ڈالی تو ان کی نظریں میرا کے نیم تاریک کمرے کی طرف اٹھ گئیں۔

بالفرض سمیع کے ابا کسی طرح مان بھی جاتے تو یہ "اچھی سی لڑکی" تو پھر بھی ان کی دسترس سے اب بہت دور ہو چکی تھی۔ اس کا انہیں اندازہ ہو چکا تھا۔

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر وہ کچھ اور باتیں کرنے میں جو مصروف ہوئیں تو پھر شائستہ کے آنے پر ہی سلسلہ منقطع ہوا۔

شائستہ بے حد تھکی ہوئی لگ رہی تھیں' مگر پھر بھی خوش تھیں۔

مسز خاور نے نئی برانچ کی خوشی میں ایک تنخواہ بطور بونس دی تھی۔

"شکر ہے خدا کا کہ اس نے کوئی سبیل کی' کئی خرچے ایک ساتھ جمع تھے' پچھلے مہینے بجلی کا بل بھی جمع نہیں ہو سکا تھا' اس بار دونوں اکٹھے ہی چلے جائیں گے' یہ دودھ والے کے پیسے اور یہ....." زینت آپا کے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک گھر کے اخراجات کا جوڑ توڑ کرتی رہیں۔ باوجود ساری کفایت شعاری کے خرچ آمدنی

سے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ہر مہینہ کوئی نہ کوئی اضافی خرچ آ جاتا۔

مہمان داری ہو جاتی یا کسی تقریب کا دینا دلانا اور کچھ نہیں تو چھوٹی موٹی بیماریاں تو چلتی ہی رہتی تھیں۔

شائستہ کو اس قدر غور و فکر کرتا دیکھ کر ماہین کو ایک خیال بار بار آنے لگتا تھا کہ "میرا کو امی کی پریشانیوں کا ذرا سا بھی احساس کیوں نہیں؟" پر شائستہ کو شاید اس سے بھی مطلب نہیں تھا۔ ہزار کا ایک نوٹ ماہین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"یہ رکھ لو' تم اور میرا جا کر اپنے لیے کوئی سوٹ خرید لینا۔"

وہ وقتی طور پر یہ بھی بھول گئیں کہ میرا کے لیے اب دو چار سو والے سوٹ کی حیثیت کچھ بھی نہیں رہی تھی۔ اپنی الماری میں سے کپڑے نکالتے ہوئے وہ اس کی طرف سے پشت کیے ہدایتوں پر ہدایتیں دے رہی تھیں۔

"میرا کے ساتھ ہی جا کر لانا' اسے کپڑے کی زیادہ پہچان ہے اور دیکھنا یہ میرا پھر کوئی پھیکا سیٹھا سا رنگ نہ اٹھا لائے۔ اس عمر میں تو شوخ رنگ اچھے لگتے ہیں' یہ ابھی سے ہی....."

ماہین نے ایک نظر ہاتھ میں پکڑے ہزار کے نوٹ پر ڈالی۔ ایک دم ہی اس کا دل بھر آیا۔ آنسوؤں کے معاملے میں وہ شروع سے ہی بہت کچی تھی' سیکنڈ نہیں لگتا تھا۔

وہ جلدی سے باہر نکل آئی' انہوں نے پیچھے سے آواز بھی دی مگر اس نے بغیر مڑے "امی آئی امی" کہہ کر ان کی تسلی کر دی۔

شائستہ کا بوتیک صبح ساڑھے گیارہ' بارہ سے پہلے نہیں کھلا کرتا تھا۔ میرا ان سے کچھ دیر پہلے جاتی تھی۔ پہلے دن سویرے جانے کی غلطی اس نے پھر نہیں کی تھی۔ قریباً ایک ماہ اس کو روٹ کی بس سے جانا پڑا پھر آفس کی گاڑی اسے لینے آنے لگی تھی۔ یہ پک اینڈ ڈراپ والی صورت حال شائستہ کو بھی پسند آ گئی تھی۔ تھوڑی سی فکر کم ہوئی تھی مگر پھر بھی دل پر جو ایک بھاری بوجھ رکھا گیا ہوا' کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

صبح جس وقت میرا اپنے لائے ہوئے سلے کپڑے ایک بڑے شاپر میں ٹھونس رہی تھی' ماہین نے امی کے دیے جانے والے پیسوں کے بارے میں اسے بتایا۔

اس کے تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکے پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سخاوت کے تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے بڑے اسٹائل سے گویا ہوئی۔ "ایسا کرو' یہ ہزار کا نوٹ تم ہی رکھ لو' دو سوٹ بنا لینا' مجھے تو اب کسی کے دیے ہوئے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بات ضرورت کی نہیں میرا! تم لوگی تو امی کو خوشی ہو گی۔" ماہین نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا' دل تو چاہ رہا تھا کہ بہن کی طبیعت اچھی طرح صاف کر دے۔ آخر اتنے سالوں سے وہ کس کی محنت کی کمائی کا کھا اور پہن رہی ہے۔

مگر اسی وقت شائستہ آ کر دروازے میں کھڑی ہو گئیں۔ جو بات کرنے آئی تھیں' اسے بھول کر وہ اس شاپر کے بارے میں پوچھنے لگیں جو میرا نے ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔

"میرے کپڑے ہیں' آج واپسی میں ٹیلر کو دیتی آؤں گی۔"

اس نے اسی ٹکڑا توڑ انداز میں جواب دیا۔

نیچے سے اس کی گاڑی کے ہارن کی آواز آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے اپنی چیزیں سنبھالتی باہر نکل گئی۔ ماہین دروازہ بند کر کے آئی تو شائستہ وہیں ان دونوں کے مشترکہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھی تھیں۔

"امی! آپ میرا کو ڈانٹتی کیوں نہیں ہیں' بہت دماغ خراب ہو رہا ہے اس کا۔ ایک بار ٹھیک ٹھاک خبر لیں' بالکل صحیح ہو جائے گی۔"

ماہین کو بہت شدید غصہ آ رہا تھا اور ایسا ہی وہ شائستہ سے بھی چاہ رہی تھی۔

شائستہ اسے اداسی کے ساتھ مسکراتے ہوئے دیکھے گئیں۔ وہ اپنی دانست میں میرا کو کنٹرول کرنے

کے سارے گریتا کر ذرا خاموش ہوئی تو شائستہ ہلکے سے بولیں۔

"میرا کو جس دن بھی میں نے کچھ سختی سے کہہ دیا نا' وہ اور بھی زیادہ اجنبی اور لاپروا بن جائے گی۔ ہمیں منٹ کی بھی مہلت دیے بغیر۔ وہ شروع سے ہی بہت سرکش ہے۔ اپنی بات منوانے کے لیے آخری حد سے گزر جانے والی۔ تمہارے ابو کہتے تھے۔ "شائستہ! کبھی بھی میرا کو ضد مت دلانا' ورنہ یہ اپنا نقصان کر بیٹھے گی۔" میرا کے لیے یہ باتیں پہلے بھی کہی جا چکی تھیں اور ہر بار ماہین کو نئی کوفت میں مبتلا کر دیتی تھیں' اس کا خیال تھا کہ میرا کی اس خودساختہ ضد کو اہمیت دے دے کر اور بھی ضدی بنایا جا رہا ہے۔

اس کی بڑبڑاہٹ کو نظرانداز کر کے وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولیں۔

"کس قدر کمرہ پھیلا ہوا ہے تم دونوں کا' چلو ٹھیک کرو اسے۔ یہ کیا کیا چیزیں پھیلا رکھی ہیں۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ خود کمرے میں پھیلی افراتفری کو سمیٹنے میں لگ گئیں۔

"وہی ہیں ایک شہزادی میرا' ان ہی کا سارا سامان ہے۔ میرے تو کپڑے الماری میں ہیں....."

ماہین نے جل کر کہا۔

شائستہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے میرا کے لائے ہوئے کاسمیٹکس کی طرف متوجہ تھیں۔ پرانی سی ڈریسنگ ٹیبل پر بڑا دلچسپ تضاد موجود تھا۔

شاندار پیکنگ میں بند کاسمیٹکس اپنی کوالٹی اور قیمت کا خود اظہار کر رہے تھے۔

وہ حیرت سے ایک ایک چیز کو اٹھا کر دیکھ رہی تھیں اور اب اس حیرت کی وجہ قیمتوں سے زیادہ میرا کی "پرچیزنگ پاور" پر تھی۔

"یہ اتنے پیسے کہاں سے آ رہے ہیں اس کے پاس۔" وہ ایک دم بہت خوفزدہ سی دکھائی دینے لگیں۔

"اس کی سیلری کے پیسے ہوتے ہیں امی! ان سے ہی یہ سب....."

"مت بہلاؤ مجھے۔" انہوں نے اس کی بات پوری سنی بھی نہیں۔ "کتنی تنخواہ ہے اس کی' کہیں گورنر لگی ہے کیا۔ یہ سات آٹھ ہزار یہاں بکھرے پڑے ہیں' درجن بھر جوڑے ابھی اس شاپر میں لے کر گئی ہے' ہو کیا رہا ہے آخر۔ آسمان سے پیسے برس رہے ہیں کیا۔؟" ان کی آواز غصے سے پھٹنے لگی تھی۔

ماہین کو پہلی بار اتنے سخت لہجے سے واسطہ پڑا تھا' ضبط کے باوجود بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ پر انہوں نے ذرا بھی توجہ نہیں دی۔

"ساری زندگی صبر اور شرافت سے گزاری ہے' اب اس پر یوں پانی پھیرو گی تم دونوں' شرم تو نہیں آتی ہے۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا امی!" ماہین کے آنسوؤں میں اور شدت آگئی۔

شائستہ باہر چلی گئیں تو تب بھی وہ وہیں کمرے میں بیٹھی چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔

بوتیک جانے کا ٹائم ہو چکا تھا۔

گھر کی دیکھ بھال اور رات کے لیے کھانا بنانا دونوں کام ہی ماہین اچھی طرح کر لیتی تھی پھر بھی وہ جاتے جاتے اسے دو چار ہدایتیں ضرور دے دیا کرتی تھیں۔

آج وہ بھی دینا ضروری نہیں سمجھیں' ماہین جو ان کے جانے کی کھٹ پٹ سن کر آنسو صاف کرتی باہر لاؤنج میں آگئی تھی' ان کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھتی ہی رہی۔ پر آج دل اتنا برا ہو رہا تھا کہ بس۔

"اللہ حافظ امی!" جب وہ گھر سے نکل رہی تھیں تو ماہین نے دروازہ بند کرتے ہوئے ہلکے سے کہا۔

"اللہ حافظ!" وہ بڑبڑانے والے انداز میں کہتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئیں۔

اسی وقت سامنے والا دروازہ کھول کر سمیع باہر آیا۔ ماہین پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہی اسے صورتحال میں کچھ گڑبڑ کا اندازہ ہوا مگر اس وقت بے حد جلدی میں تھا۔

تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے بہت سی قیاس آرائیاں ذہن میں ابھریں۔ سب سے پرزور خیال میرا کے بارے میں تھا۔ سمیع لڑکا تھا' باہر اٹھتا بیٹھتا تھا'

اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرا کے تیزی سے بدلتے ہوئے انداز آس پاس کے لوگوں کو چونکا رہے ہیں مگر سب ہی کو شائستہ کا حد درجہ پاس تھا۔

ایک زرد اور گرم دن باہر پوری طرح پھیل چکا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے روڈ پر لاتے ہوئے بھی مستقل ماہین کا خیال آتا رہا۔

اس کا اترا ہوا چہرہ اور نم نم آنکھیں۔۔۔۔

"کاش! وہ اس کے لیے کچھ کر سکتا۔"

دل میں ابھرتی یہ خواہش اتنی بے ساختہ تھی کہ وہ خود ہی کچھ چونک سا گیا۔

"رحم کرو خود پر۔" دھیرے سے سر جھٹک کر خود کو سرزنش کرتے ہوئے وہ مسکرا دیا۔ اس قسم کی خواہشیں پالنے کی اجازت نہ تو حالات دیتے تھے اور نہ ابّا۔

پر تھوڑی ہی دیر بعد اسے پتا چلا کہ وہ تو ابھی بھی مستقل اسے ہی سوچ رہا ہے، جو اتنے سالوں سے صبح شام میں نہ جانے کتنی بار عام سی باتیں کرتے ہوئے نظر آتی تھی۔

سیدھی ہموار سڑک پر چلتے چلتے پہلی بار ابّا اور حالات کے خوف کو دل سے نکال کر سمیع نے سوچا کہ پھوپھی شہناز کی صاحبزادی نصرت کے ساتھ بھلا زندگی کا کیا رنگ ہو گا۔

☼ ☼ ☼

شائستہ آج معمول سے کافی پہلے گھر آ گئی تھیں۔

ماہین بار بار امید بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھتی رہی مگر وہ صبح کی نسبت مزید سخت موڈ میں نظر آ رہی تھیں۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ میرا کا انتظار کرتی رہی۔ شائستہ بالکونی میں کھڑی تھیں۔ ماہین بھی ان کے پاس ہی جا کھڑی ہوئی۔ جتنی دیر وہ گھر میں رہتی تھیں، وہ ان کے ارد گرد ہی منڈلاتی رہتی تھی۔

شائستہ کو اس کی یہ عادت اچھی طرح پتا تھی، سو کچھ نہیں بولیں۔

ماہین نے دل ہی دل میں شکر کیا، ورنہ آج بلا قصور جس طرح وہ جھاڑی گئی تھی، وہی سین اس وقت بھی دہرایا جا سکتا تھا۔

ملگجی شام پر رات کی سیاہی پوری طرح غالب آ گئی تھی، نیچے کی دکانوں کے آگے برگر، چاٹ، کولڈ ڈرنکس اور کھانے پینے کے دوسرے اسٹالز پر لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ سیخوں پر پکتے ہوئے گوشت کی خوشبو اور دھواں چاروں طرف پھیل رہے تھے۔

"قصّہ غم میں تیرا نام نہ آنے دیں گے۔"

دو چار دکانیں چھوڑ کر تنور والے کے ہاں سارا دن ہی مہدی حسن کی غزلیں اور فلمی گیت بجتے رہتے تھے۔ کبھی بھولے سے بھی اس کے ہاں سے کسی دوسرے گلوکار کی آواز نہ سنائی دی تھی۔

ماہین کو اس کے ذوق اور ثابت قدمی دونوں پر ہی حیرت ہوتی تھی مگر اس وقت دل کسی بھی بات میں نہیں لگ رہا تھا۔ میرا کے آنے پر جو زوروں کا معرکہ متوقع تھا، اس کا خیال سہمائے دے رہا تھا اور یوں ہی الگ الگ اپنی اپنی سوچوں میں گم وہ ماں بیٹی وہیں بالکونی میں کھڑی تھیں۔ جب نیچے آ کر رکنے والی اس چمچماتی گاڑی میں سے میرا اتری، شائستہ نے ابھی تک اسے ہائی ایس میں ہی جاتے دیکھا تھا، سو میرا کو اندر داخل ہوتے ہی پہلا سوال اسی تبدیلی کے متعلق سننے کو ملا۔

"فیروز حسین تھے، شہر کے ٹاپ کلاس کیمرہ مین۔ ہماری فرم کے لیے کام کرتے ہیں، بہت نام ہے ان کا اور بہت زیادہ کوآپریٹو ہیں۔" وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے فریج میں سے پانی کی بوتل نکالنے لگی۔

"تو اس ٹاپ کلاس شخص کو کوئی اور کام نہیں جو ایک معمولی ورکر کو گھر ڈراپ کرنے کی ذمّہ داری اٹھا رہا ہے۔"

میرا نے گلاس منہ سے لگایا ہی تھا کہ عقب سے شائستہ کی آواز ابھری۔

یہ چبھتا ہوا سوال میرا کو بری طرح کھلا۔ پانی کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر وہ پلٹی اور شائستہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

"آپ بے کار کے طعن مت کریں، وہ بہت اچھے اور کیئر کرنے والے شخص ہیں اور دوسروں کے کیریئر سیٹ کرنے میں بھی بہت ہیلپ فل۔۔۔۔"

شائستہ جس شدید ذہنی دباؤ سے گزر رہی تھیں، وہاں ایسے کسی شخص کی مدح سرائی سننا جسے وہ پہلی نگاہ میں ہی ناپسند کر چکی تھیں، بالکل ناممکن سی بات تھی۔ پہلے سے بھی زیادہ تلخ ہو کر بولیں۔

"رات کے وقت اپنی گاڑی میں غیر لڑکیوں کو لے کر گھومنے میں کیا انٹرسٹ چھپا ہوا ہے اس شخص کا اور تمہارے باپ زندہ ہوتے تو تمہاری مجال تھی کہ اس طرح خود سری کا مظاہرہ کرتی پھرتیں۔" میرا خلافِ عادت نہ بھڑکی، نہ طیش میں آئی، ایک طنزیہ سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اگر باپ زندہ ہوتے تو کم از کم آپ کی طرح یوں تنگ نظری کا ثبوت نہ دے رہے ہوتے اور آپ بھی اس سخت احساس کمتری کا شکار نہ ہوتیں، جس کا مسز خاور کے بوتیک پر کھڑے رہ رہ کر ہو گئی ہیں۔"

میرا کے الفاظ، انداز سب سخت سرد مہری میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ماہین جو خاموش خاموش نگاہوں سے ماں اور بہن کو تکے جا رہی تھی، اسے پہلی بار ایسا لگا جیسے کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی بات کسی بڑی تبدیلی کا پتا دینے لگتی ہے۔ میرا کے چہرے پر اتری اجنبیت بھی بڑی معنی خیز تھی۔

بات بڑھتی جا رہی تھی۔

یہ فیروز حسین تو خوامخواہ ہی اس وقت بیچ میں آ گئے تھے۔ اصل بات جو پیچھے رہ گئی تھی، شائستہ اب اس پر آئی تھیں۔

میرا کی بڑھتی ہوئی فضول خرچیاں اور اس کے لیے اس کے پاس آتا بے دریغ روپیہ۔

"کہاں سے آ رہا ہے اتنا پیسہ اور کس بات کے اتنے پیسے دے رہے ہیں یہ لوگ تمہیں اور دوسری لڑکیوں کو بھی کیا اتنا ہی دیا جا رہا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔

میرا نے ایک آدھ بار تو انہیں سرسری طور پر مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر جب وہ اگلے دن اس کے آفس جا کر حقیقت حال معلوم کرنے کا ارادہ ظاہر کرنے لگیں تو پھر صاف صاف کہہ ڈالنا ہی بہتر سمجھا۔

"میں بہت سارا پیسہ کمانا چاہتی ہوں امی! اور میں کما بھی سکتی ہوں۔ آپ بھی ان تھوڑے سے پیسوں کا واویلا چھوڑ کر آگے کی طرف دیکھیں۔ ہمارے ایک کلائنٹ کو اپنی ایڈ فلم کے لیے۔۔۔۔" شائستہ اور ماہین دم بخود سی اس کی یہ ساری تفصیلات سن رہی تھیں۔

وہ بحیثیت ماڈل اپنا کیریئر اسٹارٹ کر چکی تھی اور پہلی ایڈ فلم کا شوٹ بھی ہو چکا تھا۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے بالکل گہری خاموشی ہوئی، باہر سڑک پر مچتا ہمہ وقت کا شور بھی کچھ شرمندہ سا ہو کر اس فلیٹ کی بالکونی کے نیچے ہی تھم سا گیا تھا۔

"اور میرا! تم نے یہ سب کچھ کرنے سے پہلے مجھ سے ایک لفظ پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا، رسمی طور پر بھی۔" دھیرے سے پوچھے جانے والے اس سوال کے جواب میں وہ سر جھٹک کر بولی۔

"نہیں، اس لیے کہ آپ مجھے کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دیتیں اور میں اپنے فیصلے اب خود ہی کرنا چاہتی ہوں۔"

شائستہ چند لمحے غور سے اس کا چہرہ تکتی رہیں پھر بڑے مضبوط لہجے میں بولیں۔ "ٹھیک ہے پھر ان دو چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لینا، ماں کا یا اس کامیاب کیریئر کا۔"

اپنی بات پوری کر کے وہ فوراً ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ لاک بند ہونے کی آواز میرا اور ماہین دونوں ہی نے سنی۔

"خوامخواہ کی ایموشنل بلیک میلنگ۔" میرا کا موڈ بری طرح آف ہو چکا تھا۔ ایک بے حد خوشگوار ماحول میں دن گزار کر جہاں مستقبل کا ہر امکان روشنی سے بھرپور نظر آتا تھا، یہ گھسی پٹی دقیانوسیت جھیلنا اب اس کے لیے ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔

"اور اب تم نہ شروع ہو جانا۔" اس نے کڑے

تیوروں کے ساتھ ماہین کو دیکھا جو ماں کے کمرے کے دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ "میں بہت جلد اپنا انتظام کرلوں گی' تم لوگوں کو ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے' سمجھیں۔" ماہین چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔

وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی' تب بھی ماہین اس کے پیچھے جانے کی ہمت نہ کرسکی۔ ابھی ابھی جو کچھ وہ کہہ کر گئی تھی' اگر محض الفاظ نہیں تھے تو پھر...

"کیا میرا واقعی ہمیں چھوڑ کر جاسکتی ہے؟" اس نے اپنے ٹھنڈے ہوتے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے دباتے ہوئے سوچا۔

میرا نے جو قدم آگے بڑھایا تھا' وہ پیچھے ہٹنے کے لیے نہیں تھا۔ وہ خوبصورت بھی تھی اور باصلاحیت بھی۔

جوہر شناس نگاہوں میں سما چکی تھی' کامیابی کو اس کے قدم چومنے سے کون روک سکتا تھا۔

فیروز حسین جیسے فیشن فوٹو گرافر کے ساتھ ہونے والے شوٹس دھوم مچانے لگے تھے۔ کمرشل فلمیں' شوز' ہر طرف سے آفرز آرہی تھیں۔ فیروز حسین کے مشورے پر وہ اس ایڈورٹائزنگ فرم کو چھوڑ کر فری لانسر ماڈل کے طور پر کام کرنا شروع کرچکی تھی۔

اس بے حد گلیمر اس زندگی میں فیروز حسین سب سے اہم کردار ثابت ہوا تھا۔ اتنا کہ باقی سب ہی رشتے دھندلے پڑ چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

بادلوں بھری خاموش سی سہ پہر اس چھوٹے سے فلیٹ میں اتری ہوئی تھی۔ جب زینت آپا' شائستہ کی سوجی ہوئی آنکھوں کا دکھ اپنے دل پر محسوس کرتے ہوئے دھیرے دھیرے سمجھا رہی تھیں۔

"شکر ہے خدا کا کہ عزت سے اپنے گھر کی ہو رہی ہے' جو بھی اس کا شوق ہے' اپنے شوہر کی اجازت اور اس کے ساتھ رہ کر ہی پورا کرے گی۔ تمہاری ذمہ داری تو آج ختم ہوئی نا' بس اب اٹھو اور اس کی خوشیوں کی بقا کے لیے اللہ سے دعا کرو' اس کے حق میں تمہاری دعا سے بڑھ کر کوئی دوسری شے کارگر نہیں ہوسکتی۔"

اسی رات پرل کانٹی نینٹل کے سوئمنگ پول کے کنارے منعقدہ شاندار تقریب میں میرا کی شادی فیروز حسین کے ساتھ انجام پائی۔

دو سیلبریٹیز کی شادی کی تقریب میں جتنا اسٹائل' جتنا گلیمر ہوسکتا تھا' اس تقریب میں وہ سب تھا۔

بے حد قیمتی لباس اور جیولری کے ساتھ میرا کے خوبصورت چہرے پر خوشیوں کے ڈھیروں رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ فیروز حسین جیسے معمولی شکل والے ادھیڑ عمر شخص کو دیکھ کر فوراً" ہی یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ دو بے حد پروفیشنل لوگوں نے اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کا بندوبست کیا ہے اور بس...

رات گئے سمیع کی چھوٹی سی گاڑی میں گھر واپس آتے ہوئے شائستہ کے برابر بیٹھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ امی نے کچھ دن پہلے کتنی سچی بات کہی تھی۔

"میرا کو واقعی منٹ بھر میں اجنبی بن جانے کا ہنر آتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

سمیع کی بڑی بہن آئی ہوئی تھیں۔

شکار پور سے ان کا سال میں ایک ہی چکر بمشکل لگ پاتا تھا' وہی نہیں بقیہ تین کی میکہ آمد کا سلسلہ بھی بس اتنا ہی تھا۔ چاروں میں سے ایک بھی کراچی میں نہیں تھی۔

ابا نے چاروں بیٹیاں چار الگ الگ سمتوں میں بیاہ دی تھیں' بے چاری کبھی بھی اکٹھے میکے نہیں آیا کرتیں۔

بڑی آپا اس وقت یہی دکھڑا لیے بیٹھی تھیں۔

"فرحت کو دیکھے تو سال سے بھی اوپر ہوگیا ہے۔ ثروت سے تو پھر بھی مل آئی تھی ملتان جاکر' جب سردیوں میں اس کے سسر کا انتقال ہوا تھا۔"

زینت آپا تو خیر کیا کہتیں مگر ابا نے ان کے اتنے دن بعد آنے کا بھی لحاظ نہیں کیا' بڑی بے مروتی سے بولے۔

"شکر کرو سب اپنے اپنے گھروں میں خوش ہو' یہ خود ساختہ غم پالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

بڑی آپا اپنے بچوں کے سامنے ٹوکے جانے پر تھوڑی سی شرمندہ ہو کر بولیں۔ "میرا یہ مطلب نہیں ابا! کبھی کبھی اکٹھے ہو کر بیٹھنے کو بھی تو دل چاہتا ہے نا' آپ ایسا کریں اب سمیع کی شادی کردیں' اسی بہانے ہم سب بھی ایک ساتھ آکر رہ لیں گے۔"

سمیع بھی وہیں بیٹھا اپنا کچھ کام کر رہا تھا۔ بے ساختہ ہی بولا۔ "آپ چاروں ایک ساتھ' اس چھوٹے سے فلیٹ میں۔"

ابا نے گھور کر سمیع کو دیکھا۔

انہیں بڑی آپا کا آئیڈیا پسند آیا تھا' سو فی الحال اسی موضوع پر رہے۔

"بات تو بڑی اچھی ہے' پر شہناز بھی تو راضی ہو۔ جب تک اس کا بیٹا شارجہ سے نہیں آجاتا' وہ شادی کا نام لینے پر بھی راضی نہیں۔"

سمیع کی سوچ کا دھارا جب سے مڑا تھا' اس کے بعد سے اسے یہ ذکر مذاق میں بھی برا لگنے لگا تھا۔ ماہین کا نام لینے کی غلطی تو ابھی اس نے نہیں کی تھی' زینت آپا کے سامنے پھوپھی شہناز کے ہاں شادی ہونے کی مخالفت شروع کرچکا تھا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرنے لگے۔

"آپ کی چھوٹی بہن ہیں' آپ کی بات کیوں نہیں مانیں گی۔ بس ابا! آج ہی چل کر پھوپھی سے بات کرتے ہیں تاریخ کی۔"

ابا کی ذرا سی توجہ بھی بیٹیوں کے لیے بہت ہوا کرتی تھی' اس وقت تو وہ مسکرا بھی رہے تھے' بڑی آپا کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے پھر آج اللہ کا نام لے کر چلتے ہی ہیں۔" وہ فوراً" ہی راضی ہوگئے۔ سلام نہ کرنے والی ناراضی تھوڑے سے گلے شکووں کے بعد ویسے بھی دور ہو چکی تھی۔

اس موضوع کے بس چھڑنے کی دیر تھی' فوراً" ہی آگے کی تفصیلات طے ہونا شروع ہوگئیں۔ بری کا زیور' مہمانوں کی تعداد' ولیمے اور مہندی کے کھانے کا مینو' وغیرہ وغیرہ۔

"مہندی اور بارات میں ایک دن کا وقفہ رکھیں گے آپا! تاکہ رات بھر کا فنکشن ہوسکے۔"

"ہاں ہاں بھئی جیسے تم بہنوں کا دل چاہے۔" بڑی آپا کو سارے ارمان یاد آرہے تھے اور ابا تخت فیاضی کے موڈ میں آچکے تھے' ماحول بالکل بدل گیا۔

سمیع کو ایسا لگنے لگا کہ جیسے اس کی بارات بالکل ہی تیار کھڑی ہے۔ بینڈ بجنے کی آواز بالکل قریب ہی سنائی دینے لگی اور اس سارے تصور پر حاوی ہوتا شہزادی نصرت کا سجا بنا سراپا۔

"نہیں' نہیں۔"

گھبراہٹ میں ایک دم ہی اس کے منہ سے زور سے نکلا۔ سب ہی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"تمہیں کیا ہوا۔" ابا کو یہ دخل در معقولات بری لگی۔

"جی.... وہ کچھ نہیں۔"

یہ چند الفاظ ابا کے سامنے ان کی ساری اولاد نے ہمیشہ سب سے زیادہ استعمال کیے تھے مگر آج سمیع کو ان کے آگے کچھ اور بھی کہنا تھا۔ نہ کہہ کر زندگی بھر کا خسارہ مول لینے کی حماقت وہ بالکل بھی نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

"اس سارے چکر کی ضرورت کیا ہے آخر۔"

"کس چکر کی؟"

ابا جو پھر سے ان رشتے داروں کے نام گنوا رہے تھے جن سے آج کل وہ ناراض تھے۔ ایک بار پھر چونکے۔

"آخر ہو کیا رہا ہے' کھل کر بات کیوں نہیں کرتے۔"

سمیع نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے فی الفور ہی اس بوجھ سے نجات کی ٹھانی۔ جو اس کے اعصاب کے لیے کڑا امتحان بنا ہوا تھا۔

زینت آپا کی ملتجی نگاہوں سے نظریں چرا کر اس نے ابا کی طرف دیکھا اور بولا۔ "مجھے یہ شادی نہیں کرنی

ہے ابا! پھوپھی شہناز کے ہاں اس رشتے کو آپ ختم کردیں۔"

چند سیکنڈ تو وہ بالکل گنگ سے اسے دیکھے گئے۔ ان کی کوئی بات آج تک گھر میں رد نہیں ہوئی تھی' سو ردِعمل تو شدید حیرت کا ہی تھا اور اس کے بعد ان کا وہی جلالی طوفانی غصہ جس کی آج بھی خاندان بھر میں مثالیں دی جاتی تھیں۔

"ناخلف! ناہنجار!" جیسے القاب کے ساتھ انہوں نے سمیع کو جو کچھ بھی کہنا چاہا' کہا مگر وہ یوں ہی سکون کے ساتھ بیٹھا سنتا رہا۔

"جب رشتہ طے ہوا تھا' اس وقت تو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اب زمانے کو دیکھ کر خرابیاں نظر آنے لگی ہیں۔ ذرا عقل کو آواز دو' نصرت سے اچھی لڑکی کہاں مل سکتی ہے۔"

سارا غصہ اتار لینے کے بعد وہ منطقی طور پر سمجھانا شروع ہوئے۔

سمیع کا دل چاہا کہ کہہ دے کہ محض دروازہ کھول کر سامنے دیکھنے پر ہی نصرت سے ہزار گنا اچھی لڑکی مل سکتی ہے مگر فی الحال ایسا کچھ کہنا معاملے کو مزید خراب کرنا تھا' سو اس نے وہی کچھ کیا جو انہوں نے سوال کی صورت میں پوچھا تھا۔

"اس وقت میں انٹر میں پڑھ رہا تھا۔ ابا! وہ کوئی وقت تھا رشتہ طے کرنے کا' آپ نے خوامخواہ مجھے پھنسا دیا لے کر۔"

ان کے سخت غصے کا سامنا کر لینے کے بعد اب وہ بڑے اطمینان سے سوال و جواب کا کھیل کھیل رہا تھا۔ بڑی آپا حیران پریشان سی بیٹھی تھیں۔

شروعات ان ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ نہ وہ سمیع کی شادی کی خواہش کا اظہار کرتیں' نہ یہ سارا ہنگامہ اٹھتا۔

"تیار رہنا تم دونوں۔" ابا نے اب سمیع کو مکمل نظرانداز کرتے ہوئے بڑی آپا اور اہلیہ کو مخاطب کیا۔

"شام کو شہناز کے گھر ضرور چلنا ہے۔" جو بات ابھی کچھ عرصے آرام سے ٹلی رہتی تھی' وہ ایک دم ہی اہمیت اختیار کر گئی۔

سمیع اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ضرور جائیں مگر میرے حوالے سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میں صاف کہہ رہا ہوں۔" وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

آج ابا اور سمیع دونوں کو اپنی اپنی ذات کے حوالے سے بالکل مختلف تجربہ ہوا تھا۔

اپنی بات رد کیے جانے کی جھینپ تھی یا کیا۔ وہ شام کو پھوپھی شہناز کے گھر جانے تک بڑبڑاتے ہی رہے۔ آج اسے ساتھ چلنے کے لیے بھی تکلیف نہیں دی گئی' وہ سب لوگ ٹیکسی سے چلے گئے۔

بڑی آپا کے تین ہنگامہ پرور بچوں کے وقتی طور پر چلے جانے کے بعد ایک دم ہی خاموشی سی چھا گئی۔ اسی سکون بھری تنہائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے سمیع لاؤنج میں بیٹھا آگے کا لائحہ عمل ترتیب دیتا رہا۔ اپنی آج کی ہمت پر اسے خود بھی حیرت تھی اور اب یہ حیرت گہرے اطمینان میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ باہر کا دروازہ ایک دم ہی کسی نے زور سے بجایا۔ آنے والے کا بے صبرا پن انداز سے ظاہر ہو رہا تھا' سمیع نے جلدی سے دروازہ کھولا' وہاں ماہین کھڑی تھی۔

"سمیع بھائی! زینت آنٹی کو بھیج دیں پلیز۔" وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔

"امی تو گھر پر نہیں ہیں' خیریت۔"

سمیع کے پوچھنے پر وہ شائستہ کی طبیعت کئی دنوں سے خراب سی تھی' دو تین دن سے وہ اپنے بوتیک پر بھی نہیں جا رہی تھیں۔

"اس وقت تو بخار اتنا تیز ہے کہ بالکل بے ہوشی سی طاری ہے۔" بائیں ہاتھ کی پشت سے آنکھ کے بیرونی گوشے پر جمع ہوتے پانی کو خشک کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

"گھبراؤ نہیں' میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آرہا ہوں۔" سمیع اسے تسلی دیتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

نیچے ہی ڈاکٹر زمان کا کلینک تھا۔ بلڈنگ کے سارے مکین ہی ان کے واقف کار تھے۔ وہ فوراً ہی اوپر چلے

آئے۔

شائستہ واقعی بالکل بے سُدھ سی ہو رہی تھیں۔ جتنی دیر میں ڈاکٹر زمان انہیں چیک کر کے انجکشن لگا کر فارغ ہوئے، وہ بڑے تشویش بھرے انداز میں ماں کو دیکھے گئی۔

سمیع، ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہی نیچے چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو دوائیں لیے ہوئے تھا۔

"ابھی تھوڑی دیر میں طبیعت سنبھلنا شروع ہو جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب رات کو پھر آئیں گے دیکھنے کے لیے۔"

ڈاکٹر کے دیکھ لینے اور اتنی تسلیوں کے بعد ماہین کے چہرے پر پھیلی وحشت اب اطمینان میں بدل رہی تھی۔ کچھ خیال آیا تو بڑے مشکور سے لہجے میں بولی۔

"آپ کو بہت زحمت ہوئی اس وقت مگر میں کیا کرتی، زینت آنٹی کے علاوہ کس کے پاس جاتی۔"

سمیع ہلکے سے مسکرا دیا۔

"بہت ساری زحمتیں وہ زندگی بھر اٹھانے کے لیے بخوشی تیار ہے۔ اگر یہ ماہین جان لے تو ابھی اس کا کیا ری ایکشن ہو۔"

آج کل دل کی بات دل میں ہی رکھنے کی خاصی مشق ہو چکی تھی، سو موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

"اور میرا ٹھیک ہے، آتی تو ہے نا۔"

"ٹھیک ہو گی، تین ماہ میں صرف ایک بار آئی ہے، وہ بھی اکیلی۔ میں کسی کسی دن فون کر کے خیریت پوچھ لیتی ہوں۔"

ماہین نے دوائیں سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ چہرہ دوسری طرف ہونے کی وجہ سے سمیع نے اس کے تاثرات تو نہیں دیکھے مگر لہجے میں کچھ ٹوٹتا ہوا سا صاف محسوس کیا۔ جن کی پروا ہوتی ہے، ان کے لیے شاید یوں ہی حساسیت بڑھ جاتی ہے۔

"مصوفیت بھی تو بہت رہتی ہو گی، کتنی جلدی ٹاپ پر آئی ہے۔ ظاہر ہے محنت تو بہت کرنی....."

وہ بڑی لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے میرا کی تعریف کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ یوں ہی پشت کیے ہوئے بولی۔

"امی کے سامنے اس کے ٹاپ کلاس ہونے کا ذکر مت کیجئے گا، میں تو گھر میں ان کی موجودگی میں ٹی وی بھی نہیں کھولتی۔"

سمیع کچھ چپ سا ہو گیا۔

شائستہ آنٹی کی روز بروز گرتی صحت کی وجہ سمجھ میں آنے لگی تھی۔

"تم آنٹی کو سمجھاؤ ماہین! میرا کی بات کو اتنا دل پر مت لیں۔ آج کل تو یہ ٹرینڈ چل پڑا ہے، ماڈلنگ اور ایکٹنگ، اچھے کیریئر سمجھے جانے لگے ہیں۔ اچھی فیملیز کے پڑھے لکھے لڑکے لڑکیاں اسے جوائن کر رہے ہیں۔"

سمیع کے پاس بھی وہی رٹے رٹائے سے جملے تھے جو ماہین دن میں کئی بار اپنے آپ سے دہرا لیتی تھی مگر پھر بھی دل میں جو ایک چبھن تھی، کم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔

"ہر کلاس کی ویلیوز الگ ہوتی ہیں سمیع بھائی! ہر چیز ہر ایک کو سوٹ نہیں کر سکتی، کم از کم ہم مڈل کلاس لوگ تو آج بھی اس معاملے میں بہت حساس ہیں۔"

سمیع نے جس خلوص سے اس وقت مدد کی تھی، اسی کا خیال کرتے ہوئے ماہین نے بڑے نرم انداز میں اس کی بات کو رد کیا۔

شائستہ ابھی سو ہی رہی تھیں، سمیع کو یہاں مزید بیٹھے رہنا نامناسب سا لگا تو فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔ ماہین سے تھوڑی دیر بعد پھر آ کر پوچھ لینے کا کہہ کر وہ باہر نکل آیا۔

گھر میں نری بوریت ہی تھی مگر کیا کیا جا سکتا تھا۔

"اس مڈل کلاس حساسیت سے پیچھا چھڑانا واقعی ہم لوگوں کے لیے ناممکن سی بات ہے۔"

دل ہی دل میں اس نے ماہین کی تائید کی۔ دوبارہ جانے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے کچھ وقت یوں ہی گزار لیا جائے مگر حیرت انگیز طور پر ابا وغیرہ واپس چلے آئے۔ ابھی پورے آٹھ بھی نہیں بجے تھے۔

سمیع کے حساب سے تو انہیں کھانا وغیرہ کھا کر رات گیارہ بجے سے پہلے نہیں لوٹنا چاہیے تھا۔

"پھوپھی سے ابا کی تلخی ہو گئی ہے، کافی شرائط وغیرہ رکھ رہی ہیں، بس اسی لیے کھانے پر بھی نہیں رکے۔ حالانکہ انہوں نے بہت روکنا چاہا۔"

بڑی آپا نے آتے ہی چپکے سے سب سے پہلے یہ "خوش خبری" سنائی۔

سمیع کو شرائط کی تفصیلات سے کچھ دل چسپی نہیں تھی، وہ تو بس دعا ہی کر سکتا تھا کہ ابا اور پھوپھی کے اختلافات اتنے بڑھیں کہ یہ سلسلہ خود ہی ختم ہو جائے۔ مگر ابا کے حوصلے ابھی بھی بلند تھے۔

"شادی تو سمیع کی نصرت سے ہی ہو گی۔ شہناز کچھ بھی کر لے، ہار اسے ہی ماننا پڑے گی۔ میرے آگے اس کی ایک نہیں چلے گی۔"

سمیع برا سا منہ بنائے کچھ دیر تو ان کی اس قسم کی باتیں سنتا رہا پھر بالکل لاتعلق سا بن کر زینت آپا کو شائستہ کی طبیعت کا بتانے لگا۔

انہیں اپنی بے خبری پر برا رنج سا ہونے لگا۔

"میں تو جب سے یہ نگہت اور اس کے بچے آئے ہیں ہر بات ہی بھولی جا رہی ہوں۔ معلوم بھی ہے کہ شائستہ بے چاری کتنی پریشان ہے اور کتنی تاکید کر کے اس نے ایک کام سونپا تھا۔"

سب ہی تھوڑا سا چونک گئے۔

میرا کی دی ہوئی ٹینشن اب پرانی بات ہو چکی تھی پھر بھی سب کا دھیان اسی کی طرف گیا۔

"کیا میرا کی شادی چل نہیں پا رہی ہے۔"

"اونہہ! خدا نہ کرے۔" بڑی آپا نے قیاس آرائی میں جتنی جلدی دکھائی تھی، وہ زینت آپا کو اچھی نہیں لگی۔

بات کچھ اور ہی تھی۔ ماہین کا رشتہ طے ہونے جا رہا تھا۔

ایک زینہ چھوڑ کر دوسری منزل پر شرافت صاحب کی فیملی رہتی تھی۔ ان کی بیوی نے اپنے بھائی کا رشتہ ماہین کے لیے دیا ہوا تھا۔

"بلاک فائیو میں میڈیکل اسٹور ہے لڑکے کا۔" شائستہ کہہ رہی تھی کہ آپ جا کر مل لیں لڑکے سے اور جو معلومات کرنی ہیں، وہ بھی کر لیں۔"

وہ ابا کو مخاطب کر کے بتانے لگیں۔

سمیع کو ان کے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بھلا ماہین کی شادی کہیں اور کیسے ممکن ہے۔" دل میں پھیلتی حیرانی کو چھپائے وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔

کتنی عجیب بات تھی کہ پھوپھی شہناز کی بیٹی سے جان چھڑانے کی دن میں دس بار سے بھی زائد پلاننگ کرتے ہوئے اسے ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ماہین کے لیے کوئی اور بھی اس انداز میں سوچ سکتا ہے۔

باہر ابا کی بلند آواز گونج رہی تھی، اپنی اہمیت کا احساس انہیں یوں ہی پرجوش کر دیا کرتا تھا۔ شرافت صاحب سے ان کے بڑے دیرینہ مراسم تھے۔ سمیع کو پتا تھا کہ وہ بغیر دیکھے ہی لڑکے کو سو میں سے سو نمبر دینے والے ہیں۔

☆ ☆ ☆

میرا کو شائستہ کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع تو مل گئی تھی مگر اسٹارز والی مصوفیت کا مرض اب اسے بھی پوری طرح لاحق ہو چکا تھا، سو آتے آتے بھی دو چار دن نکل ہی گئے۔

جب تک وہ آئی، شائستہ واپس اپنے بوتیک کی ذمہ داری سنبھال چکی تھیں۔ اس کی بھری دوپہر میں آنے کی زحمت یوں ہی گئی۔

"ضرورت کیا تھی ابھی جانے کی، کم از کم ہفتہ بھر تو آرام کر لیتیں مگر وہ تو مسز خاور کو تکلیف پہنچانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتیں۔ تین دن بھی نہ جانے کیسے گزارے ہوں گے گھر میں۔"

نیم تاریک سے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی وہ جب سے آئی تھی، ماں کی کوتاہیاں جتانے میں مصروف تھی۔ ایک بار بھی بھولے سے اپنی بے خبری کا افسوس نہیں کیا تھا۔ ماہین نہ چاہتے ہوئے بھی ٹوک بیٹھی۔

"پھر کیا کریں وہ، کس کی طرف دیکھیں۔ کون ہے

جو ان کے ہاتھ پر کما کر پیسے رکھ رہا ہے۔ سارے خرچے' ساری فکریں' ان ہی کے سر ہیں نا۔"

میرا کو نہ معلوم کیوں یہ اشارا اپنی طرف محسوس ہوا۔ تھوڑا سا منہ بنا کر بولی۔ "خیر جتنے پیسے مسز خاور دے رہی ہیں' اس سے زیادہ تو میں بھی انہیں دے سکتی ہوں مگر وہ مانیں تب نا۔ ویسے تم بات کر کے دیکھ لو۔" اپنے پیسوں کے حوالے سے یہ پہلی بات تھی جو اس نے کی تھی۔

ماہین نے بڑے دکھ سے بہن کی طرف دیکھا جو فل اسپیڈ میں چلتے پنکھے کے نیچے بیٹھی کوفت بھرے انداز میں ہاتھ میں پکڑے میگزین سے خود کو ہوا دے رہی تھی۔

"میرا تو انہیں پروفیشن ہی پسند نہیں تو پیسہ کہاں سے جائز معلوم ہوگا۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ لڑکیوں کے ماں باپ خود سب سے بڑے مددگار بنے ہوئے ہیں کیریئر سیٹ کروانے میں۔ فیروز سے پورٹ فولیو بنوانے کے لیے سفارشیں ڈھونڈ کر لاتے ہیں لیکن اگر میں تمہارے لیے کہوں گی تو امی تو مجھے قتل ہی کر ڈالیں گی۔"

اپنی لمبی تقریر کے آخر میں اس نے وہ آئیڈیا بھی پیش کر دیا جو سراسر اس کے فوٹو گرافر میاں کا تھا۔

ماہین ایک دم ہی چڑ گئی۔

"مجھے تو معاف ہی رکھو اور پلیز امی کے سامنے کچھ ایسا ویسا نہ کہہ بیٹھنا' وہ ابھی بیماری سے اٹھی ہیں پھر سے طبیعت خراب کر لیں گی۔"

میرا اس کے بگڑے ہوئے تیوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے قائل کرنے کی دیر تک کوشش کرتی رہی' اس کے میاں کا کئی دن سے اصرار تھا۔

تلخی کچھ زیادہ ہی بڑھنے لگی۔

"تم مر جانا ان ہی تین کمروں میں گھٹ گھٹ کر یا پھر کسی تھرڈ کلاس سے آدمی کا گھر بسا لینا۔ امی تمہارے لیے بس ایسا ہی رشتہ ڈھونڈ سکتی ہیں اور بس۔"

میرا نے سخت طیش کے عالم میں اپنے خوبصورت شیڈ والے بالوں کو سمیٹ کر دوبارہ بینڈ میں جکڑتے ہوئے پوری قطعیت کے ساتھ ماہین کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کی۔

وہ جواب تک پوری طرح سے اس کے ساتھ بحث میں الجھ چکی تھی' ایک دم ہی چپ ہو گئی۔

امی اس کے لیے ایسا ہی رشتہ ڈھونڈ چکی تھیں۔ عمر میں اس سے دگنا' کرخت چہرے والا' بیگم شرافت کا بھائی' جو بیوی بچوں کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کا خواہش مند تھا۔

امی نے اس رشتے کا ذکر کرتے ہوئے اس سے بڑی بے بسی کے ساتھ کہا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا بیٹا! میں اب انتظار میں وقت ضائع نہیں کر سکتی۔ میرا نے مجھے بہت ڈرا دیا ہے' میں بس اب جلد سے جلد تمہیں....."

انہوں نے اور بھی بہت کچھ کہا' بیگم شرافت کے بھائی کی اچھی مالی حیثیت ماہین کو خوش رکھنے کی گارنٹی وغیرہ وغیرہ.....

اس نے کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں سنا' میرا کی شادی کے وقت سے ماں کی آنکھوں میں ٹھہری دکھ کی تحریر کو پڑھ کر وہ روز ہی اس عہد کو تازہ کرتی تھی کہ اسے میرا کی نافرمانی کا ازالہ کرنا ہے اور بس۔

"میں جا رہی ہوں' ایک تو گرمی اتنی ہے کہ انسان بس بوکھلایا ہی رہے۔" میرا اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

اسٹار زوالے سارے ناز نخرے اس نے بہت جلد سیکھ لیے تھے۔ ماہین کو ایک بار پھر سوچنے کی تاکید کرتے ہوئے وہ سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

ماہین ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ دروازہ بند کرنے لگی تو نگاہیں خود بخود زینت آپا کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ سمیع کو ایک ہفتہ کے لیے آفس کے کسی کام سے اچانک ہی لاہور جانا پڑ گیا تھا۔ اس کی موجودگی سے بڑی ڈھارس رہتی تھی گیا تو اس بات کا احساس ہو رہا تھا۔

جاتے جاتے بھی اگرچہ وہ بہت جلدی میں تھا مگر پھر بھی ذرا دیر کے لیے آیا تھا۔

"تم بالکل فکر نہ کرنا ماہین! میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا' سب کچھ سنبھال لوں گا۔"

وہ لاؤنج میں کھڑی شائستہ کے کپڑے استری کر رہی تھی' جب وہ اس کے نزدیک آ کر کھڑا ہوا تھا۔ سامنے ہی امی کچن میں نہ جانے کیا کیا پیسے جا رہی تھیں۔ گرائنڈر کی گھرگھر میں سمیع نے جو بات سمجھانی چاہی تھی' وہ یونہی گئی۔

ماہین نے کپڑوں پر جھکے جھکے سوچا۔

"کیا سنبھال لیں گے سمیع بھائی! میری شادی کے انتظامات۔" کچن میں سے شائستہ سمیع کو آواز دے رہی تھیں' وہ ان کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت سمیع کے ساتھ ساتھ اس کی بات بھی یاد آئی۔

کچھ سوچ کر اس نے اندر جانے کے بجائے زینت آپا کے دروازے پر ہلکی سی دستک دے ڈالی۔

آج کل ڈھیر ساری سوچیں ہر وقت گھیرا ڈالے رکھتی تھیں اور ان میں کوئی بھی خوش کن قرار نہیں دی جا سکتی تھی۔ تہارہ کا انہیں دعوت دینے سے بہتر تھا کہ بڑی آپا کے بچوں کو بلا لیا جاتا۔ ویسے بھی وہ دو ایک دن میں جانے والی تھیں۔

بچے۔ ماہین سے بے حد مانوس ہو چکے تھے۔ فوراً" ہی اپنے دو چار کھلونے اٹھا کر چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

"بے کار میں لے کر جا رہی ہو' دس کام پھیلا کر آئیں گے۔" بڑی آپا بے چاری پیشگی معذرت کرنے لگیں۔

"کوئی بات نہیں بڑی آپا! بچے ہی تو ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

ابا بھی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور اتنی گہری سوچ میں تھے کہ ماہین کی آمد کا نوٹس بھی نہیں لے پائے۔

"السلام علیکم خالو!" انہیں نظر انداز کر کے چلے جانا ماہین کو اچھا نہیں لگا۔

"آں!" وہ چونک سے گئے۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر شاید "وعلیکم السلام" بھی کہا۔

چند لمحے وہ بڑی پرسوچ نگاہوں سے ماہین کے چہرے کو تکتے گئے پھر دھیرے سے بولے۔

"کیسی ہو بیٹا! اچھی تو ہو۔" اس بار چونکنے کی باری ماہین کی تھی۔

یہ نرم سا لہجہ ان کی شخصیت سے ذرا بھی میچ نہیں کر رہا تھا۔ وہ تو خیریت بھی ڈپٹنے کے سے انداز میں پوچھ ڈالتے تھے۔

"جی خالو!" وہ کچھ کنفیوز سی ہو گئی۔

ان کی تلاشتی نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر کے اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

بڑی آپا کے بچے دروازے میں کھڑے چلیں چلیں کا شور مچائے ہوئے تھے' پر ابا کو اس ڈھلتی سہ پہر نہ جانے کون سا معمہ حل کرنے کی پڑی تھی جس کے لیے انہیں ماہین کی مدد درکار تھی۔

"دل تو نہیں گھبراتا؟"

"میرا یاد آتی ہو گی؟"

"امی کے بغیر دن گزارنا کیسا لگتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

ان سارے بے مقصد سوالوں سے انہوں نے جیسے اپنے لیے سارے اہم کلیوز حاصل کیے اور پھر اسی مبہم سے انداز میں اسے جانے کی اجازت دے دی۔

زینت آپا تھوڑے سے فاصلے پر ہی بیٹھی تھیں۔ انہوں نے یہ ساری کارروائی دیکھی بھی اور سنی بھی۔ کچھ کچھ اندازہ بھی تھا' سو ایک ٹھنڈی سانس لے کر بڑی آپا کی طرف متوجہ ہو گئیں جو چائے کی ٹرے لیے آ رہی تھیں۔

"زینت!"

ابا کی آواز پر وہ بڑی آپا سے بات کرتے کرتے خاموش ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"تمہیں ٹھیک طرح سے معلوم ہے کہ شائستہ نے ماہین کی رضامندی حاصل کی ہے۔" پچھلے دو دن سے وہ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں تھے۔

"پوچھ لیا ہے شائستہ نے اس سے اور تصویر بھی دکھا دی ہے۔" انہوں نے اپنی طرف سے بڑا تسلی بھرا

جواب دیا۔

"پھر بھی۔" ابا کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا۔

زینت بیگم نے بڑی آزردگی سے ان کی طرف دیکھا' اس "پھر بھی" کا جواب اتنا تفصیلی دیا جاسکتا تھا کہ وہ ساری عمر بھی بیٹھے سنتے رہتے تو کم تھا مگر وہ صرف اتنا ہی بولیں۔

"ہاں تو پھر کیا کرے۔"

"کیوں' کوئی زبردستی سے ہے کیا۔ ذرا بھی جوڑ نہیں بنتا اس آدمی کا ماہین سے۔" وہ جیسے تڑپ کر بولے۔ انہیں زینت بیگم کی طرح گھٹ گھٹ کر بات کو پینے کی عادت نہیں تھی۔ دو دن خاموش رہ لیے تھے' ان کے حساب سے وہ بھی بہت تھا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ شائستہ کو سوجھی کیا ہے۔ ماہین سے دوگنی عمر ہے اور بات کرو تو پانچ منٹ میں اس کی جہالت اور بدمزاجی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اب شرافت صاحب سے مراسم کا یہ مطلب تو نہیں کہ بالکل ہی آنکھ بند کرلی جائے۔ کسی اچھے رشتے کا انتظار بھی تو کیا جاسکتا ہے۔"

وہ بڑے جوش سے کہتے چلے گئے' ذرا رکے تو ایک دم ہی بڑی آپا بولیں۔

"کہاں سے آئے گا اچھا رشتہ ابا! نہ شائستہ باجی کے پاس ماہین کو دینے کے لیے لمبا چوڑا جہیز ہے اور نہ ذمہ داری اٹھانے کے لیے شوہر یا بیٹا۔ کرنے دیں جو کر رہی ہیں' کم از کم بوجھ تو ہلکا ہوجائے گا۔"

ان کے لہجے میں کیا تھا جو ابا نے دل میں اترتے ہوئے محسوس کیا اور برسوں پہلے کی تلخ سچائی کھٹاک سے سامنے آکھڑی ہوئی۔

انہوں نے بھی تو یہی کہا تھا۔

معمولی سی تنخواہ میں چار بیٹیوں کی ذمہ داری اور ان سب سے چھوٹا سمیع۔ بارہ تیرہ سال پہلے سمیع کا پڑھ لکھ کر کسی قابل ہونا کتنی دور کی بات لگتی تھی' اس وقت انہوں نے بھی تو یہی کہا تھا نا۔

وہ چپ چاپ کٹہرے میں آکھڑے ہوئے۔

آج جو "خصوصیات" وہ شرافت صاحب کے سالے کی گنوا رہے تھے' اس سے کہیں زیادہ بڑی آپا کے شوہر میں اس وقت موجود تھیں۔ جب انہیں شرف قبولیت بڑی آسانی کے ساتھ بخشا گیا تھا۔ محض بوجھ ہی تو ہلکا کرنا تھا۔

پہلی بار انہیں بڑی آپا کی طرف دیکھنے کے لیے بڑی ہمت کا سہارا لینا پڑا مگر وہ اب ان کی طرف سے پیٹھ کرکے بچوں کے کپڑے تہہ کرنے میں مصروف تھیں۔

انہیں اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

کیا ضرورت تھی بھلا یہ ذمہ داری مول لینے کی۔ بلڈنگ کی اتنی لڑکیاں بھی تو آخر بغیر ان کے صلاح مشورے کے بیاہی گئی ہیں' ماہین بھی رخصت ہوجاتی۔

اتنے عرصے سے لگی بندھی طرز پر وہ سوچتے چلے آرہے تھے۔ اسی پر کاربند رہنے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے بڑے سرسری سے انداز میں بولے۔

"خیر ایڈجسٹمنٹ تو کرنی ہی چاہیے۔ میرا کہنے کا مطلب تو صرف اتنا تھا کہ ماہین کے لیے کچھ مسائل تو یقیناً ہوں گے ہی۔"

بڑی آپا جو کپڑے تہہ کرکے اب ہاتھ میں لیے کھڑی تھیں' دکھ کا ایک ہلکا سایہ ان کے سادہ اور معصوم چہرے پر اترا ہوا تھا۔

"آپ اتنی فکر نہ کریں ابا! مڈل کلاس کی لڑکیاں تو ہمیشہ سے ہی "ایڈجسٹمنٹ" کے نام پر یہ زہر پیتی چلی آئی ہیں۔ ماہین بھی پی ہی لے گی' کیا فرق پڑتا ہے۔"

ان کی آواز میں نمی گھلی ہوئی تھی۔ اپنی بات کہتے ہوئے وہ تیز قدموں سے سامنے والے کمرے میں چلی گئیں۔

زینت بیگم نے ایک تاسف بھری نگاہ ڈالی اور پھر ایک گہری سانس لے کر لاؤنج کی کھڑکیوں کے پردے سرکا کر پٹ کھولے تو شام کا سنہرا پن ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کے لیے لاؤنج میں پھیلنے لگا۔

ابا وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے نہ جانے کس حساب کتاب میں مصروف تھے۔

چار بیٹیوں کی شادیاں کرتے ہوئے وہ کس کس کے کتنے قرض دار ہو چکے تھے' یہ آج سے پہلے علم ہی نہیں ہو سکا تھا۔

"عصر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔"

زینت بیگم نے اطلاع دی تو وہ زیر لب کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ایک نظر سامنے والے کمرے پر ڈالی جہاں سے بڑی آپا ابھی تک برآمد نہیں ہوئی تھیں۔ اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر انہیں جیسے کچھ یاد آیا۔ پلٹ کر زینت بیگم کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"تم ذرا شہناز کو فون کر کے کہہ دینا کہ جاوید کے جس دوست کا شارجہ سے نصرت کے لیے رشتہ آیا ہوا ہے وہاں "ہاں" کہلوا دے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

ایک مسکراتی ہوئی نگاہ انہوں نے زینت بیگم کے حیران چہرے پر ڈالی۔ "اور میں نماز پڑھ کر مٹھائی لے کر آتا ہوں' آج رات ہی چل کر شائستہ سے بات کر لیتے ہیں' ماہین بڑی پیاری بچی ہے۔"

کچھ قرض انہوں نے فوری طور پر اتارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اپنے نہ سہی' دوسروں کے سہی۔

کچھ نہ کچھ ازالہ شاید اسی طرح ممکن ہو۔

بڑی آپا کمرے کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کی حیران' آنکھوں میں پھیلتی خوشی کی چمک کو انہوں نے بڑی محبت سے دیکھا۔

ایک سچی گہری خوشی کو دل میں اترتا محسوس کرنا کیا ہوتا ہے۔

یہ تجربہ انہیں ابھی ابھی ہی ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

سفید نیٹ کے پردے کو سرکاتے ہوئے میرا نے ٹیرس کی طرف کھلنے والا گلاس ڈور کھولا تو نمی سے بوجھل ہوتے ہوا کے تیز جھونکے استقبال کے لیے موجود تھے۔

ایک ہاتھ سے اپنے خوبصورت بالوں کو سمیٹتے ہوئے وہ ٹیرس پر چلی آئی۔ جھاگ اڑاتے سمندر کا فسوں حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا مگر عجیب بات تھی کہ اب یہ منظر اس پر سحر طاری نہیں کرتا تھا' بس یونہی بے کار پھیکا پھیکا سا لگتا تھا۔

سی سائیڈ!

فرنٹ ویو!

محض تین سال پہلے شادی کے بعد اس نے فیروز حسین سے اپارٹمنٹ لیتے ہوئے یہ ہی دو فرمائشیں کی تھیں اور محض اس کی خوشی کے لیے وہ اپنا باتھ آئی لینڈ والا گھر خالی کر کے یہاں شفٹ ہوا تھا۔

اس وقت وہ اپنے بخت پر کس قدر نازاں تھی۔ زمین پر پیر دھرنے کو تیار نہیں ہوتی تھی۔

جیسے کوئی حریص بچہ کاؤنٹر پر سجی ساری سوئٹس اپنی جیب میں بھرنے کی فکر کرتا ہے' وہ بھی بس ایسے ہی خواہشوں کے سارے جگنو جلدی جلدی مٹھی میں بند کیے جا رہی تھی۔

یہ سوچے بغیر کہ بند مٹھی میں جگنو کی جھلملاہٹ دم توڑ دیتی ہے اور سچی بات تو یہ کہ سوچنے کی فرصت بھی کسے تھی' زندگی سے صرف اپنا حق وصول کرنے والے سوچنے کی زحمت کم ہی کرتے ہیں۔ "میرا حسین" کو بھی اپنے رنگ محل سے باہر جھانکنے کی فرصت نہیں تھی۔

اور اب جب فرصت ملی تو آس پاس کا منظر یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔

ساتھ والے ٹیرس پر بڑا پیارا بچہ اپنی ریموٹ کنٹرول گاڑی کو بڑی مہارت سے چلا رہا تھا۔

یہ بچہ ابھی کچھ عرصے سے ہی یہاں دکھائی دینے لگا تھا' شاید یہ لوگ نئے آئے تھے۔

کچھ دیر وہ بڑی محویت سے بچے کی دل چسپ حرکتیں اور معصوم مسکراہٹ کو دیکھتی رہی۔

بچے نے بھی شاید اس کی دل چسپی نوٹ کر لی تھی' جب ہی وہ شرمیلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

ننھے وجود کتنی آسانی سے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں' میرا شدت سے کمپنی کا احساس ہوتا' وہاں امی کی طرف جاتی تو ماہین کی سال بھر کی بیٹی کے ساتھ سب ہی کو مصروف پاتی۔

"مجھ سے دوستی کرو گے۔" اس نے ذرا زور سے پوچھا۔ لہروں کا ہلکا ہلکا شور اور تیز ہوا کے باوجود بچے نے اس کی بات سن لی تھی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ گاڑی چھوڑ کر گرل کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

میرا کو بڑا اچھا لگا' وہ اس سے ابھی کچھ پوچھنا ہی چاہ رہی تھی کہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر ایک بڑی پیاری سی لڑکی باہر آئی۔ جینز کے ساتھ ڈھیلی سی ٹی شرٹ پہنے وہ بچے پر نامعلوم خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔

انگلش میں کہے گئے دو چار جملے میرا کے کانوں تک بھی پہنچے۔ بچہ اسے میرا کے متعلق بتا رہا تھا مگر وہ ایک نگاہ غلط میرا پر ڈالتے ہوئے بچے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے واپس اندر چلی گئی۔

ایک ماڈل گرل سے اسے کیا دل چسپی ہو سکتی تھی' جس کی شہرت محض ایک ماچس کی رگڑ کی مانند تھی۔

جلی' بھڑکی اور بجھ بھی گئی۔ پلک جھپکنے کے سے وقفے میں تینوں کام ہو گئے تھے۔

میرا کو بڑی خفت محسوس ہوئی۔

تو کیا وہ اب اس قابل بھی نہیں رہی تھی کہ اسے ذرا سی توجہ کے ساتھ صرف ایک نظر دیکھا جاتا۔

مگر شاید زیادہ فرق ماحول کا بھی تھا' یہاں کوئی کسی کو گردانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اردگرد سے بے نیازی لوگوں کا عام رویہ تھی' جبکہ وہاں امی کے ہاں کبھی کبھار کا جانا اب بھی خاص ہو جاتا تھا۔ آس پاس کے فلیٹوں کی کتنی ہی لڑکیاں بہانے بہانے سے چکر لگا لیتیں۔

"میرا باجی! اب کیوں نہیں آ رہیں آپ ٹی وی پر۔"

"بہت دنوں سے کوئی نیا ایڈ نہیں کیا آپ نے۔"

"کوئی نیا فیشن شو' ہمیں بھی چانس دلوائیں نا۔"

سوال در سوال!

وہ کیا کہتی.....

اپنے منہ سے یہ قبولنا کہ اب اس کی مارکیٹ ویلیو ختم ہو چکی ہے' آسان بات نہیں تھی مگر پھر بھی وہ لڑکیوں کو یہ سمجھانے کی کوشش ضرور کرتی تھی کہ ہر چمکتی چیز ہاتھ میں پکڑنے سے کبھی کبھی ہاتھ جل بھی جایا کرتے ہیں۔ کچھ سمجھ کر اسے بڑی احسان مند نظروں سے تکتیں اور کچھ پیٹھ پیچھے یہ بے وقوفی بھرے تبصرے کرتیں۔

"خود تو خوب پیسہ کما رہی ہیں' دوسروں کو نصیحتیں کرنے چلی ہیں۔"

لاؤنج میں ٹیلی فون کی بیل ہو رہی تھی' گھر کے سناٹے میں ہلکی سی آواز بھی چونکا دیتی تھی۔

میرا نے جلدی سے بڑھ کر فون اٹھایا تو دوسری طرف ماہین تھی۔

ایک گہری سانس لے کر میرا قریب پڑے فلور کشن پر بیٹھ گئی۔

"کتنے دن سے نہیں آئی ہو' معلوم ہے امی کتنا یاد کرتی ہیں۔ گھر بھی اتنی دور لیا ہے کہ آتے ہوئے دس بار انسان کو سوچنا پڑے۔"

فون کے دوسرے سرے سے ماہین بلا تکان اسے ڈانٹے جا رہی تھی۔ اس کے عقب سے زینت آپا کی آواز اور سڑک کے اسی بے ہنگم شور کی آواز بھی آ رہی تھی۔ جس سے وہ ہمیشہ ہی بیزار رہتی تھی۔

ایک بے حد مانوس' رشتوں کی گرمی سے لبریز زندگی کی طرف بلاتا ماحول اب بھی اس طرف موجود تھا۔

"کاش وہ پل سے بھی کم کے وقفہ میں واپس اسی ماحول کا حصہ بن جائے۔" اس کے دل نے پوری سچائی کے ساتھ خواہش کی۔

"کیا ہوا' آواز نہیں آ رہی کیا' ہیلو میرا!" ماہین نے ذرا زور سے بولتے ہوئے پوچھا تو وہ آنکھوں کو ہتھیلی سے رگڑتے ہوئے بولی۔

"سن رہی ہوں' تم خاموش ہو تو کچھ بولوں۔ یہ بتاؤ' امی کیسی ہیں' طبیعت تو ٹھیک ہے نا ان کی۔"

"ہاں بس طبیعت تو ان کی تمہیں پتا ہی ہے تھوڑی اوپر نیچے ہو ہی جاتی ہے' شکر ہے اللہ کا ہم سب لوگ قریب ہیں' امی کو دیکھ بھال کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ میں' زینت آنٹی' سمیع سب ہی....."

میرا کو اب ماہین پر بڑا رشک آتا تھا۔ وہ بلاشبہ خوش قسمت تھی اور یہ ساری خوش قسمتی کیا یوں ہی اس کے حصے میں آ گئی تھی۔

"امی تمہیں بہت مس کرتی ہیں میرا! تمہاری طرف سے وہ بہت فکر مند ہیں' روزانہ نئی نئی باتیں پڑھنے اور سننے کو ملتی ہیں۔ تم اپنے میاں کو سمجھاتی کیوں نہیں ہو آخر۔"

ماہین دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔

فیروز کی بدکرداری آئے دن ایک نئی کہانی کا عنوان بن جاتی تھی۔

میرا کی نظریں ماں اور بہن کے سامنے جھک جاتی تھیں۔ "اس کی وجہ سے وہ دونوں اپنے اپنے سرکل میں کیسی شرمندگی محسوس کرتی ہوں گی بھلا۔"

ٹیلی فون رکھتے ہوئے وہ دس بار کی سوچی ہوئی بات کو پھر خود سے دہرا گئی۔

"اور اگر انہیں فیروز حسین کی ان تازہ کوششوں کے بارے میں پتا چل جائے جو وہ اس کے سلسلے میں جاری رکھے ہوئے ہیں تو؟"

چپکے سے ایک آواز اندر سے ابھری تو وہ بری طرح خوفزدہ ہو گئی۔

امی اور ماہین کو اپنی ذات سے کوئی نیا دکھ دینے کا تصور بھی اب آسان نہیں رہا تھا۔

انسان کو اپنی غلطیوں کا احساس اسی وقت ہی کیوں ہوتا ہے جب اس کے پاس کھو دینے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

"تو پھر تم نے کیا سوچا' کر رہی ہو یا مجھے دوسرا انتظام کرنا پڑے گا۔" کئی دن بعد فیروز حسین پھر اس کے روبرو تھا۔

آج کل وہ سویرے اٹھنے لگی تھی' اپنے لیے چائے کا کپ بنا کر لاؤنج میں آ کر بیٹھی تھی کہ دو راتوں سے غائب فیروز حسین کی آمد ہوئی۔

"میں تمہیں پہلے بھی جواب دے چکی ہوں اور اب بھی وہی ہے۔" میرا نے اس کے چہرے کی خشونت اور لہجے کی کرختگی دونوں کو نظرانداز کرتے ہوئے پورے سکون کے ساتھ جواب دیا۔

"تم ہو کیا چیز میرا بیگم! اوقات پہچانتی ہو اپنی' اس دو کمروں کے فلیٹ سے یہاں آ پہنچی ہو تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

رواداری' محبت' مروت جیسے جذبے دونوں کے بیچ میں سے کب کے اٹھ چکے تھے یا شاید ان کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔

"لڑکیاں' پانچ سات سال نکال ہی لیتی ہیں اس فیلڈ میں' ایک تم ہو' دو سال بھی ڈھنگ سے نہیں چل پائیں۔ میرا وقت اور پیسہ دونوں برباد ہوا۔ اونہہ! مڈل کلاس ذہنیت کی لڑکی کبھی سروائیو ہی نہیں کر سکتی اس فیلڈ میں۔ بہرحال آخری بار پوچھ رہا ہوں یہ شوٹس کرواؤ گی یا نہیں۔"

"نہیں۔" وہ کسی بھی قیمت پر خود کو اس حد کے لیے تیار نہیں کر پائی۔ میرا کے لہجے میں قطعیت تھی۔

عریانی کی حدوں کو پار کرتے ہوئے آؤٹ فٹس پہننے سے اس نے پہلے بھی انکار کیا تھا اور ابھی بھی انکاری تھی اور اپنی اس مڈل کلاس ذہنیت پر شرمندگی نہیں' فخر محسوس ہونے لگا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے' یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔ میں بے مصرف چیز پر وقت اور پیسہ ضائع کرنے والا شخص نہیں ہوں۔"

غصے کی انتہا پر پہنچتے ہوئے فیروز حسین کو یک بارگی یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ خوامخواہ ہی اپنی انرجی ویسٹ کر رہا ہے۔

بے حد گھاگ کھلاڑی ہونے کے باوجود وہ اس بار غلط پتوں پر داؤ لگا چکا تھا۔

میرا نے ایک نظر اس پستہ قد اور معمولی صورت والے شخص کو دیکھ کر آخری بار یہ سوچا کہ وہ اس شخص کی آخر کون سی بات پر فدا ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آتی سردیوں کی نرم دھوپ سے بھرا دن تھا جب شائستہ روٹ کی بس سے اپنے فلیٹ کی سامنے والی روڈ پر اتریں۔

آج وہ بس تھوڑی دیر کے لیے ہی اپنے بوتیک گئی تھیں' مسز خاور کو خدا حافظ کہنے۔

بوتیک کی جاب انہوں نے چھوڑ دی تھی اور اس کے پیچھے سو فیصد میرا کی مرضی تھی۔

"مسز خاور آپ کی خدمات سے بہت مستفید ہوئیں' اب کچھ مدد آپ کو میری کرنی ہوگی۔" اپنی عدت ختم ہونے سے پہلے سے وہ یہ رٹ لگائے ہوئے تھی۔

وہ اسے کیسے انکار کر سکتی تھیں' زندگی کا جو تاریک باب اس نے حال میں ہی ختم کیا تھا' اس سے روشنی میں آنے کے لیے اسے کسی مہربان سہارے کی ضرورت تو تھی نا۔

تو پھر ان سے بڑھ کر میرا کے لیے دوسرا کون ہو سکتا تھا۔ بجائے سڑک کراس کر کے اپنے فلیٹوں کی طرف جانے کے وہ اس سائیڈ پر داہنی طرف تھوڑا آگے کی طرف چلتی چلی گئیں۔

تھوڑے ہی فاصلے پر ایک خوش رنگ عمارت کے آگے رک کر انہوں نے اس پر لگے بورڈ کو پڑھا' ایک چھوٹے سے مونٹیسوری اسکول کا گیٹ چوکیدار نے ان کے لیے کھولا تو وہ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہو گئیں۔

سامنے شیشے کی کھڑکی کے پار میرا فائلوں پر جھکی بے حد مصروف نظر آ رہی تھی۔ اس کا نیا دفتر یہی تھا۔

اور اب جبکہ صحیح سمت کی طرف وہ پہلا قدم بڑھا چکی تھی تو ایک روشن منزل کہیں نہ کہیں اس کی بھی منتظر تھی۔

دل میں بھرپور یقین لیے شائستہ بہت مطمئن سی "ایڈمنسٹریٹر" کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

★

اقبال بانو

مگر دل اداس ہے

"نمو آگئی ہے۔" ساجدہ بیگم نے اسے چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے کہا۔

اس نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ نہ چہرے سے نہ لبوں سے' آہستہ سے پیالی لبوں سے لگالی اور ساجدہ بیگم سمجھ گئیں کہ وہ کچھ نہیں کہنا چاہتا اور بھلا وہ کہتا بھی تو کیا۔

نمو آگئی تھی۔ اسے تو بہت پہلے پتا تھا کہ وہ آجائے گی اس لیے یہ انہونی بات نہ تھی۔ ساجدہ بیگم اندر چلی گئیں اور وہ چائے پیتے ہوئے ٹی وی دیکھنے لگا۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی کہ حرا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"بھائی! وہ نمو آپی آگئی ہیں۔"

وہ یوں بتا رہی تھی جیسے کہ پہلی اطلاع وہی اسے دے رہی ہو مگر اس کے لبوں پر کوئی جنبش نہ ہوئی تھی۔

تب ہی وہ آگئی جس کے کپڑوں سے اسے ہمیشہ مسالوں کی خوشبو ہی آیا کرتی تھی اور وہ سخت چڑتا تھا۔

"میرے پاس آیا کرو تو کم از کم یہ "کچن ڈریس" بدل کر آیا کرو۔" مگر جب سے نمو گئی تھی' شاید اس کے سونگھنے کی حِس ہی مر گئی تھی۔ کبھی اس نے نہیں کہا تھا کہ اسے مسالوں کی بو آتی ہے۔

"خالہ کہہ رہی ہیں' شام کے لیے کیا پکائیں۔"

"پہلے مجھ سے پوچھا جاتا تھا؟" وہ تڑخ کر بولا۔

"آج آپ گھر میں ہیں تو پوچھا جا رہا ہے' اب آفس جا کر تو آپ سے پوچھنے سے رہے۔"

"جو مرضی پکالو۔" وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔

جاتے جاتے اس نے سنا' شانی کہہ رہی تھی۔

"تمہارے بھائی کے مزاج ہی نہیں ملتے۔"

"شانی آپا! دکھ بھی تو کتنا بڑا پایا ہے۔"

"دکھ کی کیا بات ہے' محبوبہ چلی گئی تھی' اب آگئی ہے تو خوش ہوں' بھنگڑا ڈالیں۔ یوں بھی آج کل تو محبت کاروبار ہے۔ اب دیکھ لو' نمو نے کیسی دھواں دھار محبت کی' پا بھی لیا اور اب واپس کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔"

وہ زور زور سے بول رہی تھی اور اسے پتا تھا کہ اس کو سنا رہی ہے۔ دل تو چاہا جا کر ٹینٹوا دبا دے مگر۔۔۔ ہاں مگر غلط تو نہیں کہہ رہی تھی۔

"لیکن شاہانہ بیگم! یہ تم مجھے کیوں سنا رہی ہو' اب میرا نمو سے کیا تعلق' کیا واسطہ جو اس کے طعنے مجھے ملیں۔" اس نے دکھ سے سوچا تو اس کے اندر درد کی لہر سی اٹھی تھی۔

"واسطہ نہیں' تعلق نہیں تو یہ درد کیسا؟" کیسی سرگوشی تھی' وہ چونک گیا۔ اس کے اندر سے یہ آواز آئی تھی۔ وہ طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"اے شانی! جلدی سے چائے تو پلوا دو۔" اس نے شانی کے کمرے میں جھانک کر کہا۔

"ابھی چائے کا ٹائم نہیں ہوا۔" وہ رسالہ پڑھ رہی تھی۔

"تمہیں کیا غرض ٹائم سے؟"

"خالہ لڑتی ہیں کہ اتنی جلدی چینی پتی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ تو سمجھتی ہوں گی' میں پھانکتی ہوں۔"

"کیا خبر۔" وہ مسکرایا۔

"مجھے تو چائے اچھی ہی نہیں لگتی۔" اس نے بتایا۔

"تو چینی پھانک لیتی ہوگی۔" وہ بولا۔

"جی نہیں' فضول عادتیں نہیں ہیں میری"

"اچھا چائے تو پلاؤ' سچ میرا سر پھٹا جا رہا ہے' درد سے۔" سکندر نے انگلیوں سے پیشانی دبائی۔

"واقعی۔" وہ پریشان ہو گئی۔ "پہلے بتانا تھا کہ سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں سمجھی چسکے کے لیے پینا چاہتے ہو۔ چلو کمرے میں' میں وہیں لاتی ہوں۔" وہ چارپائی کے نیچے اپنی چپل تلاش کرنے لگی۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ دو کپ چائے چھوٹی طشتری میں رکھے اس کے کمرے میں آگئی۔

"کیا حال ہیں نمو!" شانی نے مروت نبھائی۔

"ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو' پیپر کیسے ہوئے؟" نمو

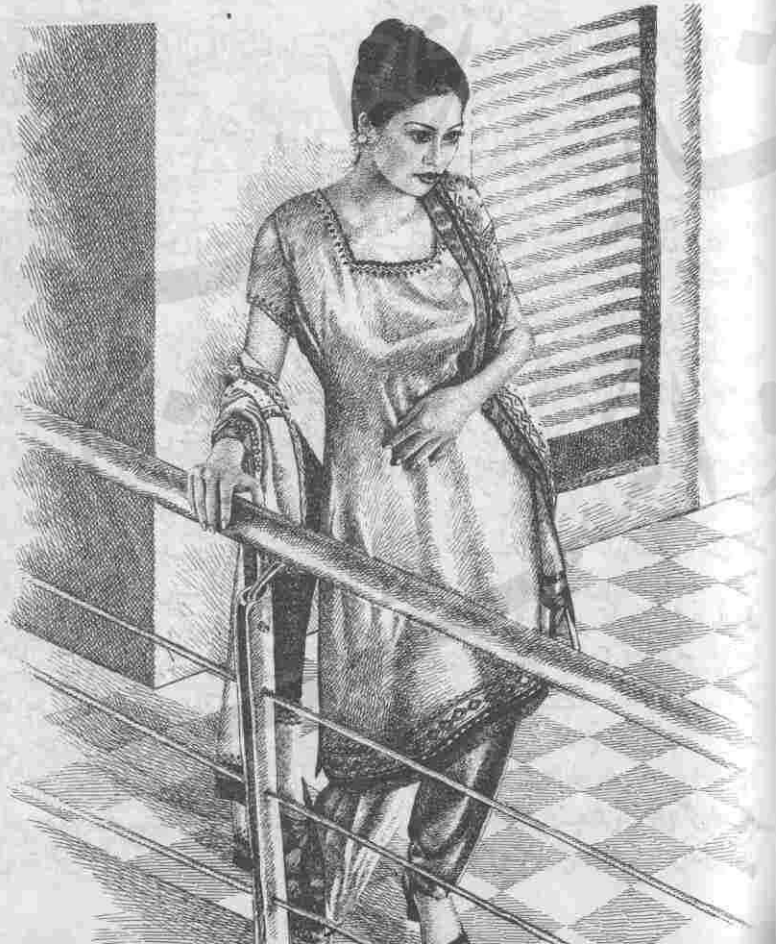

نے پوچھا۔
"بہت اچھے۔"
"ہاں پاس تو ہو ہی جائے گی۔" سکندر بولا۔
"جی نہیں' اگر فرسٹ ڈویژن نہ لی تو دیکھنا۔" وہ اکڑ کر بولی۔
"دیکھ لیں گے۔" سکندر نے کپ اٹھایا اور نمو کی طرف بڑھایا پھر دوسرا خود لے لیا اور بولا۔
"تمہیں کیسے پتا تھا کہ دو کپ چائے چاہیے۔"
"مجھے پتا تھا نمو یہیں ہوگی۔" وہ کہہ کر ایک دم ہی پلٹ گئی تھی۔
"ویسے بہت ذہین ہے شانی! اگر خالہ خالو اتنی جلدی چلے نہ جاتے تو۔۔۔"
"ممانی جان نے بھی تو نوکرانی بنا کر رکھا ہوا ہے' آخر سگی بھانجی ہے۔" نمو نے کہا۔
"امی تو منع کرتی ہیں مگر اسے ہی چین نہیں آتا۔ کہتی ہے گھر کے کاموں میں مزا آتا ہے۔"
"توبہ ہے' واحد لڑکی دیکھی ہے جسے گھر کے کاموں میں مزا آتا ہے۔ مجھے تو مسالوں کی بساند سے ہی الٹی آنے لگتی ہے۔" نمو نے جھرجھری سی لی تو سکندر اس کی اس ادا پر فدا ہی ہو گیا۔
شانی' سکندر کی خالہ زاد تھی۔ آٹھویں کلاس میں پڑھ رہی تھی جب وہ مستقل ان کے گھر آگئی کہ عابدہ اور تنویر ایک حادثے میں چل بسے تھے۔ شانی ان کی اکلوتی اولاد تھی' تب ساجدہ بیگم اسے اپنے گھر لے آئیں کہ جوان ہوتی لڑکی تھی' کس کے پاس چھوڑتیں۔ ان کے اپنے صرف دو بچے تھے' بڑا سکندر بخت جو بی کام کر رہا تھا اور اس سے آٹھ سال چھوٹی حرا جو ان دنوں چھٹی جماعت میں تھی۔ شانی تو حرا کے لیے آیا' سہیلی سب کچھ ہی بن گئی۔ دونوں میں بہت ہی پیار تھا' البتہ سکندر ذرا لیے دیے رہتا۔
نمو' سکندر کی پھوپھی زاد تھی' گھر قریب تھا اس لیے اکثر ان کے گھر پائی جاتی۔ ایف ایس سی کر رہی تھی اور سکندر سے مفہوم پڑھنے کے بہانے آجاتی۔ جو بقول شانی کے پڑھتی کم اور سکندر کو دیکھتی زیادہ تھی۔
شانی تھی تو ابھی چودھویں سال میں مگر قد کاٹھ ایسا تھا کہ لگتی بیس کی تھی۔ اونچی لمبی گوری چٹی' بڑی بڑی غلافی آنکھوں والی شانی جس نے ماں باپ کی موت کے دکھ کو اپنے تک ہی محدود رکھا تھا۔ اسے پتا تھا اگر وہ روئے دھوئے گی تو لوگ سوائے ترس کھانے کے اور کیا کریں گے۔ ہر کوئی اپنے دکھوں پر روتا ہے اور وہ بھی رات کی تاریکی میں اپنے دکھوں پر روتی تھی۔
گھر کا سارا کام اس نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ صبح ناشتہ تیار کر کے سب کو دیتی پھر وہ اسکول جاتی کہ حرا کے اسکول ہی میں اسے داخلہ مل گیا تھا' دونوں ساتھ جاتیں اور ساتھ ہی آتیں۔
دوپہر کو ساجدہ بیگم کھانا تیار کر لیتیں۔ البتہ شام کو وہ انہیں کچن میں گھسنے نہ دیتی تھی اور جھٹ پٹ رات کا کھانا تیار کر لیتی اور پھر آہستہ آہستہ ناشتہ اور رات کا کھانا اس کی ذمہ داری ہو گیا۔ البتہ مہمان آجاتے تو پھر ساجدہ بیگم ہاتھ بٹا دیتیں کہ ان کا سسرال بہت بڑا تھا۔ سب اسی شہر میں تھے' آئے روز کوئی نہ کوئی آہی جاتا تو کھانا کھلائے بغیر نہ بھیجا جاتا جبکہ نمو تو ہر وقت کی مہمان تھی۔ نمو اور سکندر بخت کی دلچسپی کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی اور پتا نہیں کیوں نمو کو سکندر کے قریب دیکھ کر شانی کو بڑا غصہ آتا مگر وہ اس کی خاطر مدارات بھی کرتی کہ مجبوری تھی اور سکندر بھی نمو کے سامنے خوب چہکتا مہکتا۔ اس پر تنقید کرتا۔ خصوصاً" اس کے لباس پر کہ مسالوں کی بساند آتی ہے۔
"خدا کے لیے شانی! یہ "کچن ڈریس" پہن کر میرے قریب نہ آیا کرو۔" وہ کئی بار کہہ چکا تھا۔
"میں تمہارے قریب کب آتی ہوں' خود ہی بلاتے ہو۔ پانی لاؤ' چائے لاؤ' اب گھڑی گھڑی تو میں کپڑے بدلنے سے رہی' اتنا نخرہ ہے تو مت کام کہا کرو۔" وہ تڑ سے بولتی اور سکندر چپ ہو جاتا۔
وہ نمو کی محبت کے ہنڈولوں میں جھول رہا تھا۔ نمو کی محبت اس کے رگ و پے میں اتر چکی تھی اور نمو بھی تو اسے چاہتی تھی' کبھی ہولے سے اس کے ہاتھ پر

ہاتھ رکھ دیتی تو سکندر کو لگتا ڈھیر ساری ٹھنڈک اس کے دل میں اتر گئی ہو۔

☆ ☆ ☆

سکندر کا یونیورسٹی میں ایم کام میں داخلہ ہو گیا تھا جبکہ نمو ایف ایس سی کے امتحانوں سے فارغ ہوئی تھی۔ شانی نے فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تھا۔ نمو اب بھی شام کو آجاتی تھی اور لان میں سکندر کے ساتھ چائے پیتی' ٹینس کھیلتی' کبھی کیرم کھیلا جاتا۔
"سکندر! تمہاری کلاس میں لڑکیاں بھی ہوں گی۔"
ایک روز لیڈو کی گوٹی چلاتے ہوئے ایک دم نمو نے پوچھا۔
"ہاں ہیں تو' کیوں؟" وہ کچھ نہ سمجھا۔
"کوئی تمہیں بھی پسند آئی۔" نمو نے پوچھا۔
"میں وہاں لڑکی پسند کرنے تو نہیں گیا اور یوں بھی میں نے جو لڑکی پسند کرنی تھی' کر لی۔" وہ شرارت سے بولا۔
"کون ہے؟" نجانے وہ کیا جاننا چاہ رہی تھی۔
"ہے ایک نک چڑھی۔" اس نے چھیڑا۔
"دیکھو سنی! اگر تم نے کسی اور کو پسند کیا نا تو وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا جس روز تمہارے لبوں پر کسی اور کا نام آیا۔۔۔" نمو نے وارننگ دی اور سکندر اسے دیکھتا رہ گیا۔
اور پھر کچھ یوں ہوا کہ وہ تو اپنی محبت میں سچا تھا' اسے نمو پر بھی اعتبار تھا مگر نمو بدل گئی۔
جیسے موسم بدلیں۔
جیسے رات سے دن بدلے۔
صرف چند روز کے لیے ان کے گھر اس کا چچا زاد خرم آکر رہا تھا۔ وہ امریکہ سے آیا تھا اور یہاں گارمنٹ کی فیکٹری لگا رہا تھا۔ ساتھ ہی ڈیفنس میں اس نے کوٹھی کی تعمیر بھی شروع کروا رکھی تھی۔ چم چم کرتی گاڑی' قیمتی ملبوسات جو خوشبوؤں میں بھیگے ہی رہتے۔ شاید ان خوشبوؤں کے حصار میں نمو بھی آگئی تھی۔ اب اس کا سکندر کے ہاں آنا بھی کم ہو گیا تھا۔ سکندر تو اس کا عادی تھا' برداشت نہ ہوا تو ایک روز وہ پھوپھو کے ہاں جا نکلا۔ نمو گھر پر نہیں تھی' اس کے دل پر گھونسا سا لگا۔ پتا چلا تھا کہ وہ خرم کے ساتھ گئی ہے۔
وہ دکھے دل کے ساتھ گھر آیا۔
اس کا ذہن کہتا' نمو بدل گئی ہے۔
مگر دل کہتا۔ نہیں' ساری دنیا بدل سکتی ہے' نمو نہیں بدل سکتی۔ آخر ہم دونوں محبت کرتے ہیں۔
اسے یقین تھا کہ پھوپھو اسے بتائیں گی۔ سکندر آیا تھا تو وہ بھاگی بھاگی آئے گی مگر آنا تو درکنار اس نے تو فون بھی نہیں کیا تھا۔
اور پھر ایک روز سکندر کو پتا چلا نمو کا خرم سے نکاح ہو رہا ہے تو وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر در محبوب پر چلا آیا۔ اتفاق تھا' نمو گھر میں ہی تھی۔ پھوپھو اسے بٹھا کر چائے لینے چلی گئیں تو سکندر نے دیکھا۔
نمو تو بہت بدل گئی تھی۔ اس کا چہرہ' اس کا ہیئر اسٹائل' کیا خبر دل نہ بدلا ہو۔
"نمو! کیا یہ سچ ہے تمہارا خرم سے نکاح ہو رہا ہے۔"
"ہاں سکندر! جب کوٹھی تیار ہو جائے گی تو شادی پھر ہو گی۔" اس نے بتایا۔
"نمو!" سکندر نے کہنا چاہا۔
"پلیز سکندر! مجھے ماضی میں مت لے جاؤ۔ میرے جو خواب ہیں' وہ خرم چند ماہ میں پورے کر دے گا' جبکہ تمہیں تو برسوں چاہئیں اور میں اتنا انتظار نہیں کر سکتی کہ زندگی بہت مختصر ہے۔ میں زندگی میں ناکام نہیں ہونا چاہتی۔ وقت نے مجھے چانس دیا ہے تو میں یہ چانس مس نہیں کر سکتی۔ پیٹ میں روٹی نہ ہو تو یہ محبت وحبت سب دیوانے کا خواب ہوتی ہے اور مجھے تو لگتا ہے مجھے خرم سے محبت ہے۔ کہتے ہیں محبت' حالات اور وقت کے ساتھ بدلتی ہے تو یہ سچ ہے۔ وہ نجانے کیا کہتی رہی اور سکندر کو لگا جیسے اس کے اردگرد دھماکے ہو رہے ہوں اور ڈھیر سارا ملبہ اس پر آرہا ہو۔
اس ملبے تلے اور تو کوئی نہ آیا' سکندر اور نمو کی محبت دب گئی۔ سکندر بے مراد لوٹ آیا۔ اس نے

اپنے چہرے پر دکھ کا اشتہار تو نہ لگایا مگر وہ اب ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ سرِشام ہی کمرے میں گھس جاتا ورنہ پہلے تو وہ نمو کا انتظار کرتا تھا اب کس کا انتظار کرتا؟

اس نے ایم کام کیا تو اسے ملٹی نیشنل کمپنی میں منیجر کی جاب مل گئی' ان دنوں نمو کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ ان کے گھر سے سب شریک ہوئے' بس سکندر رہی نہ گیا۔

اور پھر اس کا ذکر ہی قصہ پارینہ بن گیا۔ ساجدہ بیگم چاہتی تھیں کہ اس کی شادی کر دیں تاکہ گھر کا جمود ٹوٹے مگر وہ راضی ہی نہ تھا۔

"ابھی نہیں۔"

اس کا ایک ہی جواب ہوتا اور ساجدہ بیگم دکھی ہو جاتیں اور پھر خرم اور نمو کے تعلقات کے بارے میں خاندان میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔

"نمو بہت دکھی ہے۔"

یہ جملہ اس کے کانوں میں بھی پڑا مگر اس نے سوچا میں بھی تو دکھی ہوں۔

پھر سنا' خرم اسے مارتا ہے۔

خرم نہیں' مقدر مارتا ہے۔ سکندر مسکراتا۔

خرم کے بازاری عورتوں سے تعلقات ہیں۔

خرم ڈرنک کرتا ہے۔

خرم ریس اور جوا کھیلتا ہے۔

اور پھر آج اس نے سنا تھا کہ نمو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آ گئی ہے' اسے طلاق ہو گئی تھی۔ وہ جو وقت سے اپنے حصے کی خوشیاں چھین لینا چاہتی تھی۔

بس اتنی خوشیاں تھیں وقت کے پاس اس کے لیے' اس نے خود کو داؤ پر لگا دیا۔ کتنا گھاٹے کا سودا کیا تھا۔ کاش! ہم مقدر کے تابع نہ ہوتے۔ سکندر بخت کی آنکھوں کے فرش گیلے ہو گئے۔

وہ آفس سے آیا تو لاؤنج میں پھوپھو اور نمو کو دیکھ کر ایک لحظہ کو ٹھٹکا۔ حالانکہ رات ساجدہ بیگم نے اسے بتایا تھا کہ "کل تمہاری پھوپھو اور نمو آئیں گی اور وہ تم سے معافی مانگنا چاہتی ہے' بیٹا! معاف کر دینا اور۔۔۔"

"اور امی! یہ کہ ان سے کوئی وعدہ نہ کر بیٹھے گا۔ میں کہیں اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔" سکندر نے بتایا۔

"کیا۔۔۔ کیا مطلب' کون ہے وہ؟"

"وہ۔۔۔" سکندر مسکرایا اور جب اس نے بتایا تو ساجدہ بیگم بھی مسکرا دی تھیں۔

اب وہ پھوپھو کو سلام کر کے اندر چلا گیا تھا۔ نمو کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔

شانی اس کے لیے چائے لے آئی تھی اور بولی۔

"پہلے سوچا مہمانوں کے ساتھ چائے لگا دوں آپ کی بھی۔"

"پھر؟" سکندر نے پوچھا۔

"پھر سوچا' نمو یہیں آ جائے گی' دو کپ لائی ہوں۔" وہ بولی۔

"اب وہ نہیں آئے گی۔" سکندر بولا۔

"میں بھیجتی ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔"

"ہائے! وہ سموسے جل جائیں گے۔" وہ جلدی سے باہر بھاگی اور سکندر ہنس دیا۔

پھر وہ شاور لے کر لباس بدل کر باہر آیا تو وہ وہاں نہیں تھی۔ لگتا ہے کچن میں ہو گی' وہ کچن کی طرف آیا تو وہ حسبِ معمول گنگناتے ہوئے سموسے تل رہی تھی۔

کھیڈ مقدراں دی
کوئی جیت گیا کوئی ہار گیا

وہ سنتا رہا' سموسے اس نے پلیٹ میں رکھے اور پلٹی تو وہ کچن کے دروازے میں کھڑا تھا۔

"کیا ہے' ہٹیں۔"

"سنو۔" سکندر بولا۔

"بولیں۔"

"مجھ سے شادی کرو گی؟" اس نے پوچھا۔

"وجہ؟" شانی نے اسے دیکھا۔

"وجہ یہ ہے کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور نمو؟"

"اس کا یہاں کیا ذکر؟" وہ جھنجلا گیا۔

"آپ تو اسے چاہتے تھے۔"

"تم تو مجھے چاہتی ہو۔"

"یہ کس نے کہا؟" وہ پٹاخ سے بولی۔

"تمہاری آنکھوں نے۔" وہ بولا۔

"آنکھوں کی زبان سمجھتے ہیں۔" وہ چہکی۔

"اور کسی کی نہیں مگر تمہاری آنکھوں کی زبان سمجھتا ہوں' جن میں صرف میری شبیہ ہلکورے لیتی ہے۔ میرے دیر سے آنے پر یہی آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں اور مجھے دیکھ کر ہیروں کی چمک ان میں ابھر آتی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ بڑی راز فاش کر دینے والی ہیں میری آنکھیں۔" وہ ہنس دی۔

"بولو' مجھ سے شادی کرو گی نا۔" وہ نہایت محبت سے پوچھ رہا تھا۔

"آخر نمو میں کیا برائی ہے' وہ آپ کی محبت رہی ہے' اگر ایک غلطی اس سے ہو گئی تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اسے معاف ہی نہ کیا جائے۔ سکندر بخت! محبت تو معاف کرتی ہے۔"

"محبت میں معافی ہوتی ہے شاہانہ! مگر واپسی نہیں ہوتی۔ جس طرح ہر شے فنا ہے' محبت بھی مر جاتی ہے۔ وقت کے ساتھ' حالات کے ساتھ اور مجھے جو نمو سے محبت تھی' وہ بھی مر گئی۔ اس روز جب اس نے میرا اعتبار ختم کیا' میرے اعتماد کی چادر کو تار تار کیا' اس روز میری محبت بھی ختم ہو گئی۔ محبت میں اعتبار پہلی شرط ہوتا ہے۔ مجھے بتاؤ' جب مجھے اس پر اعتبار ہی نہیں تو میں اسے کیسے اپناؤں' مجھے میرا اعتبار ہی نہیں مل پائے گا۔ تو محبت۔۔۔"

"اگر وہ آپ سے معافی مانگ لے۔" شانی نے پوچھا۔

"پھر بھی نہیں' میں کسی صورت بھی نمو کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کروں گا' تم بتا دینا اسے۔ مجھے پتا ہے آج وہ اسی معافی تلافی کے لیے آئی ہے۔ کہہ دینا کہ سکندر بخت کے دل تک اب وہ کبھی نہیں پہنچ سکتی کہ اب وہاں شاہانہ کا بسیرا ہے۔ میں نے امی سے بات کر لی ہے' صرف تمہارا اقرار چاہیے اور مجھے یقین ہے تم انکار نہیں کرو گی کہ تمہارے انکار کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہی ہو گا جو میں چاہوں گا۔" وہ اپنا پورا استحقاق استعمال کر رہا تھا۔

"مگر ویڈنگ ڈریس میں اپنی مرضی کا بنواؤں گی۔" وہ لہک کر بولی۔

"چلو منظور ہے' کیسا؟"

"یہی کچن ڈریس ٹھیک رہے گا۔" اس نے مسکراہٹ چھپائی۔

"ہاں' ٹھیک ہے' میری بچت بھی ہو جائے گی اور یوں بھی تم اس میں بہت اچھی لگتی ہو۔" سکندر نے کہا۔

"سکندر!" اس نے مکا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ سکندر کے مضبوط ہاتھ نے اس کی کلائی تھام لی۔ شاہانہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آج محبت کے چراغ روشن تھے' بڑا والہانہ پن تھا اور اس کی نظروں کی تاب شانی کی نظریں نہ لا سکیں اور جھکتی چلی گئیں۔ اس کا یہ شرمیلا روپ سکندر کے اندر ڈھیر ساری روشنیاں بکھیر گیا۔

"نمو مر گئی۔" شانی بتا رہی تھی۔

"اچھا! اس کو مرنا ہی تھا۔"

"سکندر تم اتنے کٹھور کیوں ہو۔" وہ چلائی۔

"بھئی! ظاہر ہے' گھر نہ رہے عورت کا' تو مر ہی جاتی ہے نا۔" وہ مسکرا دیا اور نہ کہہ سکا کہ وہ جو سمجھتی تھی' وہ خرم سے محبت کرتی ہے' ایسا نہ تھا۔ محبت تو اس کی سکندر ہی تھا' وہ تو خرم کی دولت سے محبت کرتی تھی۔

اور وہ جو کہتی تھی "دیکھو سنی! تم نے کسی اور کو پسند کیا تو وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

محبت مر جاتی ہے مگر محبت میں واپسی نہیں ہوتی۔

سکندر بخت کو آج اس بات کا یقین آ گیا تھا' اس کی پلکوں سے دو آنسو ٹپکے جنہیں اس نے اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیا۔ اب وہ اپنی محبت کی موت پر دو آنسو بہانے کا استحقاق تو رکھتا تھا نا!۔

نزہت شبانہ حیدر

ستارے کو خبر ہونے دو

ایک بات تو طے تھی کہ میں کام بہت تیزی سے کرتی تھی۔

اب یہ پتہ نہیں اچھی عادت تھی کہ بری، مجھے یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔ گھر میں امی ابو حتی کہ بھائی کو بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ صبح کا ناشتہ یا دوپہر کا کھانا اریزہ نے بنایا ہے۔

انہیں تو بس، مطلب یہ کہ بھائی کو یہی نظر آتا کہ جس وقت وہ آفس سے آتے ہیں، اس وقت انہیں بھابھی کچن میں نظر آتی ہیں۔

میں اس بات پر اکثر ہی کڑھ کر رہ جاتی۔ جب بھائی جان کسی لیکچر میں مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے کہ میرے لیے بھی ہاتھ پاؤں چلانا کتنا ضروری ہے اور میں یہی سوچ کر رہ جاتی کہ آج کل کے دور میں ہاتھ پاؤں چلانے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ بندے کو زبان چلانی آجائے، باقی سب خیر ہے۔

جس وقت صبح سب سو رہے ہوتے تھے، امی مجھے

ناولٹ

ناشتے اور کالج کے لیے اٹھا دیا کرتی تھیں۔ میں ان دنوں فرسٹ ایئر میں تھی اور زندگی کے سہانے خوابوں میں سے ایک خواب یہ بھی تھا کہ بھائی کی شادی کے بعد ناشتا بھابھی بنا دیا کریں گی، کیونکہ پوری رات کا تو مجھے پتہ نہیں کہ میں سوتی تھی یا جاگتی تھی۔ لیکن فجر کی نماز کے بعد تو ایسی زبردست نیند آتی تھی، نیند اور سنہرے خواب۔ ابھی میں نے خواب کی وادی میں قدم رکھا نہیں کہ امی کی آواز سے وہ سارے سپنے زمین بوس ہو جاتے۔

"اریزہ! اٹھ جاؤ بیٹا، ناشتا بنانا ہے۔"

"امی! ایک دن بھابھی سے کہہ دیں۔" میں کروٹ بدل لیتی۔

"بری بات اریزہ! جب اپنا کام ہے تو خود کرو۔"

"مگر امی!"

"امی کی جان! بندہ اپنی عادتیں کیوں خراب کرے۔ آج اکیلی ہے پھر بچے وغیرہ ہو جائیں گے اس کے بعد کیا ہو گا۔ بچے کی اپنی ہزار ضرورتیں ہوتی ہیں جو صرف ماں ہی پورا کر سکتی ہے پھر صبح کا وقت بہت مختصر ہوتا ہے، ایسے مختصر وقت میں دلہن ناشتا بنائے یا بچے کو دیکھے گی۔"

"امی! آپ تو بس۔"

"اس زمانے کی تیاری وقت سے پہلے کر کے رکھ

لو۔ آنے والے وقت کی تیاری تو پہلے سے ہی کرنی ہوتی ہے نا ورنہ پھر پریشانیوں کے لیے تیار رہو۔"

"امی! آپ اسی لیے پریشان نہیں ہوتیں۔"

"پریشانی تو انسان کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ اریزہ! لیکن اس کا کوئی نہ کوئی حل بھی ضرور ہوتا ہوگا' اس حل کو سوچا کرو' پریشانی میں پریشان ہونا کوئی مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

"اچھا امی! آج تو یوں کریں کہ ڈبل روٹی منگوالیں پھر ذرا مسئلے کا حل سوچتے ہیں۔"

"کون سا مسئلہ؟" امی نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"مسئلہ کون سا ہوتا ہے امی!" میں نے دل ہی دل میں شعر پڑھا۔

یہی ہے نا تمہیں ہم سے بچھڑ جانے کی جلدی ہے
کبھی ملنا تمہارے مسئلے کا حل نکالیں گے

یہ شعر پڑھ کر یا سوچ کر بھی مجھے بڑا عجیب سا خیال آتا تھا۔ میں ہمیشہ یہی سوچتی تھی کہ بھئی چاہے بندہ ہے یا بندی مگر بڑا صبر ہے اور کیا اطمینان ہے۔

میں نے ایک دفعہ نیہاں سے بھی کہہ دی تھی۔ تو وہ کہنے لگی۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہے اریزہ! اور کچھ نہیں۔"

"بھئی سیدھی سی بات ہے کہ یہ شعر یا اس کے جذبات کسی لڑکی کے ہی ہوسکتے ہیں۔ اتنی کول مائنڈ سوچ کسی صنف نازک کی ہی ہوسکتی ہے۔"

"یہی ہے نا تمہیں ہم سے بچھڑ جانے کی جلدی ہے اور مرد کو تو ذرا شبہ بھی ہو جائے کہ لڑکی بے وفائی کا سوچ رہی ہے تو بس پھر وہ یہی کرتے ہیں کہ جن پر مرتے تھے' ان ہی کو مار دیتے ہیں۔"

"توبہ ہے نیہاں! کیسی خوف ناک باتیں کر رہی ہو۔" میں نے جھرجھری لی۔

"میں کوئی خوف ناک بات نہیں کر رہی ہوں۔ مائی ڈیئر! حقیقت بیان کر رہی ہوں' تم تو ضرور

پچھلے جنم میں کبوتر رہی ہوگی' جو بلی کو دیکھ کر بس جھٹ آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ کیا تم اخبار میں پڑھتی نہیں ہو کہ ابھی فلانی اداکارہ کو گولی مار دی' ابھی اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا اور دور کیوں جاتی ہو۔ اداکارہ ماروی کی بات اتنی پرانی تو نہیں ہوئی' کس طرح بیچ سڑک پر گولی ماری گئی ہے۔ تو بھائی بات تو یہ ہے کہ بے وفائی تو مرد بھی کرتا ہے مگر اس کے ساتھ کبھی تم نے اس قسم کے حادثے پڑھے ہیں۔"

"اچھا' اچھا۔" میں نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔

"تم ایک عدد تھیسس بھی لکھ لو' کچھ تمہارے دل کا بوجھ ہی ہلکا ہو جائے گا۔"

"اس کے لیے تھیسس لکھنے کی کیا ضرورت ہے' تم ہو نا میرے پاس۔"

"میں اب اپنے بھی پاس نہیں ہوں۔"

"اے یہ میرے کان کیا سن رہے ہیں؟"

"جو بھی سن رہے ہیں ٹھیک ہی سن رہے ہوں گے۔" میں نے بیگ اٹھایا۔

"تم ہرگز ایسے نہیں جاسکتیں' بتاؤ بات کیا ہے؟"

"کون سی بات۔"

"ابھی جو تم نے اتنا رومینٹک جملہ بولا تھا۔"

"افوہ' تو کیا مجھ پر پابندی ہے کہ میں کچھ نہیں بول سکتی۔ چلو اب اٹھ جاؤ۔"

ہم دونوں لائبریری میں آگئے' لیکن میرا دل بالکل بھی پڑھنے میں نہیں لگ رہا تھا' آج ہلکا ہلکا بخار بھی محسوس ہو رہا تھا اور نزلے نے تو جیسے زندگی اجیرن کر رکھی تھی اور سارا کام الگ کرنا پڑا تھا۔

میں بھابھی کے متعلق سوچ رہی تھی جن کو ایک چھینک بھی آجاتی تو بھیا فوراً حکم صادر کردیتے کہ بس اب لیٹ کر آرام کرنا ہے۔

"تم کن خیالوں میں گم ہو۔" نیہاں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"کہیں نہیں۔" حالانکہ ایک دفعہ دل میں آیا کہ نیہاں کو بتادوں لیکن امی ہی منع کرتی تھیں کہ گھر کی

بات دوستوں میں کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور میں امی کی ہر بات نہ چاہتے ہوئے بھی مان ہی لیا کرتی تھی۔

گھر جاتے جاتے حرارت تیز بخار میں بدل گئی۔ امی گھر پر تھیں نہیں' میں خود ہی میڈیسن لے کر لیٹ گئی۔ بھابھی تو زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھیں۔

جب رات تک کھانا ملنے کے کوئی آثار پیدا نہیں ہوئے تو بھابھی اپنے کمرے سے نکلیں۔

"اریزہ! کیا آج کھانا نہیں بنے گا' امی بھی گھر پر نہیں ہیں۔"

"بھابھی! مجھے تو بہت تیز بخار ہے۔"

"اچھا' اچھا۔" انہوں نے زیادہ دھیان نہیں دیا "تو پھر کیا کریں؟" ان کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ اسی وقت بھیا بھی آگئے۔

"کیا بات ہے' کس بات پر مذاکرات ہو رہے ہیں۔" اور پھر مسئلہ جان کر انہوں نے چٹکی بجائی۔ "تو پھر کھانا باہر سے لے آئیں گے۔" میں صرف ان پر ایک شاکی نظر ڈال کر رہ گئی۔

ابھی ایک ہفتہ پہلے یہی سچویشن تھی' صرف ترتیب الٹ تھی اور اگلے دن میرا پیر بھی تھا' تب میں نے بھائی سے کہا تھا تو انہوں نے قابل اعتناء نہیں سمجھا تھا اور اب... میں گہری سانس لے کر رہ گئی۔

اگلے دن بھی دل یونہی اداس سا تھا اور طبیعت بھی ابھی صحیح نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن کالج جانا ضروری تھا ورنہ پریکٹیکل رہ جاتا۔

کافی دیر بس کا انتظار کرنے کے بعد میں پیدل ہی چل پڑی اور خیال بھی نہیں رہا کہ بیچ سڑک پر آگئی ہوں' جب اچانک ہی کسی کار کے بریک زور سے چرچرائے۔

"سنیں محترمہ! آپ کو خودکشی کا اگر اتنا ہی شوق ہے تو گھر میں بھی بہت ساری چیزیں مل جاتی ہیں جن سے باآسانی خودکشی ہوسکتی ہے پھر مجھ غریب پر یہ ظلم کیوں ہو سکتا ہے کہ میں تھوڑا پرانا ہوں مگر یہ گاڑی تو بالکل نئی ہے۔"

یہ آواز' یہ لہجہ میں ایک دم ساکت ہوگئی۔ تب اس گاڑی والے نے میری شکل غور سے دیکھی۔

"ارے یہ تم ہو نا اریزہ۔"

ظاہری بات ہے' مجھے کیا کرنا تھا' میں نے سر اثبات میں ہلادیا۔

"مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔" اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ایسی غائب دماغ لڑکی تمہارے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی ہے۔"

"اچھا زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہاری زبان اب بھی بالکل ویسی ہی ہے' البتہ شکل بدل گئی ہے۔"

"میں نے تمہیں پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے نہیں کہا ہے۔"

"ہا... ہا... کٹکھنی بلی' پتہ ہے میں جب سے کراچی آیا ہوں مستقل تم لوگوں کو ڈھونڈ رہا ہوں' گھر شفٹ کرلیا ہے؟"

"بس ایسا ہی سمجھو' بھیا کو آفس کی طرف سے گھر ملا ہے۔"

"اچھا' بھیا نے کہاں ہاتھ مارا۔"

"یہ گفتگو کرنے کا کون سا طریقہ ہے۔" میں نے بھنا کر کہا۔

"یار صحیح تو کہہ رہا ہوں جواد کے ہمیشہ سے یہی خیالات تھے کہ کسی اچھی جگہ شادی ہو' جہاں سسرال والے ہی سب کردیں۔ مطلب کوئی اچھی جاب یا کاروبار اسی لیے پوچھ رہا ہوں۔"

"اچھا گھر آؤ گے نا تو خود تفصیل سے پوچھ لینا۔"

"گھر آؤ گے کیا مطلب' میں ابھی تمہارے ساتھ گھر جارہا ہوں۔ مجھے فٹافٹ راستہ بتاؤ۔"

"غفران! کالج جانا بہت ضروری ہے۔"

"کچھ ضروری نہیں ہے' ہم سے ملنے کے بعد۔"

"یہ کیا بات ہے' تم کوئی پرائم منسٹر ہو۔"

"سنو اریزہ! ایک بات تو میں جانتا ہوں کہ تم شاید پرائم منسٹر کو بھی اہمیت نہ دو' لیکن دیکھو میں تو میں ہوں

نا۔"

"اچھا بھئی' گھر ہی چلو۔" اس کی بک بک سے گھبرا کر میں نے جلدی سے کہا۔

"یہ ہوئی نا بات۔"

گھر کے دروازے پر رک کر اس نے مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔

"تم بلا تکلف اندر جاسکتے ہو' اتنا فارمل ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"اور اندر وہ تمہاری ہٹلر نما بھابھی ہوئیں تو۔"

"غفران! بدتمیزی نہیں۔"

دروازہ بھابھی نے ہی کھولا۔ مجھے اور غفران کو دیکھ کر ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"خیریت' کوئی ایکسیڈنٹ ہوگیا۔"

"ایکسیڈنٹ ہی سمجھئے۔ ویسے آپ بھابھی ہیں نا' اتنی خوب صورت خاتون کو بھابھی ہی ہونا چاہیے۔ لوگ اچھی چیزیں کہاں چھوڑتے ہیں' ہیں نا۔ نک چڑھی بلی' صحیح کہہ رہا ہوں نا۔"

اس نے ایک ہی منٹ میں بھابھی کو دوست اور مجھے دشمن بنالیا۔

"تم نے کبھی کوئی غلط بات کی ہے اور اندر آجاؤ' امی اندر ہی ہیں۔"

امی بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔

"ارے اتنے عرصے کے بعد دیکھا ہے۔"

"خالہ جان! میں تو آپ کو تقریباً" روز ہی دیکھتا تھا

"خواب میں۔" اس نے جملہ مکمل کیا۔

اس کی عادت اب بھی ویسی ہی تھی' امی نے مسکرا کر اس کے کان پکڑ لیے اور میں اسے دیکھتے ہوئے ایک ہی جملہ سوچ رہی تھی کہ بولتا تو وہ پہلے بھی تھا لیکن اب کچھ زیادہ ہی بک بک کرنے لگا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔

اور مجھے ایک ہی منٹ میں پتہ چل گیا کہ اس کے ساتھ ضرور کچھ ہوا ہے۔ کیا کچھ مجھے اندازہ ہو رہا تھا لیکن ظاہر سی بات ہے' وہ صرف اندازے بھی ہو سکتے تھے۔

میں نے اس کے لیے کھانا نکالا۔ ذرا اچھے طریقے سے سلاد وغیرہ بھی سجادیا۔

"اریزہ! تم کتنی سگھڑ ہوگئی ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم نے اگلے گھر جانے کے لیے ساری تیاریاں مکمل کرلی ہیں۔"

"تقریباً"۔" میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

"بہت جلدی ہتھیار ڈال دیے۔" اس کی مسکراہٹ میں سادگی کا عنصر تھا اور آنکھوں میں شرارت لیکن میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ بس اب غصہ نہیں ہونا۔ ویسے بھی بچپن میں اس نے میرے ہزار نام رکھ چھوڑے تھے۔ چڑچڑی تو کٹ کھنی یا بچہ مارنے والی اور امی کہتی تھیں کہ میں بچپن میں بھی ایسی ہی اور نیہاں کا یہ خیال تھا کہ میں ابھی بھی ایسی ہی ہوں' حالانکہ میں خود اپنے متعلق بہت اچھی رائے رکھتی تھی جسے کبھی کوئی خاطر میں نہیں لایا۔ یہ ٹھیک تھا کہ میں بہت زیادہ ہنسنے' مسکرانے والی لڑکی نہیں تھی جس کی سب سے بڑی وجہ تو یہی تھی کہ میرے اپنے تو کیا' البتہ دوسروں کے غم ہی مجھے پہروں ملول رکھتے تھے۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن میں نے کالج میں نیہاں کو غفران کے آنے کا بتایا۔

"ارے واہ یہ تو بالکل فلمی سین ہوا مطلب یہ کہ سڑک پر چلی جارہی تھیں کہ اچانک ایک گاڑی پیچھے سے آئی اور اس میں ایک گمشدہ ہیرو۔۔۔ ونڈر فل۔"

"اپنا زورِ خطابت جاری رکھو' کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔"

"اگر تمہاری جگہ میں ہوتی نا تو بس۔" نیہاں نے ایک ہتھیلی کا مکا دوسری ہتھیلی پر مارا۔ اریزہ کی بات پر اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔

"یوں بھی اس کا خیال تھا کہ اریزہ کی باتوں کا اثر وہ لے جس کے پاس فالتو دل ہو اور دماغ۔ تفصیل اس

نے یہ بتائی تھی کہ دماغ کی بات تو سمجھ میں آتی ہے' لیکن دل کا بھی میں نے اس لیے کہا ہے کہ ایک دل تو اریزہ کی باتیں سن کر ویسے ہی شہادت کے درجے پر فائز ہو جائے گا تو بندے کے پاس اگر دوسرا دل ہوگا تو زندگی کے کام اسی سے چلیں گے۔ اس بات پر میں ناراض بھی ہوگئی تھی۔ لیکن کیا کیا جائے کے مصداق میرے ساتھ سب سے بڑی پریشانی تو یہ تھی کہ جو مجھے اچھا لگتا تھا بس وہی اچھا لگتا تھا۔ نیہاں میری دوست تھی اور اس وہی تھی۔ ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کے بعد کسی اور کی ضرورت نہیں سمجھی۔ حالانکہ میں اکثر اس بات سے چڑتی کہ "میری دوستی تمہیں کہیں نہ کہیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہے لیکن تمہاری دوستی سے مجھے سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں ملا۔" جس پر وہ ہمیشہ اس کر میرے گال چوم لیتی۔

"ارے یار! کبھی نہ کبھی یہ قرض بھی ادا کر ہی دیں گے۔" اور یہ بات حقیقت بھی تھی۔

نیہاں کے ساتھ ساری دنیا کے مسئلے تھے' اپنے گھر کے' اپنی متوقع سسرال اور سب سے بڑھ کر جس آزاد سے اس کا نکاح ہوا تھا' اس کے عجیب و غریب قصے سنا سنا کر اس نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔

پہلے سب باتیں سنو پھر اس کا حل بھی تلاش کرو۔ میرے پاس نہ غم تھے' نہ ایسا کوئی مسئلہ۔۔۔ بس لے دے کر یہ ایک بھابھی کا مسئلہ تھا' امی کی ہدایت کے پیش نظر وہ بھی اس سے ڈسکس نہیں کرتی تھی۔ یہ اور بات کہ نیہاں خود سے ہی اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی تھی اور مجھے اب لگ رہا تھا کہ مجھے جو دوسروں کے غم سننے کی عادت سی ہے' اس میں کہیں نہ کہیں اب اپنا غم بھی ضرور شامل ہونے والا ہے۔

☆ ☆ ☆

گھر پہنچی تو شام کے لمبے سائے ڈھلنے کو تھے' ایک تو سردیوں میں راتیں اتنی جلدی آجاتی تھیں کہ حد نہیں۔ میں فائل رکھ کر کچن میں چلی آئی۔ پتہ نہیں کتنے لوگوں کا کھانا بنے گا فریج میں جھانکا تو وہاں گوشت بھی نہیں تھا۔ کیا آج پھر کوئی سبزی پکے گی۔

مجھے سبزی زیادہ اچھی نہیں لگتی تھی' لیکن امی ہفتے میں دو دفعہ سبزیاں ضرور پکواتی تھیں اور اس دن میری بھوک ہڑتال کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

"لڑکیوں کو ہر طرح کی عادت ہونی چاہیے اور روز گوشت کھانا کون سی بہت اچھی بات ہے انسان کو متوازن خوراک لینی چاہیے۔"

میں کہتی "امی آپ ضرور کوکنگ کا پروگرام بہت سنتی ہوں گی یا مسز زبیدہ طارق سے آپ کی دوستی ہوگئی ہوگی۔"

ہربات کی ایک ٹپ اور کھانے میں نئی نئی ورائٹی۔

امی کے ہاتھ کے ذائقے کی وجہ سے یہ بات بھی بھابھی کا پلس پوائنٹ بن گئی تھی۔

"امی تو اتنا اچھا کھانا بناتی ہیں کہ اپنے ہاتھ کا کھانا اچھا ہی نہیں لگتا۔" وہ اکثر کہتیں۔

میں دل میں سوچتی کہ یہ بات تو صحیح ہے' کیونکہ بھابھی کے ہاتھ میں بھی میری طرح ذائقہ نہیں تھا۔

روز میں بھی یہی کوشش کرتی تھی کہ سالن تو امی ہی پکادیں۔ لیکن اس کی جگہ میں دوسرے کام سارے کر دیتی تھی۔

اور امی مجھے سکھانے کے خیال سے مستقل اپنے ساتھ لگا کر بھی رکھتی تھیں۔

"اریزہ دیکھو اس طرح۔"

اب سب کچھ دیکھ بھی لیا ہے اور پکانا بھی آتا ہے۔ لیکن جب بھی پکاؤں گی وہ اچھا ہی نہیں پکتا اور پھر میں چڑ جاتی۔

" میری تو سمجھ میں ہی نہیں آتا امی کہ آخر کھانے کو میرے ساتھ کیا دشمنی ہے۔ بالکل وہی وہی چیزیں ڈالتی ہوں جیسے آپ پھر بھی کھانا پتہ نہیں کیا سے کیا بن جاتا ہے۔"

"اس کی وجہ ہے لیکن تمہیں۔ تم شاید سمجھو نہیں۔"

"امی بتا دیجئے ویسے میرا خیال ہے کہ بات کوئی نہیں

بس آپ ضرور کچھ پڑھ وڑھ کر پھونکتی ہوں گی۔"

"پتہ ہے اریزہ بیٹا! میں یہی بات سمجھانا چاہ رہی تھی جو تمہیں سمجھ میں آ رہی ہے۔ میں بھی ایسی ہی تھی تمہاری طرح لاکھ اچھے طریقے سے کھانا پکا لو پک تو جاتا تھا مگر ذائقہ کہاں سے لاؤں پھر شادی ہو گئی۔ تو آپ جس سے محبت کرتے ہیں یا جس کا خیال رکھتے ہوں آپ خوش بھی اسی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو ایک اچھے اور خوشگوار ماحول میں ایک بہترین کھانا بھی ازدواجی زندگی میں کردار ضرور ادا کرتا ہے۔"

"یہ تو اچھی کہی آپ نے پھر تو مردوں کو باورچن سے شادی کرنی چاہیے۔"

لیکن امی نے میری بکواس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔

"پھر تم لوگ ہو گئے جوادتو بہت چھوٹا تھا۔ تب بھی کھانے پینے میں اس کے اتنے نخرے تھے اسے کوئی خراب چیز پسند نہیں آتی تھی۔ تو بس عورت کی زندگی کا کارواں یوں ہی چلتا ہے۔"

"اوکے ٹھیک ہے آپ کی بات مان لی لیکن یہ تو بتائیں بھابھی کی شادی تو ہو گئی ابھی تک ان کے ہاتھوں میں ذائقہ کیوں نہیں اترا۔"

"انتظار کرو اور صبر کرو۔ ابھی کر کے دینے والے لوگ موجود ہیں شاید اس لیے۔"

"یا پھر اس لیے کہ ابھی ایک نوکرانی موجود ہے نا کرنے کے لیے جب وہ نہیں ہو گی تب ان کے ہاتھوں میں ذائقہ اتر آئے گا۔" میں نے امی کا جملہ کاٹ کر خود ہی ٹکڑا لگایا۔

تو امی خاموش ہو گئیں۔

"اریزہ! بہت بولنے لگی ہو کم بولا کرو اور دیکھو رات کے کھانے پر غفران آ رہا ہے۔ بھابھی سے کہنا یا خود بھی ایک دو چیزیں پکا لینا۔"

وہ تو شاید اپنی فطری محبت سے مجبور ہو کر کہہ رہی ہوں۔ لیکن بھابھی کا دماغ بہت اعلا تھا۔ کہیں وہ کچھ اور سمجھ لیں تو مفت کا نشانہ تو مجھے بننا پڑتا۔ لہٰذا میں نے کچن میں جا کر بھابھی سے کچھ نہیں کہا۔

وہ خود ہی کافی خوش نظر آ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے بھابھی!" میں نے خود ہی پوچھ لیا۔

"ہاں وہ آ رہی ہے نا فاطین۔"

مجھے کبھی بھی ان کی بہن کا نام پسند نہیں آیا تھا۔ فاطین بھلا یہ کیسا نام ہوا۔ اس طرح لگ رہا ہے جیسے کوئی ذہین فطین محترمہ چلی آ رہی ہوں۔

یونیورسٹی میں پڑھتی تھی مگر اس کی باتیں اور شوق دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اسکول کی حدود سے آگے نہیں بڑھی ہو۔

"ہاں کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ تو میں نے ہی امی سے فون پر کہا کہ فاطین کو بھیج دیں۔"

"چلیں اچھا کیا۔"

"کچھ دن اور تری زلف کے سائے تلے بسر ہوں گے۔"

"کون سا گانا گا رہی ہو۔"

"ایسے ہی کوئی بھولا بسرا شعر یاد آ گیا تھا۔

خیال رہے آج کل بھولے بسرے لوگوں اور شعروں کی بہت آمد ہے۔"

کیا کہتے ہیں۔ ایک تیلی پھینک کر جلتے شعلوں کا تماشا دیکھیے وہی اس وقت بھابھی نے کیا۔

میں ان کے جملے پر ٹھیک ٹھاک ہی تپ گئی۔ شاید ان کی منشاء بھی یہی ہو لیکن پھر میں نے خود پر قابو پا لیا۔

کسی دوسرے کی بات پر کیا اپنے دل کو جلا لینا۔ لہٰذا دل کو جلانا چھوڑ کر میں نے چولہا جلایا ہی تھا کہ غفران شور مچاتا ہوا آ گیا۔

"اف، اف یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں یعنی اریزہ اور کچن۔ آنٹی آنٹی!" اس نے وہیں سے امی کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔

"کیوں کیا میں کچن میں کام نہیں کر سکتی ہوں جو تم اس قدر اداکاری کر رہے ہو۔"

"اچھا پہلے تو تمہیں ایک کپ چائے بنانا بھی بہت گراں لگتا تھا۔"

میں ایک کپ چائے پینے کے لیے ترس جاتا تھا۔"

"اچھا اب فضول نہیں بولو ترسنے والے لوگوں کی

شکل تم جیسی نہیں ہوتی۔"

"اچھا پھر ان کی شکل کس طرح کی ہوتی ہے یہ بھی بتادو۔" اب اس کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔

"خدا کے واسطے غفران ایک تمہیں میں ہی مل گئی ہوں۔ اچھا تھا جو تم اس دنیا کی بھیڑ میں کھو گئے تھے کم از کم میرے کان تو محفوظ تھے۔"

"اچھا تمہیں میرا بولنا برا لگتا ہے۔" اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ مگر آنکھیں ..... وہ آنکھیں اب بھی ہنس رہی تھیں۔

"توبہ ہے غفران! تم نے ساری زندگی مذاق اڑانے کے علاوہ کوئی دوسرا کام کیا ہے۔"

"اچھا میں منظر سے ہی ہٹ جاتا ہوں۔" وہ ایک دم مڑ کر امی کے کمرے میں چلا گیا۔

"بہت عجیب ہو گیا ہے۔ ہاں باتیں تو یہ پہلے جیسی ہی کرتا ہے لیکن اس کی آنکھیں..... آنکھیں کیوں نہیں ساتھ دیتیں، ایک اداسی کی تہہ کیوں ہے۔ خیر مجھے کیا۔" میں نے سر جھٹکا۔ "میں تو اس کے متعلق اس طرح سوچنے لگی ہوں، جیسے اس پر تھیسس لکھنے کا ارادہ ہو۔"

تھوڑی دیر بعد میں نے کھانا لگا دیا۔ کھانا کھاتے کھاتے اچانک ہی بھابھی کو یاد آ گیا۔

"غفران تمہارے پاس گاڑی ہے نا۔"

"ہاں کیوں؟"

"اصل میں آج شام کو میری بہن کی فلائٹ ہے نا تو اسے لینے جانا ہے۔"

"ہاں چلیے گا۔"

"تمہیں تکلیف تو نہیں ہو گی۔"

"نہیں تکلیف کیسی اسے کون سا کندھے پر اٹھا کر لانا ہے۔" دوسرا جملہ میں نے آہستہ سے کہا لیکن اس نے پھر بھی سن لیا۔

"بری بات۔"

"تو کون سا میں نے غلط کہا۔"

"اتنی اچھی بات بھی نہیں کہی، اگر بھابھی کو بتا دوں۔" میں مسکرا کر پلیٹ پر جھک گئی۔ مجھے پتہ تھا، وہ کبھی بھی نہیں بتائے گا۔ خیر یہ تو چھوٹی سی ہی بات تھی اور وہ مجھے چھیڑ رہا تھا لیکن ہمیشہ ہر موقعے پر۔ جہاں اس کا امکان موجود بھی نہیں ہوتا وہ مجھے وہاں بھی بچا لیا کرتا تھا۔

مجھے یاد تھا۔

جب میں فرسٹ ایئر میں تھی اور صرف پلنگ توڑا کرتی تھی۔ کراچی میں ہنگامے ہو رہے تھے اور کالج بند تھا۔ ان ہی دنوں اخبار کا مطالعہ کرنے کی عادت پڑ گئی تھی اور ایک وقت ایسا آیا کہ مجھے خبروں سے زیادہ اشتہار پڑھنے میں مزہ آنے لگا۔ کلاسیفائیڈ ٹائم پڑھنے ہی میں آدھا سے زیادہ وقت گزرنے لگا۔ ان ہی دنوں ایک جاب میری نظر سے گزری۔ کسی ایڈورٹائزنگ کمپنی کو دو ایسی خوب صورت لڑکیوں کی ضرورت تھی جو ان کی پروڈکٹ کے اشتہار میں کام کر سکیں۔

میں نے نیہاں سے ذکر کیا۔

"اس اشتہار کو غور سے پہلے پڑھ لو۔ اس میں دو خوب صورت لڑکیوں کا ذکر ہے۔" اس نے جل کر کہا۔

"تو کیا ہوا، کیا ہماری شکل خراب ہے۔ ذرا آئینے سے پوچھ لو۔"

"تم آئینے سے پوچھو نہیں بیٹا۔ آئینے میں جا کر دیکھ لو۔"

"اچھا۔" میں نے خود کو آئینے میں غور غور سے دیکھا مجھے تو میں کوئی عیب نظر نہیں آیا۔

امی کیا سب ہی لوگ کہتے تھے کہ اریزہ بہت خوب صورت ہے اور آئینے نے بھی یہی کہا۔

"نیہاں تمہارا تو دماغ خراب ہے، صحیح تو ہوں۔"

"اچھا مگر یہ جو تم برگر ٹائپ کی موٹی سی لڑکی لگتی ہو۔

میں نے تو آج تک کسی ایڈ میں کوئی موٹی لڑکی نہیں دیکھی۔"

اوہ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ میں تھوڑی سی صحت مند تھی۔

"اب کیا کریں؟"

"ڈائٹنگ حالانکہ مشکل ہے۔" اور مشکل تو بہت

تھا پراٹھے انڈے آئس کریم کولڈ ڈرنک کباب ہر چیز کو چھوڑنا۔

ان دنوں مجھے ان لوگوں پر باقاعدہ رشک آتا تھا جو یہ کہتے تھے کہ ہم لوگ تو ہر چیز کھاتے ہیں مگر موٹے نہیں ہوتے ہیں۔

"یہ تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔"

"کیوں کیا ہو گیا؟" میں اس وقت سر جھکائے بڑی شرافت سے سلاد کا پورا پیالہ کھانے میں مصروف تھی۔

تمہارا چہرہ پیلا، آنکھیں پیلی، کہیں تمہیں ـ"

"جی نہیں ایسا کچھ نہیں ہے، آپ اپنی آنکھیں ٹیسٹ کروالیں۔"

"تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا اور اگر میری بات کا اعتبار نہیں ہے تو چلو کسی سے بھی پوچھ لو۔ بالکل ایسا لگ رہا ہے۔ ابھی ایتھوپیا سے آ رہی ہو۔"

"اچھا آئینے کے سامنے دس منٹ تک رہنے کے باوجود بھی مجھے یوں لگتا کہ غفران صاحب صرف بکواس کر رہے ہیں۔"

اور کبھی اس کی باتیں سچ لگنے لگتیں۔ اب تو جانے میں دو دن رہ گئے تھے۔

نیہاں کو بتایا تو وہ الٹا بگڑ گئی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم غفران کی باتیں سنتی کیوں ہو۔ وہ میں تم کو بے وقوف بناتا ہے اور تم فنافٹ بن جاتی ہو اچھا اب اگر بولے تو تم کہہ دینا۔"

"کیا کہہ دینا۔"

"وہی جو صوفیہ لارین نے کہا تھا۔

"اگر میری آنکھیں پیلی ہیں۔ تب بھی یہ میری اپنی آنکھ ہے اور اگر میں صحت مند ہوں تب بھی یہ سب میری ذات کا حصہ ہیں ان سے کیسے علیحدہ ہو سکتی ہوں۔"

"ڈائیلاگ تو بہت اچھا ہے لیکن یہ غفران کے سامنے بولنے کا تو نہیں ہے۔ بلکہ ایسا کرتی ہوں اگر اس پروڈیوسر نے میری کسی خامی کو پکڑا تو میں یہ خوب صورت ڈائیلاگ اسی کو سنا دوں گی۔ کیسا...."

"زبردست۔"

جس وقت ہم دونوں آڈیشن دینے پہنچے۔ اچھی خاصی گرمی کا موسم تھا، اس کے باوجود میں تو کانپ رہی تھی۔

"کیا مسئلہ ہے۔" نیہاں نے میرا ہاتھ دبایا "بھئی زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ ہم لوگ سلیکٹ نہیں ہو پائیں گے۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے" اور بھی لڑکیاں تھیں اور سب ہی خوب صورت تھیں اس وقت تو مجھے اتنا خیال نہیں تھا۔ لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ یہ جگہ تو کافی خوب صورت تھی۔ لیکن جہاں سارے خوب صورت بنگلے بنے ہوئے تھے، وہاں نہیں تھی ان سے تھوڑی دور ہٹ کر بنی ہوئی تھی۔

"نیہاں مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

"چپ کرو ہر چیز کرنے کا بھی شوق ہے اور پھر دل دیکھو۔"

اس کے شرم دلانے پر میں نے ایک دم ہی چپ سادھ لی۔

انٹرویو کرنے والا پینل مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آیا، حالانکہ ان میں دو لڑکے تو کافی خوب صورت تھے اور نیہاں کو بھی باہر آ کر میں نے یہی بتایا کہ "اگر یہ دونوں لڑکے ڈراموں میں آئیں تو کہیں زیادہ چانس ہے کہ وہ....."

"اچھا اس بات کا فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ وہ لوگ کیا کریں اور کیا نہیں آڈیشن ہم لوگ دینے گئے تھے، وہ لوگ نہیں۔"

"لیکن ایک بات ہے نیہاں! ان کی آنکھیں مجھے پسند نہیں آئیں۔ اچھی آنکھیں نہیں تھیں۔"

"یہ بات تو ہے لیکن شاید شوبز کے لوگ ہوتے ہی اس طرح کے ہوں۔ ہمیں کون سا علم ہے۔ یا ہم ان کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔"

گھر آ کر میں نے امی کو بتایا کہ بس سمجھ لیں ایک دو مہینے میں میرا ڈرامہ آنے ہی والا ہے۔

"اچھا" بھیا کو ذرا جو یقین آیا ہو۔

"تم نے ڈرامے کو کیا گاجر مولی سمجھ رکھا ہے کہ

ایک دو مہینے میں یک جائے گا تو جا کر کھالیں گے۔"

بھیا مجھ سے تین سال بڑے تھے، لیکن ان میں اس وقت بھی روایتی بھائیوں والی محبت نہیں تھی۔ حالانکہ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اکلوتے تھے۔ لیکن تب بھی بھیا کا رویہ کچھ اس قسم کا ہوتا جیسے اوپر تلے کے بہت سارے بہن بھائیوں میں جو ایک ٹسل آجاتی ہے۔ جو ہر دم چلتی ہی رہتی ہے تو وہی کچھ حال ان کا بھی تھا۔

اب بھی انہیں اس بات کی فکر نہیں تھی کہ میں کہاں گئی کس لیے گئی۔ میں اسکول کالج کے ڈراموں میں حصہ لیتی تھی لیکن میڈیا پر آنا ایک بالکل الگ سی بات تھی۔

اس وقت تک یہ بات میرے لیے کچھ اتنی زیادہ اہمیت کی حامل بھی نہیں تھی۔ بس جسٹ فار انجوائمنٹ اور میں نے غفران کو بھی بتا دیا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد ان لوگوں نے دوبارہ بلایا تھا۔

لیکن چار دن کے بعد ہی اس کا فون آگیا۔

"اریزہ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔"

"مجھے کہاں جانا تھا، میرے دماغ میں کچھ تھا ہی نہیں۔

"جہاں آڈیشن دینے گئی تھیں۔"

"ہاں تو انہوں نے ابھی تھوڑا ہی بلایا ہے۔ ابھی چار دن کا ٹائم ہے۔"

"تو میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں کہ چار دن کے بعد بھی نہیں جانا۔"

"مگر کیوں میں پاس تو ہو گئی ہوں۔"

"جانتا ہوں میں۔" اس نے غالباً" دانت پیس کر کہا۔

"وہاں پر وہ لڑکی پاس ہوئی تھی۔ جو خوب صورت تھی اور جس کی عقل ٹخنوں میں تھی۔"

"کیا مطلب ہے میں بے وقوف ہوں۔"

"نہیں بہت عقل مند۔ اریزہ میری بات غور سے سنو۔ میری بائیک خراب ہے ورنہ میں خود آکر تمہارا دماغ درست کر دیتا۔"

"خوامخواہ کوئی فالتو کا دماغ ہے میرے پاس اور اب تو میں ضرور جاؤں گی۔" میں نے ریسیور پٹخ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نیہاں کے گھر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ وہ آگیا۔ غصے میں لال پیلا چہرہ لیے۔ مجھے ہنسی آگئی۔

"تمہارا منہ ٹماٹر کیوں بنا ہوا ہے۔"

"پہلے یہ بتاؤ تمہیں مجھے ستانے میں بہت مزہ آتا ہے۔"

"میں نے کس کو ستا دیا۔ اتنی اچھی بچی ہوں سب لوگ کہتے ہیں۔"

"وہ سارے لوگ آنکھوں کے یا عقل کے اندھے ہوں گے۔"

"تم خود ہو گے۔ یہ دونوں چیزیں تم ہی میں پائی جاتی ہوں گی۔"

"نہیں۔" اس کی مسکراہٹ بہت جاندار تھی۔

"میں صرف آنکھوں کا اندھا ہوں اور عقل تو میرے پاس وافر مقدار میں ہے۔ وہی عقل تو میری رہنمائی کرتی ہے کہ غفران صاحب دنیا میں بہت لڑکیاں ہیں اور بہت اچھی لڑکیاں، پھر کیا وجہ ہے کہ اریزہ کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔"

غفراں کی بات سن کر میرے دونوں گال جیسے دہک گئے اتنی توہین کا احساس تو مجھے تب بھی نہیں ہوا تھا۔

جب وہ مجھے اپنی گرل فرینڈ کے قصے مزے لے لے کر سناتا تھا اب پتہ نہیں اس میں کتنا جھوٹ ہوتا تھا اور کتنا سچ۔ کیونکہ یہ تو مجھے پتہ تھا کہ وہ لڑکیوں میں خاصا مقبول تھا۔ نیہاں کہتی تو تھی کہ غفران میں کوئی خاص بات ضرور ہے اور میں غفران سے یہی کہتی تھی کہ میں ہمیشہ وہ خاص بات ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن مجھے تو کچھ نظر ہی نہیں آتا اور اب اس نے کتنی آسانی سے اپنی ساری باتوں کا بدلہ لے لیا تھا۔ میری حالت دیکھ کر۔ وہ ایک دم گھبرا گیا۔

"او یار میں مذاق کر رہا تھا۔ نہیں بلکہ مذاق بھی نہیں کیا کہنا چاہیے۔" اس نے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

"ہاں میں کہہ تو سچ رہا تھا لیکن غلط موقع پر، مجھے یہ

بات ابھی نہیں کہنا چاہیے تھی سورج سر پر چمک رہا ہے۔ کوے شور مچا رہے ہیں۔"

"تم بکواس نہیں کرو۔" مجھے ہنسی آگئی۔

"شکر ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "سچ اریزہ! میں تمہاری ناراضی افورڈ نہیں کر سکتا۔"

پھر تم پیڑی سے اترے پہلے تم فون پر بکواس کرتے رہے اس کے بعد میرے سر پر شروع کر دی تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔"

"مسئلے تو اب تمہاری زندگی میں شروع ہوتے، دعا دینا کہ تم اور تمہاری دوست دونوں کو بچا لیا۔"

"ہمیں کہاں بچایا، کیا ہم لوگ سمندر میں ڈوب رہے تھے۔"

"جہاں آڈیشن دینے گئی تھیں وہاں نہ فون کرنا ہے، نہ کسی لیٹر کا جواب دینا ہے۔"

"مگر کیوں، کچھ پتہ تو چلے غفران! تمہیں تو کسی 007 والی فلم کا ہدایت کار ہونا چاہئے تھا۔ کیا سسپنس ہی پھیلاتے رہو گے۔"

"کیا بتاؤں تمہیں یار!" اس نے گہری سانس لی۔

"اچھا چلو ایسا کرتا ہوں، میں ایک دو دن میں آتا ہوں پھر تمہارے سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔"

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو کہ میرے سوالوں کے جواب مل جائیں گے جیسے میں حاتم طائی والے قصے کی شہزادی ہوں۔"

کون سی شہزادی؟"

"بھئی! وہی والی شہزادی جو شادی کے خواہش مند نوجوانوں کو ایک ایک سوال پکڑا دیتی تھی اور کہتی تھی کہ جاؤ ان سوالوں کے جواب حاصل کرو جو صحیح جواب لے کر آئے گا میں اس سے شادی کر لوں گی۔"

"پھر۔ پھر؟"

"پھر۔ کیا پھر۔ اب مجھے یہ قصہ یاد نہیں۔"

"تو غالباً" تم اپنے آپ کو اس قسم کی شہزادی تصور کر رہی ہو، جس کے لئے لوگ جواب تلاش کرتے رہتے ہیں۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا، کمال ہے۔" میری پیشانی پسینے میں بھیگنے لگی۔ "تم بھی بس غفران! اپنی طرف سے بک بک کرتے ہو۔"

مجھے اپنے زیادہ بولنے پر غصہ بھی آرہا تھا۔ امی صحیح کہتی ہیں اریزہ بات کرنے سے پہلے سوچتی ہے نہ بعد میں ابھی بھی میں نے کیا کیا بکواس کر دی۔

"تم نے یہ نہیں کہا۔ اریزہ؟ کمال ہے تمہاری تو ہر روز ایک نئی خرابی سامنے آجاتی ہے۔ ابھی تازہ تازہ انکشاف ہوا کہ آپ اپنے کہے ہوئے لفظوں سے بھی پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔"

"پلیز غفران!"

"لیکن دیکھو ایسا ہو تو سکتا ہے کہ میں بھی تمہارے لئے۔"

اس کی زندگی میں قہقہے تھے، روشنیاں، ہلا گلا، سارے وہ خواب جو آج کل کے لڑکے دیکھتے ہیں۔ وہ ساری تفریحات۔ اس کے سارے افیئرز کی مجھے خبر ہوتی تھی۔ کتنی ہی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی۔ کتنی لڑکیوں کے اسے فون آتے تھے۔ خود میرے سامنے بارہا اس کے موبائل کی بیپ ہوتی تھی۔ پہلے وہ نمبر دیکھ لیتا۔ اگر اسے اس لڑکی سے بات کرنی ہوتی تو اٹھا لیتا نہیں تو بٹن آف کر دیتا۔

میں اکثر ٹوکتی "تم بات ہی کر لیتے غفران! کیا پتہ اس لڑکی کو کوئی ضروری بات کہنی ہو۔"

"اوہ۔ ضروری بات۔ تم لڑکیوں کی ضروری بات کیا ہو سکتی ہے۔ آج یہاں چلو یا آج وہاں بہت زبردست پروگرام ہے۔

میکڈونلڈ میں زبردست برنچ چل رہا ہے۔ بس زبردست سے کم تو کوئی بات نہیں ہوتی۔"

بے شک وہ سب کچھ اپنی فرینڈز کو کہہ رہا ہوتا لیکن وہ میری صنف سے تو تعلق رکھتی تھیں۔ اور مجھے اپنی نسوانیت اپنی انا ہر چیز سے بڑھ کر عزیز تھی۔ میں نے اتنی دوستی میں بھی کبھی یہ مقام نہیں آنے دیا کہ اسے

میرے حالِ دل کی خبر ہوتی۔ ہم جیسے لوگ تو خود کو اپنے آپ سے بھی چھپا جانے والے لوگ تھے۔ پھر وہ کہاں سے میرے نشان پا سکتا تھا اور اب فون پر نہ جانے کیا کیا بکواس کر رہا تھا۔ جو کہ مجھے پتہ تھا کہ جھوٹ ہے۔ لیکن بس۔۔۔ مجھے ایک دکھ کا احساس ضرور ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے اس قسم کا جملہ کہا ہی کیوں۔۔۔ دوستی کے کچھ اصول ہوتے ہیں لیکن صحیح بات تو یہ ہے کہ اگر ہمارا معاشرہ اور ہمارا مذہب اجازت نہیں دیتا تو وہ بھی درست ہے۔

"مرد کے دل کی کس کو خبر ہوتی ہے۔" میں نے ریسیور کو کریڈل پر رکھتے ہوئے سوچا۔

مگر رات تک یہ ہوا کہ میں الجھی ہوئی رہی۔ میرے دل نے یوں ہی سوچا — کیا پتہ اس نے مذاق نہ کیا ہو اور کیا خبر کہ اس نے سچ ہی کہا ہو۔

رات تک سوچتے سوچتے میرے سر میں درد ہو گیا۔

ایک تو یہ سوچ کہ اس نے منع کیوں کیا ہے۔ اور دوسرا وہی دل کی خوش گمانیاں، پتہ نہیں کیوں ختم نہیں ہوتیں اور میں نے یہی سوچا کہ جب مجھے اتنا کچھ پتہ ہے۔ پھر بھی دل کو ایک خوش گمانی ہے کہ کیا پتہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ سچ ہی ہو۔ تو پھر وہ لڑکیاں۔ جنہیں کچھ علم ہی نہیں ہوتا۔ ان کا کتنا قصور ہو سکتا ہے۔

لیکن قصوروار تو وہ تھیں۔

کیونکہ غفران کا کہنا یہی تھا کہ "خدا کی قسم اریزہ! تم خوابوں کی دنیا سے نکل جاؤ۔ میڈیا اس قدر فاسٹ ہو گیا ہے لڑکیوں کو وقت سے پہلے ہر چیز کی آگہی ہے اور تم۔۔۔ تم پتہ نہیں کس دنیا میں رہتی ہو۔ یہ جتنی لڑکیوں سے میری دوستی تمہیں نظر آ رہی ہے ان میں سے کسی ایک آدھ سے ہی میں نے خود کی ہو گی ورنہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔"

☆ ☆ ☆

اگلا ایک دن میں نے اس کے انتظار میں بڑی مشکل سے گزارا۔

نیہاں تو بہت خوش تھی۔

"چلو چلتے ہیں۔ غفران کا تو تم کو پتہ ہے نا۔ وہ کبھی کسی معاملے میں سیریس ہوا ہے۔"

"بھئی! مجھے کیا پتہ مگر اس نے منع کیا ہے۔"

"تم کب سے اس کے کہنے پر چلنے لگی ہو۔"

نیہاں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

"بھئی۔ اب ایک آدھ دن صبر کر لو۔" میں اس کے علاوہ کہتی بھی کیا۔

اگلے دن وہ آ گیا۔

"تم نے زندگی میں پہلی دفعہ میرا خوب ہی انتظار کیا ہو گا۔" مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"خواہ مخواہ بس۔ کبھی تو اپنی خوش فہمی کو ختم کر لو۔"

"خوش فہمی کب ختم ہوتی ہے یار۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"اچھا۔ اب ڈائیلاگ نہیں بولو۔ ویسے بھی اب یہ ہمارا ڈپارٹمنٹ ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ اب کہیں، کوئی نہ آڈیشن دینے جائے گا۔ نہ اداکاری کرنی ہے۔"

"مطلب کیا ہے۔ کیا تم جل رہے ہو؟"

"کس بات سے جلوں گا۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"یہی کہ کہیں ہم دونوں فن کی دنیا کا چمکتا ہوا ستارہ نہ بن جائیں اور تم ہمیں دیکھ کر جلا کرو۔"

"ہونہہ جلا کرو۔ میرا خیال ہے کہ تم نے گھٹیا قسم کے رسالوں میں سے وہ پوائنٹ بھی نوٹ کر لئے ہیں۔ جو تمہیں اپنے انٹرویو میں کہنا ہیں۔ خوش فہمی تو دیکھو فن کی دنیا کا چمکتا ہوا ستارہ۔ بہت اچھے۔ میرا خیال ہے۔ تمہارا نِک نیم یہی نہ رکھ دیں۔ مجھے تو بڑا اچھا لگا ہے۔"

"پلیز غفران! ایک تم اور دوسرے بھیا دونوں میرا ریکارڈ ہی لگاتے رہنا۔ اب بکواس کر بھی چکو۔ پتہ

ہے۔ دو دن سے کس قدر پریشان تھی۔ تمہاری تو پتہ نہیں یہ کیا عادت ہے ایک بات کہہ دی اور ہفتوں غائب ہو گئے۔"

اسی وقت امی بھی آ گئیں۔

"اب تم۔ امی کے سامنے جتنی آگ لگا سکتے ہو لگا لینا۔ ایک تو وہ ویسے ہی خلاف تھیں۔ اوپر سے تمہاری ہدایت کاریاں۔۔۔"

"دیکھا۔ یہ صلہ ملا ہے۔ میں کتنا خوار ہوا ہوں۔ سارے ثبوت اکٹھے کرنے میں اور تم ہو کہ۔۔۔ جانتی ہیں۔ جہاں آپ اور نیہاں آڈیشن دینے گئی تھیں۔ وہ لوگ فراڈ ہیں۔"

"اچھا۔ کیا فراڈ کر لیا انہوں نے ہم سے۔ کیا ایک لاکھ روپے لے کر بھاگ گئے۔ بے وقوف وہ لوگ الٹا ہمیں پیسے دیں گے۔"

"کیا فراڈ صرف پیسے کا ہی ہوتا ہے۔ تمہاری عقل کیا کبھی صحیح مقام پر آئے گی۔ آج کی دنیا میں کیا صرف پیسے کا ہی فراڈ ہوتا ہے؟"

"تو مجھے کیا پتہ؟" میں نے شانے اچکائے "تم تو غفران! نہ جانے کون سے دور کی باتیں لے آتے ہو۔ اب کیا فراڈ والے اخبار میں ایڈ دیا کرتے ہیں سارے برے کام چھپ کر ہوا کرتے ہیں۔ ہم نے تو ساری زندگی یہی سنا ہے۔"

"تم اپنے خیالات اپنے پاس ہی رکھا کرو۔" وہ زچ ہو گیا۔ "اور اب بیچ میں مت بولنا۔ یہ جو تم نے دو ڈائریکٹرز کو دیکھا تھا نا۔ کبیر اور عرفان آفندی۔ بس اس گینگ کے کرتا دھرتا بھی یہی ہیں۔ یہ خوب صورت لڑکیوں کی تصاویر حاصل کر کے پھر فوٹوگرافی کی کچھ تیکنیک استعمال کر کے ان لڑکیوں کو بلیک میل کرتے ہیں۔ اب وہاں جانے والی لڑکیاں کچھ ایڈوانس تو ہوتی ہی ہیں نا! کچھ رہی سہی کسر وہ کہتے ہیں کہ اس کردار کی ڈیمانڈ ہے۔ بس اس سے زیادہ تفصیل سے میں نہیں بتا سکتا۔ اب خود اپنی عقل استعمال کرو۔"

میں صرف سر اٹھائے اس کا منہ دیکھتی رہی۔

وہاں جا کر ایک عجیب سی خلش تو مجھے ستا رہی تھی یا گھبراہٹ۔ جو مجھے سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

اور وہاں جس قسم کی لڑکیاں آئی تھیں، میں اور نیہاں تو سوٹ بھی نہیں کرتے تھے۔ لیکن ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے ہماری خوبصورتی کی وجہ سے ہمیں سلیکٹ کیا ہے۔ اتنا تو مجھے پتہ تھا کہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں لیکن غفران اس وقت جھوٹ نہیں بول رہا۔

"لیکن اس طرح کے کام ہو کس طرح جاتے ہیں۔ کیا انہیں کوئی چیک کرنے والا نہیں ہے۔"

"وہ کیا کہتے ہیں بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی اس لیے اپنے نازک دماغ پر اتنا زور نہیں ڈالو۔" اور یہ بات تو تھی کہ غفران کبھی اس سے جھوٹ نہیں بولتا تھا اور نہ ہی کبھی اس کی کہی ہوئی کوئی بات غلط ہوتی تھی۔

ایک مہینے کے بعد میں نے اخبار میں ان لوگوں کے گرفتار ہونے کی خبر پڑھ لی۔

پولیس نے یہ کارروائی کسی گمنام کال پر کی تھی۔

"یہ کال تم کرتے تھے نا غفران! مجھے شک نہیں یقین تھا مگر اس نے سیریس ہو کر نہیں دیا۔

"تم تو پاگل ہو میرے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہے۔" اس نے اخبار پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا پھر ایک دم سے اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔

"یار! پتہ نہیں کس قدر ٹائم لگے گا۔ ہم لوگوں کو انسان بننے میں یہ دیکھو ان جرنلسٹوں کو۔" اس نے اخبار کے دو ٹکڑے کر دیے۔

"ہوا کیا؟" میں پریشان ہو گئی۔

"انہوں نے ان لڑکیوں کی تصویریں یوں لگا دیں۔ جو میں نے بتایا تھا وہی ہونا صرف اس وجہ سے کہ ان کی خوب صورت تصاویر کی وجہ سے ان کے اخبار ہاٹ کیک کی طرح بک جائیں۔ ایک اخبار کا پیٹ بھرنے کے لیے اس قدر سنگ دلی۔"

"یہ ان کی مجبوری ہو گی غفران۔" میں نے اس کا

غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"یار! کیسی مجبوری ابھی پچھلے دنوں بھی کچھ اسی قسم کی رپورٹنگ ہوئی تھی جس کے بعد ان میں سے ایک لڑکی کے باپ نے خودکشی کرلی تھی۔"

وہ کافی دیر ملول رہا پھر اٹھ کر چلا گیا اور میں کتنی ہی دیر گم صم ایک جگہ پر بیٹھی رہ گئی۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے خواب روشنی پھر تاریک اندھیرا بن کر لپکتے ہیں۔ شام ہوتے ہوتے۔ مجھے بخار آگیا تھا۔

"تم پاگل ہو اریزہ' ہر بات کو سوار کرلیتی ہو۔"

"لیکن وہ سب کچھ جو ان کے ساتھ ہوا غفران! وہ میرے اور نیہاں کے ساتھ بھی تو ہو سکتا تھا۔"

"ہونے کو تو کیا نہیں ہو جاتا تم اس ڈر سے کیا گھر میں بند ہو جاؤ گی۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ آہٹوں سے ڈرنا چھوڑ دیجیے۔ یہ تو ساری زندگی آپ کے عقب میں چلتی رہیں گی۔" اس نے مجھے سمجھایا ایک مہینے سے میری اسٹڈی بالکل ختم تھی' اس نے سارے نوٹس مجھے ارینج کرکے دیے۔

حالانکہ ان دنوں خود اس کے ٹوفل کی تیاری چل رہی تھی۔ اسے انگلینڈ جاکر M.S کرنا تھا پھر وہ چلا گیا۔

جانے سے ایک دن پہلے وہ میرے پاس آیا تھا۔

میں خود اس کے جانے سے اتنی ہراساں و پریشان تھی کہ نہ مجھے اس کی کوئی بات سمجھ میں آرہی تھی نہ اس کے کہے لفظ۔

پھر وہ چلا گیا اور بالکل ان ہی دنوں بھائی کا اسلام آباد ٹرانسفر ہو گیا۔ غفران کی ممی اپنی بیٹی کے پاس قطر گئی ہوئی تھیں۔

اور میری زندگی کا سب سے خوب صورت وقت جیسے وہیں کہیں چھوٹ گیا' رہ گیا اور پھر دوبارہ مجھے مل نہیں سکا۔

دو سال کے بعد واپس بھائی کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا اور ہم یہاں لوٹ آئے۔

لیکن بیچ کے تین سال... میں انہیں کہاں سے ڈھونڈ لاتی۔

اک صبر کا ہنر تھا میرے پاس سو اسے ہی مشعلِ راہ بن لیا تھا۔

زندگی میں بہت سے لوگ بچھڑ جاتے ہیں لیکن اکثر رات کو سوتے وقت میں خود سے پوچھا کرتی تھی۔ کیا وہ واقعی بچھڑ جاتے ہیں اور اب جبکہ یونہی وہ ایک دن واپس مجھے مل گیا تو اب میں اکثر خود سے یہ پوچھتی تھی۔

کیا وہ واقعی مجھے مل گیا ہے اور اگر مل گیا ہے تو اس کی آنکھوں میں ایک اداسی کی لہر سی کیوں ہے۔

ایک ملال کا رنگ' اک اداسی کا ستارہ۔ یہ سارے رنگ بھی میرے اپنے تھے اور میری ان سے تین سال بہت اچھی دوستی رہی تھی۔ اس لیے غفران کے چہرے پر۔ مجھے اس رنگ کو ڈھونڈنا نہیں پڑا' میں نے بہت دفعہ سوچا لیکن مجھے کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

اپنے غموں کا اشتہار لگوانا کسے پسند ہوتا ہے اور ہر درد اپنا ہی درد ہوتا ہے' لوگ کہتے ہیں بتانے سے بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ مجھے تو اس مقولے پر بھی یقین نہیں تھا۔ ہلکا تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے' جب وہ درد کوئی لے لے۔

اور اسی لیے میں ڈرتی تھی پتہ نہیں اس کا درد لے بھی سکتی تھی یا نہیں پھر زخم چھیڑنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔

سارا دن میں یہی سوچتی رہی۔ مغرب کے وقت غفران بھابھی کے ساتھ جاکر فاطین کو لے آیا۔ وہ بے تحاشا خوب صورت تھی اور اب بھی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ لیکن یہ سارا طلسم اس وقت تک رہتا تھا۔ جب تک کہ وہ منہ نہیں کھولتی تھی ایک تو اس کی آواز اس پر سے اس کی عجیب و غریب سوچیں۔ خود کو کسی انڈین اداکارہ سے تو کم سمجھتی نہیں تھی۔ ایک دفعہ میں نے نیہاں سے یہ بات کہی تھی۔ تو اس نے سن کر کہا تھا۔

"اس آخری بات کے لیے تو اسے معاف کردو۔ کیا ہم لوگ کوشش نہیں کرتے کہ ذرا خوب صورت نظر آئیں یا کسی سے ہم لوگوں کی شکل ہی ملنے لگے اور اس کی شکل پر تو ایک خاص قسم کی خوب صورتی بھی

ہے۔" اور اب وہ آگئی تھی اور غفران سے باتیں وہ کر رہی تھی اور غصہ مجھے آرہا تھا۔

پہلے میں نے تین چار پلیٹیں پٹخ کر رکھیں پھر جب گلاس پٹخ کر رکھا تو بے چارہ کانچ کا گلاس شہید ہو گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے مہمانوں کے آنے پر اس طرح کرتے ہیں۔"

"خوامخواہ کی مہمان ابھی دیکھنا پورے گھر میں ان کا عمل دخل اس طرح بڑھ جائے گا کہ ہم لوگ ہی مہمان لگ رہے ہوں گے۔"

"چلو اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ تمہاری طرح نک چڑھی نہیں ہے۔"

"ہاں تو جاؤ بیٹھو جا کر اس سے باتیں کرو یہاں کس لیے کھڑے ہو۔"

"قسم سے بالکل چھوٹی بچی لگ رہی ہو بھلا بتاؤ کوئی کیا کہے گا۔"

☆ ☆ ☆

"اریزہ! بات سنو۔" اس دن میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی جب وہ میرے سامنے ہی آکر بیٹھ گیا۔

"ہاں بولو۔" میں بدستور نوٹس بنانے ہی میں مصروف تھی۔

"تم سے تو کوئی بات کرنا ہی بے کار ہے۔ اس سے اچھا تو یہ ہے کہ میں فاطین سے بات کر لوں وہ ڈھنگ سے سنتی تو ہے۔"

"تو کر لو نا بابا لان میں بیٹھی ہو گی۔"

"وہ تو کر لوں گا' لیکن اس سے میں شادی کی بات تو نہیں کر سکتا مجھے شادی کرنا ہے تم سے۔"

پتہ نہیں اس نے وہی لفظ بولے تھے۔ جو میں نے سنے تھے یا پھر اس نے ہی کچھ اور کہا تھا اور میرے دل ہی نے غلط سنا ہو۔

میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یہ دوسری دفعہ تھا جب اس نے یوں اس طرح کہا تھا اور وہ دونوں ہی دفعہ مجھے یوں لگا تھا جیسے اس نے مذاق اڑایا ہو۔

"ظاہر ہے شادی تو ہونی تھی اور کہیں نہ کہیں تو ہونی تھی۔ لیکن غفران وہ مجھے ہمیشہ دسترس سے بہت دور لگا تھا۔

محبت کرنے والے ہمیشہ بہت دور لگتے ہیں یا نظر آتے ہیں۔ وقت اور تقدیر مقدر ہے تو دوسری بات ہے۔

"میں تمہیں آج یہ بات دوسری دفعہ کہہ رہا ہوں۔ شاید تم نے مذاق سمجھا تھا۔ اور آج اس بات کے ساڑھے تین سال بعد پھر دوبارہ کہہ رہا ہوں۔ محبت کے راستے کبھی واپس نہیں پلٹتے آج سے تین سال پہلے بھی میں تم سے مایوس ہو کر گیا تھا۔ پھر ضحیٰ سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ بھی پاکستانی تھی' ہم دونوں ہی انگلینڈ میں اکیلے تھے اس لیے ہم لوگوں کی ٹھیک ٹھاک دوستی ہو گئی یا شاید محبت۔ میں کچھ اس بات کی صحیح طرح سے تشریح نہیں کر سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

"حالانکہ اس نے بہت شروع ہی میں بتا دیا تھا کہ اس کا نکاح ہو چکا ہے اور واپس جاتے ہی اس کی رخصتی ہو جائے گی۔ لیکن ہر چیز اگر طے شدہ اصولوں کے مطابق ہی ہو جائے تو دنیا کے غم کہاں جائیں' پھر ہم دونوں ہی پاکستان واپس لوٹ آئے۔" اس کے بعد صرف خاموشی تھی۔

ایک چپ کا وقفہ تھا۔ صرف ایک دل کے دھڑکنے کی صدا تھی۔

بھابھی غفران کو ساتھ لے کر اکثر ہی نکل جاتی تھیں اور یہ تو کہنے والی بات ہی نہیں تھی' واپسی پر فاطین بہت جوش و خروش سے قصے سناتی۔

"اللہ اریزہ! یہ غفران تو بہت ہی اچھے ہیں" یا پھر "آج غفران نے ہمیں K.F.C میں لنچ کروایا۔"

یا "ان کی چوائس بہت زبردست ہے۔" یہ اور اس طرح کی بے شمار باتیں اور میں جو ایک خلا میں بھٹک رہی تھی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ حقیقت بات تو یہ تھی کہ یہ غفران کی نظر میں بے شک چھوٹی

سے بات ہو گی لیکن اس بات نے مجھے بہت دھچکا پہنچایا تھا۔ لیکن فاطین کے ہر وقت کے غفران نامے نے مجھے پریشان کر دیا۔

مجھے تو کچھ یوں لگتا کہ غفران سے میرا جنم جنم کا ساتھ ہے اور اب جبکہ منزل بھی کچھ دور نہ تھی۔

دل پر ایک بوجھ سا آگرا تھا لیکن امی نے جب میری مرضی پوچھی تو میں نے ہاں کر دی۔

نیہاں کو ساری بات پتہ تھی۔ اس سے میں کچھ چھپا ہی نہ پائی تھی۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے اریزہ!" اس نے مجھے سمجھایا تھا۔ "وہ اگر چھپا بھی لیتا تو تم کیا کر لیتیں۔"

"وہ مجھ سے چھپاتا نہیں۔" میں نے یقین سے کہا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں اداسی کی ایک لکیر دیکھی تھی۔

"کوئی خاموش سا غم وہ صرف ایک تعلق میں تھا' محبت تھی پھر اسے مجھ سے بھی محبت ہے میں اس کی اس بات کا یقین کروں۔"

"تو ہو گئی ہو گی اسے محبت' اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔"

"تمہارے لیے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" میں نے جل کر کہا۔

"تمہارے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ تم غفران کو جانتی ہو۔ اس لیے اس قدر سنورے کر رہی ہو' بعد میں تمہاری شادی جس شخص سے ہو تمہیں کیا خبر کہ وہ محترم پہلے سے کتنی محبتیں کر چکے ہوں۔"

نیہاں اسی طرح باتیں کیا کرتی تھی' اسی طرح دل توڑنے والی۔ میں چپ ہو گئی۔

ایک طرح سے وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ میں نے اس موضوع پر بھی سوچ لیا تھا لیکن اس اجنبی شخص کے لیے میرے دل میں کوئی جذبہ نہیں ابھرتا تھا۔

میری طرف سے وہ ایک چھوڑ کئی محبتیں کر چکا ہو لیکن غفران... میری آنکھیں جلنے لگیں۔

اس سارے دن میں' میں نے بہت سوچا لیکن اب سوچنے کو کیا رہ گیا تھا۔ شادی میں بہت کم دن رہ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ بجھا بجھا سا چراغ تھا' یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو اسے لے گئی کہاں ہوا' یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو میرے پاس جتنی ہے روشنی' یہی چراغ کی زندگی میں کہاں جلا میں کہاں' بجھا یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو کسی کو خبر ہو نہ ہو۔ اسے تو خبر تھی کہ وہ کہاں سے ختم ہو رہی ہے غفران کے ساتھ بہت سارے دن گزارنے کے بعد بلکہ ایک سال گزارنے کے بعد مجھے احساس ہو گیا کہ

یہ میری زندگی کے وہ ماہ و سال ہیں جو میرے دل کو کوئی خوشی نہیں دے کر جائیں گے۔ ایک سرد جامہ اور بے کیف دن و رات جس میں مجھے رہنا تھا۔ جہاں مجھے گزارا کرنا تھا۔

حالانکہ غفران آج بھی میرے لیے اسی طرح تھا میرا خیال رکھتا' میری بات مانتا۔

مگر محبت... محبت تو اسے ضحیٰ سے ہی تھی' یہ بات اس نے کبھی مجھ سے نہیں کہی ہمارے درمیان ضحیٰ کے موضوع پر صرف ایک دفعہ بات ہوئی تھی۔ وہ بھی شادی سے پہلے اس کے بعد غفران نے کبھی اس کا نام بھی نہیں لیا اور نام لینے کی اسے ضرورت بھی کیا تھی۔

جن کے نام ماتھے پر لکھے ہوں' جن کی خوشبو لمس سے آتی ہو۔ جن کا خیال معطر جاں کو مہکائے رکھتا ہے۔ پھر انہیں کون سی چیز سفر میں رکھتی ہے' کون سا خیال انہیں سونے نہیں دیتا۔

میں یہ سب سوچتی اور خود اپنے آپ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا جیسے میرے اندر بھی ایک آگ ہے اور باہر بھی۔

سارے راستے بس آگے کے راستے ہیں۔ ڈھل اور گوشی دونوں کے معصوم سے ننھے منے قہقہے بھی مجھے زندگی کی طرف لے کر نہیں آتے تھے۔

میں سوچتی ایک دفعہ' صرف ایک دفعہ میں زندہ ہو جاؤں اور زندگی کو محسوس تو کروں۔

دنیا بہت خوب صورت جگہ ہے۔ میں دن میں دس دفعہ یہ جملہ خود کو باور کراتی۔ ہر چند کہ کوئی میرے اندر کہتا کہ دنیا بے شک خوب صورت جگہ ہوگی لیکن یہ میرے لیے نہیں ہے۔

اس دن نیہاں میرے اوپر برس پڑی "کیا اتنی سی بات پر زندگی حرام کرو گی۔"

"یہ اتنی سی بات ہے۔" میری آواز دکھ سے بوجھل ہو گئی "یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ تم تصور کرو نیہاں! جس شخص کو میں نے چاہا وہی اب میرا نہیں ہے۔"

"وہ ابھی تمہارا نہیں ہے لیکن کیا وہ تمہارا ہو بھی نہیں سکتا۔"

"تمہارا مطلب ہے نیہاں کہ میں اس سے زبردستی کی جھوٹی محبت کر لوں۔ اس کے گلے کا ہار بن جاؤں۔ اور پرانے زمانے کی ہیروئنوں کی طرح اس کی خدمت کروں اور اپنی خدمتوں سے اسے اتنا رام کر لوں کہ پھر وہ مجھ سے بھاگ کر کہیں نہ جا سکے۔"

میرے سینے میں سارے زمانے کا زہر اتر گیا۔

"لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو کیا ہوا اریزہ! تم یہ سب کچھ اپنے شوہر کے لیے کرو گی، کسی اور فرد کے لیے نہیں نہ ہی یہ کرنا گناہ ہے نہ کسی بھی طریقے سے ناجائز۔ تم کب بڑی ہو گی اریزہ بہتر ہے کہ اپنے آپ کو بدلو۔"

"کیا بدلوں نیہاں! میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ زندگی جیسے میرے اندر مر گئی ہے، یقین کرو اس قدر بے کیف زندگی کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تمہیں اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ سارا دن تم اتنے بڑے محل میں رانی بنی رہتی ہو، سارا کام کرنے کے لیے نوکر چاکر موجود ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ ساری نعمتوں سے سرفراز کر دیتے ہیں تو بندہ یونہی ناشکری کرتا ہے وہ یونہی خود ساختہ غم نکال کر ان کی آبیاری کرتا ہے۔ اپنے آنسوؤں سے اسے ہرا رکھتا ہے۔ تم یونہی اپنے زخموں کو ہرا رکھو گی۔"

نیہاں کی یہ مجھ سے آخری ملاقات تھی۔

اس کا نکاح تو پہلے ہی ہو چکا تھا اب اگلے مہینے رخصتی تھی۔

جاتے جاتے اس نے گلے لگا کر مجھے پیار کیا۔

"میری باتوں کا برا نہیں ماننا لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔ تم غفران کو کھو دو گی۔"

"میں نے اسے پایا ہی کب ہے نیہاں۔"

"پھر تمہاری سوئی وہیں جا اٹکی ہے۔" اس نے مجھے گھورا "یہ محبت کیا چیز ہوتی ہے یار۔ جو قریب ہے، جو پاس ہے بس وہی محبت ہے۔"

"مگر میں اس کی محبت نہیں ہوں۔"

"تم ہی ہو۔ ضحیٰ کو بھول جاؤ۔"

اور جس دن اس نے کہا اور جس دن میں نے دل کو سمجھایا۔

بالکل اسی دن میں نے کراؤن پلازہ میں ضحیٰ اور غفران کو دیکھا۔ مجھے کچھ چیزیں لینی تھیں اور وہاں ایگزیبیشن لگی ہوئی تھی۔

میں نے اسے آرام سے پہچان لیا۔ اس کے انگلینڈ میں قیام کے دنوں کی فوٹو گراف ایک دو پڑی ہوئی تھیں۔

لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ وہ کہیں سے بھی شادی شدہ نہیں لگ رہی تھی۔

میری آنکھوں کے سامنے جیسے سارے منظر دھندلا گئے۔ مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے میں مستقل گر رہی ہوں، میرے پاؤں کے نیچے وہ زمین ہی نہیں جس پر میں کھڑی ہو سکوں۔ جیسے کوئی فلم ریوائنڈ کر کے چلا دی جائے۔

واپسی پر مجھے امی کے گھر جانا تھا پھر واپس گھر آنا تھا کیونکہ گوشی کو میں نے مانٹیسوری میں ڈال دیا تھا۔ لیکن اب میرا کون سا گھر رہ گیا تھا۔ مجھے کہاں جانا تھا۔

امی میرے جانے سے مزید بوڑھی ہو گئی تھیں۔

بھیا اور بھابھی کی اپنی دنیا تھی۔ بھابھی کو آج بھی یہ لگتا تھا کہ میں نے غفران کو ان کی بہن سے چھین لیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں شاید مجھ سے نفرت کرتی تھیں لیکن بظاہر بہت آؤ بھگت ہوتی تھی۔ شاید غفران کی وجہ

سے یا اس کی دولت کی وجہ سے۔

مجھے کچھ نہیں پتہ تھا۔ میں اگر کچھ جانتی ہوتی تو جو میرے ساتھ ہو رہا تھا اس طرح ہوتا ہی کیوں۔

رات کو غفران نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ "آج ضحیٰ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب تم یہ مت سمجھ لینا کہ میں اس سے ملتا ہی رہتا ہوں۔

بس اتفاق کی بات کہ آج میں کراؤن پلازہ گیا۔ تو وہاں وہ بھی آئی ہوئی تھی، اس کے ساتھ تو بہت برا ہوا۔" غفران اپنی ہی دھن میں مگن تھا "شادی کے صرف ایک سال بعد ہی اس کے شوہر کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔"

وہ بول رہا تھا اور میں اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جذبۂ ترحم تھا یا محبت اس کے لہجے میں ضحیٰ کے لئے کون سی بات تھی۔ میں نہیں جان سکی۔ اسی وقت وہ میری طرف مڑا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے، تم کیوں اتنی سفید ہو رہی ہو؟"

اس نے بڑھ کر میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا جسے میں نے ہٹا دیا۔

"کیا بات ہے اریزہ!" اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ "کیوں اس طرح کرنے لگی ہو، میں کیا تمہارے لیے غیر ہوں جو میرے چھو لینے سے تم برف کی بن جاتی ہو۔

ڈیڑھ سال ہو گیا ہے تمہارا اس طرح کا برتاؤ دیکھتے ہوئے، مجھے برداشت کرتے ہوئے کیا میں انسان نہیں ہوں یا پھر تمہارا شریک حیات نہیں۔"

اس نے ہاتھ مار کر ڈریسنگ ٹیبل سے ساری چیزیں نیچے گرا دیں۔

ڈیڑھ سالوں میں یہ پہلی دفعہ تھا کہ میں نے اس کا یہ روپ دیکھا تھا۔ اگر میں غلط تھی اور جو میں جانتی تھی کہ بے شک میں غلط کر رہی ہوں تو اس نے پہلے مجھے کیوں نہیں ٹوکا۔

لیکن اپنے دل کا کیا کرتی، محبت میں منافقت مجھ سے یہ ہو ہی نہیں پاتا تھا۔ میری محبت کی راہ میں ایک کانٹا آیا تھا اور کانٹوں کا کیا ہے۔ وہ تو یوں بھی خود رو ہوتے ہیں۔

تو اس نے اسے نکالا کیوں نہیں، کیوں اسے میرے دل میں اور میری زندگی میں پیوست رہنے دیا۔ اور آج جب اس کانٹے سے میری آشنائی ہو گئی تھی۔ ایک درد کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ تو آج ہی غفران کو برا لگ گیا۔ آج ہی کیوں اگر میں برف تھی تو وہ بھی تو کسی اور خوش گمان میں تھا۔

آج آئینہ کیوں چٹخا ہے۔ کبھی بہت پہلے کسی کتاب میں میں نے پڑھا تھا۔

تعبیر تو قرار ہے۔ اگر خود تعلیقی سے قرار آجایا کرتا تو نجات ہی نجات تھی۔ آدمی کا سارا جسم اس کے اختیار میں ہوتا ہے، بجز دماغ کے۔

یہ دماغ ہی ہے جو اپنے آپ سے ضد کرتا ہے اور آپ ہی مان جاتا ہے۔ ایک دماغ میں کئی دماغ ہوتے ہیں۔ جو بیک وقت مختلف سمتوں میں بھٹکتے ہیں، یہ آدمی کا ہر وقت امتحان لیتا رہتا ہے جانے کب کس نے خواہشوں، خوش امیدوں، اور اداسیوں کے سارے معاملات دل سے وابستہ کیے تھے۔ حالانکہ اس کا حاصل ہی کیا تھا۔

دل و دماغ دونوں کا واسطہ آدمی سے ہے، دونوں کے وظائف ایک ہوں یا جدا ان پر قابو پانا سب سے بڑا ہنر۔ سب سے بڑا اختیار۔

میں نے یہ سب کچھ ایک لمحے میں سوچ لیا ایک لمحہ جو سب کچھ دے جاتا ہے یا پھر سب کچھ چھین لیتا ہے۔

یہ تو قسمت کے بعد خود آپ پر منحصر ہے اور مجھے اس لمحے کو بچانا تھا۔

اپنے بچوں کو۔

اپنے گھر کو۔

خواہشوں، خوش امیدوں اور اداسیوں کے سارے معاملات دل سے وابستہ سہی۔ لیکن کون سا دل اور کیسے اس کے معاملات مجھے اب اسے اٹھا کر طاق پر رکھنا تھا۔

ایک گھر کی خاطر۔

صرف ایک گھر کی خاطر

رخسانہ نگار

محبت آگ کی صورت

"اونہوں! ریولان کا پنک شیڈ دکھاؤ۔" میں نے ناک چڑھا کر سیلز مین سے کہا۔

"آں۔ آں یہ کچھ بہتر ہے۔ ساتھ میں آوٹ لائن بھی دکھائیں۔" پنک شیڈ لگا کر چیک کرنے لگی۔

"اوہو اب بس کرو بھی اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ چلو میں سامان گاڑی میں رکھ رہا ہوں۔ ناؤ کم آن۔"

اتنے سارے جملے جب کوئی شخص ادا کرے اور آپ اس آواز سے واقف بھی ہوں بلکہ اس آواز کو اتنے قریب سے سنتے رہے ہوں جتنے قریب سے آپ خود کو بہت آرام سے سن سکتے ہیں تو آپ کا فوری طور پر گردن گھما کر دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لپ اسٹک میرے ہاتھ سے چھوٹ کر شوکیس کے شیشے پر گر پڑی" مگر میں نے اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور گردن موڑ کر آواز کے جائے وقوع کی طرف دیکھا۔

وہ روحیل احسن ہی تھا۔ میں بھلا اس کی آواز پہچاننے میں غلطی کر سکتی ہوں یا اس کو پہچاننے میں ۔بھلا کوئی عورت اپنے شوہر کو جو اس سے محض چھتیس گھنٹے پہلے عارضی سفر کے لئے جدا ہوا ہو اسے پہچاننے میں غلطی کر سکتی ہے۔

وہ اسٹور سے خرید ا گیا سامان گاڑی کی ڈگی میں رکھ رہا تھا۔

"اس نے وہی لائٹ گرے شرٹ 'بلیک جینز کے ساتھ پہن رکھی تھی جو میں نے اس کے سوٹ کیس میں سب سے اوپر رکھی تھی روحیل کی شرٹس میں خود پریس کیا کرتی تھی' پورے جی جان سے۔ شرٹ کی کریز آستینوں سے ابھی تک جمی ہوئی تھی۔ وہ بہت مصروف انداز میں سامان رکھ رہا تھا۔

"ماما! ماما! جلدی آیئے نا۔ پاپا بلا رہے ہیں تین ساڑھے تین سال کا صحت مند خوبصورت بچہ جس نے بے حد قیمتی ریڈی میڈ سوٹ پہن رکھا تھا مجھ سے چھ قدم دور کھڑی ایک فربہی مائل' عام شکل و صورت کی عورت نما لڑکی کے دامن کو زور سے جھٹک کر بولا۔

"چلو چلو بیٹا! سارے جہان کے کام تمہارے پاپا کے دم سے چل رہے ہیں۔ ان کی جلدی ہی ختم نہیں ہوتی آؤ۔ چلیں۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑا کوئی پیکٹ شوکیس پر رکھا اور تیزی سے اسٹور کا گلاس ڈور دھکیل کر باہر نکل گئی۔

روحیل نے اس سے کچھ کہا' اس نے مسکرا کر کوئی جواب دیا۔ بچہ دونوں کے بیچ آ گیا شیشے کے باہر منظر صاف نظر آ رہا تھا ایک مکمل تصویر۔

روحیل فرنٹ ڈور کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لڑکی دوسری طرف سے گھوم کر آئی اور اس کے برابر بیٹھ گئی جہاں میں بیٹھا کرتی ہوں بلکہ دنیا کی ہر بیوی اپنے شوہر کے ساتھ گاڑی میں اسی سیٹ پر بیٹھا کرتی ہے۔ بچہ ان دونوں سے پہلے ہی پیچھے بیٹھ چکا تھا۔ گاڑی ذرا سا ریورس ہوئی اور پھر اگلے ہی پل نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"ملک ایسوسی ایٹس کی آنر تھیں مسز ماہ روحیل ۔کروڑ پتی سمجھیں' یہ اس بچے جتنی تھیں جب سے اس اسٹور پر آ رہی ہیں۔ ہمیشہ شاپنگ یہیں سے کرتی رہتی ہیں ادھر اسلام آباد ہی میں رہتی ہیں۔ ان کی مدر بلائنڈ ہیں ان کے پاس ہی رہتی ہیں۔ شوہر ان کا کسی دوسرے شہر میں جاب کرتا ہے ہفتہ پندرہ دن بعد آتا ہے۔ ویسے آپ انہیں جانتی ہیں؟"

سیلز مین میری محویت دیکھ کر نان اسٹاپ شروع ہو گیا۔

اصل میں اس اسٹور پر جاب کرنے سے پہلے میں چار سال تک ملک صاحب کا ڈرائیور رہا ہوں۔ بی بی کو کالج لایا' لے جایا کرتا تھا ویسے ان دونوں کی لو میرج تھی۔" وہ ذرا آہستگی سے بولا۔

"ملک صاحب کو یہ لڑکا کچھ خاص پسند نہیں تھا کہتے تھے یہ ہماری دولت کے چکر میں ہے بڑے جھگڑے ہوئے گھر میں مگر پھر بی بی کی خواہش کے آگے مجبور ہو گئے ویسے کون سا شیڈ پسند آیا جی آپ کو؟"

اسے اپنے زیادہ بولنے کا احساس ہوا تو خود ہی بات بدل گیا۔

"میں پھر لے جاؤں گی میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"میں نے اپنے چکراتے سر کو تھاما اور بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے اسٹور کا دروازہ دھکیل کر باہر آ گئی۔

اسٹور کے کارنر پر ذرا ہٹ کر خالی سی جگہ تھی' میں بڑی مشکل سے وہاں تک پہنچی اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ روحیل اور یہ سب میری آنکھوں کے آگے پیلے نیلے ستارے گڈمڈ ہو رہے تھے۔

میری اور روحیل کی شادی کو فقط دس ماہ ہی تو ہوئے تھے جب پرسوں شام اس نے کراچی میٹنگ میں جانے کی بات کی تو میں نے لاڈ سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر ساتھ جانے کی فرمائش کی۔

"نہ میری جان! اس حالت میں تو تم سفر کی بات نہ کرو' وہ بھی پلین میں۔ ہمارے بچے کو کچھ ہو گیا تو؟" اس نے شوخی سے میرے گال پر چٹکی کاٹی۔

"ہمارے پیار کی پہلی نشانی ہے۔ اس کی خاطر تو تمہیں یہ سب سہنا پڑے گا۔" اور میں فوراً" مان بھی گئی آخر بچے کا خیال تو مجھے بھی تھا۔

تو پھر یہ سب کیا تھا کراچی سے اسلام آباد؟ مگر کیسے۔ کتنا روکا تھا امی نے مجھے۔ خالہ نے فرح اور زارا نے سب نے۔

"گل رخ مت کرو ایسے۔ محض چند ماہ کی شناسائی کی بنیاد پر ایسے رشتے نہیں جوڑے جاتے۔ شادی کے

لئے صرف لڑکا ہی تو نہیں دیکھا جاتا، ہمیں تو کچھ بھی اس کے بارے میں نہیں معلوم۔ نہ ماں باپ، نہ بہن بھائی۔ بھلا اس طرح بھی شادیاں ہوتی ہیں۔"

مگر مجھے جو آگ لگی تھی عشق کی، روحیل احسن کے منہ زور عشق کی اس کی تمازت نے مجھے اندر تک دہکا رکھا تھا۔ اس آگ کے بھڑ بھڑاتے شعلے کچھ سننے نہیں دے رہے تھے۔

اور خود سری کی عادت بھی بہت پختہ تھی۔ خدا نے حسن اور وہ بھی مقابل کو پاگل کردینے والے حسن سے مالا مال کرکے بھیجا تھا کہ اس حسن کے خمار نے ہمیشہ ہی میری عقل کو اپنے حصار میں لئے رکھا۔

جو بات سرعت سے منہ سے نکل جاتی، وہی حرف آخر ہوتی۔

روحیل کو میں نے اپنی دوست کی شادی میں دیکھا تھا۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا صرف مجھے ہی نہیں روحیل کو بھی۔ شادی کے تین دن کے میں ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے جیسے صدیوں کی جان پہچان ہو۔

نظروں کی پہچان نے دلوں پر بیت جانے والی اس خاموش قیامت کو زباں دے دی۔

میری دوست کا ولیمہ تھا اور ہم دونوں ہوٹل کی پچھلی میزوں پر بیٹھے دیوانہ وار ایک دوسرے کو تکے جارہے تھے۔ زباں خاموش تھی میری بھی اس کی بھی اور نظروں کی تکرار نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔

گل رخ! آئی لو یو۔" روحیل کے بس یہ کہنے کی دیر تھی پھر تو جیسے درمیان میں کوئی بھی آڑ نہ رہی۔

زبان کو لفظ مل گئے اور خوابوں کو انداز بیاں۔

"گل! ایسا کیوں ہوتا ہے تمہیں دیکھ کر لگا کہ جو زندگی بیتی، سور ایگاں تھی۔"

ہوٹل میں مکس گیدرنگ کا شور تھا۔ روحیل کی آواز بہت مدھم تھی مگر مجھے تک رہا تھا سارے جہاں میں صرف وہی بول رہا ہے باقی ساری کائنات دل تھامے اسی کو سن رہی ہے۔

"کیا اب بھی یہ احساس باقی ہے؟" میں نے کتنی مشکل سے سوال کیا۔

"اب..... اب تو مت پوچھو۔ کوئی بھی احساس باقی نہیں سوائے اس کے کہ تم سامنے موجود ہو اور میں تمہیں ہاتھ لگا کر چھو سکتا ہوں، اپنے قریب کرسکتا ہوں۔ تم نے کبھی سنا ہے کوئی اپنے خواب کو یوں چھو سکتا ہو، اپنے قریب کرسکتا ہو۔ میں..... میں دنیا کا پہلا شخص ہوں نا جسے یہ معجزہ عطا ہوا ہے۔"

اس کا لہجہ مخمور سا تھا۔

محبت معجزہ ہی تو ہے گل خواب کو بدن مل جائے اسی کو تو معجزہ کہتے ہیں۔ اس کی باتیں مجھے پاگل کردینے کو کافی تھیں۔

"یہ معجزہ میرے ساتھ بھی تو ہوا ہے روحیل! اس نے بہت آہستگی سے ٹیبل پر دھرے میرے ہاتھ پر اپنا مضبوط گرم توانا ہاتھ رکھا تو میں نے زور سے آنکھیں بند کرکے کہا۔

"روحیل! مجھے لگتا ہے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں تمہاری سنگت کا۔" میں نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں۔

"یہ خواب تھا گل! اگر تم سے ملنے سے پہلے۔ اب اس خواب کو حقیقت، ہماری محبت بنائے گی۔" اس نے ایک جذب کے عالم میں کہا تھا۔

بس چند دنوں کی رفاقت نے مجھے اپنے گھر والوں سے بغاوت پر اکسادیا۔ اچھا بھلا میرا رشتہ میرے خالہ زاد عامر سے چند دن پہلے تک طے ہونے جارہا تھا اور فرح کا عاشر کے ساتھ۔ سب کچھ ٹھیک تھا کہ روحیل کی آمد نے سب گڑبڑ کردیا۔

"امی جان! میں شادی کروں گی تو صرف روحیل سے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔" میرے دوٹوک فیصلے سے گھر میں جیسے بھونچال آگیا۔

پھر امی کی منتیں، خالہ کا سمجھانا بجھانا، فرح اور زارا کی ناراضی مجھے کوئی بھی فیصلہ بدلنے پر مجبور نہ کرسکا۔ بس روحیل روحیل روحیل..... ایک ہی ضد سر پر سوار تھی۔

"آخر اس کا کوئی آگا پیچھا بھی ہے یا نہیں۔ اسے

کہو اپنے کسی بڑے کو گھر بھیجے۔" آخر میری ضد کے آگے امی ہار گئیں۔

"میرے چچا امریکہ میں ہوتے ہیں جنہوں نے مجھے پالا اور کوئی رشتہ دار نہیں، ماں باپ میری پیدائش کے فوراً" بعد ایک حادثے کا شکار ہوگئے تھے اور میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ایگزیکٹو مینیجر ہوں۔ انیسویں اسکیل سے زیادہ تنخواہ ہے میری۔ گھر ہے گاڑی ہے امریکہ میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ اسلام آباد میں رہا ہوں۔ باقی چال چلن کے بارے میں خود پڑتال کرلیں۔ جہاں جاب کرتا ہوں وہاں سے معلومات لے لیں۔ ایک صاف ستھری زندگی گزار رہا ہوں اور یہ زندگی حسین تر ہوجائے گی اگر گل رخ میرے ساتھ ہوگی۔"

اس کی اس لمبی چوڑی وضاحت کے بعد میں نے کسی کو کوئی بات کرنے ہی نہ دی اور صرف چند ہفتوں میں ہی گل رخ، روحیل احسن کی خواب انگیز رفاقت کی ساتھی بن گئی۔

پہلے چند ماہ تو پتا ہی نہ چل سکا کہ میں زمین پر ہوں یا آسماں پر۔ وہ صرف باتیں ہی اچھی نہیں کرتا تھا، ہم سفر بھی بہت اچھا تھا اور اس کا ساتھ سب سے حسین۔ مجھے لگتا میں دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوں۔

محل جیسا گھر، قیمتی گاڑی حسین، وجیہہ اور بے تحاشا محبت کرنے والا شوہر نہ ساس نہ سسر نہ کوئی اور بندش۔ دو نوکر ہمہ وقت موجود، ڈرائیور گاڑی کے ساتھ میرے حکم کا منتظر اور میرا پرس کڑکڑاتے نیلے ہرے نوٹوں سے ہر وقت بھرا رہتا اور شام کو جب روحیل آفس سے آتا تو ہم تیار ہوکر آؤٹنگ کے لئے نکل جاتے۔

میں جو ان دنوں بے حد حسین ہوگئی تھی کہ مجھے نظر بھر کر دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ بقول روحیل کے میرا خوشبوؤں بھرا وجود اکثر ڈرائیونگ وہیل پر اس کے کنٹرول کو ڈگمگا دیتا۔

"گل! تم اتنی حسین ہوگی یہ تو تمہیں اتنے قریب سے دیکھا تو میں نے جانا ہے۔"

وہ میرے کان میں سرگوشی کرتا تو میں اپنے آپ میں سمٹ کر رہ جاتی اور پانچ ماہ پہلے جب میں نے اسے ایک نئے وجود کے آنے کی خبر دی تو وہ جیسے خوشی سے پاگل ہی ہوگیا۔

"بس میری ایک ہی شرط ہے بچے کے بعد بھی تم اسی طرح حسین اور نازک رہنا۔" وہ میرے قریب ہوکر بولا۔

اس دن اس نے مجھے ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کرائی ڈنر ہم نے باہر ہی کیا اور ایک بیش قیمت بریسلٹ میری کلائی میں پہنایا۔

اس حسین موقع کی یاد میں، اس کی سرگوشی میرا دل چھوگئی۔

میں نے حیرت سے کلائی میں پڑے اس زیور کو دیکھا جو میری طرح بے جان نظر آرہا تھا۔

"گل کلاں کو کچھ ہوگیا تو مجھے الزام مت دینا۔ ایسی جلد بازی کے کاموں کا نتیجہ عموماً" اچھا نہیں ہوتا۔ امی کی آخری وارننگ میرے کاموں میں گونجی۔

"خود ہی بھگتنا جو ہوگا میں بتا رہی ہوں ہمارے پاس مت آنا میرا جو فرض تھا میں نے پورا کیا۔"

اگلے ہفتے امی اور خالہ حج پر جارہی تھیں، سارے فرائض سے سبکدوش ہوکر۔

حج کے بعد وہ خالہ کی بیٹی رافعہ آپا کے پاس آٹھ دس ماہ رہیں گی۔ زارا اور فرح کی عامر اور عاشر کے ساتھ شادی پچھلے مہینے ہی تو ہوئی تھی وہ چاروں بھی ہنی مون کے لئے ان کے ساتھ ہی جارہے تھے۔ آج ان کا اسلام آباد کا پروگرام بن گیا تھا بالکل اچانک۔

رافعہ آپا کے لئے اور ان کے بچوں کے لئے گفٹس خریدنے ہیں آپی۔ آپ بھی چلیں نا۔ روحیل بھائی کو تو کل آنا ہے۔ آپ گھر میں اکیلے بور ہوں گی۔ محل چاہے سونے کا ہو تنہائی تو دور نہیں کرسکتا نا آجائیں نا! عامر بہت احتیاط سے ڈرائیو کریں

گے۔ اگلے ہفتے تو ہم نے بھی چلے جانا ہے، کچھ وقت اکٹھے گزاریں۔"

ان چاروں کا اصرار میں رد نہ کر سکی اور ان کے ساتھ چل دی۔ وہ چاروں سپر مارکیٹ کے مختلف اسٹورز میں شاپنگ کرتے پھر رہے تھے۔ ہنستے آپس میں خوب مذاق کرتے۔۔۔ میں اپنے لئے کچھ کاسمیٹکس کا سامان خریدنے اس اسٹور میں چلی آئی اور یہاں۔۔۔ مجھے پھر وہ اندوہناک منظر یاد آگیا۔

"میرے اللہ میں کیا کروں کس سے کہوں؟" میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔

میں اکثر سوچا کرتی تھی روحیل کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے۔ آخر ایک جاب سے انسان اتنا کیسے کما سکتا ہے۔

"ملک ایسوسی ایٹس کی آنر۔۔۔ کروڑ پتی ہی سمجھیں۔"

"معلوم نہیں تم کس کے نصیب کا کھا رہی ہو۔" ایک بار جو میں نے مزید کھانے سے انکار کر دیا کہ میں موٹی ہو رہی ہوں تو روحیل کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔

"کس کے نصیب کا۔۔۔؟ اس کی پہلی بیوی اور اس کے بچے کا یا اللہ میں کیا کروں۔" آنسو بہنے لگے۔

اپنے فیصلے کی اندھی صلیب پر میں اکیلی کھڑی جھول رہی تھی۔

"ہمارے پاس مت آنا۔" امی کی تنبیہہ۔

"آپی چلیں۔ شاپنگ تو مکمل ہو گئی ہے کچھ کھا پی لیں۔ کیا بات ہے آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں آپ نے کچھ نہیں خریدا۔ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟" زارا مجھے ہلا ہلا کر پوچھ رہی تھی۔

اور میرا صلیب پر لٹکا بدن ہولے سے ہلا۔

"آئی ایم آل رائٹ۔ چلو چلیں۔" یہ میری آواز تو نہ تھی اور جو بدن سیڑھیوں سے اٹھا وہ میرا بدن تو نہ تھا۔

یہ تو کوئی اور ہی گل رخ تھی اوپر سے صحیح و سالم۔ اندر سے محبت کی آگ میں جھلسی ہوئی خستہ حال، چور چور بدن والی۔

"آخر اس آگ نے صرف مجھے ہی کیوں جھلسایا۔ اس دھوکے باز کو تو کوئی آنچ بھی نہ پہنچے گی تمام عمر۔"

واپسی کے سفر میں کھڑکی سے باہر خوبصورت نظاروں کو بے جان نظروں سے تکتے ہوئے میں نے سوچا۔

میں نے بہت سوچا تھا۔ روحیل کو چھوڑ دینے کے بارے میں بھی اس دھوکے باز کو سرِ بازار رسوا کرنے کے بارے میں بھی، اس کا گریبان اور منہ نوچنے کے بارے میں بھی اور ساری دنیا کی ہمدردیاں سمیٹنے کے بارے میں بھی۔

مگر اس کے بعد۔۔۔۔؟

اس کے بعد کے سوال نے میرے اندر احتجاج کے سارے نوحے بے زبان کر دیے۔

"اس کا منہ نوچ کر کہاں جاؤں گی؟"

امی کے پاس؟

"کس منہ سے ان کا سامنا کروں گی۔ ان کے طعنے سننے، خالہ کے طعنے اور زمانے بھر کے بھی اور یہ میرا بچہ جنم لے گا، بڑا ہو گا مجھ سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھے گا تو؟"

ان سوالوں کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

اور سب سے بڑھ کر اپنے دل کی، نفس کی بے ایمانی میں کس کو بتاؤں۔

وہ سب عیش و عشرت جن کی میں ان چند ماہ میں عادی ہو چکی ہوں، جو مجھے اپنی ماں کے گھر بھی میسر تھے اور نہ آئندہ کبھی ہوں گے۔ ان کی چاٹ نے مجھے اپنی محبت کے اس کریہہ بٹوارے پر بھی مجبور کر دیا۔

"ہاں محبت بھی مل سکتی ہے عیش و عشرت آسائشوں کے پلڑے میں۔"

اور میں تو ہوں ہی اپنے نفس کی ماری ہوئی۔ میں بھی اس کی خواہش میں اندھی ہوئی تھی اور اب بھی ایک کمزور انسان۔۔۔ میں زمانے سے لڑ سکتی ہوں سب سے اپنے نفس کی خاطر لڑ سکتی ہوں مگر اپنے نفس سے منہ نہیں موڑ سکتی۔۔۔ نہیں موڑ سکتی۔۔۔

★

اپنے من میں ڈوب کر

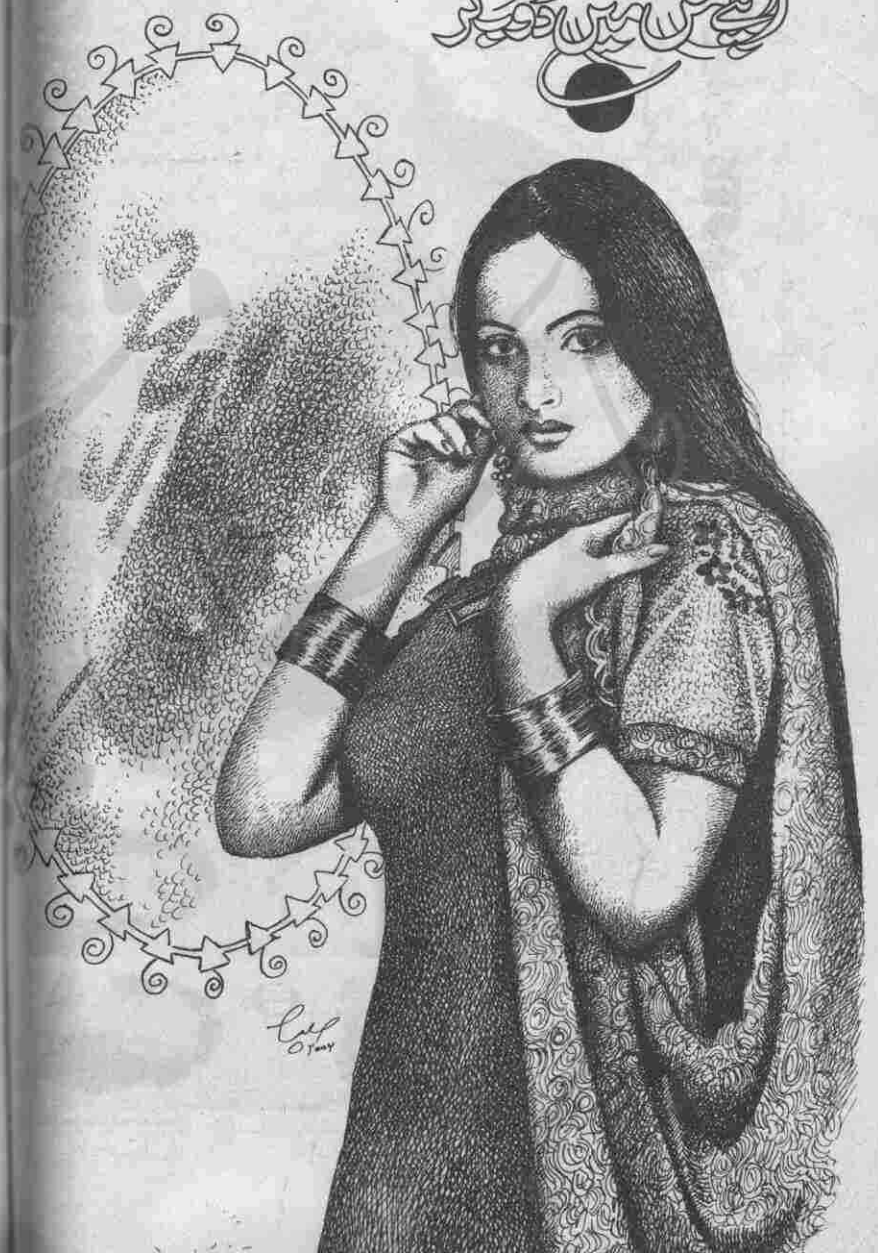

صبح ہی صبح پھر وہی بات ہو گئی تھی جس سے میں بے انتہا چڑتا تھا۔

مجھے یونیورسٹی سے دیر ہو رہی تھی' اس لیے امی کو جلدی ناشتہ تیار کرنے کا کہہ کر میں باتھ روم میں گھس گیا۔ تیار ہو کر میز پر آیا تو امی چاچو کو ناشتہ دے رہی تھیں۔

"امی! ناشتہ۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ان سے کہا۔ "جلدی کریں' مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"ہاں بناتی ہوں بیٹا!" وہ ناشتے کی پلیٹیں چاچو کے سامنے رکھ کر ٹرے لیے واپس کچن کی جانب جانے لگیں۔

"کیا مطلب۔" مجھے غصہ آگیا۔ "ابھی تک ناشتہ بنا نہیں' میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ مجھے آج یونیورسٹی جلدی پہنچنا ہے۔"

"ابھی بن جاتا ہے بیٹا! تمہارے چاچو کے لیے بنا رہی تھی۔" وہ اطمینان سے کہہ کر کچن کی جانب مڑ گئیں۔

میرا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ یعنی میری بات کی اس گھر میں کوئی اہمیت نہ تھی اور یہ چاچو..... میں نے چڑ کر ان کی جانب دیکھا' جو مزے سے ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔

میں نے غصے سے کرسی کھسکائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے کہاں چلے' ناشتہ تو کر لو۔" میرے اٹھنے پر وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے' آپ کریں ناشتہ۔" میں نے لفظ ناشتے کو چبا چبا کر ادا کیا اور دل ہی دل میں جلتا بھنتا باہر نکل آیا۔

اپنی سیکنڈ ہینڈ سوزوکی موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرتے ہوئے میری نظر چاچو کی کرولا پر پڑی تھی اور میرا موڈ مزید آف ہو گیا تھا۔

یہ جلنے اور کڑھنے کا روگ مجھے بچپن ہی سے لگ گیا تھا۔ جب چاچو کو ہر بات میں مجھ پر فوقیت دی جاتی' ڈانٹ میں وہ ہمیشہ ہی بازی لے جاتے تھے۔

"فیضان کو دیکھو' چھوٹی کلاس سے اسکول میں ٹاپ کر رہا ہے اور تم....." پاپا مجھے گھورتے اور گھورنے کا یہ عمل ہر اس روز دہرایا جاتا' جب میرا رزلٹ آؤٹ ہوتا۔

میں بھی کوئی کوئی کند ذہن' غبی طالب علم نہیں تھا۔ تیسرا' چوتھا رینک تو آ ہی جاتا تھا۔ اب یہ ٹاپ واپ مجھ سے نہیں ہوپاتا تھا تو میں کیا کرتا۔

وہ شکل و صورت میں بھی مجھ سے کچھ بہتر تھے۔ ہر

شخص ان کی ظاہری خوبصورتی پر ریجھ جاتا تھا تو میں بھی کوئی ایسا گیا گزرا نہیں تھا۔ بس ان کی ہائٹ چھ فٹ دو انچ تھی تو میری بھی چھ فٹ سے کم نہیں تھی' بلکہ رنگت تو ان سے کچھ زیادہ ہی کھلتی ہوئی تھی۔

خیر حسن تو دیکھنے والے کی آنکھوں میں ہوتا ہے اور مجھے آئینہ دیکھتے ہوئے کبھی احساس کمتری نہیں ہوا تھا۔

لوگ کہتے وہ بہت خوش اخلاق ہیں' اب مجھ سے یہ چالاکیاں نہیں ہوتی تھیں کہ خوامخواہ خوش اخلاقی کا جھنڈا بلند رکھوں' چاہے دل چاہے یا نہیں۔

ہماری عمروں میں صرف پانچ سال کا فرق تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم دونوں میں بہت دوستی ہوتی لیکن رقابت کی یہ آگ جو اندر ہی اندر مجھے بچپن سے جھلسا رہی تھی' اس نے ہمیں ہمیشہ چچا بھتیجا ہی رکھا' کبھی دوست بننے نہیں دیا۔

ابا جی یعنی میرے دادا اپنے اس بیٹے پر بڑا ناز کرتے تھے اور پاپا کو کبھی اس پر حسد نہیں ہوا۔ انہیں تو خود اپنے اس اکلوتے بھائی سے بڑی محبت تھی۔

پاپا اور امی کی شادی کے وقت وہ محض چار سال کے تھے۔ وہ پاپا سے پورے بیس سال چھوٹے تھے۔ پاپا اور چاچو کے درمیان میں تین بہنیں اور اس دنیا میں آئیں اور جب چاچو بن بلائے مہمان کی طرح اتنے سالوں بعد اس دنیا میں چلے آئے تو بجائے اس کے کہ ابا جی اور اماں شرمسار ہوتے' پورے گھر میں بے انتہا خوشیاں منائی گئیں۔

وہ بے حد صحت مند اور خوبصورت بچے تھے۔ بھائی اور تینوں بہنیں ان پر جان چھڑکتی تھیں پھر کچھ سالوں بعد ان محبتوں میں ایک اضافہ اور ہو گیا' وہ امی تھیں۔

اور ایک سال بعد جب میں ان کی گود میں آیا' تب بھی وہ محبت برقرار رہی اور چاچو بڑی شان سے محبت اور توجہ کی اونچی مسند پر براجمان رہے۔

میں نے ہوش سنبھالا تو ہر جگہ چاچو کی ذات چھائی ہوئی تھی۔

"فیضان اتنا خوبصورت ہے۔"

"فیضان کی ذہانت کا کوئی مقابلہ نہیں۔"

"کس قدر تہذیب یافتہ بچہ ہے۔"

"کوئی بھی تو خامی نہیں اس میں' خدا ایسی اولاد سب کو دے۔"

ہر جانب سے ان کے لیے ایسے ہی جملے میرے کانوں میں اترتے اور میرے دل میں ان کے لیے چھپی نفرت اور رقابت میں اضافہ ہو جاتا۔

میرے تو اپنے والدین میرے اپنے نہیں تھے' ان پر پورا پورا چاچو کا قبضہ تھا۔ میرے بعد میرے دو اور بہن بھائی سدرہ اور اشمل بھی اس دنیا میں آئے لیکن مجھے ان سے کبھی حسد یا جلن محسوس نہیں ہوئی۔

یہ اور بات کہ میں نے کبھی صاف لفظوں میں حسد اور رقابت کو زبان نہیں دی تھی' لیکن دل ہی دل میں اس آگ نے میرے پورے وجود کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ چاچو کے ساتھ میرے اس تناؤ اور کھنچاؤ کو سب لوگ اس رشتے کا تقاضا سمجھتے تھے جو میرے اور ان کے درمیان تھا۔ عمروں کا فرق کتنا بھی کم ہوتا بہرحال وہ میرے چچا تھے۔

اشمل اور سدرہ البتہ ان سے کافی فری تھے' جس پر اماں یعنی میری دادی انہیں اکثر ڈانٹتی تھیں کہ "دیکھو ایک اغلب بھی تو ہے۔ مجال ہے چچا سے کوئی مذاق کرلے' کتنا ادب کرتا ہے" لیکن ان کا جواب ہوتا کہ چاچو ہیں ہی ایسے ان سے بھلا کوئی کس طرح تکلف سے پیش آسکتا ہے۔ پھر وہ کب ان کے ساتھ بات کرتے وقت اخلاقی تقاضوں کا خیال نہیں رکھتے' بے تکلفی میں بھی تہذیب کا دامن نہیں چھوڑتے۔

خود چاچو بھی ان کی اس بے تکلفی اور ہنسی مذاق میں ان کا بھرپور ساتھ دیتے تھے۔ صرف ایک میں ہی تھا' جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔

خاص طور پر جب میرے مقابلے میں انہیں فوقیت دی جاتی تو میری اس نفرت اور چڑ میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

کمپیوٹر سائنس میں ایم ایس کرنے کے بعد انہوں نے ایم بی اے کیا۔ ایم بی اے کرتے ہی انہیں جاب مل گئی اور اب ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلا عہدے پر فائز تھے۔ جلد ہی انہوں نے آفس کی جانب سے ملی ہوئی گاڑی خود خرید لی تھی۔ ان کی معقول تنخواہ ہر ماہ کی پانچ تاریخ کو ان کے ہاتھ سے امی کے ہاتھ میں منتقل ہو جاتی۔

پہلی مرتبہ جب انہوں نے ایسا کرنا چاہا تو امی نے کافی تامل کیا تھا۔ "نہیں فیضان! تمہاری تنخواہ پر میرا کوئی حق نہیں' تم اماں کے ہاتھ میں دو یہ سب۔"

"کمال ہے بھابھی! سالوں سے گھر کا سارا خرچ آپ کے ہاتھ میں ہے' اماں تو کب کی ریٹائر ہو کر سکون کی زندگی گزار رہی ہیں' پھر یہ پیسے لے کر وہ کیا کریں گی۔" انہوں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"کچھ بھی سہی لیکن بہرحال یہ ان کا حق ہے۔" امی بدستور اپنے موقف پر ڈٹی رہیں۔

اور یوں چاچو نے جب اپنی تنخواہ اماں کو دی تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگیں۔ "ارے بچے! مجھے کیوں دے رہا ہے یہ سب' اپنی بھابھی کو دے۔ میں تو ان چکروں سے آزاد ہوں اب۔"

"لیجیے انہیں دو تو وہ کہتی ہیں کہ ان پر اماں کا حق ہے۔ آپ کو دوں تو آپ کہتی ہیں مجھے یہ سب بھابھی کو دینا چاہیے' میں کیا کروں بھئی۔"

"ارے بیٹا! یہ اس کی سعادت مندی ہے کہ اس نے ایسا کہا ہے ورنہ تو ان پیسوں پر اس کا زیادہ حق ہے۔ آج جو تو کسی لائق ہے تو اس میں ماں باپ کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ تیرے بھائی اور بھابھی کا بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے اولاد کی طرح پالا ہے تجھے' پڑھایا لکھایا' اس قابل بنایا' اپنے بچوں سے بڑھ کر سمجھا ورنہ ہم دونوں بوڑھے تو اس عمر میں تیری دیکھ بھال نہ کر سکتے تھے بیٹا!"

"جانتا ہوں اماں' تب ہی تو میں آپ سے پہلے ان کے پاس گیا تھا۔"

یوں امی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ ہر مہینے اپنی پوری تنخواہ ان کے ہاتھ میں تھما دیتے اور وہاں سے کھسک لیتے۔

اور امی یقیناً" کبھی بے حد ضرورت پڑنے پر ہی اس میں سے کچھ خرچ کرتی تھیں ورنہ وہ ساری رقم بینک میں جمع ہو رہی تھی۔

پھر جب ایک روز چاچو چمچماتی کرولا گھر لے آئے تو سب حیران رہ گئے۔

"آفس کی طرف سے ملی ہے۔" انہوں نے چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ بتایا۔

"واہ چاچو! مزے آگئے آپ کے تو۔" اشمل نے رشک سے انہیں دیکھا تھا۔

"صرف میرے کیوں' اب سب مزے کریں گے۔" انہوں نے کہا۔

"تم یہ گاڑی خرید کیوں نہیں لیتے فیضان!" امی نے اچانک پوچھا تو وہ ان کی سادگی پر مسکرا دیے۔

"آپ کو معلوم ہے کرولا کتنے کی آتی ہے؟" انہوں نے امی کو چھیڑا تھا۔

"ہاں بھلا کتنے کی۔"

اور جب انہوں نے بتایا تو وہ اٹھ کر اندر کمرے میں گئیں اور ایک چیک بک لا کر ان کے سامنے رکھ دی۔

"کل صبح چلیں گے بینک' تم پیسے نکلوا لو پھر یہ گاڑی اپنے نام کروا لینا۔ نہیں تو ایسی ہی دوسری گاڑی کسی شوروم سے خرید لینا۔"

"لیکن یہ اتنے پیسے آپ کے پاس آئے کہاں سے۔" وہ حیران رہ گئے۔

"تمہارے اپنے ہی ہیں۔" پاپا جواب تک خاموشی سے مسکراتے ہوئے سب سن رہے تھے' اچانک بولے۔

"میرے لیکن وہ تو....." وہ ایک لمحے کے لیے رکے پھر سب سمجھ گئے۔ ان کے چہرے پر ناراضی اور افسردگی کے تاثرات بیک وقت ابھرے۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ میرے پیسوں کو پرایا

سمجھتے ہیں' تب ہی آج تک انہیں خرچ نہیں کیا۔"

"ارے نہیں بھئی' ضرورت پڑنے پر خرچ بھی کیا ہے۔ تم اکاؤنٹ میں دیکھ لینا لیکن اب اضافی رقم کو یوں اڑایا تو نہیں جاسکتا۔ میں نے اس نیت سے جمع کرلی تھی کہ تمہاری شادی میں کام آئے گی۔" امی نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

"ہاں صرف میری ہی شادی میں۔" ان کا موڈ ایک دم آف ہوگیا تھا۔

پھر وہ وہاں سے اٹھنے ہی لگے تھے کہ پاپا نے انہیں روک لیا۔ "ارے نہیں یار! صرف تمہاری ہی کیوں جس کی بھی پہلے ہوجائے۔ تم بڑے ہو اس لیے تمہارا خیال سب سے پہلے آیا تھا۔ ہوسکتا ہے پہلے میں ہی کرلوں دوبارہ۔"

"ارے واہ!" امی نے انہیں گھورا تھا ورنہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ پاپا ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنے کے لیے مذاقاً" ایسا کہہ رہے ہیں۔

"چلئے پھر آپ کی بارات اس نئی گاڑی میں لے کر چلیں گے۔" چاچو نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر فوراً" ہی اپنا موڈ ٹھیک کرلیا تھا۔

"اچھا اب میری سوکن لاؤ گے تم دونوں بھائی مل کر۔" امی نے خفگی سے ان کے بال بکھیرے تھے تو انہوں نے ہنس کر ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

اور میں دل ہی دل میں کڑھتا' اس ہنستے بستے ماحول سے باہر نکل آیا تھا۔

میں ان دنوں یونیورسٹی نیا نیا گیا تھا' جبکہ چاچو کو جاب کرتے تین سال ہو رہے تھے۔ انہیں اپنی قابلیت کی وجہ سے تعلیم مکمل کرتے ہی بے حد اچھی جاب مل گئی تھی اور مجھے ابھی عملی زندگی میں قدم رکھنے میں کچھ وقت درکار تھا اور اپنی ضرورتوں کے لیے امی کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا۔ اس روز میں پوری رات سوچتا رہا کہ بجائے اپنے والدین کو کچھ دینے کے میں ان سے اپنی ضرورت کے لیے لیتا رہتا ہوں۔

پھر میں نے دو ایک دوستوں کی مدد سے تین چار ٹیوشنز حاصل کرلیں۔ میرا ایٹھس اچھا تھا اور مجھے معقول پیسے ملنے لگے۔

گھر والوں کو میرے سارا دن باہر رہنے پر اعتراض رہنے لگا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں ادھر ادھر دوستوں میں وقت ضائع کرتا ہوں' لیکن جب میرے پاس اتنی رقم جمع ہوگئی کہ میں ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خرید سکتا تو میرا یہ بھید گھر والوں کے سامنے کھل گیا۔

"ارے بیٹا! تمہیں موٹر سائیکل چاہیے تھی تو مجھ سے کہتے' اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔" امی خفا ہونے لگیں تو میں سوچ کر رہ گیا کہ اس سے پہلے انہیں اس بات کا خیال کیوں نہ آیا تھا کہ میں بسوں میں دھکے کھاتا پھرتا ہوں۔ پاپا اپنی گاڑی آفس لے جاتے تھے پھر وہ شام میں ہی گھر میں گھستے تھے۔ میرے بارے میں تو ان کا یہ خیال تھا کہ میں ان کی گاڑی چلائی تو میں اسے کچھ نہ کچھ کر ڈالوں گا' یعنی میں اسکول جاتا بچہ تھا ان کی نظر میں۔ ہاں البتہ کبھی کبھار چاچو ضرور اسے استعمال کرلیتے تھے۔ اب ان کی گاڑی کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا تھا۔

"کوئی بات نہیں امی! اچھی بات ہے کہ اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہیے۔" میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا۔

لیکن گھر میں کسی کو بھی میری موٹر سائیکل سے دلچسپی نہیں تھی۔ بھلا دو دو گاڑیوں کے ہونے کے بعد میری موٹر سائیکل کی کیا دال گلنی تھی۔ بس میرا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔

"اور پڑھائی کیسی جارہی ہے؟" چاچو آتے جاتے کبھی کبھار ضرور پوچھ لیا کرتے۔

"جی بالکل ٹھیک۔" میں زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجالیتا۔

مزے کی بات تھی کہ میں نے کبھی ان پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ مجھے ان سے اتنی شدید چڑ ہے۔ وہ تو اسے میری سنجیدہ مزاجی پر محمول کرتے تھے۔

میں نے دل ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ مجھے زندگی میں ان سے زیادہ بلند مقام حاصل کرنا ہے' ان سے آگے جانا ہے تاکہ دوسرے میرے بارے میں بھی یہی کچھ کہنے پر مجبور ہوجائیں' جو وہ چاچو کے لیے ہر گھڑی کہا کرتے تھے۔

میں نے آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے گھر کے بہت سے کام اپنے ذمے لے لیے۔ ہر کام کو احسن طریقے سے انجام دینے کے بعد میرے کان تعریفی جملوں کے منتظر رہتے' لیکن شاید میرے ان چھوٹے موٹے کاموں کو میرا فرض سمجھا جاتا۔

"اور اگر یہی کام چاچو کرتے تو تعریفوں کے ڈونگرے برسائے جاتے ان پر۔" میں دل ہی دل میں گھر والوں کی ناانصافی پر کڑھتا۔

میرا ماسٹرز کا رزلٹ آیا تو میں ٹھیک ٹھاک نمبروں سے پاس ہوگیا تھا۔ ہاں چاچو کی طرح میرا غیر معمولی نتیجہ نہیں آیا تھا' جس پر پاپا نے مجھے کافی جھاڑا تھا۔

"فیضان کو دیکھو' کتنا اچھا رزلٹ آیا تھا اس کا' ہمیشہ ہی آتا رہا۔ سدرہ اور اشمل بھی اچھے نمبروں سے پاس ہوتے ہیں لیکن تم' جسٹ سیکنڈ ڈویژن۔"

"پاپا! فرسٹ ڈویژن میں صرف دو پرسینٹ کم ہیں۔" میں نے آہستگی سے احتجاج کیا۔

"جس گھر میں ہر بچہ ٹاپ کرتا رہا ہو اور فرسٹ آتا رہا ہو' وہاں سیکنڈ ڈویژن۔" انہیں تو جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

"پاپا! میں جتنا پڑھ سکتا تھا پڑھ لیا' پلیز اسی پر اکتفا کریں۔" میں سنجیدگی سے کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ انہیں سمجھانا بے کار تھا' مرغے کی ایک ٹانگ کی مانند وہ ایک ہی بات دہراتے رہتے۔

ساری گڑبڑ چاچو نے پھیلائی ہوئی تھی۔ انہوں نے گھر والوں کو اچھے اور اعلا نتائج کا عادی بنا دیا تھا۔ اب یہ اوسط درجے کا نتیجہ ان سے برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا۔

حالانکہ رات میں چاچو نے انتہائی خوش دلی سے

مجھے مبارک باد دی تھی، لیکن میرے دل میں ان کے لیے بغض اور کینہ میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ "سب دنیا دکھاوا ہے۔" میں نے دل میں سوچا تھا۔

ہاں البتہ سدرہ اور اشمل کی مبارک بادیں میں نے خوش مزاجی سے وصول کی تھیں۔ وہ میرے بہن بھائی تھے، ان سے میرا کوئی مقابلہ نہ تھا۔

چاچو اور میرے درمیان یہ مقابلے کی فضا کب پیدا ہوئی تھی، مجھے اس کا علم نہیں لیکن ہوش سنبھالتے ہی میں خود بخود ایسا محسوس کرنے لگا تھا۔ شاید اس میں گھر والوں کا ہاتھ ہو جو بات بات میں ہم دونوں کا مقابلہ کرنے بیٹھ جاتے تھے۔ اس وقت وہ یہ بھول جاتے تھے کہ سگے بہن بھائیوں میں بھی ہر بچہ ایک جیسی ذہانت، صورت اور صلاحیتوں کا مالک نہیں ہوتا۔ مزاج تک الگ ہوتا ہے پھر ان میں ایک جیسی صلاحیتیں ڈھونڈنا مناسب نہیں ہوتا لیکن والدین اور گھر والے یہ چھوٹی سی بات نہیں سمجھتے۔

میرے دل میں فیضان چاچو کے لیے چڑ ان ہی لوگوں کی پیدا کی ہوئی تھی۔ نہ وہ ہر بات میں ان کی مثالیں دیا کرتے، نہ ہی میں ان سے چڑتا۔

مجھے لگتا جیسے چاچو دل ہی دل میں اس صورت حال اور میری اندرونی کیفیات سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ انہیں بخوبی احساس تھا کہ وہ ہر معاملے میں مجھ سے بہت بہتر نہ سہی تو بھی بہتر ہیں اور میں یہ جان کر جلتا کڑھتا رہتا ہوں۔ اسی لیے وہ اپنی صلاحیتوں کو مزید بہتر اور اعلا بنانے کی کوششیں تیز کر دیتے۔

یا شاید ایسا نہ ہو اور مجھے ہی لگتا ہو۔ بہرحال جو بھی کچھ تھا میری شخصیت ان سب باتوں سے مسخ ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

پاپا چاہتے تھے کہ میں آگے بھی پڑھوں۔ میری اکنامکس میں ماسٹرز کی ڈگری ویسے بھی انہیں قابل اعتنا نہیں لگتی تھی لیکن میں اب پریکٹیکل لائف میں آنا چاہتا تھا۔ تاکہ میں بھی گھر کے مسائل میں ہاتھ بٹا کر تعریفوں کے چند ڈونگرے سمیٹ سکوں جو چاچو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہے تھے۔

پاپا نے اس بات پر کافی ڈانٹا تھا کہ ابھی اس کی کیا ضرورت ہے، مجھے مزید تعلیم حاصل کرنی ہے لیکن میں نے ان کی کسی بات پر کان نہ دھرا اور اپنے ایک دوست کے والد کی توسط سے مجھے ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب مل گئی۔

میں نے جب پہلی تنخواہ امی کے ہاتھ پر لا کر رکھی تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش بیٹھی رہ گئیں۔

"بیٹا! یہ چند ہزار کی نوکری کس کام کی، تم اپنے پاپا کی بات مان لیتے۔"

"امی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔" مجھے سخت غصہ آگیا۔ "یہاں ہزاروں طالب علم ہر سال پڑھ کر نکلتے ہیں، نوکری کے لیے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں لیکن انہیں نوکریاں نہیں ملتیں۔ یہ تو شکر ہے کہ مجھے اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے نوکری مل گئی۔ ترقی بھی ہو جائے گی۔ میں ساری عمر اسی سیٹ پر تو بیٹھا نہیں رہوں گا۔ آپ دوسروں سے میری تنخواہ کا مقابلہ کیوں کر رہی ہیں۔ کیا آپ کو اس بات کی خوشی نہیں کہ یہ آپ کے بیٹے کی پہلی کمائی ہے۔"

آخر میں شاید میری آواز رندھ گئی تھی۔ امی نے چونک کر مجھے دیکھا اور جیسے سب سمجھ گئیں، آخر کو ماں تھیں۔

"نہیں بیٹا! میرے لیے تو یہ چند ہزار، لاکھوں سے کم نہیں۔ یہ میرے بیٹے کی محنت کی کمائی ہے۔ بس میں تو یہ چاہتی ہوں تم کسی سے کم نہ رہو، نہ آج نہ کل۔ خوب ترقی کرو، کسی کو بھی سدا ساتھ نہیں رہنا ہوتا۔ جب تم اپنی دنیا الگ بساؤ تو تمہارے پاس ایسے وسائل ہوں کہ تم تنہا ان کا مقابلہ کر سکو۔ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ ہر شخص کو اپنی دنیا خود بنانی ہوتی ہے لیکن محدود آمدنی اس چھوٹی سی دنیا میں تلخیاں پیدا کر دیتی ہے۔ خوشحالی رشتوں میں توازن اور محبتوں کو برقرار رکھتی ہے۔"

وہ مجھے رسانیت سے سمجھا رہی تھیں اور میری

سمجھ میں ہر بات آرہی تھی۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں امی!" میں نے محبت سے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "ابھی تو ابتدا ہے، زندگی ختم تو نہیں ہو گئی۔ میں بھی آگے بڑھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا، خوب محنت کروں گا، آپ کو مجھ سے مایوسی نہیں ہوگی۔"

میری باتوں پر ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی اور یہی چمک میرے لیے آگے کی زندگی میں روشنی پھیلاتے ہوئے راستہ بنانے کے لیے ناگزیر تھی۔

"میری ساری دعائیں تیرے ساتھ ہیں میرے بچے!" انہوں نے میرا ماتھا چوم لیا۔

میں نے آہستہ آہستہ کسی کو احساس دلائے بغیر گھر کی بہت سی ذمے داریاں اور گھر والوں کی بہت سی ضرورتیں اپنے ہاتھ میں لے لی تھیں۔ کبھی اباجی اور اماں کی دوائیں لے آتا تو کبھی ان کے لیے ٹانکس اور جوس کے ڈبوں کا ڈھیر لگا دیتا۔

"اباجی! آپ یہ چیزیں روزانہ لیا کیجیے، آپ بہت کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔" حالانکہ وہ اپنی عمر کے مطابق بہت صحت مند تھے۔

"اماں! آپ بھی اپنا خیال رکھا کریں۔ دیکھیں اباجی اس عمر میں بھی اپنا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ اپنی دوا، ڈائیٹ اور واک سے خود کو کس قدر فٹ رکھا ہوا ہے انہوں نے۔ آپ کو تو اپنا بالکل خیال نہیں۔ آج سے میں اپنے ہاتھ سے آپ کو یہ سب چیزیں کھلاؤں گا۔" اماں کو تنہا پا کر میں ان سے کہنے لگتا۔

میری توجہ، اپنائیت اور محبت پر وہ نہال ہو جاتیں۔ وہ فطرتاً بہت محبت کرنے والی تھیں۔ پوتے کی اتنی غیر معمولی توجہ یقیناً انہیں خوش کرنے کے لیے کافی تھی۔

چاچو جس کمپنی میں تھے وہ انہیں تنخواہ نگڑی دیا کرتے تھے تو ان سے کام بھی کافی لیا کرتے تھے۔ اسی لیے وہ گھر اور گھر والوں کو اتنا وقت نہیں دے پاتے تھے اور ان کی اسی کمزوری کو پکڑ کر میں کافی فعال ہو گیا تھا۔

پاپا کو میں نے گھر کی ذمے داریوں سے بالکل بری الذمہ کر دیا تھا اور گھر میں جب بھی کسی پلمبر، الیکٹریشن یا کسی کارپینٹر کی ضرورت پڑتی، جو کچھ مجھے آتا میں خود کرنے بیٹھ جاتا، نہیں تو انہیں گھر لا کر کام کروانے کی ذمہ داری میں نے لے لی تھی۔

اشمل ابھی میٹرک میں تھا، اسے بچہ کہہ کر میں نے ان کاموں سے دور ہی رکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری ان سرگرمیوں میں کوئی اور میرا ہاتھ بٹائے۔ میں تنہا ہی اپنے نمبر بڑھا رہا تھا۔

بس ایک ہی خواہش میرے دل میں جڑ پکڑتی جا رہی تھی۔ جب کوئی یہ کہتا کہ "دیکھو فیضان کو" اسے تو گھر سے کوئی دلچسپی نہیں اور بے چارہ اغلب گھر اور گھر والوں کے لیے کس طرح جان مارتا رہتا ہے۔" میرے کان شدت سے ان جملوں کے منتظر رہتے تھے لیکن یہاں آکر گھر والے اس مقابلے کو بھول جاتے تھے جو بچپن ہی سے چاچو اور میرے درمیان پیدا کر دیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس روز پاپا کے کسی دوست کی دعوت تھی۔ پاپا کے ان دوست کو ہم سب نے کافی سال پہلے دیکھا تھا پھر وہ لندن چلے گئے۔ ابھی چند سال پہلے کراچی شفٹ ہوئے تھے۔ تب پاپا نے انہیں گھر پر ایک بار مدعو کیا تھا لیکن ان دنوں میں اپنے آپ میں مگن رہا کرتا تھا، اس لیے ان سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اب وہ اپنی بڑی بیٹی کے پاس لندن جا رہے تھے، جس کی شادی انہوں نے وہیں کر دی تھی، لیکن ان کی چھوٹی بیٹی اپنے لاسٹ سمسٹرز کی وجہ سے ان کے ساتھ نہیں جا رہی تھی اور میرے سننے میں آیا تھا کہ وہ ہمارے ہاں ہی ٹھہرے گی کہ اس کا سارا ددھیال اسلام آباد میں تھا اور ننھیال میں صرف ایک خالہ تھیں، جو امریکہ میں تھیں۔

"خاصی فلمی اور افسانوی سچویشن ہے کہ ہیروئن، ہیرو کے گھر میں آکر ٹھہرتی ہے اور پھر ان کے درمیان دوستی ہو جاتی ہے اور اس کے بعد۔" سدرہ نے اشمل

کے کان میں سرگوشی کی تھی لیکن میں زیادہ دور نہیں تھا' اس لیے وہ سرگوشی میرے کانوں میں با آسانی اتر گئی تھی۔

"لیکن یہاں تو دو ہیرو ہیں' میرا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ بہت چھوٹا ہوں ابھی۔" اشمل نے منہ لٹکا کر جواب دیا تھا۔ مجھے ہنسی آگئی تھی لیکن میں نے میگزین چہرے کے آگے کر رکھا تھا۔

"جو ہیروئن کو بھا جائے وہ ہیرو' دوسرا ولن۔" سدرہ یقیناً" آج کل فلمیں بہت دیکھ رہی تھی۔

"چلو دیکھتے ہیں کہ کون ہیرو ہے اور کون ولن۔"

"میرا تو دل کہتا ہے چاچو ہوں گے۔ ویسے دل آنے کی بات ہے' جب جو لگ جائے پیارا۔" سدرہ گنگنانے لگی اور میرا دل جل کر خاک ہو گیا۔ یعنی میرے اپنے بہن بھائیوں کی نظر میں' میں چاچو کے سامنے ہیرو بننے کے قابل نہیں تھا۔

"اسے آنے تو دو' پہلے یہ فیصلہ تو ہو جائے کہ وہ بھی ہیروئن بننے کے قابل ہے کہ نہیں۔" پہلی بار اشمل نے معقول بات کی تھی۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" سدرہ نے بھی اس کی تائید میں سر ہلا دیا تھا۔

اس روز میں نے دعوت کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ صبح آفس جانے سے پہلے میں امی کو دعوت کی ساری چیزیں دے کر گیا تھا اور اسی چکر میں آفس لیٹ پہنچا تھا۔ خیر آفس والوں کو اعتراض اس لیے نہیں ہوا کہ اب تک میں نے کوئی چھٹی نہیں کی تھی اور وقت پر اپنے آفس پہنچتا تھا۔ جاتے ہی میں نے آدھی چھٹی کی درخواست دے دی تھی جو فوراً" منظور کرلی گئی کہ میں نے آفس آکر دو تین گھنٹوں میں اپنے سارے ضروری کام نمٹائے تھے۔ میں چاہتا تو چھٹی بھی کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا تھا اور یہی بات میرے باس کو بہت پسند آئی تھی۔

جلدی گھر آکر بھی میں نے بہت سے کام نمٹائے' امی میری اس تبدیلی پر بہت خوش تھیں' سدرہ اور اشمل بھی ساتھ مل گئے تھے۔ ہم لوگوں نے سارا انتظام باہر لان میں کیا تھا۔ پاپا آفس سے آئے تو سارا ارینج منٹ دیکھ کر حیران اور بہت خوش ہوئے۔

"زبردست۔" ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کس نے کیا یہ سب؟"

"سب اغلب نے کیا ہے۔ صبح آفس جانے سے پہلے سب چیزیں دے کر گیا تھا' ابھی بھی آفس سے جلدی آگیا ہے۔" امی بھی وہیں آگئی تھیں۔

"امی! میرا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے۔" سدرہ نے احتجاج کیا۔

"ہاں بھئی ان دونوں نے بھی بہت کام کیا ہے۔" امی مسکرائیں تو پاپا بھی مسکراتے ہوئے اندر چلے گئے۔

میرا کام ہو گیا تھا' پاپا کو معلوم ہو گیا تھا کہ آج کی دعوت کی تیاری میں میرا کتنا حصہ ہے۔

رات میں پاپا کے دوست' ان کی مسز اور بیٹی آئیں تو میں وردہ کو دیکھ کر سکتے میں رہ گیا تھا۔

وہ اسم بامسمّیٰ تھی' اسے دیکھ کر پہلا خیال کسی کھلتے ہوئے تازہ گلاب کا ہی آتا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی اور بے انتہا دلکش چہرے کی مالک۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک جانا کوئی اچھنبے کی بات نہیں تھی۔ سدرہ اور اشمل بھی بہت متاثر نظر آرہے تھے۔ وہ بھی بڑے دوستانہ انداز میں ان سے باتیں کر رہی تھی۔ اپنے بے انتہا حسن کے باوجود وہ مغرور نہیں تھی' اس پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔

"شاید اسے یہاں رہنا ہے' اس لیے اتنی خوش اخلاقی سے پیش آرہی ہیں محترمہ!" میں نے اس کے گلابی چہرے کو تکتے ہوئے سوچا۔

"ارے آپ ہمارے اغلب بھائی سے تو ملی ہی نہیں۔" سدرہ کو باتیں کرتے کرتے ایک دم خیال آیا تو وہ مجھے پکار بیٹھی۔ "اغلب بھائی! یہاں آجائیں' اتنی دور کیوں بیٹھے ہیں۔"

میں چہرے پر بظاہر سنجیدگی لیے ان کے پاس چلا آیا۔

"یہ ہیں اغلب بھائی اور اغلب بھائی! یہ ہیں وردہ۔

آپ مجھ سے دو تین سال ہی بڑی ہوں گی' اس لیے میں آپ کو باجی واجی نہیں کہوں گی۔" سدرہ کے کہنے پر وہ مسکرائی۔

"چلو ٹھیک ہے' دوستی زیادہ بہتر ہے لیکن آپ جناب کے ساتھ کہ بہرحال میں تم سے کم از کم چار سال بڑی ہوں گی' تم ابھی انٹر میں ہو نا۔"

"جی۔" سدرہ نے سر ہلایا۔

میں خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

"آپ بہت کم بولتے ہیں۔" وہ اچانک مجھ سے مخاطب ہوئی تو میں گڑبڑا گیا۔

"نہیں' کچھ ایسا کم بھی نہیں' شاید آپ کا رعب حسن ہے۔" اشمل کے کہنے پر میرے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ کچھ بھی تھا وہ مجھ سے کافی چھوٹا تھا اور میں نے شروع سے ان دونوں کو خود سے ایک فاصلے پر رکھا تھا۔ مجھے چھوٹوں کی اس حد تک بے تکلفی بالکل پسند نہ تھی کہ وہ بدتمیزی میں بدل جائے۔

وہ خود بھی اشمل کے اس طرح کہنے پر جھینپ سی گئی تھی۔

"آپ کس سبجیکٹ میں ماسٹرز کر رہی ہیں؟"

"مائیکروبایالوجی۔" اس نے مختصراً" جواب دیا۔

"اوہ!" میں ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ میں آرٹس کا بندہ' سائنس پڑھنے والوں سے خوامخواہ رعب میں آجاتا تھا۔

لیکن میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا' ہم دونوں کافی حد تک بے تکلف ہو چکے تھے' ساتھ ساتھ اشمل اور سدرہ کے چٹکلے بھی جاری تھے۔

پھر کچھ ہی دیر بعد چاچو کے چلے آنے پر جیسے چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

وہ اس روز ویسے بھی شاندار لگ رہے تھے۔ فان کلر کے کلف لگے ہوئے شلوار سوٹ میں وہ انتہائی اسٹائلش لگ رہے تھے۔ میرا دل حسد کی آگ میں سلگنے لگا۔ میں نے دیکھا' وردہ اور اس کے امی ابو بھی چاچو کی دلکش شخصیت سے کافی متاثر نظر آرہے تھے۔

"اب ہے اصل مقابلہ۔" سدرہ نے اشمل سے آہستگی سے کہا تو وہ سر ہلانے لگا۔

چاچو اپنی شخصیت کے ازلی اعتماد کے ساتھ آتے ہی ان لوگوں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ وردہ بھی اب مجھے نظرانداز کر کے ان سے باتوں میں مگن ہو گئی تھی۔

میں جلتا کڑھتا وہاں سے اٹھ آیا' پھر اشمل کے کھانا لگ جانے کی اطلاع پر ہی میں اپنے کمرے سے باہر نکلا۔

میرے جانے اور واپس آنے کا وردہ نے شاید کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ تب ہی وہ کھانے کے دوران چاچو کے ساتھ باتوں میں مصروف رہی۔ ہنسی اس کے تراشیدہ لبوں سے جھرنوں کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ چاچو پتا نہیں اسے کون سے لطیفے سنا رہے تھے' ان میں اس طرح محفل پر چھا جانے اور لوگوں کے دلوں تک رسائی حاصل کرنے میں کمال حاصل تھا۔ وہ اپنی شخصیت' اعتماد' تعلیم اور شاندار نوکری کا بہت فائدہ اٹھاتے تھے۔ جس کسی شخص میں اتنی خوبیاں ہوں اس کے لیے دوسروں کو متاثر کرنا کون سا مشکل کام ہے' لیکن ایسا ہونا کب ہے' یہ میری ایک خام خیالی ہی تھی۔

اس رات پتا نہیں کیوں میری آنکھوں سے نیند جیسے اڑ سی گئی تھی۔ پہلی بار کوئی لڑکی مجھے اس حد تک اچھی لگی تھی کہ میں ایک لمحہ بھی اس کا خیال اپنے دل سے ہٹا نہیں پایا تھا۔ میرے لیے اسے پانا کوئی اتنا مشکل بھی نہ ہوتا کہ میں بھی کوئی ایسا گیا گزرا نہیں تھا لیکن درمیان میں یہ چاچو کی ذات۔۔۔

ظاہر ہے ہر شخص کو اپنے لیے بہتر سے بہتر ساتھی کی تلاش ہوتی ہے۔ اب اس وردہ کو جب اسی گھر میں مجھ سے بہتر شخص مل جاتا تو اسے مجھ میں کون سی خوبی نظر آتی۔

پھر مجھے اپنی ہی سوچ پر ہنسی آنے لگی۔ ضروری تو نہیں کہ وہ اس گھر میں اپنے لیے ایک ساتھی ڈھونڈے' وہ یہاں اس کام کے لیے تو نہیں آرہی تھی۔ اسے ہمارے ہاں چند مہینے رہنا تھا' اس کے

فائنل سمسٹر تک۔ اس کے بعد یا تو وہ اپنی بہن کے پاس لندن چلی جاتی یا پھر اس دوران اس کے والدین لوٹ آتے تو وہ اپنے گھر شفٹ ہو جاتی۔
اور مجھے جو کرنا تھا اسی دوران کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

جس روز وردہ کے والدین کو لندن جانا تھا' ہمارا پورا ہی گھر انہیں ایئرپورٹ چھوڑنے گیا تھا۔ فلائٹ رات کی تھی' اس لیے چاچو بھی ہمارے ساتھ چل رہے تھے لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ فلائٹ دن کی بھی ہوتی تو وہ آفس سے چھٹی کر کے ضرور چلتے۔ میرے ذاتی خیال میں وہ بھی وردہ کی زلفوں کے اسیر ہو چکے تھے۔

"اپنا خیال رکھنا بیٹا! اور پریشان نہ ہونا' شانزہ کا مسئلہ نہ ہوتا تو ہم بھی تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہ جاتے۔ تمہاری ممی کے ساتھ میں بھی اپنے کچھ کام نمٹا کر آجاؤں گا۔" احسن انکل اسے اپ سیٹ دیکھ کر سمجھا رہے تھے۔

"کمال کرتے ہو احسن! وردہ کوئی غیروں میں تو نہیں رہے گی۔ دیکھنا اتنے دنوں میں اسے یہاں اتنی محبت ملے گی کہ ہو سکتا ہے جب تم واپس آؤ تو یہ تم لوگوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دے۔" پاپا نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی تو وہ ہنستے ہوئے ان کے گلے لگ گئے۔

"بس اللہ کے بعد ہماری بیٹی آپ لوگوں کے حوالے ہے۔" آنٹی نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

یقیناً" وہ انتہائی مجبوری کی حالت میں وہاں جا رہی تھیں۔ ان کی بڑی بیٹی شانزہ ان دنوں پریگننٹ تھی اور کچھ پیچیدگیوں کے باعث ڈاکٹرز نے اسے مکمل بیڈ ریسٹ بتایا تھا۔ ڈلیوری میں ڈھائی ماہ باقی تھے اور وہاں اس کے شوہر کے علاوہ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنی نوکری کی وجہ سے اسے مکمل وقت دینے سے قاصر تھا۔ خود وہ اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں آ نہیں سکتی تھی۔ یہ اس کا پہلا بچہ تھا جو شادی کے پانچ سال بعد بہت دعاؤں اور منت مرادوں کے بعد اس دنیا میں آرہا تھا اور نہ شاید وہ وردہ کو یوں چھوڑ کر کبھی نہ جاتیں۔

"آپ بالکل فکر مت کریں بھابھی! وردہ میری سدرہ کی طرح رہے گی میرے گھر میں۔ آپ بالکل بے فکر ہو کر جائیں۔" امی بھی آنٹی کو تسلی دینے لگیں۔

چاچو بھی آگے بڑھ کر بڑے طریقے سے ان دونوں کو سمجھا رہے تھے' وردہ کو تسلی دے رہے تھے۔ اشمل اور سدرہ بھی اس کام میں آگے آگے تھے۔

ایک میں ہی تھا جو انتہائی خاموش ایک کونے میں کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے آنسو جیسے میرے دل پر گر رہے تھے' اس کی ناک رونے سے گلابی ہو رہی تھی اور آنکھیں.....

اف! خوبصورتی تو جیسے اس لڑکی پر ختم تھی۔

روتے روتے اس نے جوں ہی گردن اٹھائی تو اتفاقاً" اس کی نظریں مجھ سے ٹکرا گئیں۔ میرے یوں ایک ٹک دیکھنے پر وہ تھوڑا سا گڑبڑا گئی تھی' میں بھی جھینپ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

واپسی میں وہ بہت خاموش تھی' حالانکہ اشمل اور سدرہ اسے مستقل بہلا رہے تھے۔ ہم چاروں پاپا کی گاڑی میں بیٹھے تھے' جبکہ امی اور پاپا چاچو کی گاڑی میں تھے۔ وہ سدرہ کے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھی صرف اپنے ہاتھوں کو تک رہی تھی۔ شاید وہ زندگی میں پہلی بار اپنے ماں باپ سے یوں جدا ہوئی تھی۔

"وردہ! آپ اتنی اداس نہ ہوں نا' میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کو ہمارے گھر میں بالکل اجنبیت محسوس نہیں ہوگی۔ ہم سب آپ کو بہت اچھی کمپنی دیں گے۔ آپ سب بھول جائیں گی اور پھر تین چار مہینوں کی تو بات ہے' یوں چٹکی بجاتے گزر جائیں گے۔" سدرہ نے یوں چٹکی بجائی جیسے واقعی وہ اتنے سارے دن اتنی آسانی سے گزر جائیں گے۔

مجھے اس کی دلی کیفیت کا اچھی طرح سے اندازہ تھا۔ شاید کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ بھی اسی طرح افسردہ ہوتی۔

سدرہ کے کہنے پر وہ آہستہ سے مسکرائی۔ "سوری میں نے تم سب کو اپنی وجہ سے پریشان کر دیا ہے۔"

"ہرگز نہیں' ہم تو بلکہ بہت خوش ہیں۔ آپ آئی

ہیں تو خوب انجوائے کریں گے۔" اشمل نے کہا۔

سب ہی اسے سمجھا رہے تھے لیکن میں اپنی ازلی سنجیدگی کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکا' بس خاموشی سے سنتا رہا۔

گھر پہنچتے ہی وہ سب سے معذرت کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

دوسری صبح اسے نارمل دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ رات بھر روتی رہی ہوگی' اس کی آنکھیں نیند کی کمی اور رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی ہوں گی لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

میں آفس جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کے لیے لاؤنج میں آیا تو وہ میز پر ناشتہ لگا رہی تھی۔

"ارے آپ!" حیرت سے میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

ایک تو اس کا نارمل ہونا' دوسرے اتنی تندہی سے گھر کے کاموں میں مشغول ہونا' میرے لیے اچھنبے کی بات تھی۔

"کیوں' میں کیا؟" وہ پوچھنے لگی۔

"آپ کل ہی تو آئی ہیں' آج کام میں لگ گئیں۔" اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"میں بھی اسے یہی سمجھا رہی تھی بیٹا! لیکن یہ سن نہیں رہی۔ اب یہ سارا ناشتہ اس نے میرے ساتھ بنوایا ہے' میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود۔" امی بھی کچن سے برآمد ہو گئی تھیں۔

"تو کیا ہوا آنٹی! میں گھر میں بھی تو ممی کے ساتھ یہ سب کرتی تھی۔ دراصل لندن میں اتنے سال رہنے کی وجہ سے ہمیں گھر کے سارے کام کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ وہاں نوکر اتنی آسانی سے تھوڑی ملتے ہیں' شانزہ آپی' امی اور میں مل جل کر کرتے تھے سب کچھ۔"

"پھر بھی بیٹا! تم یہاں مہمان ہو۔" امی اسے سمجھانے لگیں۔

"مہمان....." وہ ٹھٹکی۔ "آنٹی! مہمان صرف دو دن کا ہوتا ہے اور اگر آپ نے مجھے مہمان سمجھا تو مجھے اپنا بندوبست کہیں اور کرنا ہوگا۔"

"دھمکی۔" مجھے ہنسی آگئی۔

"اوہ! آپ ہنستے بھی ہیں۔" وہ ٹھٹک کر مجھے دیکھنے لگی۔

شرمندہ ہو کر میری ہنسی رک گئی۔ امی مسکراتی ہوئی واپس چلی گئیں۔ یقیناً" کچن میں چولھے پر کچھ چھوڑ آئی تھیں۔

"سوری' میں نے اس لیے تو نہیں کہا تھا کہ آپ ہنسنا بند کر دیں۔"

وہ بھی کچن کی جانب پلٹ گئی۔

اس دوران چاچو اور پاپا بھی ناشتے کے لیے آگئے تھے۔ اشمل اسکول جا چکا تھا اور سدرہ یقیناً" تیار ہو رہی تھی۔

"بھابھی! مجھے دیر ہو رہی ہے آفس سے۔" چاچو نے میز پر بیٹھتے ہی ناشتے کے لیے ہانک لگائی تھی اور وردہ ان کی ناشتے کی ٹرے تھامے بوتل کے جن کی طرح کچن سے نمودار ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم۔" اس نے ان دونوں کو دیکھتے ہی کہا تو پاپا اسے ناشتہ لاتا دیکھ کر تھوڑے حیران ہو رہے تھے۔

"کیسی ہو بیٹا! نیند ٹھیک سے آئی اور یہ تم ناشتہ کیوں لا رہی ہو؟" انہوں نے بیک وقت کئی سوال کر ڈالے تھے۔

"سب ٹھیک رہا انکل! اور ٹھیک ہے اور ناشتہ لانا کوئی اتنا بڑا کام تو نہیں کہ ہر شخص پریشان ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے ناشتہ میز پر چن دیا تھا۔

"بالکل نہیں' کوئی پریشان نہیں ہو رہا۔ آپ مزے سے جس طرح چاہیں رہیں۔" چاچو نے انتہائی اطمینان سے کہا اور ناشتے میں مصروف ہو گئے۔

حالانکہ ناشتے کی میز پر پہلے میں آیا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح امی نے ناشتہ پہلے چاچو کو دیا تھا اور پہلی بار ان کی یہ بے انصافی مجھے بری نہیں لگی کہ اس طرح میں اس کے ساتھ کچھ زیادہ وقت گزار سکتا تھا۔

میں اس دوران بظاہر اخبار میں گم ہو چکا تھا لیکن

میری نظریں اس کے قدموں کو چوم رہی تھیں اور کان اس کی آواز کے سحر میں گم تھے۔

چاچو اور پاپا ناشتہ کر کے چلے گئے تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سدرہ بھی تیار ہو کر آگئی تھی۔ امی بھی کاموں سے فارغ ہو کر اپنا ناشتہ وہیں لے آئی تھیں۔

وہ سدرہ اور امی کے ساتھ باتوں کے دوران ناشتے میں مصروف تھی کہ اچانک امی نے مجھے مخاطب کیا۔

"اغلب! تم وردہ کو یونیورسٹی ڈراپ کر کے آفس چلے جانا' راستے میں ہی پڑے گی یونیورسٹی۔"

"راستے میں نہ بھی پڑتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا امی!" میں نے دل ہی دل میں کہا اور منہ سے "جی اچھا" کہہ کر سر ہلا دیا۔

"میں سوچ رہی ہوں گھر سے اپنی گاڑی لے آؤں آنٹی! یہ تو روز کا مسئلہ ہے لیکن یہاں کھڑی کرنے کی مشکل ہوگی۔ دو گاڑیوں کے بعد تیسری کی گنجائش کہاں ہے۔" اس نے کہا تو میں بے ساختہ بول اٹھا۔

"میں روز آپ کو ڈراپ کردوں گا وردہ! کوئی مسئلہ نہیں۔"

"لیکن مجھے واپسی میں پھر پوائنٹ سے آنا پڑے گا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" امی نے کہا۔ "چلو' دیکھتے ہیں رات میں تمہارے انکل سے مشورہ کریں گے۔ سدرہ کو اسی لیے تو وین لگوا دی ہے کہ دوپہر میں یہ تینوں اپنے آفس سے نہیں اٹھ سکتے۔"

"چلیں' آپ تیار ہیں تو جلدی آجائیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میرا دل اس کے اس طرح ساتھ جانے پر بلیوں اچھل رہا تھا۔

"جی بس میں بیگ وغیرہ لے آتی ہوں۔" وہ اندر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

"بیٹا! تم سے کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ تم ماشاء اللہ سمجھ دار ہو لیکن یہ بچی ہماری مہمان ہے۔ اسے کوئی شکایت نہ ہو' اس کے والدین نے بہت اعتماد کر کے اسے ہمارے پاس چھوڑا ہے۔"

"جی امی! آپ بے فکر رہیں۔"

میں نے اپنا موبائل اور موٹر سائیکل کی چابی میز پر سے اٹھائی۔ آج مجھے اور شدت سے اپنی سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل بہت بری لگ رہی تھی۔ میری نظروں کے سامنے چاچو کی کرولا گھوم رہی تھی۔

"آپ موٹر سائیکل پر بیٹھ جائیں گی نا۔" اس کے آنے کے بعد میں نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر انتہائی اطمینان سے میرے پیچھے بیٹھ گئی۔

میرا جی چاہا موٹر سائیکل کو زوردار ایڑ لگاؤں اور ہوا سے باتیں کرنے لگوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو موٹر سائیکل مجھے انتہائی بری لگ رہی تھی اب اس کی افادیت کا مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ گاڑی ہوتی تو وہ میرے اتنے نزدیک کیسے ہوتی پھر مجھے اپنی اس گھٹیا سوچ پر خود ہی غصہ آنے لگا۔

اگر مجھے اس سے محبت ہو چلی تھی تو اس طرح سوچنا مجھے زیب نہیں دیتا تھا۔

میں جیسے خود سے لڑ رہا تھا۔

"آپ ہمیشہ ایسے ہی خاموش اور سنجیدہ کیوں رہتے ہیں؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"پتا نہیں' شاید یہ میری فطرت ہے یا عادت۔" میں نے سنبھل کر جواب دیا۔

"ہنسا بولا کریں' آپ تو خوش نصیب ہیں کہ اتنے لوگوں میں گھرے رہتے ہیں۔ تنہائی کتنی بری چیز ہوتی ہے یہ مجھ سے پوچھیں۔ جب انسان کسی سے باتیں کرنے کو ترس جاتا ہے پھر آپ کے ہاں تو ماشاء اللہ سب ہنس مکھ ہیں۔ اشمل' سدرہ' آپ کے چاچو' انکل' آنٹی' حتیٰ کہ آپ کے دادا اور دادی بھی۔"

"بس کہنا عادت سی بن گئی ہے' خیر کوشش کروں گا۔"

"اپنوں سے' دوستوں سے باتیں کر کے انسان ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ اندر کی گھٹن نکل جاتی ہے۔" پتا نہیں وہ میرے اندر کی گھٹن کے متعلق کیسے جان گئی تھی' مجھے حیرت سی ہوئی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو' خیر....." وہ خاموش ہو گئی۔

اور میں چاہنے کے باوجود اس سے مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

پھر ایسا ہی ہونے لگا۔ صبح میں اسے یونیورسٹی ڈراپ کردیا کرتا' واپسی میں وہ کبھی کسی دوست کی گاڑی میں' کبھی پوائنٹ سے گھر آجاتی۔

وہ بہت جلد سب گھر والوں میں گھل مل گئی تھی اور یہ اس کی ذات کی ایک اضافی خوبی تھی۔

اس کی شخصیت میں بلا کا اعتماد اور بے انتہا ملنساری تھی جو اسے لوگوں میں کافی مقبول بنا دیتی تھی۔ خود ہمارے سارے گھر والے اس سے بہت خوش تھے۔

میں اکثر دیکھتا وہ امی کے ساتھ کچن میں گھسی بڑے اچھے ماحول میں ان کا ہاتھ بٹا رہی ہوتی۔ کبھی اماں کے کمرے میں بیٹھی ان کے ساتھ باتیں بگھار رہی ہوتی تو کبھی ابا جی کے ساتھ زور و شور سے کسی کتاب یا آج کی تازہ خبر پر گفتگو ہو رہی ہوتی۔

اشمل اور سدرہ تو تھے ہی اس کے دیوانے۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ چاچو بھی آج کل گھر میں زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ آفس سے آکر تو وہ گھر سے نکلتے ہی نہیں تھے' بلکہ شاید وہ آفس سے بھی کچھ جلدی آنے لگے تھے۔

مجھے اندر ہی اندر کھولن ہونے لگتی۔

"اونہہ! بظاہر کتنا بنتے ہیں لیکن ایک لڑکی کے لیے..." میں چڑ کر سوچتا۔

"ایک لڑکی کے لیے کیا؟" کوئی میرے اندر سے پوچھتا۔ "تم بھی تو ایک لڑکی کے لیے جل کڑھ رہے ہو اس وقت' اس کی وجہ سے اپنی روٹین بدل چکے ہو۔ اسے متاثر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہو' تو وہ بھی اگر ایسا کر رہے ہیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔"

یہ برداریشان کن احساس تھا کہ وہ میرے لیے بہت ناگزیر ہو چلی تھی اور یہ میں کب چاہتا تھا۔ میں تو اپنے اندر اتنی ہمت ہی نہیں پاتا تھا کہ اس سے اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کر سکوں اور وہ خود سے نہ سمجھتی یا انہیں پذیرائی نہ بخشتی تو زندگی میرے لیے کتنی آزار ہو جاتی۔ میری ذات میں ایک بہت بڑی خامی تھی اور وہ تھی اعتماد میں کمی۔ شاید اس کی وجہ میرے گھر والوں کا رویہ ہو۔ ہر بات میں چاچو سے میرا مقابلہ کر کے انہوں نے میرے اندر اعتماد کو پیدا ہی کہاں ہونے دیا تھا۔

پھر ایسا کیا کیا جائے کہ وہ اچھی سی لڑکی خود سے میری جانب ملتفت ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ خود چاچو کوئی پیش رفت کر بیٹھیں مجھے کچھ کرنا تھا' اس طرح کہ کسی کو اور خود اسے احساس تک نہ ہو۔

لیکن کیا...؟ یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ دکھ جاتا تھا۔

کبھی کبھی وہ موڈ میں ہوتی تو راستے میں مجھ سے خوب باتیں کرتی' جن کے جواب میں کافی سوچ سمجھ کر متانت سے دیا کرتا تھا۔ کیا کرتا اپنی ازلی فطرت سے مجبور تھا' چاہنے کے باوجود میرے اندر اس جیسی بے تکلفی پیدا نہ ہو سکی تھی۔

"خدا کے لیے اغلب! بولا کیجئے' اندر ہی اندر گھٹا مت کیجئے۔" ایک دن اس نے کہا تو میں حیران رہ گیا۔

وہ کب میرے اندر تک اتر کر سب کچھ بھانپ چکی تھی۔

"آپ سے کس نے کہا کہ میں اندر ہی اندر گھٹتا رہتا ہوں' بعض لوگوں کی فطرت ہوتی ہے خاموش رہنے کی۔" جواباً میں نے کہا۔

"میں نے آپ کے چہرے پر ایک کشمکش دیکھی ہے جو اندر ہی اندر لڑنے والوں کے چہرے پر نظر آتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آپ بہت سی باتیں کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پاتے۔ اظہار انسان کی تسکین کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے' اس طرح اس کی زندگی میں مثبت تبدیلیاں آتی ہیں۔ وہ مطمئن ہو جاتا ہے' اس کی شخصیت میں توازن پیدا ہو جاتا ہے' جو دیکھنے والے کو بھی متاثر کرتا ہے' خود اس کی زندگی بھی سہل ہو جاتی ہے۔" وہ بڑی تفصیل سے میری شخصیت اور رویے کا تجزیہ کر رہی تھی۔

"آپ نے نفسیات کیوں نہیں پڑھی' بڑی کامیاب رہتیں۔"

"یہ میری باتوں کا جواب نہیں۔"

"پتا نہیں وردہ...!" میں مزید سنجیدہ ہو گیا۔ "یہ شاید میری ذات کی سب سے بڑی خامی ہے۔"

"آپ کی شخصیت انتہائی مکمل ہے اغلب! سوائے ایک اعتماد کے' اپنے اندر اسے پیدا کریں۔ لوگوں کے نزدیک آئیں' ان سے بھاگیں نہیں' دیکھیں پھر آپ ان میں کس طرح مقبول ہوں گے۔ آپ کے اپنے بہن بھائی کو آپ سے شکایت ہے کہ آپ ان سے اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں' ان کے ساتھ گھلتے ملتے نہیں۔" وہ مجھے دیکھنے لگی۔

"یہ ایسے رشتے ہوتے ہیں اغلب! جو خوش نصیبوں کو ملتے ہیں اور یہی وقت ہوتا ہے ان کے ساتھ زندگی کے اچھے لمحات گزارنے کا پھر تو سب زندگی کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر جانے کہاں کہاں نکل جاتے ہیں۔ اب دیکھ لیں میری ایک بہن ہے' میں اس کے ساتھ ہنسنا بولنا چاہتی ہوں لیکن وہ مجھ سے کتنی دور ہے۔ کبھی کسی سے کوئی دل کی بات کہنی ہو تو دل مار کر رہ جاتی ہوں۔ آپ کے تو چاچو آپ کے دوست ہو سکتے ہیں' وہ آپ کے تقریباً ہم عمر ہیں' اچھے مزاج کے ہمدرد شخص ہیں۔"

"چاچو۔" میرا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ شاید میری آنکھوں میں بھی تلخی اتر آئی تھی۔

وہ بغور مجھے دیکھتی رہی اور شاید سب کچھ سمجھ گئی' اس جیسی ذہین لڑکی سے کچھ چھپا رہنا بھی تو مشکل تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر ایک دن میں نے چاچو اور وردہ کو لان میں بیٹھے دیکھا۔ دونوں بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔ پتا نہیں کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ ظاہر ہے اتنی دور سے ٹیرس پر کھڑا میں کیا سمجھ سکتا تھا لیکن میرے اندر غصے کا ایک ابال سا اٹھا تھا۔

وردہ نے مجھے یوں ٹیرس پر کھڑے دیکھ کر ہاتھ ہلا کر مجھے وہیں آنے کا اشارہ کیا تھا لیکن میں نظر انداز کر کے اپنے کمرے میں آگیا تھا۔

"یہ چاچو..." غصے سے میرے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ "یہ میری زندگی سے چلے کیوں نہیں جاتے۔ کیوں میری ہر خوشی' ہر کامیابی کے بیچ میں آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

کافی دیر تک اپنے کمرے میں اسی کیفیت میں ٹہلنے کے بعد میرے غصے کی شدت میں کچھ کمی ہوئی تو میں اپنی موٹر سائیکل کی چابی اٹھا کر باہر آگیا۔

میں نے دیکھا اس وقت وہ لان میں تنہا بیٹھی تھی۔ چاچو وہاں نہیں تھے۔ وہ پتا نہیں کیا سوچ رہی تھی۔

میں اسے نظر انداز کرتا ہوا وہاں سے گزرتا چلا گیا تو پیچھے سے اس کی آواز آئی۔

"اغلب! کہیں جا رہے ہیں آپ؟"

"جی ہاں۔" میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"پلیز مجھے میری فرینڈ کے گھر چھوڑ دیں گے' مجھے کچھ کام ہے۔"

"چاچو کے ساتھ کیوں نہیں گئیں' وہ بھی شاید ابھی نکلے ہیں۔" میرے لہجے میں ہلکی سی طنز کی آمیزش تھی۔

"اس وقت مجھے خیال نہیں آیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں' آپ کو جلدی ہے تو..." پہلی بار شاید اسے بھی میرا رویہ برا لگا گیا تھا۔

"نہیں' مجھے جلدی نہیں ہے۔ میں آپ کی سہولت کی وجہ سے کہہ رہا تھا۔ صبح تو مجبوری ہوتی ہے' وہ جلدی نکل جاتے ہیں۔"

"میں موٹر سائیکل پر بھی اتنی ہی سہولت سے بیٹھ جاتی ہوں۔ ایک منٹ ٹھہریں' میں آنٹی کو بتا آؤں اور بیگ لے آؤں اپنا۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ باہر تھی۔

میں راستے بھر خاموش رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ بولے گی لیکن اس روز خلاف توقع وہ بھی خاموش رہی' ہاں البتہ اپنی دوست کے گھر کے سامنے اترتے ہوئے اس نے ایک جملہ ضرور کہا۔

"آپ خاصے بدگمان شخص ہیں' یہ آپ کی شخصیت کی دوسری خامی ہے۔"

میں شدید چڑ گیا۔ کیا میں اتنا ہی گیا گزرا تھا کہ وہ میری ذات کی خامیاں گنواتی رہے۔

جواباً" میں نے تیزی سے موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کیا اور اسے وہیں چھوڑ کر کچھ پوچھے بنا وہاں سے چلا آیا۔

اس رات میں جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا رہا۔ گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے اندر ایک جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔

لوگ مجھے' میری کیفیات کو کیوں نہیں سمجھتے' اور یہ وردہ... جسے دوسروں کی نفسیات جاننے کا بڑا دعوا ہے مجھے کیوں نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے وہ تمہیں اور تمہارے جذبات کو اتنی اہمیت ہی نہ دیتی ہو' تب ہی تو اسے تمہاری پروا بھی نہیں۔ کجا کہ ان کے ساتھ ساری زندگی کا کوئی بندھن باندھ لیا جائے۔"

میں خود سے لڑ رہا تھا۔ خود کو دوش دے رہا تھا۔

پھر رات گئے جب میں گھر پہنچا تو دروازہ کھولنے والے فیضان چاچو تھے۔ پہلی بار میں نے ان کے چہرے پر بزرگانہ ناراضی کو دیکھا تھا' ورنہ تو وہ ہمیشہ اپنے رشتے کو بھلا کر دوستانہ رویہ روا رکھتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ میں اس کی قدر نہیں کرتا تھا۔

"کہاں تھے تم اب تک؟" انہوں نے ناراضی سے مجھ سے پوچھا تو میں کچھ جواب دیے بنا اپنی موٹر سائیکل اندر کھڑی کرنے لگا۔

"میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے۔" ان کی تیز آواز عقب سے ابھری۔

"میں آپ کو جواب دینے کا مجاز نہیں ہوں۔" میں نے روکھے لہجے میں کہتے ہوئے ان کے چہرے پر نظر ڈالی جو میرے جواب پر شدتِ ضبط سے سرخ پڑ گیا تھا۔

"لیکن اپنے ماں باپ اور ان کے باپ کو وضاحت کرنے کے مجاز تو ہو۔ رات کے دو بج رہے ہیں' تم کبھی کسی کو بتائے بنا اتنی دیر باہر نہیں رہے' اس لیے انہیں اس کی عادت نہیں ہے۔ اماں بھابھی اور سدرہ کا رو رو کر برا حال ہے۔ بھائی جان اور میں جانے کہاں کہاں فون کر کر کے پوچھ چکے ہیں۔ کہیں پھنس گئے تھے تو فون کر کے اطلاع دے دیتے' غیر ذمے داری کی انتہا ہے۔"

"ہاں' ایک آپ ہی ہیں دنیا میں ذمے دار۔"

میں جھلا کر مزید کچھ بولنا چاہتا تھا' لیکن سامنے برآمدے میں ایک ایک کر کے سب گھر والوں کو جمع ہوتے دیکھ کر ٹھہر گیا۔

واقعی مجھ سے غلطی ہو گئی تھی' میں نے ایک ایک کر کے سب پریشان چہروں پر نظر ڈالی پھر میری نظر ان سب پر سے ہوتی ہوئی سب سے پیچھے کھڑے اس چہرے پر پڑی جو میری اس تاخیر کا سبب تھا۔ اس کی آنکھوں میں ملامت تھی۔

پھر سب مل جل کر پتا نہیں کیا کیا بولنے لگے' کوئی رو رہا تھا' کوئی ڈانٹ رہا تھا' کوئی سمجھا رہا تھا اور وہ خاموشی سے پلٹ گئی تھی۔

اور اب مجھے سب کچھ بھول کر ان لوگوں کو مطمئن کرنا تھا' معافی مانگنا تھی اور اس کے لیے مجھے خاصے جھوٹ گھڑنا پڑے۔

دوسری صبح پہلی مرتبہ میں آفس بھی نہ گیا' رات سوتے سوتے بہت دیر ہو گئی تھی' اس لیے اٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بہت دیر سو کر کچھ طبیعت فریش ہوئی تو میں واش روم سے فارغ ہو کر ناشتے کے لیے لاؤنج میں چلا آیا۔

امی حسبِ معمول کچن میں تھیں اور وردہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ یعنی آج اس نے بھی چھٹی کر لی تھی۔

میں اسے دیکھ کر وہیں بیٹھ گیا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی ملامت بھرا لہجہ' کوئی ناراضی کے اظہار والی بات لیکن دوسری جانب خاموشی طاری تھی۔ یوں جیسے اسے میری آمد کی قطعی خبر نہ ہو۔

"وردہ! آئی ایم سوری۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"سوری ان لوگوں سے کریں جنہیں آپ نے اپنی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت سے پریشان کیا ہے۔" اس نے خشک لہجے میں اخبار پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"اور آپ! آپ پریشان نہیں ہوئیں؟"

"تو آپ مجھے پریشان کرنا چاہتے تھے۔" اس نے اخبار پر سے نظریں ہٹا کر مجھے دیکھا۔

"مجھے غصہ آگیا تھا آپ کی بات پر۔" میں نے ایمانداری سے اعتراف کیا۔

"خود پر جلنا کڑھنا چھوڑ دیں' یہ سب لوگ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں' اس طرح انہیں پریشان کر کے آپ کے کس جذبے کی تسکین ہوئی میں نہیں جانتی۔"

"اور آپ؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ میرا خیال تھا میرے یوں ایک دم پوچھ بیٹھنے پر وہ تھوڑا کسمسائے گی یا کم از کم جھینپے گی ضرور لیکن وہ اسی طرح پراعتماد بیٹھی رہی۔

"میرا ان لوگوں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ وہ آپ کے اپنے ہیں' میں یہاں چند روز کی مہمان ہوں۔" اس کا جواب صاف ٹالنے والا تھا۔

میں مزید کچھ پوچھتا لیکن اس سے پہلے امی کی آمد نے مجھے خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ میں اب مزید خاموش نہیں رہنا چاہتا تھا' اس لیے ایک دو روز میں امی کو تنہا پا کر میں ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر بیٹھا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ خوش ہوں گی لیکن وہ کچھ دیر کے لیے چپ بیٹھی رہ گئیں۔

"کیوں امی! اس میں کیا قباحت ہے' کیا وردہ آپ کو پسند نہیں ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں' ایسی بات نہیں ہے۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے لیکن ابھی چند روز پہلے اماں بھی فیضان کے لیے تذکرہ کر رہی تھیں۔"

"وردہ کے لیے..." میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"ہاں' کہہ رہی تھیں کہ اچھی بچی ہے' اس کے ماں باپ آجائیں تو فیضان کے لیے بات کرتے ہیں۔"

"چاچو نے کہا ہے ان سے بات کرنے کے لیے..."

"میرا خیال ہے' نہیں۔ یہ ان کی ذاتی خواہش لگتی ہے کیونکہ انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

"تو پھر آپ انہیں بتا سکتی ہیں کہ میں ایسا چاہتا ہوں' انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"دیکھو' میں بات کر کے دیکھوں گی لیکن ظاہر ہے کہ فیضان بڑا ہے' پہلے اس کے بارے میں سوچا جائے گا۔"

"یہ کون سی کتاب میں لکھا ہے۔" میں چڑ گیا۔ "پھر ان کے لیے کوئی اور لڑکی دیکھی جا سکتی ہے۔"

"اس کے پیرنٹس کو آنے تو دو پھر سوچیں گے۔" ان کا انداز ٹالنے والا تھا۔

مجھے لگا کہ جیسے وہ ہمیشہ کی طرح چاچو کو مجھ پر فوقیت دے رہی ہوں لیکن یہ کوئی ناشتے کا معاملہ نہ تھا کہ میں صبر کر کے بیٹھ جاتا۔ یہ میری پوری زندگی کا سوال تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ وردہ نہیں تو کوئی بھی نہیں۔

ان دنوں میرا دماغ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں وردہ کو اپنی جانب کس طرح ملتفت کروں' وہ تو یقیناً" چاچو کی ہمہ صفت شخصیت کی اسیر ہو چکی تھی۔ اس روز کے بعد سے وہ مجھ سے تھوڑی کھنچ سی گئی تھی اور اس کی یہ بے گانگی میری دیوانگی میں اضافہ کر رہی تھی اور اسی لیے میں ایک روز اسے تنہا پا کر اس سے پوچھ بیٹھا۔

"وردہ! کیا آپ مجھ سے کچھ خفا ہیں؟"

"کس نے کہا آپ سے؟" وہ بے نیازی سے میگزین کے اوراق الٹتی رہی۔

"میں نے محسوس کیا ہے۔"

"غلط فہمی ہے آپ کی۔" وہ اچانک اٹھ کر وہاں سے چلی گئی اور میں ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہ یقیناً" مجھ سے بھاگ رہی تھی' شاید اس نے میری آنکھوں میں وہ کچھ پا لیا تھا جس نے آج کل میرا چین سکون چھین رکھا تھا۔

محبت کس قدر بے کل کر دینے والا احساس ہوتا ہے' یہ مجھے ان دنوں پتا چلا تھا۔ نہ آپ کے اختیار میں کچھ ہوتا ہے' نہ ہاتھ میں اور پھر جب آپ کو یہ احساس ہو کہ ان راہوں پر چلنے والے آپ تنہا ہیں جس کے لیے آپ اتنی کٹھنائیاں سہ رہے ہیں' وہ تو یکسر لاپروا ہے۔

کس قدر تکلیف دہ خیال تھا یہ بھی کہ وہ اور اس کے جذبے میرے نہیں ہیں۔

میری جھنجھلاہٹ اور اکتاہٹ اور بڑھ گئی تھی' اس لیے میں گھر والوں سے بھی چڑا ہوا رہنے لگا تھا' اسی لیے ایک روز میں نے سدرہ اور اشمل کو بھی بلاسبب ہی ڈانٹ دیا۔

وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ہمیشہ کی طرح ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ میں کچھ دیر پہلے ہی آفس سے آکر وہاں بیٹھا تھا اور صبح کا اخبار ہاتھ میں لیے خبروں پر نظریں ڈال رہا تھا۔ میرا سارا دھیان کچن کی جانب تھا جہاں امی اور وردہ شام کی چائے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ کچن کے اندر کا آدھا حصہ یہاں سے صاف نظر آتا تھا۔ وردہ کا آسمانی آنچل ادھر سے ادھر لہرا رہا تھا۔ وہ امی کے ساتھ خوش گپیوں اور کام میں مصروف تھی اور کیسے اس گھر کا ایک حصہ لگ رہی تھی۔

"کاش تم ہمیشہ کے لیے یہیں رک جاؤ' اس گھر میں۔" میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی لیکن اگلے ہی لمحے مجھے خیال آیا کہ وہ اس گھر میں ایک دوسرے شخص کی وجہ سے بھی رک سکتی ہے۔ یہ سوچتے ہی میرے اندر غصے کی ایک تیز لہر سی اٹھی۔ اسی وقت اشمل نے شاید سدرہ کو کسی بات پر چھیڑا تھا جس پر وہ زور سے چیخی تھی۔

مجھے اس کے اس طرح چیخنے پر شدید غصہ آگیا تھا۔

"کیا بدتمیزی ہے سدرہ! اتنی بڑی ہو گئی ہو لیکن تمیز نام کو نہیں ہے تم میں۔ اس طرح چیختے ہیں۔"

میرے ناراض ہونے پر وہ تھوڑی سی چپ ہو گئی۔

"اغلب بھائی! یہ اشمل مجھے تنگ کر رہا ہے' میری چوٹی کھینچی تھی اس نے۔"

"تو کیا ہوا' ذرا سی چوٹی کھینچنے پر اس طرح چیختے ہیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔" اشمل نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے اسے زبان چڑائی۔

"دیکھیں اس نے پھر زبان چڑائی ہے مجھے' بلاوجہ ستاتا رہتا ہے۔" سدرہ نے پھر سے منہ بنایا۔

حالانکہ بات کوئی بھی نہ تھی' بہن بھائی اس سے زیادہ ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں' جس سے گھر میں زندگی کا احساس ہوتا ہے لیکن میں نے ان دونوں کو بری طرح جھڑک دیا تھا اور پھر غصے میں اٹھ کر وہاں سے جانے لگا تھا۔ کچن سے چائے کی ٹرے تھامے وردہ اس سارے جھگڑے کو دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تھم سی گئی تھی۔

"کہیں کا غصہ کہیں کیوں نکالتے ہیں آپ۔" مجھے جاتے دیکھ کر اس نے جتایا تو میں رک گیا۔

"کہاں کا غصہ ہے مجھے۔" میں نے اسے گھورا۔

"اس موضوع پر پھر بات کریں گے' فی الحال تو چائے پئیں۔ سیانے کہتے ہیں چائے غصے میں وہ کام کرتی ہے جو آگ پر ٹھنڈا پانی۔" وہ وہیں بیٹھ کر چائے کپ میں انڈیلنے لگی۔

"سوری بھائی! آپ آفس سے تھکے ہوئے آئے تھے اور ہم جھگڑنے بیٹھ گئے۔" سدرہ نے منمناتے ہوئے معذرت کی تو میں شرمندہ ہو کر بیٹھ گیا۔

اس دوران وہ ہنستے بولتے ہوئے سب کو چائے دیتی رہی۔ امی بھی وہیں آگئی تھیں۔

"ابا جی اور اماں نے تو اپنے کمرے سے نکلنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ کم از کم اس وقت تو نکلا کریں باہر۔" میں نے چائے پیتے ہوئے امی سے کہا۔

"ابا جی کسی دوست سے ملنے گئے ہیں' جبکہ اماں سو رہی ہیں' جب سے ان کے گھٹنوں نے کام کرنا چھوڑا ہے وہ کم ہی نکلتی ہیں باہر۔"

"آپ نکالا کریں نا انہیں' وہیل چیئر پر باہر آجائیں۔ سب کے درمیان بیٹھیں۔"

"ہاں آدمی اندر ہی اندر گھٹتا رہے تو ٹھیک نہیں

ہوتا اس کے لیے۔"

وردہ کی آواز میں معنی خیزی تھی' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی' میرے دیکھنے پر مسکرا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

اسی شب جب میں کھانے کے کچھ دیر بعد لان میں واک کر رہا تھا' وہ وہیں چلی آئی۔

"ہاں' اب کھل کر بتائیے مجھے' آپ کو کیا الجھن ہے۔" کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے اچانک پوچھا۔

"کس نے کہا آپ سے کہ مجھے کوئی الجھن ہے۔" میں خوامخواہ سنجیدہ ہو گیا۔

"چلیں نہ بتائیں' میں نے تو سمجھا تھا کہ۔۔۔۔" اس نے بھی اصرار نہ کیا۔

"کیا سمجھا تھا آپ نے۔"

"انسان کو اپنے اندر کی فیلنگز کسی نہ کسی سے شیئر ضرور کرنی چاہئیں۔ آپ کا کوئی دوست نہیں ہے؟"

"نہیں' کہتے ہیں جس کے جتنے زیادہ دوست ہوتے ہیں وہ اتنا ہی اکیلا ہوتا ہے۔"

"تو مجھے دوست سمجھ لیں۔"

"خالی دوست۔۔۔۔" میں نے پوچھنا چاہا لیکن خاموش رہا۔

"چلیں نہ سہی' کسی اور کو بنالیں۔ ہماری زندگی میں دوستی بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔"

"دوست تو بعد میں آتے ہیں' میں نے تو سگے رشتوں کو کبھی خود سے مخلص نہیں پایا۔ میری ذات' میرے اوصاف کچھ بھی نہیں ان کی نظر میں۔ ہمیشہ زندگی بھر میری نفی کی جاتی رہی' میرے مقابلے میں دوسروں کو فوقیت دی گئی' میں اپنے ہی گھر میں دوسرے درجے کے شہری کی طرح پلتا بڑھتا رہا۔" میں اچانک پھٹ پڑا۔

وہ انتہائی توجہ سے میری باتیں سنتی رہی۔

"جس بچے کو بچپن سے یہ احساس دلایا جاتا رہا کہ وہ ہر بات میں دوسرے سے کم تر ہے' اس کی شخصیت' اس کا ذہن' اس کی تعلیم' اس کی صفات سب دوسرے کے مقابلے میں کچھ نہیں ہیں' وہ اس جیسا کیوں نہیں ہے۔ آپ بتائیں کیا اس میں اعتماد پیدا ہو سکتا ہے' وہ اندر ہی اندر الجھتا ایک الجھی ہوئی شخصیت ہی بن سکتا ہے۔ وہ کچھ کرتا ہے تو کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا۔ کوئی تعریف' کوئی توصیف اس کے حصے میں نہیں آتی لیکن ایسا ہی کچھ دوسرا کرتا ہے تو اس کی واہ واہ ہوتی ہے۔ ایک شور مچ جاتا ہے۔ اس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔"

"اور یہ دوسرا کون ہے' آپ کے چاچو۔۔۔۔؟" وہ فوراً ہی سمجھ گئی تھی۔

میری آنکھوں میں پھر سے نفرت کے سائے پھیلنے لگے جو شاید اس نے دیکھ لیے تھے۔

"جہاں تک میں سمجھی ہوں اغلب! تو یہ آپ کی سوچ ہے۔ آپ کے چاچو ایک مخلص اور مہربان شخص ہیں' آپ سب سے محبت کرتے ہیں' ان کے ذہن میں تو شاید آپ سے کسی مقابلے کا خیال تک نہ آیا ہو گا اور رہے آپ کے گھر والے تو گھر میں دو بہن بھائی بھی ہوں اور ان میں سے کوئی ایک بہتر ہو مزاج میں' پڑھنے میں تو دوسرے بچے کو آگے بڑھنے کے لیے اکسانے کی وجہ سے اس کی مثالیں دی جاتی ہیں تاکہ وہ بھی اچھے بچے کی طرح محنت کرے۔ آگے بڑھے ورنہ ماں باپ کے لیے تو سب بچے برابر ہوتے ہیں۔ آپ کے ماں باپ کے لیے بھی آپ اہم ہیں' آپ ان کی پہلوٹھی کی اولاد ہیں' وہ بچہ جس نے پہلی بار دنیا میں آنکھ کھول کر انہیں ماں اور باپ کہلانے کا فخر بخشا۔ وہ آپ سے زیادہ کسے چاہ سکتے ہیں اور رہی دوسری بات کہ آپ کچھ بھی کریں' آپ کی واہ واہ نہیں ہوتی تو کیا آپ گھر کے کام' گھر والوں کی خدمت' تعریفیں سمیٹنے کے لیے کرتے ہیں؟"

اس کے اچانک پوچھنے پر میں گڑبڑا سا گیا۔ اس بے انتہا ذہین لڑکی سے کچھ چھپانا عبث تھا۔

"نہیں تو۔۔۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔"

"میں ٹھیک سمجھ رہی ہوں اغلب! جب بھی کسی کے لیے کچھ کریں چاہے وہ اپنا ہو یا غیر، خلوص کے ساتھ کریں۔ بنا کسی خود غرضی کے، بدلے کی نیت کے بغیر۔ کسی کے لیے کچھ کرنا پھر صلہ چاہنا تو آپ کے عمل کو ضائع کر دیتا ہے۔ آپ کی نیکی تو وہیں ختم ہو جاتی ہے جہاں آپ کے عمل میں غرض شامل ہو جاتی ہے۔ بے شک وہ غرض ایک چھوٹے سے تو صیفی جملے کی چاہ ہی کیوں نہ ہو۔"

میں ساکت، حیران اور ششدر بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کس طرح میرے اندر تک اتر گئی تھی، پاتال سے بھی گہری میری ذات اس کے لیے کیسی ہلکی ثابت ہوئی تھی۔

"بس یہی فرق ہے آپ میں اور آپ کے چاچو میں۔ ایک بار بے غرض ہو کر دیکھیں۔"

میں نے غور کیا وہ چاچو کو مسلسل آپ کے چاچو کہہ رہی تھی، کیا اس کے دل میں کوئی چور تھا، میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا لیکن وہ جانے کے لیے مڑ چکی تھی۔

"چلتی ہوں اب، آئی ایم سوری۔ آپ دوست بنانے کو تیار نہیں ہیں اور میں نے ایک اچھے دوست کی طرح آپ کی زندگی کی الجھنوں میں دخل اندازی شروع کر دی۔" وہ معذرت کر کے وہاں سے چلی گئی۔

میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن اس وقت میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ سوائے اسے جاتے دیکھنے کے کچھ نہ کر سکا۔

پھر اس کے والدین واپس لوٹ آئے تو وہ اپنے گھر لوٹ گئی۔ اس کے جانے کے بعد گھر جیسے ایک دم ویران ہو گیا۔

اماں تو اسے یاد کر کے اکثر آہیں بھرتیں۔ "کیسی ہنس مکھ بچی تھی، گھر میں رونق بکھیرے رکھتی تھی، جاتے جاتے اپنے ساتھ ساری رونقیں لے گئی۔"

"ہائے ایسے تو نہ کہیں اماں! گھر سے گئی ہیں، دنیا سے تو نہیں۔ ان کے لیے لفظ "تھی" کا استعمال تو نہ کریں۔" سدرہ انہیں ٹوکتی۔

"اللہ میری توبہ بچے! ایسی باتیں تو منہ سے نہ نکال - میں تو کہہ رہی تھی کہ اس کے ہونے سے کیسی زندگی لگتی تھی گھر میں۔" وہ جلدی سے کہتیں۔

"ہاں تو ہمارے دم سے کوئی رونق نہیں اس گھر میں۔" سدرہ جان بوجھ کر منہ بناتی۔

"نامیری بیٹی!" وہ اسے لپٹا لیتیں۔ "بیٹیاں ہی تو گھر کی رونق ہوتی ہیں لیکن پھر چلی جاتی ہیں تو ایک دم گھر ویران ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر انہیں ہم ہمیشہ کے لیے یہاں ہی کیوں نہ لے آئیں تاکہ اس گھر کی رونق ہمیشہ برقرار رہے۔" وہ میرے دل کی بات کہتی تو میں دل ہی دل میں اس کا شکر گزار ہو جاتا۔

"ہاں سوچا تو ہے، دیکھو ایک آدھ دن میں تمہاری ماں جائیں گی اس کے گھر۔"

میں ان کے جواب پر بے قراری سے اٹھ جاتا۔ کہیں وہ چاچو کے لیے تو... اور یہیں آ کر میرے لیے جیسے سب ختم ہو جاتا۔

☼ ☼ ☼

میں نے محسوس کیا تھا کہ جوں ہی میں امی سے اس سلسلے میں بات کرتا وہ ٹال جاتیں، پتا نہیں اس سلسلے میں وہ سستی سے کام کیوں لے رہی تھیں۔ حالانکہ وردہ کے والدین کو پاکستان آئے بھی ہفتہ بھر سے اوپر ہو چکا تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں انہیں وہاں جانے کے لیے پھر سے کہتا پاپا کی طبیعت کی خرابی نے مجھے بلکہ ہم سب کو سب کچھ بھلا دیا۔

کمزور تو وہ کافی دن سے ہوتے جا رہے تھے۔ چاچو، میں اور باقی گھر والے انہیں بہت دن سے کہہ رہے تھے کہ وہ اپنا مکمل چیک اپ کروائیں لیکن وہ مسلسل ٹالے جا رہے تھے، لیکن ایک روز چاچو ان سے اس بات پر سخت ناراض ہو گئے تو وہ ان کے ساتھ چلے گئے۔ ان کے سارے ٹیسٹ وغیرہ ہوئے اور جب رپورٹس ہمارے ہاتھ میں آئیں تو جیسے ہم سب کے پیروں تلے سے زمین ہی کھسک گئی۔

ان کے دونوں گردے ناکارہ ہو چکے تھے' گھر میں تو جیسے صف ماتم بچھ گئی تھی۔ حالانکہ پاپا اسی طرح بہادری سے کام لے رہے تھے' ہم سب کو سمجھاتے رہتے تھے۔

"دیکھو تم سب پریشان نہ ہو' جتنے دن کی زندگی ہے وہ میں ضرور جیوں گا۔ خدا نے اس بیماری میں موت لکھی ہے تو اسی طرح سہی۔"

"کہتی بھی تھی کہ اپنا چیک اپ کروالیں' سنتے ہی نہیں تھے۔ شروع میں ہی معلوم ہو جاتا تو....." امی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔

"کسے معلوم تھا کہ....." وہ افسردگی سے مسکراتے۔ "مجھے تو زندگی میں کبھی نزلہ کھانسی بھی ایسا نہیں ہوا کہ تکلیف دہ بنتا۔ معمولی چھوٹی موٹی بیماریاں.... دو ایک دن میں ٹھیک۔ اب کیا پتا تھا کہ ساری کسر اس طرح نکلے گی۔ خیر جو میرے مالک کی مرضی' اس نے بیماری دی ہے' شفا بھی وہی دے گا اور نہیں چاہے گا تو میں اور تم کچھ نہیں کرسکتے۔ بس دعا کیا کرو کہ خدا مجھے اتنی مہلت دے کہ اپنے بچوں کی ذمے داریوں کو نبھانے تک جی سکوں۔"

میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ میرے خوش باش' ایکٹو اور ہنس مکھ سے پاپا کس طرح بستر سے لگ گئے تھے۔

شروع شروع میں مہینے میں ایک بار پھر بعد میں بیماری کے بڑھنے پر ہفتے میں ایک بار انہیں ڈائیلاسز کے لیے جانا پڑتا کہ یہ اس کا واحد علاج تھا۔ گھر واپسی پر کمزوری اور نقاہت سے ان کی وہ حالت ہوتی کہ ہم سب کے دل خون کے آنسو رو رہے ہوتے۔

ان دنوں چاچو کا صرف ایک کام رہ گیا تھا کہ وہ ان کے گردوں کی تبدیلی کے لیے کوشش کریں۔ وہ اس سلسلے میں بہت بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ پیسہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا لیکن پاپا کی زندگی سے بڑھ کر ہمارے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

پھر ایک روز مجھے پتا چلا کہ چاچو نے اپنی گاڑی بھی بیچ دی ہے۔ بینک میں رکھی ہوئی تمام رقم تو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔

مجھے بے انتہا شرم آئی۔ مجھے یہ خیال کیوں نہ آیا تھا۔ "لیکن میری سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل سے ملتا ہی کیا جو میں اسے بیچتا۔" میں نے اپنا دفاع کیا۔

پھر ایک روز چاچو نے بتایا کہ کہیں سے ایک گردے کا انتظام ہو گیا ہے اور پاپا کو گردہ لگا دیا جائے گا جس کی بنا پر پاپا پھر سے زندگی کی جانب لوٹ سکیں گے۔

"شکر ہے میرے مالک کا' اس نے کوئی راہ نکال ہی دی۔" امی تو یہ سنتے ہی رونے لگی تھیں۔

"لیکن یہ ہوا کیسے؟" پاپا کے لیے بھی یہ مژدہ حیران کن تھا۔

"بس بھائی جان! اللہ بڑا سبب الاسباب ہے۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر انہیں تکنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی اور چہرے پر اپنے بھائی کے لیے بے انتہا محبت۔

پاپا کا دوسرا ہاتھ ان کے کندھے پر آکر ٹک گیا۔ ان کے چہرے پر چاچو کے لیے تشکرانہ جذبات تھے۔ ان کی بھاگ دوڑ' بے لوث خدمت پاپا کی نظروں سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ ان دنوں تو جیسے وہ خود کو بھولے ہوئے تھے۔ انہوں نے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے اپنا جو کردار نبھایا تھا وہ بے غرض تھا۔

"مجھے تم پر فخر ہے فیضان! تم نے میرے لیے جو کیا....." پاپا نے گلوگیر لہجے میں کہا تو چاچو نے ان کی بات کاٹ دی۔

"پلیز بھائی جان! کچھ نہ کہیں' میں نے کچھ نہیں کیا آپ کے لیے' کچھ بھی نہیں۔" پتا نہیں کیوں ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

اشمل' سدرہ' امی' اماں اور ابا جی' سب کے سب ان دونوں کے گرد جمع ہو گئے تھے' ہر شخص خوشی سے رو رہا تھا۔

اور پتا نہیں کیوں میں وہاں سے اٹھ آیا۔ میرا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ بھاگ دوڑ میں نے بھی کی تھی' پریشان میں بھی رہا تھا۔ اپنی جمع پونجی میں نے بھی استعمال کی تھی لیکن اس کے باوجود تعریف و توصیف

صرف چاچو کے حصے میں آئی تھی۔ اس لمحے بھی جب مجھے خوش ہونا چاہیے تھا' میں سلگ رہا تھا۔ کیسی عجیب اولاد تھا میں۔

پھر پاپا کے آپریشن کی تاریخ مل گئی لیکن اسی شام جب چاچو نے آکر بتایا کہ انہیں آفس کے کسی کام سے پندرہ بیس دن کے لیے لندن جانا ہے تو سارے گھر والے پریشان ہو گئے تھے۔

"ارے بیٹا! تم نے اپنی کمپنی والوں کو بتایا نہیں کہ ایک ہفتے بعد تمہارے بھائی کا اتنا بڑا آپریشن ہے۔" ابا جی نے پریشانی سے کہا۔

"بتایا تھا ابا جی! لیکن میرا جانا بہت ضروری ہے' کام کی نوعیت ایسی ہے کہ میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔"

"ارے خوب کہی بچے! بھائی کی زندگی سے نوکری زیادہ اہم ہے۔" اماں طیش میں آگئیں۔

"نہیں اماں! بھائی جان کی زندگی سے زیادہ میرے لیے کسی چیز کی اہمیت نہیں' لیکن نوکری بھی اس لیے ضروری ہے کہ پیسوں کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ فی الحال میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔" انہوں نے رسانیت سے سمجھایا۔

"فیضان ٹھیک کہہ رہا ہے اماں! ایسی اچھی نوکریاں پھر آسانی سے نہیں ملتیں۔ آپ اسے جانے دیں' یہاں اور دوسرے لوگ ہیں۔ سارا انتظام تو ہو ہی گیا ہے۔ اب تو بس مزے سے جاکر آپریشن ٹیبل پر لیٹنا ہے۔"

پاپا نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے مسکرانے کی کوشش کی' حالانکہ میں دیکھ رہا تھا کہ چاچو کے جانے کی خبر سن کر وہ بھی پریشان سے ہو گئے تھے۔

"آپ لوگ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ اغلب ماشاءاللہ سمجھ دار ہے' وہ یہاں ہو گا پھر احسن انکل نے بھی مجھے یقین دلایا ہے' وہ ہر بات کا خیال رکھیں گے۔ دل تو میرا بھی نہیں چاہ رہا لیکن مجبوری ہے۔" چاچو پھر سے سب کو سمجھانے لگے۔

اسی رات وہ میرے کمرے میں آئے اور مجھ سے کہنے لگے۔ "میں جانتا ہوں اغلب! کہ تمہیں کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ماشاءاللہ سمجھ دار ہو' سب کچھ آسانی سے ہینڈل کرلو گے' سب کا خیال رکھنا۔" ان کی آواز بھرا سی گئی تھی۔

ان کے سمجھانے پر میں تھوڑا چڑ سا گیا۔ "وہ میرے گھر والے بھی ہیں اور پاپا کی فکر مجھے آپ سے کم نہیں ہے۔"

انہوں نے میرے لہجے اور لفظوں پر حیران ہو کر مجھے دیکھا پھر مزید کچھ اور کہے بنا خاموشی سے پلٹ گئے۔

مجھے تھوڑی سی شرمندگی ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے میں نے سر جھٹک دیا۔

ان کے جانے پر پورا گھر پریشان تھا لیکن مجھے ایک گھٹیا سی خوشی ہو رہی تھی۔ ایک کمینہ احساس۔ "چلو وہ نہیں ہوں گے تو میری بھاگ دوڑ دوسروں کی نظر میں تو آئے گی۔"

اس سب میں یہ بھول گیا تھا کہ میں وہ ساری تگ و دو اپنے باپ کے لیے کر رہا اور اس میں دکھاوا اور نمود کی گنجائش کہاں سے نکل آتی تھی لیکن میرا ذہن ایسا سوچ رہا تھا۔

پھر چاچو چلے گئے۔ پاپا کامیاب آپریشن کے بعد گھر لوٹ آئے۔ پورا گھر خوشیاں منا رہا تھا' اس دوران چاچو کے تین چار فون آئے تھے اور انہوں نے آپریشن کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

وردہ اور اس کے گھر والوں نے صحیح معنوں میں اس دوران ہمارا ساتھ دیا تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وردہ کچھ خاموش سی ہو گئی تھی۔ مجھ سے تو وہ برائے نام ہی گفتگو کرتی تھی۔ ہاں البتہ گھر والوں کو اتنے اچھے طریقے سے تسلی دیتی تھی کہ سب جیسے دوبارہ ہمت باندھ لیتے تھے۔

پاپا گھر آئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر میری حالت بری ہو گئی تھی۔ کتنے دنوں سے میں ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔

لیکن یہ احساس کہ پاپا اب صحت مندی کی جانب لوٹ رہے ہیں' سب تکلیفوں کو بھلا دیتا تھا اور اس

سے بھی بڑھ کر یہ بات کہ پاپا اور سب گھر والے مجھ سے بہت خوش تھے۔ میں نے ایک بیٹے کا فرض بہت اچھی طرح سے ادا کیا تھا۔

پاپا کے لہجے میں میرے لیے بہت محبت ہوتی' ہر آئے گئے کے سامنے کہتے کہ میری بیماری میں میرے بیٹے نے میری بہت خدمت کی ہے۔

"ارے بھئی تو کون سا احسان کیا ہے' بیٹا ہے آخر۔" سامنے والا جواب دیتا۔

"ہاں ہے تو لیکن آج کل اس قدر نفسا نفسی کا دور ہے کہ سگی اولاد بھی اپنی نہیں رہی' لیکن میں اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہوں۔ بھائی ہے تو وہ سگی اولاد سے بڑھ کر بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ جاب کی وجہ سے مجبوراً" جانا پڑا اسے ورنہ تو وہ سب کچھ بھولا ہوا تھا میرے لیے۔"

وہ میری تعریف کرتے کرتے پھر سے چاچو کے راگ الاپنے لگتے تو میں سلگ کر وہاں سے اٹھ جاتا۔ چاچو کو گئے پچیس دن ہو رہے تھے اور پاپا شدت سے ان کے منتظر تھے۔ گھر والے بھی ان کی کمی کو بہت محسوس کر رہے تھے اور ایک میں تھا جس کے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ کاش وہ کبھی واپس نہ آئیں۔

"کیا ان کے جانے سے اس گھر کے کام رک گئے تھے' کیا ان کے جانے سے ہمیں کوئی مشکل پیش آئی تھی' کیا میں نے احسن طریقے سے سب کچھ ہینڈل نہیں کرلیا تھا۔" میں خود غرضی سے سوچتا۔

اور پھر ایک دن وہ لوٹ آئے۔ سب انہیں یوں اچانک دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ کافی کمزور ہو رہے تھے۔ پاپا سے مل کر پتا نہیں کیوں وہ آہستہ آہستہ آنسو بہاتے رہے۔ شاید یہ خوشی کے آنسو تھے۔

اس دن احسن انکل' آنٹی اور وردہ وغیرہ بھی آگئے تھے۔ مجھے لگا احسن انکل کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن پھر پتا نہیں کیوں وہ رک جاتے۔ آنٹی بھی کچھ مضطرب سی تھیں اور وردہ تو یکسر مجھے نظر انداز کیے چاچو میں گم تھی۔ وہ بھی اس میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔

مجھ سے مزید برداشت نہ ہوا تو میں اٹھ کر باہر آگیا۔

میرا وجود جیسے پس منظر میں چلا گیا تھا۔ وہی بات جس سے میں شدید چڑتا تھا' وہی ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا' آپ اٹھ کر باہر کیوں آگئے۔" وردہ کی آواز پر میں چونک کر مڑا۔

وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"یونہی اندر دل گھبرا رہا تھا۔" میں نے گول مول سا جواب دیا۔

"دل گھبرا رہا تھا یا....." وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"یا....؟" میں نے اسے گھورا۔ پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

"آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں' میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔"

"وردہ!" میں نے اچانک اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "آپ مجھ سے شادی کریں گی؟"

"نہیں۔" اس نے اطمینان سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔ اس کے چہرے پر میرے اس اچانک پروپوزل پر کسی قسم کا تاثر نہیں ابھرا تھا۔ جیسے وہ میرے اس سوال کی پہلے سے منتظر تھی۔

"کیوں' کیوں وردہ! کیا آپ مجھے پسند نہیں کرتیں۔" میں بے تابی سے پوچھنے لگا۔

"نہیں' مجھے خود غرض لوگ پسند نہیں ہیں۔ وہ لوگ جو زندگی کے آئینے میں صرف اپنی تصویر دیکھنا پسند کرتے ہیں' کسی کے کام آتے ہیں تو اپنی غرض سے' کسی کا بھلا چاہتے ہیں تو صرف اس لیے کہ ان کی واہ واہ ہوگی۔" اس نے صاف گوئی سے بنا کسی لاگ لپٹ کے کہا۔

"تو آپ کی نظر میں میں ایسا ہوں؟" مجھے معلوم تھا وہ سچ کہہ رہی ہے لیکن مجھے پھر بھی غصہ آگیا۔

"آپ یہ سوال خود سے کریں' آپ کا ایک ایک عمل اس کی تفسیر ہے اور جس شخص کا ہر ہر عمل مصنوعی ہو اس میں کہیں بھی رتی بھر خلوص نہ ہو' وہ کسی کو کیا دے سکتا ہے جو اپنے گھر والوں سے خالص اور سچی محبت نہ کرسکا' وہ کسی اور کو کیا دے سکے گا۔ فریب' خود غرضی' ریاکاری۔"

"آپ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔" میرا لہجہ بھڑک اٹھا تھا اور چہرہ یقیناً" لال بھبوکا ہو گیا تھا۔

قطعی نہیں' جب تک کسی آخری نتیجے تک نہیں پہنچ جاتی' کوئی فیصلہ نہیں سناتی۔ آج آپ کو ایک بات بتاؤں کہ قدرت نے مجھے ایک وصف عطا کیا ہے کہ میں لوگوں کے رویوں' لہجوں اور آنکھوں سے ان کے اندر کی سوچ کو پڑھ لیتی ہوں۔ میں نے بھی ایک روز اچانک آپ کے اندر اتر کر جھانک لیا تھا۔ آپ ساری زندگی اپنے چاچو سے چڑتے اور نفرت کرتے آئے ہیں' کیونکہ زندگی کے ہر میدان میں وہ آپ سے چند قدم آگے رہے' آپ کو مات ہوتی رہی اور یہ شکست آپ کو جھنجلاتی رہی۔"

وہ براہِ راست میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

"یہاں ان کا کیا ذکر ہے؟" میری جھنجلاہٹ اور غصے میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"ان ہی کا ذکر تو ضروری ہے۔" وہ مسکرائی۔ "ان ہی سے تو رقابت محسوس کرتے رہے ہیں آپ! یہ جانے بغیر کہ آپ کی یہ نفرت بلاسبب ہے۔ ان کی کچھ خوبیاں قدرت کی دی ہوئی تھیں تو کچھ انہوں نے اپنی محنت' لگن' خلوص اور بے غرضی کے جذبے سے اپنے اندر پیدا کرلیں۔ آپ چاہتے تو آپ بھی ایسا کرسکتے تھے' لیکن آپ نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا' ان سے حسد کرنے لگے۔ جانتے ہیں حسد اس آگ کی طرح ہوتا ہے جو سوکھی لکڑی کو راکھ بناتا جاتا ہے اور وہ دل دنیا کا سب سے برا دل ہوتا ہے' جو حسد اور کینے جیسی برائیوں سے بھرا ہوا ہو اور آپ نے اپنی تمام صلاحیتوں کو اسی کام میں لگالیا اور خلوص و سچائی سے دور ہوتے گئے اور پتا ہے انہوں نے کیا کیا۔ وہ سب کچھ بھول کر صرف محبت کرتے رہے' اپنے گھر والوں سے' اپنے بھائی سے....."

وہ بیچ میں رکی' اس کا لہجہ کپکپا گیا تھا اور آنکھیں نم ہو چلی تھیں۔

"ہاں تب ہی اتنے مشکل وقت میں' اپنی جاب کو

حنا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

جولائی 2003ء کا

شمارہ شائع ہو گیا ہے

جولائی 2003ء کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

جولائی کے شمارے کی ایک جھلک

گلوکارہ فریحہ پرویز سے ملاقات

"پتنگ باز سجنا نے" مجھے راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا

افشاں غزل کا مکمل ناول: "دائے شب ہجراں الوداع"

"شیشے کا گنگر" ساجدہ نوید کا ناولٹ

غزالہ عذیر کا ناولٹ "محبت اب نہیں ہوگی"

سباس گل' اقبال بانو' کرن گوریجہ' صائمہ عمر اور روشن چوہدری کے افسانے

"دل بے چین سمندر" زرنین آرزو کا سلسلے وار ناول

مریم ماہ منیر کا سلسلے وار ناول "ہوا میں ڈولتی خوشبو کی صورت"

اس کے علاوہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں' روحانی ڈاک' انشاء نامہ' انٹرویو' شوبز کی دنیا کی دلچسپ معلومات اور وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

جولائی کا شمارہ آج ہی طلب کریں

فوقیت دے کر اس وقت چلے گئے جب ان کے بھائی کو ان کی سخت ضرورت تھی۔ اپنا بینک بیلنس اور گاڑی قربان کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں پاپا سے بہت محبت ہے۔" میں نے طنزیہ کہا۔

"ان کا جانا ضروری تھا۔" وہ بھی طنزیہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ "اپنا ایک گردہ اپنے بھائی کو دینے کے لیے ان کا منظرِعام سے غائب ہونا ضروری تھا اور وہ یہ بات کسی کو بتانا نہیں چاہتے تھے۔"

میں حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

"یقین نہیں آرہا نا۔ یہ بات صرف ممی اور پاپا کو معلوم ہے یا پھر فیضان کے چند دوستوں کو۔ انہوں نے چپکے چپکے اپنے سارے ٹیسٹ کروائے تھے۔ خوش قسمتی سے ان کے ٹشو میچنگ ٹیسٹ انکل سے مل گئے تھے پھر بھی ڈاکٹرز اس کے لیے تیار نہیں تھے لیکن وہ بضد رہے۔ ہر جگہ سے مایوس ہو کر انہوں نے یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا کیونکہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ انکل گردے کی تبدیلی کے علاوہ کسی علاج سے ٹھیک نہیں ہو سکیں گے۔ پاپا کو بھی انہوں نے انتہائی مجبوری کی حالت میں اس راز میں شریک کیا تھا۔ یہ راز کوئی اور جانے نہ جانے آپ کے لیے اس کا جاننا انتہائی ضروری ہے تاکہ ایک عرصے سے ان کے لیے دل میں بھرا وہ بغض آپ نکال سکیں جس نے آپ کے دل کو پوری طرح ڈھانپ لیا ہے۔"

وہ جانے کے لیے مڑی پھر کچھ سوچ کر ٹھہر گئی۔

میں خاموش کھڑا رہا۔ میرے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ خلوص، سچائی، بے غرضی کا مطلب مجھے آج سمجھ میں آرہا تھا۔ میں تو ساری زندگی صرف اسی لیے دوسروں کے کام آتا رہا تھا کہ لوگ میری تعریف کریں، مجھے سراہیں، میری واہ واہ کریں لیکن چاچو نے اتنا بڑا قدم اٹھا کر بھی دوسروں کو لاعلم رکھا تھا۔ انہیں بھائی کی زندگی کی پروا تھی، اس سے غرض نہ تھی کہ لوگ یہ بات جان کر انہیں آنکھوں پر بٹھائیں گے ان پر تعریفوں کے ڈونگرے برسائیں گے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اس بارے میں کسی کو بھی بتایا تو کوئی انہیں اس کی اجازت نہ دے گا۔ کوئی دے سکتا تھا ایسی مثال۔

میں..... میں تو شاید ایسا سوچنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

"ابھی دو دن پہلے آپ کی دادی اماں نے میرے پیرنٹس سے میرے سلسلے میں بات کی ہے، وہ فیضان کے لیے میری آرزومند ہیں۔ ساتھ ساتھ انہوں نے ممی سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر کسی وجہ سے فیضان مجھے پسند نہ ہوں تو میں اغلب کے لیے بھی ایسا سوچ سکتی ہوں۔ میرا اس گھر میں آنا ان کے لیے اہم ہے اور میں نے اپنے ممی اور پاپا کو بتا دیا ہے کہ میں فیضان سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

میں نے اس کی آخری بات پر چونک کر اسے دیکھا۔

"میری ممی کی طرح آپ بھی مجھے ایک ناعاقبت اندیش لڑکی سمجھیں گے جو ایک صحت مند مکمل لڑکے کو چھوڑ کر ایک ادھورے شخص سے شادی کر رہی ہے۔ یقیناً" آپ کی نظر میں یہ جذباتیت کی انتہا ہے لیکن نہیں، یہ میرا انتہائی دانش مندانہ فیصلہ ہے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں آپ دونوں ہی کو چھوڑ کر کسی تیسرے شخص سے شادی کیوں نہیں کر لیتی تو بھی میں ایسا نہیں چاہوں گی۔ اس دور میں ایک سچا، بے غرض اور پرخلوص شخص شاید مجھے کہیں اور نہ ملے اور میں ایک چھوٹی سی کمی کے لیے اس سچائی کو کھونا نہیں چاہتی۔ اب چاہے لوگ مجھے بے وقوف کہیں، جذباتی کہیں یا انتہا پسند۔"

میں نے دیکھا وہ مسکرا رہی تھی جیسے اپنے اس فیصلے پر بہت مطمئن ہو۔

"نہیں وردہ! آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ نہ تو آپ جذباتی ہیں، نہ انتہا پسند۔ آپ نے اپنے لیے ایک بہترین شخص منتخب کیا ہے اور یہ بات ایک طویل عمر کے سفر کے بعد مجھے پتا چلی ہے۔"

میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کی اور اسے وہیں چھوڑ کر اندر چلا آیا۔

☆

فائزہ افتخار

یہ لمحے تیرے نام کریں

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ایک عجیب سے اضطراب نے اسے گھیر رکھا تھا' وہ اس اضطراب کی وجہ جانتا تھا۔ ظاہر تھا زندگی کا یہ نیا موڑ من چاہا ہونے کے باوجود ''اچانک'' تھا۔ کب سے اس کے دل میں چھپ کے بیٹھی یہ خواہش اپنی اس پذیرائی پر بوکھلا سی گئی تھی۔ اس نے بھی تو عرصہ ہوا خود ہی اس خواہش سے دستبرداری کا اعلان کیا تھا۔ ایسے میں اگر

مکمل ناول

بن مانگے وہ مل جائے جس کی تمنا کی جسارت کرنا بھی دشوار لگتا ہو تو شاید انسان اسی طرح گھبرا جاتا ہے' وہ بھی گھبرا اٹھا تھا۔ جب امی نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ چونک اٹھا۔

''کیا؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے' اب بھی ایسا ہو سکتا ہے' میں نے تو ایسا سوچا تک نہیں۔'' وہ بڑبڑاتا رہا۔ امی کے فیصلے پر جی بھر کے حیران ہوا مگر خوش ہونے کی ہمت نہ کی۔ بھلا ان کے یک طرفہ فیصلے پر جشن مناتے پھرنا کہاں کی دانش مندی تھی بلکہ اسے تو ان پر ہلکا ہلکا سا غصہ آرہا تھا۔

''کیا ضرورت تھی میرے سامنے ایسا خیال ظاہر کرنے کی' کتنا وقت اور کتنی محنت لگی مجھے' اس خیال کو دل سے نکالنے میں اور اب پھر سے وہ مجھے الجھا رہی ہیں۔ اب... اب جبکہ میں الجھنے کے لیے آزاد بھی ہوں۔''

لیکن تب وہ خود کو خوش ہونے سے روک نہ سکا' جب امی نے اسے رشتہ طے ہونے کی خوش خبری سنائی اور یہ بھی کہ احمریں بھی اس شادی کے لیے دل و جان سے راضی ہے۔

شادی بے شک سادگی سے ہوئی تھی۔ صبح نکاح اور اس کے ساتھ ہی رخصتی اور اسی رات ولیمہ کی دعوت لیکن وہ احمریں کی پذیرائی کو اس سادگی کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنا پورا کمرہ اس نے موتیے اور سفید گلابوں سے بھر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا احمریں کو سفید رنگ اور موتیے کی مہک کتنی پسند ہے۔ چار روز پہلے ہی اس نے اس بیڈ روم کے آسمانی رنگ کو تبدیل کر کے وائٹ پینٹ کروایا تھا۔ مختصر سے ٹیرس میں بیڈ روم کا دوسرا

دروازہ اور بڑی سی کھڑکی جہاں کھلتی تھی' وہاں اس نے موتیے کے پودے کے بڑے بڑے گملے رکھوا دیے۔ وہ جب چاہے ہاتھ بڑھا کے موتیے کی کلیاں چن سکتی تھی۔ امی نے اس کے اس اہتمام کو خاصا محسوس کیا تھا' لیکن اس نے پروانہ کی۔

اس نے سوچا تھا وہ احمریں پر بھی سب کچھ "کھل" کے ہی ظاہر کرے گا' وہ ساری بے تابیاں' وہ لمبی ڈنگ مارتی راتیں اور وہ سارے کٹھن دشوار دن جو اس کو سامنے پا کر بھی بے بس اور مجبور بن کے گزارے۔ دل کو مسلنے' کچلنے کے وہ سارے تکلیف دہ مراحل اسے بتانے کا ارادہ تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اضطراب کی جگہ ہیجان نے اس پر غلبہ پالیا۔ وائٹ اور گولڈن پینٹ سے آراستہ اس وسیع آرام دہ بیڈ کے وسط میں موتیا رنگ کے گھیر دار کرتے اور چوڑی دار پائجامے میں بڑے سے گولڈن کام سے بھرے ہوئے دوپٹے کو پھیلائے بیٹھی احمریں نے اس کے شوق کو اور بھی بڑھا دیا۔

یہ تم ہو میرے پہلو میں
کہ خواب زندگی تعبیر کی صورت میں آیا ہے

وہ بے ساختہ کہتا اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ گھٹنوں پر دھرے اس کے کومل ہاتھوں میں واضح لرزش پیدا ہوئی اور جھکے ہوئے سر نے اٹھتے اٹھتے خود کو پھر سے روک لیا' وہ مسکرایا۔

یہ کھلتے پھول سا چہرہ
جو اپنی مسکراہٹ سے جہاں میں روشنی کر دے
لہو میں تازگی بھر دے
بدن اک ڈھیر ریشم کا
جو ہاتھوں میں نہیں رکتا

وہ کہتا رہا' اس کا ہاتھ نامحسوس طریقے سے اس کے ہاتھ سے شانے تک کا سفر طے کر گیا اور احمریں... وہ جیسے کسی اچانک جھٹکے کے زیر اثر تھی۔ اس کی آنکھیں بدستور جھکی ہوئی تھیں اس کے باوجود اس کے چہرے سے تعجب کی تحریر بخوبی پڑھی جا سکتی تھی۔

انوکھی سی کوئی خوشبو کہ آنکھیں بند ہو جائیں۔

اس نے سرگوشی کرتے ہوئے اس کا آنچل کچھ سرکایا۔

"بہت نزدیک سے دیکھیں تو چیزیں پھیل جاتی ہیں
سو میرے چار سو دو جھیل سی آنکھوں کا پہرا ہے
تمہیں میں کس طرح دیکھوں

اس کے لہجے میں شاید وہ سب بے تابیاں تھیں جو گزشتہ سالوں کی بندش نے سینے میں دبا دبا کر طوفان کر دی تھیں۔ احمریں الجھ تو پہلے ہی گئی تھی' اب چونک بھی گئی۔ اس کی صبیح پیشانی پر ایک ہلکی سی شکن عارب کو سنبھلنے پر مجبور کر گئی۔

اس نے سرخ مخملیں ڈبیا میں سے دو طلائی کنگن نکالے۔ بے حد باریک اور نفیس نقش اور جا بجا چمکتے سفید نگینے ان کی خوبصورتی بڑھا رہے تھے۔ اس نے احمریں کا دایاں ہاتھ اس کے پہلو سے یوں اٹھایا' جیسے کسی نازک سی کلی سے شبنم کا کوئی قطرہ پور پر چن لیا ہو۔ وہ اس کی نازک سی کلائی میں یہ کنگن پہنا رہا تھا اور اس کے انداز میں کوئی مزاحمت نہ تھی لیکن اگلے ہی لمحے جب عارب نے اس سے کہا۔

"جانتی ہو' یہ کنگن میں نے آج سے دو سال پہلے خریدے تھے۔"

تو اچانک... اچانک وہ اپنا ہاتھ کھینچ کے رہ گئی لیکن عارب کی نرم گرفت مضبوط ہو گئی اور اس کا ہاتھ اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اس نے اور بھی محصور کر لیا۔

"لیکن انہیں لیتے ہوئے بھی تمہارا ہی چہرہ میرے تصور میں تھا۔ میں نے جھٹکنے کی بہت کوشش کی مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ میں نے ہار مان لی اور یہ کنگن ویسے کے ویسے رکھ دیے۔ نہ میں انہیں دیکھ کے تمہارا تصور کرنے سے خود کو باز رکھ پا رہا تھا اور نہ ہی انہیں تمہاری نذر کرنے کا اختیار رکھتا تھا' اس لیے یہ پڑے رہے۔ دو سال تک پڑے رہے اور شاید عمر بھر پڑے رہتے اگر تم نہ آتیں... تم نہیں جانتیں احمریں! تم میرے لیے کیا ہو اور تم نے میری زندگی میں آ کر مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔"

اس نے اپنی بے یقین آنکھیں اٹھائیں' عارب

اور بھی سحر زدہ ہو گیا۔ وہ تو ویسے بھی ان آنکھوں کا ڈسا ہوا تھا اور اتنے قریب سے ان آنکھوں کی کرنیں خود پر پڑتے محسوس کرنا اسے بے خود کر گیا۔ اسی عالم بے خودی میں اسے یہ تک نہ محسوس ہوا کہ یہ کرنیں کتنی حدت لیے ہوئے ہیں۔ وہ ان آنکھوں کی خوش رنگ پتلیوں میں ناچتی وحشت سے یکسر انجان اب تک بس ان طلسمی پلکوں کے اٹھنے کے منظر میں ہی گم تھا۔

"تمہاری یہ آنکھیں... یہ پلکیں... یہ آج سے نہیں بلکہ تین سال سے مجھ پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ میں جہاں بھی گیا' کہیں بھی رہا' کسی کے ساتھ بھی رہا' یہ بادل میرا سایہ بنا رہا۔"

احمریں کی آنکھوں کی وحشت اب اجنبیت میں بدل گئی۔ حیا نے سرد مہری اوڑھ لی اور وہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔

"تو کیا آپ... کیا آپ پہلے سے مجھے..."

"ہاں ہاں احمریں! بہت پہلے سے' جب سے تمہیں دیکھا ہے تب سے' تب سے میں تمہارا اسیر ہوں تمہاری پہلی جھلک نے ہی مجھے چونکا دیا تھا۔ تمہاری آنکھوں کا پہلی بار دیکھنا ہی تو مجھے لوٹ کر..."

"بس... بس... اب ایک لفظ اور نہیں۔"

اس کی آواز اتنی بلند اور لہجہ اتنا کٹھور تھا کہ اقرار کے نشے میں ڈولتا عارب بھی چونک گیا۔ اس کا یہ روپ اس کے لیے انجان اور غیر متوقع تھا۔ اس کی گہرے سرمئی بادلوں کی رنگت والی آنکھیں شفق رنگ لالی لیے ہوئے تھیں' جیسے وسط مئی کی کسی خشک شام میں اچانک پچھم سے لال طوفانی آندھی کا جھکڑ اٹھ گیا ہو۔ ہر طرف گرد ہی گرد ہو' لالی ہی لالی ہو... اس کی آنکھوں میں بھی اس وقت سب کچھ مٹیالا مٹیالا سا تھا۔

✿ ✿ ✿

اس رات ٹوٹے ہوئے تاروں کی گونج میں
ہم کتنی دیر چلتے رہے' کچھ پتا نہیں
کب تک ہم ان کہے لفظوں کی کرچیاں
فرشِ ہوا سے چنتے رہے' کچھ پتا نہیں

وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر اس سے ایسا کیا جرم سرزد ہو گیا ہے' جس کی پاداش میں اسے احمریں کی' اپنی نئی نویلی دلہن کی اس درجہ ناراضی سمیٹنا پڑی بلکہ یہ رویہ تو شاید ناراضی سے بھی بڑھ کے کچھ تھا۔ اسے اس کے زہریلے الفاظ یاد آئے۔

"عارب مصطفیٰ! اگر میرے علم میں ہوتا کہ آپ کی بظاہر ستھری اور نکھری شخصیت کے پیچھے اتنا مکروہ کردار چھپا ہوا ہے تو میں کبھی آپ سے شادی نہیں کرتی۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے کھینچا تھا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے ایک بار پھر اس سے وضاحت طلب کرنا چاہی تھی' لیکن اسے آئینے کے سامنے کھڑے نوچ نوچ کر زیورات اتارتے دیکھ کر رک گیا اور جیسے ہی اس نے عارب کے دیے کنگن اتار کے ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخے' ایک کنگن نیچے گر کے لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔ عارب کے اندر غیض و غضب کی ایک تیز لہر اٹھی۔ وہ ایک دم کمرے سے باہر نکلا اور لان میں آگیا۔

وہ پچھلے ایک گھنٹے سے حبس بھری تاریکی میں کھڑا تھا اور ابھی بھی اس کا اندر جانے کا ارادہ نہ تھا۔ ایک ایسے مرد کی انا پر چند گھنٹے پرانی دلہن کا یہ ہتک آمیز رویہ کاری ضرب کی مانند تھا' جس نے برسوں تک اپنے جذبوں کی ہوا تک کسی کو نہ لگنے دی۔ حتیٰ کہ ان خوش رنگ آنکھوں تک پر ظاہر نہ کیا کہ کب اور کس طرح اچانک وہ ان کا اسیر ہوا۔

ایک من چاہی ہستی کو نہ پانا شاید اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا' جتنا اذیت ناک اس شخص کی نفرت سہنا ہوتا ہے' جس کی دنیا میں سب سے زیادہ تمنا کی جائے اور اس نے اس کی تمنا کب نہیں کی تھی۔ تب سے... جب پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اسے اب تک آئینے پر جھلملاتی وہ دو آئینہ سی آنکھیں یاد تھیں۔

✿ ✿ ✿

یہ تقریباً" تین سال پہلے کی بات ہے' وہ ایک انٹرویو

کے سلسلے میں اسلام آباد جارہا تھا۔ اس لیے صبح چار بجے والی کوچ میں بیٹھا۔

کوچ میں زیادہ مسافر بھی نہیں تھے۔ اکا دکا لوگ نظر آرہے تھے اور جب وہ دو لڑکیاں کوچ کے چلنے سے بس چند ہی منٹ پہلے سوار ہوئیں تو وہ خاصا حیران ہوا۔ دونوں لڑکیوں کے پاس ایک ایک مختصر سفری بیگ تھا' جبکہ ہاتھوں میں اٹھائی کتابیں انہیں اسٹوڈنٹس ظاہر کررہی تھیں۔ اسی طرح سلیقے سے پھیلا کرلیے دوپٹے اور باوقار و خوداعتماد انداز بتا رہا تھا کہ اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ عارب نے اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کردیا۔ اس وقت ہلکے ہلکے اجالے اور دم توڑتے اندھیرے میں ہر جانب ایک سکون سا ٹھہرا ہوا تھا۔ خاکروب سڑکوں پر صفائی کا آغاز کرچکے تھے۔ بک اسٹال والے ہاکرز کے انتظار میں فٹ پاتھ پر بنے اسٹینڈ جھاڑ رہے تھے اور چند سپاہی دکانوں کے تھڑوں کے نیچے سوتے ہوئے بھکاریوں کو جگانے کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ دور ایک لائن میں لگے "چنگ چی" کے رنگ برنگے اسکوٹر رکشے خلافِ عادت خاموش کھڑے تھے۔

وہ دلچسپی سے باہر کے منظر میں گم ہوگیا۔ کوچ چل پڑی تھی اور اس وقت شاہدرہ کا پل کراس کرکے دریائے راوی سے گزر رہی تھی۔ سحر کا پردہ چاک کرکے اجالا نامحسوس طریقے سے پھیل چکا تھا۔ لاؤڈ اسپیکرز کے کھڑکنے کی آوازوں سے اندازہ ہورہا تھا کہ فجر کی اذان ہونے والی تھی۔ اسے ڈرائیور کی سست رفتاری سے کوفت سی ہوئی۔ ایک گھنٹہ ہونے کو آیا اور اب تک لاہور سے ہی نہیں نکل پایا تھا۔

اس نے ڈرائیور کو مخاطب کرنے کی غرض سے رخ موڑ کے جیسے ہی سامنے نگاہ کی' ڈرائیونگ سیٹ کے سامنے لگے بیک ویو مرر پر جھلملاتا ایک ادھورا سا عکس اسے مبہوت کرگیا۔ کئی ساعتیں یونہی بے دھیانی میں اسے تکتے ہی گزر گئیں۔ وہ جیسے وقتی طور پر بھول ہی گیا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس سے انجانے میں کیا حرکت سرزد ہورہی ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل جب اس کی نظر غیر ارادی طور پر کوچ میں چڑھتی ان لڑکیوں کی طرف اٹھی تھی تو اس نے فوراً" خود کو اس معیوب حرکت پر ٹوکتے ہوئے باہر کی طرف دھیان لگایا تھا اور اب..... وہ خود ہی.....

"تب اس مٹیالے سے اندھیرے میں یہ خوش گوار آنکھیں یوں واضح بھی تو نہ ہوئی تھیں۔" وہ سوچ کے زیرِ لب مسکرایا۔

اچھی آنکھیں اس کی کمزوری تھیں اور یہ آنکھیں..... جو اس وقت آئینے پر چسپاں تھیں..... صرف اچھی نہیں تھیں بلکہ..... سب سے منفرد' سب سے نرالی تھیں۔ اگرچہ اتنے فاصلے سے اور کم روشنی کی وجہ سے ان آنکھوں کی اصل رنگت تک نہ کھل رہی تھی' اس کے باوجود ان کی جھلملاہٹ اور گہرائی اپنی انفرادیت کا اعلان پکار پکار کر کررہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ان آنکھوں کی گہرائی پر غور کیا..... ہاں گہرائی..... ان کی ساخت کے لیے یہی ایک لفظ موزوں لگا اسے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ آنکھیں اس کے چہرے پر ہی نہیں' بلکہ پورے وجود پر چھائی ہوں۔ نہ صرف اس کے وجود پر بلکہ آس پاس کے سارے ماحول اور فضا پر.....

ماحول سے اس کے ذہن میں ایکدم جھماکا سا ہوا اور اس نے ہڑبڑا کے چاروں طرف دیکھا۔ کہیں اس کی چوری پکڑی تو نہیں گئی۔ زیادہ تر لوگ اونگھ رہے تھے' کوئی اخبار بینی سے دل بہلا رہا تھا لیکن پھر بھی وہ محتاط ہوگیا کہ کہیں اس کا ٹکٹکی باندھ کے سامنے دیکھتے رہنا اسے مشکوک نہ بنادے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سیٹ کی پشت پر سر دھرا اور پلکیں موند لیں۔ حیرت انگیز طور پر اب وہ بند پپوٹوں کے پردے کے پیچھے بھی وہی آنکھیں جھلملاتے دیکھ رہا تھا۔

نجانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ وہ چونکا جب موبائل کی بپ نے کوچ کی خاموش فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کیا۔ ان لڑکیوں میں سے کسی ایک کی مدھم سی آواز سنائی دی۔

"جی امی! گوجرانوالہ گزر گیا ہے..... نہیں نہیں..... پریشانی تو کوئی نہیں ہوئی۔"

عارب نے سیٹ پر سیدھے ہو کے بیٹھتے ہوئے دھیان دیا۔ ان لڑکیوں کی سیٹ اور اس کی سیٹ کے درمیان والی سیٹ نجانے کس وقت خالی ہوئی اسے پتا ہی نہیں چلا اور اب ایک سیٹ آگے بیٹھی وہ دونوں اسے صاف سنائی بھی دے رہی تھیں اور قدرے دکھائی بھی۔ موبائل کان سے لگائے اپنی امی کو تسلیاں دیتی وہ دوسری لڑکی تھی جبکہ "وہ" اس کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے اب آئینے کو اپنی آنکھوں کے عکس کی گرفت سے آزاد کرچکی تھی۔ عارب جو خود کو جھڑک کر بمشکل اس حرکت سے باز رکھ پایا تھا' آنکھیں کھولتے ہی پھر سے اس منظر کی آس میں بھڑکنے لگا۔ اسے خوامخواہ میں ہی فون والی لڑکی سے چڑ ہونے لگی جو "اس" کی ساری توجہ اپنی جانب کھینچے ہوئے تھی۔ وہ بھی نجانے کیا کہنے کے لیے بار بار اسے اشارے کررہی تھی۔

"جی امی! گیٹ کیپر کو رات ہی کو کہہ دیا تھا' وہ خود ٹیکسی میں یہاں تک چھوڑنے آیا تھا۔ ڈرائیور کو ٹائم پر بھیج دیجیے گا' راستے میں میرو کو بھی ڈراپ کرنا ہوگا۔"

"میرو....." وہ دوہرا کے رہ گیا۔ "میرو..... یہ کیسا نام ہے بھلا۔ شاید ماریہ..... یا شاید مہرالنساء..... یا پھر مہرین..... ماہین..... نہیں ضرور مہرالنساء ہوگا۔ اونہوں..... کیا اس کا نام رکھنے والوں نے یہ آنکھیں نہیں دیکھی ہوں گی' ان آنکھوں پر تو بندہ پورے کا پورا دیوان لکھ ڈالے۔ کیا ایک اچھا سا نام بھی نہیں رکھا جاسکتا تھا جو ان آنکھوں کو خراجِ تحسین پیش کرپاتا جیسے کہ نیناں....."

"اپنی ہی کہے جاتی ہو' میری بات تو کرواؤ آنٹی سے۔" اس کی جھنجلائی ہوئی سی دبی دبی آواز آئی۔ "مجھے ان سے کہنا تھا کہ میرے گھر بھی فون کرکے اطلاع دے دیں۔"

"جانتو رہی ہو' خود ہی جان جائیں گے۔" لاپروا سے انداز میں جواب ملا جس نے اس کی جھنجلاہٹ میں

غصہ بھی ملا دیا۔

”اور ساتھ میں زبردست سی ڈانٹ بھی پڑے گی یوں بغیر اطلاع دیے ہاسٹل سے نکلنے پر۔“

”تو پھر تم خود بات کرلو میں نمبر ملا دیتی ہوں۔“

خلافِ معمول ڈرائیور نے ٹیپ ریکارڈ کو اب تک چھیڑا نہ تھا۔ ٹریفک بھی کم تھا اور کچھ عارب بھی ان کے قریب ہی بیٹھا تھا اس لیے بغیر کسی اضافی کوشش کے ان کی گفتگو بآسانی اس تک پہنچ رہی تھی۔

”پاپا! آپ تو ایکدم گھبرا جاتے ہیں۔ سوری واقعی مجھے اندازہ نہ تھا کہ اتنی صبح صبح میرا فون آپ کو چونکا دے گا.... جی نہیں ایمرجنسی کیا ہوتی تھی بس آپ کو تو پتا ہے کہ میں اکیلے سفر ہرگز نہیں کر سکتی۔ ثنا کے ساتھ ہی آنا ہوتا ہے اس کا پروگرام اچانک بنا تو پھر میں بھی.... تو پاپا بعد میں میں کس کے ساتھ آتی.... کوئی نہیں پاپا! لاہور میں آدھی رات کو بھی سناٹا نہیں ہوتا' ہم تو پھر صبح چار بجے نکلے تھے اور خان چاچا ساتھ ہی تھے۔ ہاں جی وارڈن نے بھیجا تھا۔ نہیں نہیں.... ثنا گھر تک چھوڑ جائے گی... او کے پاپا....“

یہ بھی کنفرم ہو گیا کہ دونوں ہی لاہور کی رہنے والی نہیں اور تعلیم کی غرض سے ہاسٹل میں رہ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد پیٹرول پمپ پر رکنے کی وجہ سے دوسرے چند مسافروں کے ساتھ وہ بھی نیچے اترا اور واپس چڑھتے وقت جان بوجھ کر ان کے پیچھے والی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نزدیک سے گزرتے ہوئے اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں میڈیکل کی کتاب تھی یہ موٹی سی خشک کتاب اس وقت عارب کو کسی شاطر قسم کے رقیب سے کم نہیں لگ رہی تھی' جس نے اس چاند چہرے' ستارہ آنکھوں کو اوٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ بار بار آئینے پر نظر ڈالتا اور کتاب کے بکواس سرورق کو دیکھ کے چڑ جاتا۔ آدھ گھنٹے بعد شاید اس نے تھک کے کتاب نیچے کی اور سر سیٹ کی پشت سے ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔

عارب مایوس ہونا چاہتا تھا.... ہوا نہیں.... پلکوں نے آنکھوں کو پردے میں لے کر اس کے چہرے کے باقی نقش ابھار دیے تھے' وہ نقش.... جنہیں ان آنکھوں کی تابناکی پس منظر میں دھکیل دیتی تھیں۔ اس نے تسلیم کیا کہ ان دو آنکھوں کے خزینے کے علاوہ بھی اس نے کئی سوغاتیں سمیٹ رکھی ہیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا.... دیکھتا رہا.... حیران ہوتا رہا.... اتنے دلکش نظارے کی مسلسل دید نے بھی اسے سیرابی کا کوئی احساس نہ بخشا تھا۔ وہ جتنا اسے دیکھتا جاتا تھا' تشنگی اس کی پیاس بڑھاتی جاتی تھی' وہ مضطرب ہو اٹھا۔ بس نہ چل رہا تھا کہ اس کے چرنوں میں بیٹھ کے ہاتھ باندھ کے ایک بار.... بس ایک بار آنکھیں کھولنے کی درخواست کرے۔ اپنے دل کے اس فدویانہ انداز پر اسے غصہ بھی آیا' اور قریب تھا کہ وہ خود سے اس بے تابی پر لڑنا شروع کر دیتا کہ یکایک آئینے پر پھر سے دو سرمئی جھیلیں منعکس ہونے لگیں۔

سورج کی ڈھلی ڈھلی اولین کرنیں ان آنکھوں کا سحر انگیز رنگ قوس قزح میں لپیٹ کے آئینے پر اتار رہی تھیں۔ نیلا.... پیلا.... گلابی.... کاسنی.... رنگوں کا ایک میلہ تھا.... اور وہ سرمئی نگینے جیسے اس میلے کی شان تھے۔

وہ اس میلے میں کھو جانا چاہتا تھا' کھو رہا تھا.... کہ اچانک میلہ اپنی تمام تر رونقیں سمیٹنے لگا۔ جہلم کے اسٹاپ پر کوچ کے رکتے ہی وہ دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عارب نے پھرتی سے اٹھ کے ان کے بیگ سیٹ کے اوپر لگے اسٹینڈ سے اتارے۔ دل میں موہوم سی امید تھی کہ شاید دوبارہ رابطے کی کوئی امید پیدا ہو سکے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ناممکن تھا' سو ناممکن ہی رہا۔

دوسری لڑکی نے تو اپنا بیگ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے ذرا سا مسکرا کے تھینک یو بھی کہا لیکن ”میرو“ نے اس کا شکریہ ادا کرنا تو ایک طرف اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اسی شانِ بے نیازی کے ساتھ وہ واپس چلی گئی جیسے آئی تھی۔ عارب نے خالی سیٹ پر کچھ تلاش کرنا چاہا' کوئی کتاب' کوئی ورق.... کوئی نشانی.... مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا' وہ سب کچھ ساتھ لے

گئی تھی' سوائے اپنی آنکھوں کے۔

اور یہ آنکھیں اس روز سے عارب مصطفیٰ کے پاس تھیں' اس کے دل کے کہیں بہت اندر۔

٭ ٭ ٭

”بس بہت ہو گیا عارب!“ اس بار امی جان کے تیور جارحانہ تھے۔ وہ مدافعت کے حربے آزمانے کی بس سوچ کے رہ گیا۔ آخر کب تک بے بنیاد تاویلیں گھڑتا۔

”تمہیں میرے اکیلے پن کا ذرا احساس نہیں۔ دو چار بچے ہوتے تو میں کس لیے تمہارے پیچھے پڑی رہتی۔“ انہیں اس کی بات بہت بری لگی تھی۔ امی کے اس بار پھر سے اس کی شادی پر اصرار کرنے پر تنگ آکر اچھی خاصی بدتمیزی سے کہہ دیا۔

”اُفوہ.... آپ تو میرے پیچھے ہی پڑی رہتی ہیں۔ اب کیا میں ویک اینڈ پر بھی لاہور آنا چھوڑ دوں۔“

”تو مت کیا کرو اتنا بڑا احسان مجھ پر' جہاں سارا ہفتہ ہم دونوں میاں بیوی اکیلے پڑے جھک مارتے رہتے ہیں' وہاں یہ ڈیڑھ روز بھی اکیلے ہی گزار لیا کریں گے۔“

”کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ میرے ساتھ اسلام آباد چلے آئیں۔ اچھا خاصا کشادہ فلیٹ ہے۔“

”لو بھلا ہم کیوں اپنا بسا بسایا گھر چھوڑ کے تمہارے کرائے کے ڈربے میں اٹھ آئیں۔“

”میں کب کہہ رہا ہوں کہ آپ سب کچھ بیچ کر ہمیشہ کے لیے وہاں آجائیں۔ میں تو خود وہاں ہمیشہ کے لیے رہنے نہیں گیا۔ کیا پتا کب ٹرانسفر ہو جائے اور کہاں رہنا پڑے۔ اچھا ہے آپ کی تبدیلیٔ آب و ہوا ہو جائے گی۔ اسلام آباد خاصا پُرفضا شہر ہے۔“

”لیکن لاہور میں ہماری ساری برادری ہے' رشتہ دار' ملنے جلنے والے....“

”ابھی تو آپ اپنی تنہائی کا گلہ کر رہی تھیں۔“ اس نے بات کاٹ کر جتایا۔

”تو سارا خاندان چوبیس گھنٹے ہمارے سر پر تو سوار نہیں رہتا۔“ انہیں بھی اس کی چالاکی پر غصہ آگیا۔ ”نہ ہی کسی نے ٹھیکہ لے رکھا ہے ہمارا کہ جوان بیٹا تو رسیاں تڑا کے ساری ذمہ داریوں سے آزاد اتھرے بیل کی مانند گھومتا پھرے اور ایرے غیرے ہماری دلجوئی کی خاطر یہاں ڈیرے ڈالے رکھیں۔“

”لاحول ولا....“ وہ سخت بدمزہ ہو گیا۔ ”آپ کی باتوں سے تو لگ رہا ہے کہ جیسے آپ کی نظر میں میں محض ایک جانور ہوں' رسیوں سے جکڑنا چاہتی ہیں آپ مجھے.... یہ اوقات ہے میری.... آپ کے اکلوتے نورِ نظر کی....“ اس نے ان کا دھیان بٹانے کی غرض سے ناراضی کا ڈھونگ رچانے کی کوشش کرتے ہوئے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔

”اپنی عمر دیکھو چھبیس سال کے ہو گئے ہو' اپنا کھا کما رہے ہو' ٹھیک ہے بہت سے لوگ تیس تیس برس تک شادی نہیں کرتے مگر کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہو گی اس تاخیر کے پیچھے۔ کسی کو ذمہ داریوں کے بوجھ نے مارا ہوتا ہے' کسی کو روزگار کا مسئلہ ہوتا ہے' تمہیں آخر کیا تکلیف ہے۔ تم میری واحد اولاد ہو۔ کاش میرے بھی ڈھیر سارے بچے ہوتے' میرا آنگن بھی بھرا ہوتا۔ کسی ایک کے جانے سے بے رونقی یوں ڈیرے ڈال کے نہ رہ جاتی۔“ ان کے آنسو گالوں پر پھسلنے لگے تو عارب ساری ڈرامہ بازی بھول بھال کے وہ ان کے شانوں کے گرد بازو پھیلا کے بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہے اب میں صاف بات کہہ رہی ہوں' اب میں تمہارے کسی بہانے کو خاطر میں نہیں لانے والی۔ بھلے تم منہ پھاڑ پھاڑ کے مجھے ”اپنے پیچھے پڑ جانے“ کا طعنہ ہی کیوں نہ دو۔ تمہاری زندگی پر اتنا حق تو ہے مجھے کہ میں جو چاہوں فیصلہ کروں۔ غضب خدا کا' حد ہوتی ہے ڈھٹائی کی۔ بس یہ طے ہے کہ اس سال کے آخر تک تمہاری شادی ہو گی' انشاءاللہ۔“

”مگر امی!“ وہ منہ کھول کے رہ گیا۔ ان کا دوٹوک انداز باور کر رہا تھا کہ اب بحث کی نہ تو گنجائش ہے نہ فائدہ۔ رات کو کھانے کے بعد واک کرتے ہوئے اس نے ابو سے بھی شکایتاً ”امی کے اس سخت فیصلے اور ضد

کا ذکر کیا۔

"اس کی خواہش بے جا نہیں' البتہ تمہارے مسلسل انکار کی کوئی ٹھوس وجہ نہیں ہے۔ ہاں اگر تمہاری کوئی خاص پسند یا شرط ہے تو بلا جھجک اپنی ماں کو یا مجھے بتا دو یا پھر تمہارے ذہن میں اگر کوئی خاکہ ہے تو بھی....."

"پلیز ابو جی!" وہ گھبرا اٹھا۔ سینے کے اندر چھپا کے رکھے دو سمندر نین اچانک ہی ٹھاٹھیں مارنے لگے تھے۔

"ایسی.... ایسی کوئی بات نہیں ہمیں تو صرف....."

"ذمہ داریوں سے گھبرا رہے ہو۔" انہوں نے کھوجنے والی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ سر جھکا کے رہ گیا۔

"تم عمر کے جس مرحلے پر ہو' اگر تم نے اب بھی ذمہ داریوں سے بھاگنا نہ چھوڑا تو پھر تمہیں بے لگام رہنے کی عادت پڑ جائے گی۔ گھر اور گھرداری بندش لگنے لگیں گے.... لیکن کب تک.... کبھی تو تم اس آزاد مگر تنہا زندگی سے اکتاؤ گے.... کبھی تو تمہیں کسی دوسرے کے ساتھ کی ضرورت محسوس ہوگی۔ ماں باپ سدا نہیں رہتے اور بدقسمتی سے تمہارے پاس بہن بھائی کا رشتہ بھی نہیں۔ تب تمہیں احساس ہوگا' لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ ہر کام وقت پر ہی اچھا لگتا ہے۔"

"ابو جی! اب آپ نے بھی امی جان کی طرح ڈرانا شروع کر دیا۔" حقیقتاً" وہ گھبرا گیا تھا۔ مستقبل کی اس ہولناک منظر نگاری پر' اب وہ کیسے انہیں بتاتا کہ اس کے انکار کی اصل وجہ کیا ہے۔ " وہی دو خوبصورت سی بڑی بڑی آنکھیں اور وہی آنکھوں والی۔"

ڈیڑھ سال ہو رہا تھا مگر ان آنکھوں سے وہ ایک پل کے لیے پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ چپکے سے اس کے دل کی کچی مٹی میں اپنی آنکھیں بو گئی ہو اور عارب نے اتنے ڈھیر سارے دنوں میں اس کی اپنی وارفتگی سے اس قدر آبیاری کی کہ اب اس کے اندر ان آنکھوں کا ایک پورا شجر ہرا ہو گیا تھا۔ ہر ڈال پر وہی آنکھیں' پتے پتے پر وہی پلکیں.....

اسے تو خود اپنی بے قراریوں پر حیرت ہوتی۔ اسلام آباد سے ہر ویک اینڈ پر لاہور آنا آسان بات نہیں۔ اس کے پاس معقول بہانہ تو یہ تھا کہ وہ امی ابو کی تنہائی کے خیال سے ہر ویک اینڈ ان کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے' مگر اصل وجہ تو شاید یہ تھی کہ وہ اسے کھوجنا چاہتا تھا۔ فلائنگ کوچ کے سفر سے گھبرا اٹھنے والا عارب مصطفیٰ' ٹرین اور جہاز کا سفر کرنا بھول چکا تھا۔ جہلم کے اسٹاپ پر کوچ کے رکتے ہی وہ بے تابی سے نئے چڑھنے والے مسافروں میں اسے ڈھونڈنے لگتا۔ لاہور سے واپس آتے ہوئے بھی وہ باقاعدہ دعائیں مانگا کرتا کہ ایک بار اس کا سامنا پھر اسی آہو چشم سے ہو جائے۔

لاہور میں اس نے میڈیکل کالجز کے کتنے ہی پھیرے لگائے تھے' مگر بے سود اور ایک بار تو وہ لاہور جاتے جاتے راستے ہی میں جہلم اتر گیا تھا۔ گرمیوں کی تعطیلات تھیں' اس کا اندازہ تھا کہ وہ ضرور ہاسٹل کے بجائے اپنے گھر پر ہوگی۔ صبح سے لے کر رات تک وہ بے مقصد جہلم کے گلی کوچوں' محلوں' بازاروں اور شاپنگ سینٹرز میں پھرتا رہا اور رات کی کوچ سے واپس اسلام آباد گیا تو بے تحاشا تھکن کا شکار ہو چکا تھا۔ سارے دن کی کھوج بے فائدہ رہی تھی۔

"اور کہیں یہ عمر بھی بے ثمر ہی نہ گزر جائے۔" اس نے حقیقت پسندی سے اپنا احتساب کیا۔

"اب بس بھی کرو عارب مصطفیٰ! کب تک خود کو دھوکا دیتے رہو گے۔ دنیا کے اس پُرہجوم میلے میں کسی ایک چہرے کو ڈھونڈنا کس قدر مشکل کام ہے۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ان کی بات ماننے پر تیار ہو گیا۔ شاید اتنے دنوں کی بے مقصد تلاش نے بھی اسے مایوس سا کر دیا تھا یا پھر وہ واقعی ابو کی کھینچی مستقبل کی منظر کشی سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔

"میری پسند....." امی کے پوچھنے پر وہ بتانا چاہتا تھا کہ خوبصورت آنکھیں اس کی کتنی بڑی کمزوری ہیں اور وہ جو کوئی بھی ہو اس کی آنکھیں بہت حسین ہونا

چاہئیں..... لیکن کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا فائدہ' ان آنکھوں سے بڑھ کے حسین تو نہیں ہو سکتیں۔" اس نے سوچا۔

"نہیں' میری کوئی پسند نہیں۔"

"پھر بھی' کچھ تو سوچ رکھا ہوگا' کوئی تو خواہش ہوگی۔ لمبے بال' نیلی یا کالی آنکھیں' سرو قد یا جھرنے سی ہنسی۔" چھوٹی چچی نے شرارتاً" ہنس کے اگلوانا چاہا۔ اس کے حامی بھرتے ہی امی نے پورا وفد بلوا لیا تھا' بہو کی تلاش کی مہم پر نکلنے کے لیے۔

"نہیں بھئی..... بلکہ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ شادی چونکہ صرف امی کی خواہش پر ہو رہی ہے' اس لیے ان کی بہو خالصتاً" ان کی پسند اور مرضی کی ہوگی۔ جیسی بھی وہ چاہیں' جسے بھی وہ پسند کریں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو عارب؟" امی اس کی بے زاری پر بجھ کے رہ گئیں۔

"اتنی غیر دلچسپی کا اظہار۔" خالہ نے بھی حیرت کا اظہار کیا تو وہ سنبھل گیا اور بات بھی سنبھال لی۔

"غیر دلچسپی نہیں خالہ جان! فرمانبرداری۔" اس نے لاڈ سے امی کے شانے پر سر رکھ لیا۔

"کمال ہے' میں آپ کو اپنی زندگی کے تمام اختیارات سونپ رہا ہوں اور آپ میری نیت پر شک کر رہی ہیں۔ آپ کی پسند پر بھروسہ ہے مجھے' جو انتخاب آپ میرے لیے کریں گی' وہ اچھا ہی ہوگا۔ میں تو یہاں تک کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس کی تصویر تک دکھانے کی ضرورت نہیں۔"

اور اصل میں تو یہ شرط اس نے خود اپنے آپ سے ڈر کر عائد کی تھی۔ بڑی مشکلوں سے دل کو رضامند کیا تھا' کہیں تصویر دیکھ کر پھر سے احتجاج پر نہ اتر آئے۔ کہیں اس چہرے پر بھی ان آنکھوں کو تلاشنا نہ شروع کر دے۔

وہ ساری رات اس نے اپنے دل سے نظریں چراتے گزاری۔ دو کٹورا سے نین ڈھیروں گلے لیے اسے تک رہے تھے' سوال کر رہے تھے۔

"بس..... بس..... عارب مصطفیٰ..... !اتنی جلدی ہار گئے۔"

"کیا پتا ہم یہیں کہیں ہوں' تمہارے بے حد نزدیک..... ڈھونڈتے تو سہی..... تم تو ہمیں تلاشنے کے حق سے بھی دستبردار ہونے جا رہے ہو۔"

☆ ☆ ☆

"جہلم۔"

شادی میں صرف بارہ روز رہ گئے تھے' جب اسے اطلاع ملی کہ بارات جہلم جائے گی۔ وہ بھرپور طریقے سے چونک گیا۔ اپنی ہی شادی سے اس کی غیر دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اسے یہ تک علم نہ تھا کہ اس کا رشتہ کہاں طے کیا گیا ہے۔

رشتہ اس کی غیر موجودگی میں ہی خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ ان کی خاندانی نجابت' امی ابو کا حسن اخلاق و خلوص اور خود اس کی شاندار ملازمت..... شاید ان لوگوں کو یہی مطلوب تھا۔ اس لیے محض لڑکے کی تصویر پر ہی اکتفا کر لیا گیا۔ ایک بار دفتر سے واپسی پر برابر کے فلیٹ والے نعمان آغا نے بتایا۔

"کچھ لوگ تمہارے بارے میں پوچھ گچھ کرتے پھر رہے تھے' خیر تو ہے میاں!"

"میرے بارے میں' کون لوگ؟" فوری طور پر اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"ایک تو بزرگوار سے تھے' وہ غالباً" ان کے صاحبزادے۔ کیا بات ہے' کہیں شادی وادی کا تو چکر نہیں چل رہا۔" نعمان آغا سے عمر کا دس بارہ سال کا فرق ہونے کے باوجود اس کی خاصی بے تکلفی تھی۔

"ہاں' ہے تو کچھ ایسی ہی بات۔ ادھر امی نے ایک سلسلہ شروع تو کیا ہوا ہے لیکن..... عجیب لوگ ہیں' جاسوسی کرنے کہاں تک آ گئے۔ کیا میں اس قدر ناقابلِ اعتبار یا مشکوک ہوں ان کی نظر میں۔" اسے برا لگا۔

"یہ حق ہے ان کا' آخر لڑکی والے ہیں' اتنا بگڑنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے خاصے شریف اور سیدھے سادے لوگ نظر آ رہے تھے۔ میں تو ان کے پوچھنے کے

انداز پر بھی بھانپ گیا کہ ہو نہ ہو' ضرور رشتہ وغیرہ کا چکر ہے۔"

"پھر آپ نے کیا کہا ان سے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔ نعمان آغا کی چلبلی طبیعت اور شرارتی فطرت سے آگاہ تھا' اس لیے ذرا سی امیّد تھی کہ شاید انہوں نے اِدھر اُدھر کی ہانک کر انہیں برگشتہ کر دیا ہو۔

"کہنا کیا تھا' یہی کہ ہمارا شہزادہ ہزاروں بلکہ لاکھوں میں ایک ہے۔ نیک' شریف' دو وقت کا نمازی' ملنسار......"

"ہت تیرے کی۔" وہ بڑبڑا کے رہ گیا۔ (انہوں نے بھی آج ہی سنجیدگی کا چولا پہنا تھا۔)

"آپ بھی آغا صاحب......!" وہ شکایتاً" انہیں گھورنے لگا۔ "کیا تھا جو کچھ اور کہہ دیتے۔ مثلاً ... مثلاً میں ہیروئن پیتا ہوں' شرابی ہوں' رشوت خور ہوں' ہفتے میں چار گرل فرینڈز بدلتا ہوں' محلے میں دنگا کرتا ہوں' آدھے شہر سے قرض لے رکھا ہے' وغیرہ وغیرہ۔"

"بچو! یہ سب اور وغیرہ وغیرہ... میں ان سے تو نہیں کہہ سکا مگر ڈونٹ وری' اب تم نے فرمائش کی ہے تو ذرا اپنی گردن چھری تلے آ لینے دو۔ جب تمہاری دلہن یہاں آئے گی تب اس سے ضرور کہہ دوں گا' تم دل چھوٹا مت کرو۔" وہ بھرپور تسلی' تشفی کراتے اندر چلے گئے۔

وہ بات پکی ہونے اور شادی کی تاریخ مقرر ہونے کے درمیانی عرصے میں جتنا بھی لاہور آنے سے کتراتا رہا مگر شادی کے لیے تو اسے آنا ہی پڑا۔

لیکن نجانے کیا بات تھی وہ جتنی پٹیاں دل کو پڑھاتا' کوئی نہ کوئی بات پھر سے اسے ڈگمگانے پر مجبور کر دیتی۔

"کیا' جہلم...... مگر امی! آپ نے پہلے تو نہیں بتایا۔"

"اچھا... واقعی نہیں بتایا۔" وہ بھی حیران ہوئیں۔

"شاید تم نے غور نہیں کیا ہو گا ورنہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ذکر ہی نہ ہوا ہو۔"

"امی! کیا اس نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی ہے؟" اچانک اسے ایک خیال آیا اور وہ بے قراری سے پوچھ بیٹھا۔

"اب یہ تو پتا نہیں... ویسے اسی سال سولہویں جماعت کا امتحان دیا ہے۔" سیدھی سادی مڈل پاس امی زیادہ تفصیل نہ بتا سکیں۔ "مگر عارب! تم بھی عجیب ہو' اگر ڈاکٹری پڑھنے والی لڑکی کی خواہش تھی تو پہلے کہتے' اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"اچھا چلیں' اتنا تو پتا ہو گا کہ وہ جہلم ہی میں پڑھتی رہی ہے یا کسی دوسرے شہر میں۔" آخری چانس لیا گیا۔

"نہیں' پڑھتی تو جہلم ہی کے کالج میں تھی' اتنا مجھے اچھی طرح علم ہے' پتا کر کے بتاؤں؟"

"نہیں' اب پتا کیا کروائیں گی آپ' جہلم میں پڑھتی ہے تو ظاہر ہے وہاں تو کوئی میڈیکل کالج نہیں ہے۔" وہ مایوس ہو کر اٹھنے لگا۔

"لیکن تمہیں ایکدم سے ہی ڈاکٹری پڑھنے والی لڑکی کا خیال کیسے آ گیا۔ لو بتاؤ بھلا' اب پھوٹ رہا ہے' رشتہ کرنے سے پہلے میں نے ہزار طریقے سے اگلوانا چاہا کہ کوئی پسند ہے تو بتا دو تاکہ بعد میں ماں سے گلہ نہ رہے۔ تب گونگے کا گڑ کھا کے بیٹھے رہے۔ ہائے ہائے...... رضوانہ کی نند کی لڑکی ڈاکٹری کے آخری سال میں تھی۔" انہیں کفِ افسوس ملتے دیکھ کر وہ تلخ سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

"آپ بھی کمال ہیں امی! ہر بات سے اپنی مرضی کے نتائج اخذ کر لیتی ہیں۔ بے فکر ہو جائیں' میں تو بس یونہی پوچھ رہا تھا۔"

دل میں ایک ذرا سی جو امیّد ابھری تھی' وہ فوراً ہی بجھ کے رہ گئی۔ اس نے پھر سے کچھ کریدنے کا ارادہ ترک کر دیا' لیکن جو سامنے آنا ہو وہ بغیر کریدے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ یوں بھی اب شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔ مایوں کے روز اسے اس کا نام معلوم ہوا۔ انگبین ناز۔

"انگ... بین...... یعنی کہ انگبین...... اور وہ... میرو...... بھلا میرو اور انگبین کا کیا ردھم...... نہیں' یہ وہ نہیں ہو سکتی۔ اف خدایا' کیا ہو گیا ہے مجھے۔ کیوں ہر

بات میں میں کوئی نہ کوئی نکتہ تلاش کر لیتا ہوں۔"

مہندی کی رسم کو دونوں فریقوں نے اپنے اپنے گھر میں ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ مشورہ بھی ابو جی کا تھا۔ ان کے پیشِ نظر اپنی سہولت سے زیادہ لڑکی والوں کی آسانی تھی۔ بارات کے استقبال سے ایک دن پہلے انہیں اتنا لمبا سفر طے کر کے صرف اس رسم کی ادائیگی کے لیے لاہور آنا پڑتا' جبکہ اس سے کچھ دیر قبل وہ لڑکے والوں کی رسم بھگتا کے بیٹھے ہوں۔ وقت اور پیسے' دونوں کے ضیاع سے بچنے کے لیے انہوں نے یہ رسم اپنے اپنے طور پر ادا کرنے کا فیصلہ کیا' البتہ شگن کے طور پر امی' خالہ اور چچی کے ساتھ جا کر مایوں کے روز ہی مہندی کا جوڑا اور چوڑیاں' مٹھائی وغیرہ دے آئی تھیں۔ مہندی کے روز ان کی طرف سے بھی لڑکی کی بھابھی' پھوپھی اور امی شگن کی مٹھائی اور جوڑا لے کر آ گئیں۔

"امی! کیا ایسا نہیں ہو سکتا' مہندی کی طرح شادی بھی اپنے اپنے گھر پر ہی کر لیں۔" اس کی احمقانہ تجویز پر پہلے تو انہوں نے جی بھر کے اسے مشتبہ انداز میں گھورا' پھر اس کے لہجے اور چہرے پر شرارت کی کوئی رمق نہ پا کر ایک زور کی دھپ رسید کی۔

"باؤلے ہوئے ہو' سب ہی کی شادیاں ہوتی ہیں مگر میں دیکھ رہی ہوں' جب سے تمہاری شادی کی تاریخ مقرر ہوئی ہے' تب سے تمہاری مت ماری گئی ہے۔ خوامخواہ ہی تباہی بکے جاتے ہو۔"

"باؤلا تو آپ نے کر دیا ہے۔" وہ جھنجلا گیا۔

اس نے خود پر ہر طرح سے قدغن لگا دی۔ بڑی شان کے ساتھ وہ بارات لے کر اس شہر میں گیا اور بڑی ہی کامیابی کے ساتھ اس نے اپنا دھیان بھٹکنے سے بچایا۔ خوش اسلوبی سے نکاح ادا ہو جانے پر سب کے ساتھ ساتھ اس نے خود بھی اپنے آپ کو مبارکباد دی۔

"مبارک ہو عارب مصطفیٰ! شاید اب تم ان آنکھوں کے پھیلائے جال سے باہر نکل آئے ہو' جبھی تو اس شہر کی حدود میں داخل ہونے سے لے کر اب تک تم نے ایک بار بھی ان آنکھوں کو نہیں ڈھونڈا۔"

اور یہ قسمت کی ستم ظریفی ہی تو تھی کہ دنوں' مہینوں وہ ان آنکھوں کو تلاشتا رہا مگر ناکام رہا اور جب تلاش کا ارادہ ترک کر دیا تو وہ آنکھیں خود بخود ہی...... اچانک...... ایکدم... اس کے سامنے جگمگانے لگیں۔

"اتنی آسانی سے آپ کی جان بخشی نہیں ہو گی' اب آپ ہمارے قابو آئے ہیں جناب!"

اس شوخ سی آواز پر اس نے غیر ارادی سی نگاہ اٹھائی تھی اور جسم کا تار تار جیسے جھنجھنا کے رہ گیا۔ ایک پل کے لیے تو وہ بھول ہی گیا کہ وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں بیٹھا ہے۔ آس پاس سے گونجتا میوزک' باتوں' پٹاخوں' چیخ و پکار کا سارا شور و غل مدھم بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گیا۔ ماحول کی ساری افراتفری اور ہنگامہ پروری اب تک دھندلے سے سلوموشن پس منظر کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دو سرمئی آنکھیں بھرپور طریقے سے مسکراتی ہوئی پھر سے اس پر چھا رہی تھیں۔

"ارے دولہا بھائی کا تو رنگ ہی اڑ گیا۔ بھئی میرو' ہتھ ہولا رکھ یار' تیرا اکلوتا اکلوتا بہنوئی ہے۔"

ایک چبھتی ہوئی آواز نے اسے کھینچ کر نیچے لا پٹخا۔ وہ خشک ہوتے حلق کو تر کرنے کی کوشش کرتا ہوا بمشکل اپنی نظریں جھکا پایا۔

"دل جو تیرا گھبرائے......" ایک اور شوخ لڑکی نے اس کے نروس انداز پر چوٹ کرتے ہوئے تان لگائی جس کا فوری ساتھ میرو نے دیا۔

"سر جو تیرا چکرائے
یا دل ڈوبا جائے
آجا پیارے پاس ہمارے
کاہے گھبرائے... کاہے گھبرائے۔"

دودھ کا بھرا گلاس اس کے آگے نچاتے ہوئے وہ لہک لہک کے گا رہی تھی۔

"بھائی! حساب کتاب بعد میں ہوتا رہے گا۔ لیجیے پہلے یہ نوش فرمائیے اور جان بنائیے۔ آپ کی حالت سے تو لگ رہا ہے جیسے عرصے سے پیاسے ہیں۔"

"یہ پیاس میرے اندر روئی بھی تم نے ہی تھی' اسے بھرکایا بھی تم نے ہی ہے۔" وہ اسے گلہ آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا گلاس تھام کے رہ گیا۔

"اب آئی ہو۔" اس کا رواں رواں سوال کر رہا تھا' اس نے گلاس لبوں سے لگالیا۔

"اور اس روپ میں..... اس رشتے سے۔" اس نے ایک کڑوا زہر گھونٹ بھرا اور گلاس واپس بڑھادیا۔

"ہائے میرو! تم نے کیا ڈالا تھا دودھ میں جو دولہا بھائی کے چہرے کے زاویے ہی بگڑ گئے۔"

"ارے ان کا موڈ تو اسے دیکھتے ہی خراب ہوگیا۔ لگتا ہے سالی پسند نہیں آئی۔ خیر آپ فکر مت کریں دولہا بھائی! اتنے مایوسانہ اندازے لگانے کی ضرورت نہیں' ہماری انگبین بھابھی بالکل بھی اس جیسی نہیں۔ ارے کہاں وہ چندے آفتاب' چندے ماہتاب اور کہاں یہ..... ڈیلوپا۔" ایک لڑکے نے میرو کی بڑی بڑی آنکھوں کو نشانہ بناتے ہوئے کہا۔ عارب نے ایک نظر بھر کے اسے دیکھا۔

واقعی وہاں کچھ بھی ایسا غیر معمولی نہ تھا۔ چمکتی گندمی رنگت' موزوں پیشانی' مناسب ناک..... شانوں سے ذرا نیچے آتے گہرے بھورے' سیدھے بال' سادہ سی مسکراہٹ جس میں کوئی گدگدا دینے والی کیفیت نہیں تھی' کوئی مبہم سے اشارے نہیں تھے۔ بے کشش مکانوں میں جیسے چاند راتیں تھیں اس کے سرد چہرے پر خوش گوار آنکھیں تھیں

اسے کچھ خبر نہ ہوئی کتنی دیر تک یہ نوک جھونک چلتی رہی۔ کب اور کس کی مداخلت پر اس کا ہاتھ والٹ تک گیا اور اس نے کتنے نوٹ نکال کر سامنے کھڑی "سالیوں" کے گروہ کو تھمائے۔ کب وہ باقی سب کے ساتھ اسٹیج سے نیچے اتری۔

اس کے حواس مختل ہو چکے تھے اور قوت گویائی سلب ہو کے رہ گئی تھی۔ وہ تو موقع ایسا تھا کہ کسی نے اس کی خاموشی اور کھوئے کھوئے انداز کو زیادہ محسوس نہ کیا۔ ایک آدھ بار کسی بے تکلف دوست نے ٹھوکا ضرور دیا۔

"تمہیں تو سچ مچ سانپ سونگھ گیا ہے۔ اعلا نسل کے مشرقی دولہا بنے شرم و حیا کے ریکارڈ قائم کر رہے ہو۔"

آرسی مصحف کی رسم نے اسے پھر سے ہوش کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ ایسا ہوش جو ہوش اڑانے کی حد تک سفاک تھا۔ اس کے سامنے رکھے آئینے پر جو عکس تھا' وہ ایک حسین چہرے کے تمام دلکش خدوخال بھرپور آرائش کے ساتھ اجاگر کر رہا تھا۔ سنگھار اور گہنوں کے تمام عروسی لوازمات سے آراستہ وہ پیکر اچانک اس وقت دھندلانے سا لگا جب ایک سال پہلے کا وہ عکس سرمئی بھورے بادلوں کی طرح یہاں سے وہاں تک چھا گیا۔

"کتنے جتنوں کے ساتھ میں یہ منظر بھلا پایا تھا' کتنے بند باندھے تھے میں نے' کتنی فصیلیں کھڑی کی تھیں اور کتنی سچائی اور ایمانداری کے ساتھ یہ نیا رشتہ قائم کرنے چلا تھا..... پر کیوں وہ چلی آئی' اس کی ایک جھلک نے پھر سے میرے قدم ڈگمگا دیے ہیں۔ کیا چند لمحے قبل ان آنکھوں کو پھر سے دیکھ لینے کے بعد یہ چہرہ..... بلکہ کوئی بھی اور چہرہ اس دل کو جچے گا۔"

وہ شور مچاتے دماغ اور خالی نظروں کے ساتھ آئینے میں انگبین کا شرما تا روپ دیکھتا رہا اور ٹوٹتا رہا۔

☆ ☆ ☆

کٹ گئی رات تیرے خوابوں میں
دن گزرنے میں بہت دیر لگی
تیری آنکھوں کی طرح گہرا تھا
زخم بھرنے میں بہت دیر لگی

احمریں..... ہاں احمریں..... میرو کا نام احمریں تھا۔

احمریں کا اچانک یعنی اس کی شادی کے موقع پر نظر آنا کوئی کم ناقابل یقین نہ تھا کہ اپنے اور اس کے مابین انجانے میں قائم ہونے والے اس رشتے نے اسے اور بھی بدحواس کر دیا۔ وہ ایک صاف دل کا سیدھا سادہ انسان تھا۔

نہ کوئی بہت بڑا اداکار تھا' نہ ہی سادھو سنت۔

وہ اپنے اور احمریں کے رشتے کے تقدس سے آگاہ تھا۔ اسے انگبین کا بھی احساس تھا۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا اس کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے کی اور شاید وہ کامیاب بھی ہو جاتا اگر..... اگر احمریں..... انگبین سے وابستہ نہ ہوتی۔

وہ دل و دماغ کی اس کشمکش سے عاجز آچکا تھا' اس کے دل میں کوئی چور نہ تھا' نہ ہی فطرت میں غاصبانہ پن تھا' لیکن اس ایک نظر کا کیا کرتا..... اس ایک لمحے سے اسیری کیسے حاصل کرتا..... وہ نظر..... وہ لمحہ..... اسے کبھی بھولتا نہ تھا۔

اور یہ "نہ بھولنا" ہی تو تھا جو اسے چین نہ لینے دیتا۔ احمریں سے وہ جان بوجھ کر ایک فاصلے پر رہتا' کسی کو اس کا گریز اور لیا دیا انداز خاص طور پر احمریں کے حوالے سے محسوس نہ ہو' اس لیے اس نے یہ سنجیدگی خود پر مستقل طاری کرلی۔

اس کی کوشش ہوتی کہ سسرال کم سے کم جائے اور یہ کوشش اتنی بار آور تھی کہ کم سے کم ہوتے ہوتے تقریباً" نہ ہونے کے برابر تھی۔

اگر کبھی اتفاقاً" احمریں سے سامنا ہو بھی جاتا تو اس کی شعوری کوشش ہوتی کہ اس پر ایک نظر ڈالے بنا ہی ادھر ادھر ہو جائے۔ ایک بار اس کے روکھے پن سے دلبرداشتہ ہو کے اس نے سب کے سامنے ہی گلہ بھی کر دیا۔

شادی کے چھ ماہ بعد انگبین کی سسرال میں پہلی عید تھی اور وہ اپنی امی اور بھابھی کے ساتھ لاہور عیدی دینے آئی تھی۔ عارب بھی اسی روز اسلام آباد سے گھر پہنچا تھا اور ان کی آمد سے لاعلم تھا۔ شدید تکان اور دھند بھری سردی کے باوجود وہ ان کے آنے کے چند منٹ بعد کسی ضروری کام سے باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ امی نے خاصا برا محسوس کیا اور اکیلے میں اسے ڈپٹنے لگیں۔

"ابھی تو تمہیں اس قدر بھوک لگی تھی' بس کھانا لگنے ہی والا ہے اور یہ تو دیکھو تمہاری ساس آئی ہیں' رشتے کی بھابھی بھی ساتھ ہے' وہ لوگ دوسرے شہر سے آئے ہیں اور تم چند منٹ ساتھ بیٹھنے کی بجائے باہر نکل رہے ہو۔ کوئی ادب لحاظ بھی ہے یا نہیں۔"

اسے خود بھی احساس تھا لیکن وہ جس چیز سے بچنا چاہ رہا تھا' وہ ادب' لحاظ اور مروت سب ہی کے لیے خاصی نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ احمریں کے مقابل بیٹھنے کا مطلب تھا اس کے آگے خود پر سے اختیار کھو دینا۔

اسے ایک نظر دیکھنے کا مطلب تھا اپنی نظریں بے لگام کر دینا۔

اور وہ بے لگام ہونا نہیں چاہتا تھا' اتنی کٹھنائیوں کے ساتھ جو مہاریں مٹھی میں تھام رکھی تھیں وہ محض اس کی پلکوں کے ایک بار اٹھنے اور پھر سے گرنے کے طلسم کا شکار ہو کے چھوٹ سکتی تھیں۔ اسی خدشے نے اسے ہر مصلحت اور مروت سے بے نیاز کر دیا تھا اور وہ اپنی ساس کے سامنے بڑے برخوردار انداز میں معذرت پیش کرتا ہوا اپنے کسی ضروری کام سے باہر جانے کا ذکر کر رہا تھا۔ جب احمریں کی آواز اسے پشت سے سنائی دی۔

"آپ کو تو شاید ہمارا آنا ہی پسند نہیں آیا۔"

"نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں' یہ تو بس..... یہ ہے ہی ایسا۔" اس نے مڑ کے دیکھنے کی زحمت نہ کی' وضاحت پیش کرنا کیسے گوارا کرتا' البتہ اس کے حصے کی ساری شرمندگی امی نے اپنے اوپر لے لی۔

"تم بھی احمریں.....! جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہو۔" اس کی امی نے بھی وضع داری نبھاتے ہوئے داماد اور سمدھن کو خفت سے بچایا۔

"مرد ذات ہے' سو بکھیڑے ہوتے ہیں' کب اچانک کیا کام نکل آئے' کوئی پتہ تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ کوئی شوق سے تو ٹھنڈ میں مارا مارا نہیں پھرتا۔"

"آپ کچھ بھی کہہ لیں امی! اتنا تو مجھے پتا ہے کہ ہمارے دولہا بھائی کو اور کسی سے نہ سہی مگر مجھ سے تو خاص چڑ ہے' ہے نا؟"

بظاہر یہ شرارت بھرے لہجے میں اسے بولنے پر اکسا رہی تھی لیکن انداز میں ایک بھرپور گلہ بھی تھا۔ وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کے رہ گیا۔

اپنا پن بھی اسی بے گانے پن میں ہے
پورا عالم اک دیوانے پن میں ہے
یہ جو تم سے میں انجان بنا پھرتا ہوں
ساری بات اسی انجانے پن میں ہے

☆ ☆ ☆

انگبین اچھی لڑکی تھی... ہر لحاظ سے...
حسین...
تعلیم یافتہ...
سلجھی ہوئی... اور شائستہ...

اس کی ہمراہی میں عارب نے سنبھلنے کی خاصی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔

کم از کم اس حد تک تو... کہ کوئی اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپے اس راز کی جھلک تک نہ پاسکا... خود انگبین بھی نہیں اور شاید انگبین نے تو کبھی عارب مصطفیٰ کے دل میں جھانکنے کی کوشش کی ہی نہیں یا تو اسے دل میں جھانکنے کا فن نہیں آتا تھا۔

یا پھر اسے کبھی اس ہنر کو آزمانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔

یا اس کو کبھی عارب کے دل کی طرف جانے والے رستے کا علم ہی نہیں ہوسکا۔

جو بھی تھا عارب مطمئن تھا۔ اسے انگبین کی سرد مہری یا اجتناب... یا گریز... جو بھی تھا، غنیمت لگتا۔

باقی معمولات میں اس کا طرز عمل نارمل تھا۔ امی اور ابو دونوں کے لیے وہ پسندیدہ بہو ثابت ہوئی۔ اس نے جرنلزم میں ایم اے کر رکھا تھا اور اس کی معلومات عامہ اور زوریاں غضب کا تھا۔ ابو کے ساتھ صبح کی چائے پیتے ہوئے اخبار کی تازہ ترین سرخیوں پر سیر حاصل تبصرہ کرتی ہوئی وہ نہ صرف ان سے شاباشیاں لیتی، بلکہ گھر کے ہر کام میں اپنی مشاقی اور سلیقہ شعاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے امی کا بھی دل جیتتی رہی۔

عارب سے اس کا واسطہ بس رسمی سا تھا۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی، وہ ایک روبوٹ کی طرح اس کی زندگی میں شامل تو تھی مگر ہمراہ نہیں۔ عارب نے پہلے پہل اسے اس کی شرم و حیا پر معمول کیا اور بعد میں اس نتیجے تک پہنچا کہ شاید اس کے خمیر میں یہ حس ہی نہیں۔ اس کی بے تو جہی کی یہ ادا اسے اس قدر بھائی کہ اس نے اس میں کسی قسم کی کمی نہ آنے دینے کے لیے اسے اپنے ساتھ اسلام آباد نہ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ خود انگبین نے اس فیصلے کی تائید کرتے ہوئے اسے قابل عمل بنا دیا۔ اس کے دل سے رہا سہا بوجھ بھی سرک گیا۔

"امی جان! مجھے اکیلے رہنے کی عادت نہیں۔" وہ تقریباً سسک ہی تو پڑی۔

"پاگل مت بنو بیٹا! اکیلی کیوں رہنے لگیں تم! عارب جو ہوگا۔" انہوں نے اسے چمکارتے ہوئے دلاسہ دیا۔

"وہ تو سارا دن ہی آفس میں گزاریں گے۔ ایک تو اجنبی شہر، وہاں کوئی جان پہچان والا بھی نہیں اور دوسرا اتنا خشک اور ویران سا شہر۔"

"ہم ملنے آتے رہیں گے اور لاہور کون سا دور ہے، عارب سے کہہ دوں گی، ہر ویک اینڈ پر تمہیں لے آیا کرے بلکہ ایک بار یہاں اور دوسری بار جہلم لے جایا کرے۔"

جہلم کا نام سن کر وہ بدک اٹھا۔

"مجھ سے بے کار کی امید مت رکھیں۔ پروموشن کے ساتھ ساتھ کام کا دباؤ بھی بڑھ گیا ہے۔ ویک اینڈ کا مطلب ہوتا ہے ہفتے بھر کی تھکن اور ٹینشن سے وقتی ریلیف... یہ توقع نہ رکھیں میں اپنی اس واحد عیاشی سے ہاتھ دھولوں اور اسلام آباد سے لاہور اور جہلم اور پھر واپس اسلام آباد تک کے پھیرے لگاتا رہوں۔"

اس کے صاف جواب پر وہ اور ہراساں ہوگئی۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں یہ امی! ابھی آپ خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ لاہور کون سا دور ہے اسلام آباد سے، ہم تینوں خود ہی مہینے میں ایک آدھ بار وہاں چلے جایا کریں گے۔"

اس نے ممنون نگاہوں سے انگبین کی طرف دیکھا۔

"سمجھ دار بیوی بھی ایک عطیہ ہے۔" پہلی بار اس نے مثبت انداز میں اس کے بارے میں سوچا۔

اور یہ طے پایا کہ فی الحال وہ اکیلا ہی اسلام آباد جائے گا۔ اگرچہ امی کو اب بھی سخت اعتراض تھا' انہیں گوارا نہ تھا کہ کوئی کل کلاں کو یہ طعنہ دے کہ بہو اپنے آرام اور خدمت کے لیے پاس رکھ لی لیکن ابو نے سمجھایا۔

"ابھی انگبین ذہنی طور پر تیار نہیں' اسے مجبور مت کرو' بھرے پرے گھر سے آئی ہے۔ سسرال کے مختلف ماحول میں ہم دو بڈھوں کا دم اسے پھر بھی غنیمت لگتا ہوگا' اسی لیے اکیلے فلیٹ میں رہنے سے گھبرا رہی ہے۔"

"ہاں کہتے تو آپ ٹھیک ہیں۔ جب میاں کی یاد ستائے گی تو کیسے نہ جائے گی وہاں۔" انہوں نے متفق ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

اور اس طرح وہ اکیلا ہی واپس لوٹ گیا۔ زندگی ایک مخصوص ڈگر پر رواں دواں ہو گئی۔ دل ہر وقت کسی بھاری سل کے نیچے دبا رہتا۔

جسے پانے کی خواہش کی تھی... اسے تلاشنے میں ناکام رہنا... ایک دکھ تو یہ تھا۔

جس کے نہ ملنے کو تقدیر جان کے صبر کر لیا' اس کا زندگی کے اس موڑ پر اچانک نظر آجانا جہاں سے وہ کسی اور راہ پر قدم رکھتے جا رہا تھا... یہ ایک الگ حادثہ تھا۔

پہلے پھر بھی ہفتہ دس دن میں گھر کا چکر لگ جاتا' لیکن اب وہ مہینہ مہینہ جانے کا نام نہ لیتا تھا۔

انگبین کو دیکھ کے ملال اور زیادہ بڑھ جاتا۔ حالانکہ اس کا کیا قصور تھا' اس بات کا احساس ہونے کے باوجود عارب اسے دیکھ کر خود پر طاری ہوتی قنوطیت کو دور نہیں کر پاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

زندگی شاید ہمیشہ ہی اس بے کشش ڈگر پر رواں دواں رہتی' اگر امی اسے فون پر وہ خبر نہ سناتیں۔ وہ سنتے ہی عجیب سے احساسات میں گھر گیا۔ اصولاً" تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا' یہ خبر خوشخبری ہی تو تھی لیکن سب سے پہلے وہ حیران ہوا... اور پھر... پریشان... اور خوش بھی ہو ہی گیا۔

حیران اس بات پر ہوا کہ کیا دلوں کے بندھن بندھے بغیر بھی کوئی نیا رشتہ جنم لے سکتا ہے؟

پریشان اس بات پر کہ کیا وہ اس نئے رشتے کے حوالے سے تمام تر ذمہ داریاں اور فرائض نباہ سکے گا؟

جواب ہاں میں ملا۔

"ہاں عارب مصطفیٰ! جس رشتے کو وجود میں لانے والے تم خود ہو' اس کی ذمہ داریوں سے چشم پوشی کر بھی کیسے سکتے ہو۔ یہ تو تمہارے خمیر میں شامل نہیں' یہ فرض تو تمہیں نبھانا ہی پڑے گا اور پورے دل سے نبھانا پڑے گا۔"

دل کی آمادگی پر وہ ہلکا پھلکا ہو گیا اور عرصے بعد کسی خوشی کو کھل کے گلے لگانے کی ہمت کی۔

"اچھا ہی ہوا کہ انگبین کی ضد کے آگے ہار مان کے ہی سہی مگر میں نے اسے تمہارے ساتھ بھیجنے میں زبردستی نہیں کی۔" امی فون پر ہنس ہنس کے سنا رہی تھیں۔

"میں بھی پاگل ہی ہوں' نجانے مجھے پہلے یہ خیال کیوں نہ آیا۔ اچھا ہی ہے کہ انگبین میرے پاس ہے۔ ایسی حالت میں اسے کسی بڑے' کسی بزرگ کی نگہداشت میں ہی رہنا چاہیے۔ اکیلی ہوتی تو بچی کتنا گھبرا جاتی۔"

اس نے سکون کا سانس لیا' لیکن اس بار امی نے ایک نئی فرمائش کر ڈالی۔

"یا تو تم اپنا تبادلہ جلد از جلد لاہور کروا ڈالو یا ہر ہفتے آیا کرو۔ ٹھیک ہے' اس کی دیکھ بھال کے لیے میں ہوں لیکن آخر تقویت تو اپنے شوہر سے ہی ملتی ہے۔"

"امی! آپ نے تو لگتا ہے عورتوں کی نفسیات پر پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔"

"بس اب تم بھی ایک اچھا باپ بننے کی تعلیم

حاصل کر ہی لو۔"

انگبین کے رویے میں بھی اسے واضح تبدیلی کی جھلک نظر آئی۔ اس بار گھر آتے ہی سب سے پہلے اس کی نگاہوں نے انگبین کو ڈھونڈا تھا۔ پہلی بار اس کے پاس اس سے کہنے کے لیے کچھ تھا اور اس سے سننے کے لیے بھی۔ تب اس نے پہلی بار اپنی زندگی میں آئی اس تبدیلی کو کھلے دل سے تسلیم کیا۔ شب و روز کچھ سہل سے لگنے لگے۔ نہ دن کو بے چینی گھیرتی' نہ رات کو پچھتاوے اور پشیمانی ستاتی۔

لیکن شاید تقدیر کو اس کا زندگی کی آنکھ سے آنکھ ملا کر جینے کا طریقہ کچھ زیادہ نہ بھایا۔

سب کچھ نارمل ہی تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں بھی امی اسے باقاعدگی سے ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے جاتی رہتیں۔ شہر کی سب سے مشہور گائنا کالوجسٹ کو دکھاتی تھیں جس کے مطابق انگبین ہر لحاظ سے فٹ اور صحت مند تھی' اس لیے وہ ہر فکر سے بے نیاز تھا۔ اسی بے نیازی کے عالم میں وہ ہڑبڑا کے رہ گیا' جب ابو جان کی فون کال آئی۔

"فوراً" گھر پہنچو' انگبین بہت سیریس ہے۔"

"مم... مگر... ابو جی... ابھی تو..." وہ ہراساں ہو گیا۔ اتنا تو جانتا تھا کہ گائنا کالوجسٹ کی دی گئی ڈیٹ میں ابھی پورے ۳۵ روز باقی تھے۔

"یہ سوال کرنے کا وقت نہیں' پہلی فلائٹ سے پہنچو۔"

کوشش کے باوجود اسے کنفرم سیٹ نہ مل سکی تو وہ مزید وقت ضائع نہ کرنے کے خیال سے بائی روڈ ہی نکل پڑا۔ پروموشن کے ساتھ ہی اسے گاڑی اور ڈرائیور دونوں مل چکے تھے۔

پرائیویٹ ہاسپٹل کے کاریڈور میں امی اور ابو کے ساتھ اس کے ساس' سسر' سالی اور دونوں سالے بمع اپنی بیویوں کے موجود تھے' وہ ٹھٹھک گیا۔ ان سب کے پژمردہ چہرے اور متورم آنکھیں ہزار وسوسے پیدا کر رہے تھے۔

"عارب... بیٹے...!" امی سسک پڑیں۔ انگبین کی والدہ بھی تسبیح کے دانے گراتی ہوئی مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔ اس کے سلام کے جواب میں انہوں نے سرخ آنکھیں اٹھا کے بمشکل سر ہلایا تھا۔

"ماں ہے نا' شاید ماں کے دل کو پہلے خبر ہو گئی ہوگی' اسی لیے یہ آج صبح تڑکے ہی اپنے بڑے بیٹے اور بہو کے ساتھ پہنچ گئی تھیں اور تب تک تو بینا بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ بلڈ پریشر بھی کبھی کبھی معمولی سا ہائی ہو جایا کرتا تھا اور ایسا تو ان دنوں ہوتا ہی ہے مگر آج نجانے کیا ہوا۔ اچھی بھلی بیٹھی چکیں لگا رہی تھی' اچانک چکر آئے۔ سہارا دے کر اوپر کمرے میں لے جا رہی تھی میں' ایک طرف سے اس کی بھابھی نے بھی تھام رکھا تھا۔ پتا نہیں کیسے' یہ بے دم ہوئی اور ہاتھوں سے نکل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی سیڑھیاں..."

وہ پھر سے رو پڑیں۔ عارب تصور کر کے لمحہ بھر کے لیے لرز سا اٹھا۔

"لیکن پچھلے ہفتے جب میں آیا تو آپ اسے بالکل اجازت نہیں دے رہی تھیں' اوپر والے کمرے میں جانے کی پھر اب..."

ان دونوں کا بیڈ روم اوپر تھا۔ اس کے اسلام آباد جانے کے بعد امی نے انگبین کو پیشکش کی تھی کہ وہ ان کے کمرے کے ساتھ والے روم میں شفٹ ہو جائے' لیکن اسے اپنا بیڈ روم پسند تھا' خصوصاً" اس کے آگے بنی مغلیہ طرز کی بالکونی اور اس بالکونی تک آتی جامن اور سنبل کے پیڑوں کی گھنی شاخیں اور پھر جب وہ پریگننٹ ہوئی تو امی نے سختی سے اسے اوپر جانے سے منع کر دیا۔ اس کی ضرورت کی چیدہ چیدہ اشیاء ساتھ والے کمرے میں سیٹ کیں اور بلا ضرورت اس کا سیڑھیاں چڑھنا بند کروا دیا گیا۔

"بس ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ جس دن اچھی دھوپ نکلتی اوپر والی بالکونی میں بیٹھنے کو مچل جاتی۔ اکثر میں ساتھ ہی اوپر چلی جایا کرتی لیکن آج صبح خیر سے بہو کے میکے والے اس کی خبر گیری کو آ گئے' ساتھ میں ایک اچھی خبر بھی لائے' میرو کا رشتہ خاندان میں ہی کہیں طے ہو گیا تھا۔ ہم اچھے بھلے بیٹھے یہ بات کر رہے تھے

کہ بینا خیریت کے ساتھ فارغ ہو تو میرو کی تاریخ مقرر کی جائے کہ اچانک بینا چکرا کے گر پڑی' رنگ پیلا پھٹک' ہاتھ پیر بے جان۔۔۔ اس کے بھائی نے فوراً" بی پی چیک کیا۔ خاصا ہائی تھا۔ ذرا حواسوں میں آئی تو بس ایک ہی تکرار۔۔۔ کہ اوپر جانا ہے' اپنے کمرے میں جانا ہے۔ ہماری غلطی کہ اسے صحیح طرح سے تھامنے کے بجائے بس سہارا دے رکھا تھا۔ پتہ تب لگا جب کسی بے جان چیز کی طرح وہ ہم دونوں کے درمیان کھڑی کھڑی پیٹ سے نیچے گری اور لڑھکتی گئی۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے وہیں بیٹھ گیا۔ انگبین کے بھائی نے اس کے کاندھے پر تشفی بھرا ہاتھ دراز کیا۔

"ہم لوگ فوراً" اسے ایمرجنسی میں لے آئے۔ ڈاکٹر خود حیران ہے کہ انگبین کا بی پی اتنا شوٹ کیسے کر گیا۔ ابھی پرسوں تمہاری امی ہفتہ وار چیک اپ کروا کے لائی ہیں۔" ابو نے معلومات میں اضافہ کیا۔

اور جس وقت وہ آئی سی یو میں انگبین کو دیکھنے کی نیت سے جا رہا تھا تو مدھم آواز میں ایک اور حقیقت سے آگاہ کیا۔

"ڈاکٹرز کو برین ہیمبرج کا خطرہ ہے' کیونکہ بی پی کم نہیں ہو رہا' اسی لیے وہ آپریشن کرنے سے بھی کترا رہے ہیں ورنہ انگبین کی بگڑتی حالت اور حد سے زیادہ انیمک ہونے کی وجہ سے بچے کی زندگی کو سخت خطرہ لاحق ہے۔ ڈاکٹر تابندہ کے مطابق اگر اور آدھ ایک گھنٹے تک صورت حال نارمل نہ ہوئی تو وہ آخری حل کے طور پر آپریشن کے ذریعے بچے کو بچانے کی کوشش کریں گی۔"

آدھے گھنٹے سے پہلے ہی ڈاکٹر نے ایمرجنسی کے طور پر اس سے آپریشن کے کاغذات پر سائن کروا لیے۔ کپکپاتی انگلیوں کے ساتھ اس نے اجازت نامہ پر رضامندی تحریر کی۔ بہت سی دعاؤں اور منتوں کے حصار میں انگبین آپریشن تھیٹر تک گئی اور وہ دو گھنٹے۔۔۔ طویل دو گھنٹے۔۔۔ دو صدیوں سے بھاری گزرے ان سب پر۔

"مبارک ہو بیٹی ہوئی ہے اور خدا کا شکر ادا کیجئے کہ بالکل معجزاتی طور پر بچی کی ماں کو بھی زندہ بچا لیا گیا ہے ورنہ چانسز تو تقریباً" نہ ہونے کے برابر تھے۔"

ڈاکٹر تابندہ کے کہے الفاظ ان سب میں زندگی کی نئی رمق دوڑا گئے۔ عارب کی امی' انگبین کی امی دونوں سجدۂ شکر میں چلی گئیں۔

آپریشن روم سے آئی سی یو میں منتقل کرتے ہوئے آکسیجن ماسک اور ڈھیر ساری پائپ سے ڈھکے اس کے نڈھال چہرے کو دیکھ کر عارب کے سینے پر ایک گھونسہ سا پڑا۔ اگرچہ اس نے کبھی انگبین کو اس طرح سے نہیں چاہا تھا کہ جیسے کوئی اپنی نئی نویلی من چاہی بیوی کو چاہتا ہو' لیکن اس بے ضرر اور سادہ سی لڑکی سے اسے کوئی گلہ یا شکایت بھی نہیں تھی' بلکہ جب سے ان کے درمیان یہ نیا رشتہ قائم ہوا تھا' وہ اپنے دل میں اس کے لیے گنجائش محسوس کرنے لگا تھا۔ محبوبہ کی حیثیت سے نہ سہی مگر بیوی کی حیثیت۔۔۔ یا پھر اپنے ہونے والے بچے کے لیے۔

اور اس وقت اسے یوں موت کے شکنجے میں جاتے دیکھ کر اور زندگی کے لیے ایڑیاں رگڑتے دیکھ کر اسے بڑا عجیب سا محسوس ہوا' جیسے ان سب حالات کا ذمہ دار وہ خود ہو۔

"میری وجہ سے۔۔۔ میرے لیے۔۔۔ صرف میرے لیے۔۔۔ میرے بچے کو دنیا میں لانے کے لیے وہ اتنا سب کچھ کر رہی ہے۔ آج اس کی جان پر بن گئی' وہ موت سے لڑ رہی ہے۔ صرف اور صرف میری نسل کو قائم رکھنے کے لیے۔ یہ ہے ہمارا رشتہ' دنیا کی سب سے بڑی حقیقت اور میں اس حقیقت کو جھٹلائے' خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں بھٹکتا رہا لیکن اب۔۔۔ اب میں اس رشتے کو پوری صداقت کے ساتھ نبھاؤں گا۔" اس نے خود سے عہد کیا۔

اپنے اس بچے کو جس نے ابھی چند ہی منٹ پہلے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی' بن ماں کے دیکھنے کا تصور ہی اسے ہولا کے رکھ گیا۔

"عارب! میرے بچے! پہلے صدقے کی دیگیں یتیم

خانے میں بھجواؤ۔" امی نے فوراً" پرس سے ہزار ہزار کے چند نوٹ نکالے' فوراً جذبات سے ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"امی! بس کچھ دیر تک جاتا ہوں' ذرا انگبین کو۔۔۔"

"نہ بیٹا! منت پوری کرنے میں تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اللہ سوہنے نے بھی تو ہماری دعائیں فوراً" قبول کی ہیں' پھر ہم اس کا شکرانہ ادا کرنے میں دیر کیوں کریں۔"

پکی پکائی دیگیں تیار ملتی تھیں۔ خرید کر یتیم خانے پہنچایا اور سیدھا ہاسپٹل پہنچا۔ کوریڈور میں اپنی ساس کو بین کرتے دیکھ کر اور احمریں کو اسے سنبھالنے کی کوشش میں بے دم ہوتے دیکھ کے اس کے پیر وہیں برف بن گئے۔ سہمی ہوئی نظروں سے اس نے امی کی طرف دیکھا' وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی تھیں۔ ابو نے آگے بڑھ کے اسے سہارا دیا۔

"ابو جی! کب؟ کیسے۔" وہ بڑی دقت سے وہ یہ چند الفاظ ادا کر پایا۔

"بس ابھی ہی' چند منٹ پہلے۔ میں تمہارا موبائل نمبر ملا ہی رہا تھا۔" ان کا لہجہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔

"لیکن ڈاکٹرز تو کہہ رہے تھے کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں' ایسے کچھ دیر میں ہوش آ جائے گا۔" وہ یکایک احتجاجاً" چلا اٹھا۔

"ہاں' اور اسے ہوش آیا بھی تھا۔"

وہ چونک کے انہیں دیکھنے لگا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہوش میں آنے کے فوراً" بعد اس نے ہم سب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور تم سے بھی۔۔۔"

"مجھ سے اور میں۔۔۔ اف۔۔۔ میں نے کہا بھی تھا کہ۔" اسے پچھتاووں نے گھیر لیا۔ "نجانے وہ آخری وقت میں مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھی۔"

"کچھ دیر تک وہ اندر اپنی ماں' بہن اور تمہاری امی سے خاصی بہتر حالت میں باتیں کرتی رہی پھر اچانک۔۔۔ پتا نہیں کیسے۔۔۔ اتنے کامیاب آپریشن کے بعد۔۔۔ شاید اللہ کو یہی منظور تھا۔" وہ اسے تسلی دیتے رہے اور وہ بے جان قدموں کو گھسیٹتا رسمی کارروائیاں پوری کرتا رہا۔۔۔ آخر اسے اس گھر تک بھی لے کر جانا تھا' جہاں محض چودہ ماہ پہلے اسے ہزاروں ارمانوں کے ساتھ بیاہ کے لایا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔" فجر کی اذان کی آواز اسے خیالوں سے کھینچ لائی۔

"تو۔۔۔ صبح ہو گئی۔" اس نے رات بھر کے تنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ گردن اور شانے اکڑ چکے تھے۔ رات بھر کی جلتی آرائشی لائٹوں نے صبح کی اولین ساعتوں کے ملگجے سے اجالے کو بھی روشن کر رکھا تھا۔

لان میں رات کی دعوت کی تمام باقیات نمایاں تھیں۔ کچھ ترتیب سے اور کچھ بے ترتیبی سے ایک دوسرے کے اوپر دھری چیئرز' ایک طرف رول کر کے رکھے شامیانے' گھاس پر جا بجا بکھرے استعمال شدہ ٹشو پیپرز' ہڈیاں' کولڈ ڈرنکس کی خالی بوتلیں۔۔۔ کل کی اتنی توجہ اور محنت سے کی گئی سجاوٹ تہس نہس ہو چکی تھی۔

"بالکل میرے دل کی طرح۔"

اس نے سرگوشی کی' فلاور ارینجمنٹ۔۔۔ جس پر اس نے بڑے چاؤ سے ہزاروں روپے لٹائے تھے۔

اسے ایک بار پھر اپنی وہ ساری وارفتگیاں' بے تابیاں یاد آنے لگیں جو اس شادی کے لیے اس سے سرزد ہوئیں' انگبین کی موت نے اسے حقیقتاً" دکھ پہنچایا تھا اور اس کی وفات کے محض چند دن بعد بھی امی کی یہ بات سن کر اسے دھچکا لگا تھا۔

"بینا نے مرنے سے پہلے ایک بڑی عجیب سی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ شاید وہ جانتی تھی کہ اس کا وقت تمام ہو چکا ہے۔"

وہ سوچنے لگا کہ انگبین کی آخری خواہش کیا ہو سکتی ہے۔

"وہ چاہتی تھی کہ اس کی بچی کسی غیر عورت کے

بجائے اپنی سگی خالہ کی گود میں پرورش پائے۔ کسی دوسری عورت کی بجائے احمریں اسے حقیقی محبت اور شفقت دے سکے گی۔" امی نے آہستہ سے بتایا۔

"لیکن امی! یہ کیسے ممکن ہے' احمریں کی بات طے ہو چکی ہے۔ وہ اور کتنا عرصہ یہ ذمہ داری نبھائے گی۔ نہ تو اس کا عمر بھر غیر شادی شدہ رہ کر بہن کی اولاد پالنے کا ایثار مجھے گوارا ہے اور نہ یہ مجھے منظور ہوگا کہ میری بیٹی کسی غیر کے گھر پلے۔ سگی خالہ کے ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

وہ بری طرح الجھ گیا تھا' امی نے گہری سانس بھری جیسے اسے کچھ سمجھانے میں ناکام رہی ہوں۔

"اس کا حل بھی بینا نے خود ہی تجویز کر دیا تھا اور وہ ہے احمریں کی تمہارے ساتھ شادی۔" اب کے انہوں نے صاف الفاظ میں باور کرایا' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں اور ادھ کھلے لبوں کے ساتھ انہیں دیکھ کے رہ گیا' دل نے پھیل کر سکڑنے سے انکار کر دیا تھا۔

"اور شاید یہی حل بہترین ہے اور قابل عمل بھی۔" انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا کہ شاید وہ کچھ بولے۔

"اس وقت وہاں میرے علاوہ بینا کی ماں اور خود احمریں بھی موجود تھی۔ بینا نے ان کے ہاتھ تھام کے وعدہ لیا تھا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ دسویں کے بعد تمہارے ابو کے ساتھ جا کر باقاعدہ بات کروں' پتا چلے کہ ان کے ارادے کیا ہیں۔"

"ارادے۔" وہ بڑبڑایا۔ "مگر آپ تو کہہ رہی تھیں کہ بینا نے ان سے وعدہ۔۔۔"

"ہاں وہ تو ہے لیکن سوچتی ہوں کہ کہیں مرتی ہوئی بیٹی کے قول سے زیادہ اہم زندہ بیٹی کے ارمان نہ ہو جائیں۔"

"ارمان۔" وہ چونکا۔ "ہاں واقعی احمریں کی بھی تو کوئی مرضی ہو سکتی ہے' کوئی ارمان ہو سکتے ہیں' کوئی پسند ہو سکتی ہے۔"

اور اس "پسند" والے خیال نے اس کی روح ہی سلب کر لی۔ اس پر انکشاف ہوا کہ خود اذیتی کی حد کرتے کرتے بے شک وہ اپنے دل سے جبراً" یہ اعتراف کراتا رہا ہے کہ اسے اب احمریں سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ اس اتفاقیہ حادثے کی گرفت سے خود کو کب کا آزاد کرا چکا ہے' مگر درحقیقت وہ ابھی تک ان آنکھوں کی سطح پر ہی ہلکورے لے رہا ہے۔

"وہ ماں ہیں' جیسی انگبین کی تھیں' ویسی ہی احمریں کی بھی ہیں۔" امی اس کی خاموشی سے تھک کے پھر سے خود ہی نتائج اخذ کرنے لگیں۔

"پھر خاندان برادری کا بھی سوال ہے' اپنی نند کے بیٹے کے لیے "ہاں" کر چکی ہیں وہ۔۔۔ کہیں بات سے پھرنے کی وجہ سے مسئلے نہ پیدا ہو جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ احمریں کو اعتراض ہو تم سے شادی کرنے میں۔" اس صاف مگر سفاک سے بھرے پر اس نے تڑپ کے انہیں دیکھا۔

مگر ہوا یہ کہ ان کے تمام تر خدشے اور عارب کے وسوسے بے نام و بے معنی رہے۔ ان کے کہنے سے قبل ہی انگبین کی والدہ نے از خود یہ تذکرہ چھیڑ دیا' وہ انگبین کی وفات سے اب تک یہیں تھیں' نہ صرف وہ بلکہ میرو بھی۔

"بہن جی! آپ کو تو یاد ہو گا کہ بینا جاتے جاتے ہمیں کیا ذمہ داری سونپ گئی ہے۔"

"وہ کوئی بھولنے والی بات ہے' میں تو خود اس دن سے بس اسی کے بارے میں سوچتی رہی ہوں کہ وہ ہمیں کس امتحان میں ڈال گئی ہے۔"

"پہلے مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا' لیکن اب میں نے ٹھنڈے دماغ سے سوچا تو مجھے اس میں صرف اس بچی کی نہیں' بلکہ ہم سب کی بھلائی نظر آئی ہے۔ وہ بچی جو پیدا ہوتے ہی ماں کی گود سے محروم ہو گئی ہو' اس کے لیے سوتیلی ماں۔۔۔ نہ میں وہاں سکون سے رہ سکتی تھی' نہ ہی آپ لوگ مطمئن ہوتے لیکن میرو۔۔۔ وہ بہن کی اولاد کو سینے سے لگا کے رکھے گی۔"

"یہ تو آپ درست کہہ رہی ہیں۔ آپ اس کی بات اپنی نند کے بیٹے سے طے کر چکی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس فیصلے سے آپ کے خاندان میں کوئی تنازعہ پیدا

ہو جائے یا پھر احمریں ہی اس کے لیے رضامند نہ ہو۔"

"خاندان کی مجھے پروا نہیں، میرے لیے زیادہ اہمیت میری مرتی ہوئی بچی کی آخری خواہش کی ہے اور اس سے بھی بڑھ کے اپنی نواسی کی خوشیاں اور رہا میرو کی مرضی کا سوال تو اس سے میں پوچھ چکی ہوں۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر میں مطمئن ہوں۔ ویسے تو عارب سے بھی میری بات ہو چکی ہے، یوں تو وہ دوسری شادی کے بارے میں سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے مطمئن کرنے کے لیے قسم تک اٹھانے پر تیار تھا کہ وہ زندگی بھر دوسری شادی کا سوچے گا بھی نہیں، لیکن جب میں نے اسے بینا کی آخری خواہش کے بارے میں بتایا تو ذرا نرم پڑا لیکن مشروط طور پر...... کہ اگر آپ لوگ مکمل رضامندی اور احمریں کی خوشی سے اس پر تیار ہوں تو ٹھیک ہے۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ چالیسویں کے بعد باقاعدہ بات کریں گے لیکن تب تک کے لیے...... دراصل میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ کل دسویں کے بعد ہم واپس جا رہے ہیں تو اگر آپ کی اجازت ہو تو بچی کو ہم ساتھ لے جائیں۔" انہوں نے جھجکتے ہوئے مدعا بیان کیا۔

"لیکن......" وہ ماننے میں متامل تھیں۔ ایک عرصے بعد اس آنگن میں کسی ننھے بچے کی آواز گونجی تھی، ان کا حوصلہ نہ رہا تھا اسے خود سے جدا کرنے کا۔

"دیکھیے، ایک تو آپ اور ہم اب عمر کے اس دور میں ہیں، جب پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں گود میں کھلانے کی آرزو تو بہت ہوتی ہے مگر ہمت نہیں۔ اتنے چھوٹے بچے کی ذمہ داری بہت ہوتی ہے۔ آپ ہلکان ہو کے رہ جائیں گی، اور ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ میں چاہتی ہوں میرو اور بچی دونوں ایک دوسرے کی عادت بن جائیں۔ وہ تو ابھی سے میرو کی گود پہچاننے لگی ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" دل کو ذرا سی تسلی ہوئی کہ آخر ان کا خون لوٹ کے تو ان کے پاس آنے والا ہے۔ اور یوں وہ جاتے جاتے تتلی کو ساتھ لے گئے۔

اسے تتلی نام بھی احمریں نے ہی دیا تھا۔ تھی بھی اتنی چھوٹی اور نازک سی، گلابی گلابی روئی کے گالوں جیسی گڑیا۔

دو ماہ کیسے گزرے پتا ہی نہ چلا۔ امی نے اسے "فوراً" ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آنے کو کہا تو اسے اندازہ ہوا کہ وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ جسم میں ایک نوعمری والی سنسنی سی پھیل گئی۔ اسے اپنا سادہ سا فلیٹ کسی طرح بھی احمریں کے شایانِ شان نہ لگ رہا تھا۔ فوری طور پر اس نے سارا انٹیریئر چینج کیا۔ ان ڈور پلانٹس، لاؤنج اور بیڈ روم میں رکھوائے۔ لونگ روم میں بھی کئی قیمتی ڈیکوریشن پیسز کا اضافہ کیا۔ وہ اس جگہ اور اس ماحول کو بے حد حسین بنا دینا چاہتا تھا، جہاں رہنے وہ آ رہی تھی۔ حالات اجازت نہ دے رہے تھے ورنہ وہ شادی بھی خوب دھوم دھڑکے اور شان سے کرتا، لیکن اس نے کچھ من مانی تو کر لی۔ اوپر والا بیڈ روم خصوصی توجہ سے آراستہ کیا گیا۔ فلاور ارینجمنٹ اور ڈیکوریشن ماہر سے کروائی گئی۔ احمریں کے لیے اس موتیا رنگ کے قدرے سادہ مگر دلکش عروسی لباس کا انتخاب بھی اس نے خود کیا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اسے اس کی کس قدر "چاہ" ہے اور کس قدر "طلب" تھی......

کتنے خوبصورت الفاظ اس نے ذہن میں مرتب کر رکھے تھے۔ ان آنکھوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اور کتنے جذبے چھپا رکھے تھے اس پر لٹانے کے لیے۔

مگر ابھی تو اس نے اپنے دل کی شدتیں پوری طرح اس پر ظاہر بھی نہ کی تھیں کہ اس کے دل کا حال مکمل طور پر منکشف ہو گیا۔ وہ نہ صرف اس سے گریزاں تھی، بلکہ نالاں اور شاکی بھی۔

وہ ساری رات یہ سوچ سوچ کر تھکتا رہا کہ آخر اس کڑواہٹ کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

بہت سوچنے کے بعد دل و دماغ بس اسی ایک نقطے پر متفق ہوئے کہ وہ صرف بحالتِ مجبوری اپنے خاندان کے دباؤ کے زیرِ اثر یا پھر بہن کی آخری خواہش کے احترام میں اس شادی کے لیے تیار ہوئی ہے۔

☆ ☆ ☆

اذان ختم ہوتے ہی اسے احساس ہوا کہ اب گھر میں نماز کے لیے بیداری شروع ہو چکی ہو گی۔ "سب سے پہلے تو ابو مسجد جانے کے لیے نکلیں گے اور مجھے یہاں...... اس طرح...... دیکھ کے نجانے کیا سوچیں۔" ناچار اپنے قدموں کا رخ اسے اندر کی جانب موڑنا پڑا۔

اپنے کمرے کے دروازے کے آگے وہ رک کر سوچنے لگا کہ اسے دستک دینی چاہیے یا ہینڈل موڑ کر اندر چلے جانا چاہیے۔

"نہ جانے وہ سو رہی ہو گی یا......"

یہ سوچ کر اس نے "احتیاطاً" ہلکی سی دستک دی۔ کوئی جواب نہ پا کر آرام سے دروازہ کھولا تو وہ بیڈ سے اٹھ ہی رہی تھی۔ اسے اندر آتا دیکھ کر پھر سے بڑی احتیاط کے ساتھ بیٹھ گئی اور اپنے پہلو میں لیٹی تتلی کو تھپکنے لگی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر احمریں نے پلٹ کر لبوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموشی کا اشارہ دیا۔ عارب کو لگا جیسے اس لمحے...... ان کے درمیان کوئی اجنبیت، کوئی بے گانگی نہ ہو اور تتلی کے ننھے سے وجود نے انہیں کسی ریشمی ڈور سے باندھ دیا ہو۔

احمریں کے ایک اپنائیت بھرے اظہار نے رات کے تلخ رویے کی ساری بدمزگی زائل کر دی۔ وہ واقعی سب کچھ بھول گیا۔ دبے پاؤں اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

پتا نہیں کب وہ تتلی کو یہاں لے کر آئی اور پتا نہیں کب اس نے اپنا عروسی لباس تبدیل کیا تھا۔ بلیک اینڈ وائٹ پرنٹ کے ڈھیلے ڈھالے کاٹن کے کرتا شلوار اور اس پر سفید دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ رات کے میک اپ کا چہرے پر ہلکا سا نشان بھی باقی نہ تھا، ماسوائے بالوں کی سیدھی مانگ میں چمکتے افشاں کے ذرات کے۔ بال ایک ڈھیلے سے جوڑے میں قید تھے پھر شاید اس کی گہری نیند سے مطمئن ہوتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ قریب کھڑے عارب پر ایک نظر ڈالے بغیر وہ سیدھی ڈریسنگ روم تک چلی گئی اور دیوار گیر الماریوں کے پٹ کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔

"یہ لو۔" عارب نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی نچلی دراز سے جائے نماز نکال کر اس کے آگے کی۔

"یہ ہی ڈھونڈ رہی تھیں تم!"

"شکریہ۔"

"شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے احمریں!" اس نے ان دیکھی دیوار گرانے کی نیت سے پہلا قدم اٹھایا۔

"یہ تمہاری شادی کی پہلی رات تھی، اس گھر میں نئے رشتے کے ساتھ پہلی رات اور اس میں بھی تم اپنے فرض سے غافل نہیں رہیں۔ اس محبت کے بدلے میں محبت کے سوا اور کیا دیا جا سکتا ہے۔ میں تم سے عہد کرتا ہوں احمریں...... کہ آج سے...... ابھی سے...... میرے تمام......"

"پلیز۔" اس نے ہاتھ اٹھا کے اسے مزید کچھ کہنے سے باز رہنے کا اشارہ دیا۔ لہجے میں حد درجہ بیزاری اور تنفر تھا۔

"پلیز...... آپ اپنے تمام عہد اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھیے۔ میں یہاں آپ سے عہد و پیماں باندھنے نہیں آئی۔ جس فرض کو ادا کرنے کی نیت سے آئی ہوں، اس کے لئے نہ مجھے شکریہ کی ضرورت ہے نہ ہی "کسی" اور چیز کی حاجت۔" اس نے چبا چبا کر کہا۔

عارب کا دل بجھ گیا۔

"اور ویسے بھی تتلی کے معاملے میں، میں کسی پر کوئی احسان نہیں کر رہی۔ سگی بہن کی اولاد ہے وہ...... آپ مجھ سے یہ نیا رشتہ نہ بھی جوڑتے تب بھی میرا اور اس کا تعلق کمزور نہیں تھا۔"

"میں مانتا ہوں مگر میرا کہنے کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ اتنی اعلا ظرفی کا ثبوت تو کوئی کوئی دے سکتا ہے۔" اس نے احمریں کا دل موم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ "آخر دلہن کے روپ میں ماں بننا کم آسان تو نہیں۔"

"اور آپ...... آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال

ہے؟" اس نے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے چبھتی ہوئی نظروں کے ساتھ سوال کیا۔

"اگر آپ میری جگہ ہوتے' یعنی آپ کی شادی ایک بچی کی ماں سے ہوتی اور وہ دلہن کے روپ میں شادی کی پہلی رات اپنی بچی کو تھپکنے میں گزار دیتی تو کیا آپ تب بھی اسی طرح اس کی حوصلہ افزائی کر رہے ہوتے۔"

بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دینے پر عارب کی پیشانی شکنوں سے پُر ہو گئی جسے احمریں نے کچھ اور سمجھا۔

"دیکھا' اس بات کا تصور کرنا بھی آپ کو کس قدر ناگوار لگ رہا ہے۔"

"ایک منٹ..... ایک منٹ احمریں!" وہ غصے سے کھول کر رہ گیا۔ صلح جو اور شانت رہنے کے سارے ارادے ڈھے گئے۔

"تم نے بھی تتلی کی ماں بن کے کوئی احسان نہیں کیا۔ اگر تم اس کی سگی خالہ نہ ہوتیں صرف سوتیلی ماں ہوتیں تو کیا تب تمہیں شادی کی پہلی رات اس کمرے میں اس کا وجود گوارا ہوتا' نہیں' کبھی نہیں۔"

وہ ششدر کھڑی دیکھتی رہی اور وہ اس کے قریب سے گزرتا واش روم میں گھس گیا۔ واش روم کے دروازے نے دھڑ سے بند ہو کر اسے چونکا دیا۔ تتلی بھی اس اچانک دھماکے سے ڈر کے بیدار ہو گئی اور چلا چلا کے رونے لگی۔

☆ ☆ ☆

وہ خاموشی سے اسے مختصر سے بیگ میں پیکنگ کرتے دیکھ رہا تھا۔ امی ابھی کچھ دیر پہلے ہی تتلی کو اپنے کمرے میں لے کر گئی تھیں۔ عارب نے ایک بار پھر اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔

"احمریں! کیوں تماشا بنوا رہی ہو' ذرا سی بات کا۔"

"میں آپ کے ساتھ اسلام آباد نہیں جاؤں گی' ہرگز نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے' جس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔"

"یہی ہٹ دھرمی تم تب بھی دکھا سکتی تھیں' جب تمہاری شادی میرے ساتھ کی جا رہی تھی۔"

"آپ بار بار مجھے یہ طعنہ مت دیجئے۔" اس نے ایکدم سے گھوم کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور..... اور..... وہ وہیں مسحور ہو گیا۔

"میں آپ کو کیسے یہ یقین دلاؤں کہ یہ شادی نہ تو زبردستی ہوئی ہے اور نہ ہی کسی نے مجھے مجبور کیا ہے۔ ہاں جبکہ یہ حقیقت ہے کہ اس شادی کے لیے میری رضامندی کی ایک بڑی وجہ تتلی ہے۔ آپ بھی یہ مت بھولیے کہ میں یہاں تتلی کی ماں بن کے آئی ہوں' آپ کی بیوی نہیں۔ مجھے اسی کے لیے رہنے دیجئے' نہ مجھ پر کوئی حق جتائیے اور نہ ہی میں کسی حق کو تسلیم کروں گی۔"

اس نے ہزار کوشش کی..... لہجہ پتھر کرنے کی..... مگر آخر میں الفاظ ٹھہر ہی گئے۔ عارب اب تک اس کی آنکھوں میں ہی کھویا ہوا تھا' جو ایک بار اس پر قہر برسانے کے بعد اب رخ پھیرے آنسو برسا رہی تھیں۔

کیسے اتروں پار
بادل بادل تیری آنکھیں
دریا دریا خواب
کیسے اتروں پار

اس کی مدھم گنگناہٹ پر وہ چونک گئی اور ناگواری سے اسے یوں دیکھنے لگی' مبادا اس کا دماغ چل گیا ہو۔ وہ ذرا سا سنبھل گیا۔

"میری بیٹی کی ماں بننے کے لیے تمہیں میری بیوی تو بننا ہی ہو گا۔" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی شوخی کی جسارت کی۔

"مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔" وہ بات کی تہ میں اترے بغیر رکھائی سے کہتی پھر سے بیگ کی سائیڈ پاکٹس چیک کرنے لگی۔

"خیر' یوں تو مت کہو' شوق تو بہت ہے تمہیں میرے "بچوں" کی ماں بننے کا۔" وہ اور کھلا۔

"اس کے لیے تمہیں میرا حق بھی تسلیم کرنا پڑے گا اور مجھے بھی یہ حق جتانے کی ہمت کرنی پڑے گی۔"

"مجھے دھمکا رہے ہیں آپ! مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"تم کوئی مغویہ نہیں ہو' جسے میں نے حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے اور اسے خوفزدہ کرنے کی نیت سے دھمکیاں دے رہا ہوں۔ منکوحہ ہو میری..... منکوحہ..... جائز' شرعی بیوی۔" اس کو کسی طرح نرم نہ پڑتے دیکھ کر عارب کو بھی اپنا مصالحانہ رویہ ترک کرنا پڑا۔

"ہونہہ' جائز..... شرعی..... منکوحہ..... بیوی۔" اس نے چبا چبا کے جتایا۔

"وہ تو میری بہن بھی تھی۔"

"اس کا بیچ میں کیا ذکر۔" وہ حیران ہوا۔

"ذکر تو ہو گا عارب مصطفیٰ!" وہ عجیب طرح سے مسکرائی۔ جیسے اسے چیلنج دے رہی ہو یا خبردار کر رہی ہو۔

"آپ کے سامنے اس کی سگی بہن بیٹھی ہے' اس لیے کہہ رہی ہوں کہ مجھے ساتھ لے جانے کا ارادہ ترک کر دیجئے۔ آپ کو سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔"

شادی کے اس پہلے ہفتے پر ان کی تیسری بار تفصیلی گفتگو تھی جو تلخی پر ختم ہوئی۔

وہ اسے ناپسند کرتی تھی بلکہ شاید نفرت کرتی تھی' اس کا اندازہ تو اس کے ہر عمل سے بخوبی ہوتا تھا لیکن "کیوں؟" یہ وہ جاننا چاہتا تھا۔

جب ان سرمئی بادلوں سے آنکھوں میں اپنے لیے خونیں آندھیاں دیکھنا یہ چیز اس کے لیے سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ پہلی رات کو بھی وہ اسی طرح غصے سے کھولتا باہر نکل گیا اور دوسری بار جب شادی کے تیسرے روز وہ دو دن کے لیے اپنے میکے جا رہی تھی تو اس نے سب کچھ بھلا کر پیشکش کی۔

"میں پرسوں تمہیں لینے آ رہا ہوں لیکن اگر تم دو دن کے بجائے وہاں رہنے کا دورانیہ مختصر کرتے ہوئے صرف ایک دن کا پروگرام بنا لو تو میں ابھی تمہارے ساتھ چلا چلتا ہوں۔ ایک رات رہ کر کل واپس چلے آئیں گے۔"

"یہ مہربانی کس سلسلے میں؟" تیوری چڑھا کے پوچھا گیا۔

"مہربانی..... مہربانی کیسی..... بھئی یہ تو رسم ہوتی ہے' جانا پڑتا ہے۔ ہاں دو دن رہنا ذرا مشکل ہے' اس لیے میں نے سوچا جب آنا ہو مجھے بتا دینا' میں آ جاؤں گا۔"

"آپ کیوں زحمت کرتے ہیں' میں آ جاؤں گی۔ ویسے ہی جیسے انگبین آئی تھی۔ آپ اپنے اصول کیوں ترک کر رہے ہیں۔"

عارب کو بہت کچھ یاد آ گیا۔ انگبین بھی مکلاوے کے وقت اکیلی ہی گئی تھی۔ سسرال والوں کے بے حد اصرار اور امی کے سمجھانے بجھانے پر بھی وہ ساتھ جانے کو تیار نہ ہوا تھا۔

"بھئی مجھے اجنبی لوگوں میں رہنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے' اس لیے میری طرف سے تو معذرت۔" اس نے بڑی رکھائی سے ساس کے محبت بھرے اصرار کے جواب میں کہا تھا۔

"تو بیٹا! پھر کل آ جانا' ساری برادری اکٹھی ہو گی' یہ تو رسم ہوتی ہے۔ تمہاری غیر موجودگی سو سو سوالوں کو جنم دے گی۔ ہم کس کس کو مطمئن کرتے پھریں گے۔"

"ہاں ہاں' ضرور آئے گا۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔" اس کے برے برے منہ بنانے کی پروا نہ کرتے ہوئے امی نے جلدی سے انہیں یقین دہانی کروائی مگر وہ بھی اپنی ضد کا پکا تھا۔ اس روز امی اور ابو کو اکیلے ہی جہلم جانا پڑا۔ وہ امی کی صلواتیں ڈھیٹ بنا سنتا رہا مگر ٹس سے مس نہ ہوا۔

پرانی بات یاد آتے ہی اس کی سمجھ میں احمریں کا طنزیہ لہجہ بھی آ گیا۔ اب وہ اسے کیا سمجھاتا کہ اس وقت اس کے وہاں نہ جانے کی وجہ کیا تھی۔

اس کی خاموشی نے احمریں کو اور بولنے پر اکسایا۔

"سسرال جانا' بیوی کی ذمہ داری اٹھانا' یہ سارے فرائض آپ کو بوجھ لگا کرتے تھے' ایک ناگوار بوجھ..... پھر اب آپ یہ نئے اصول کیوں وضع کر رہے ہیں۔"

اس کی باتوں کا عارب کے پاس بڑا خوبصورت جواب تھا مگر اسے تین دن پہلے اپنے جذبوں کے بے ساختہ اظہار کے جواب میں ملنے والی اس کی "پذیرائی" یاد تھی اس لیے چپ رہا۔

اور اب تیسری بار بھی یہ بحث لاحاصل ہی جارہی تھی۔ اس بار بھی احمریں کے چند فقرے عارب کو تپا کے رکھ گئے۔ وہ اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ ہلکی سی دستک کے ساتھ امی اندر داخل ہوئیں۔ احمریں نے فوراً" تتلی کے بارے میں پوچھا۔

"سوگئی ہے شاید پیٹ میں درد تھا اس لیے روئے جارہی تھی۔ گرائپ واٹر پیتے ہی اونگھنے لگی اور تم سناؤ کسی نتیجے پر پہنچی یا وہی فضول کی ضد پکڑ رکھی ہے۔" امی نے پیار سے ڈپٹا۔

"آنٹی یہ فضول ضد نہیں ہے۔ میں وہاں جانا نہیں چاہتی نہ تو میرا وہاں دل لگے گا نہ ہی مجھے وہ شہر پسند ہے۔ میں یہیں رہوں گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی کہ شہر پسند نہیں تمہارے انکل بھی سرکاری نوکری میں تھے۔ ایسے ایسے علاقوں میں حکومت اٹھا کے پھینک دیتی تھی کہ پوچھو ہی مت۔ سخت گرمیوں کے دن ملتان اور جیکب آباد میں گزارے ہیں اور کڑاکے کی سردیاں اسکردو اور ایبٹ آباد میں۔۔۔ ایسے ایسے علاقوں میں بھی رہی ہوں جہاں تانگے پر بیٹھ کے میلوں سفر کرتے ہوئے بدن کی چولیں ہل جاتی تھیں مگر یہی تو ازدواجی زندگی کا حسن ہے۔ سب دکھ سکھ اکٹھے سہنا پڑتے ہیں۔ تمہارے انکل کی اٹھارہ سالہ ملازمت میں نو بار تبادلہ ہوا اور مجھے جانا ہی پڑا۔ تمہارا شوہر وہاں ہے اس لحاظ سے تمہاری گرہستی بھی وہاں ہوگی۔ یہاں رہ کے کیا کروگی۔"

"وہی جو انگبین کرتی تھی۔" وہ درست کہہ رہی تھی ہر بات میں اپنی بہن کا حوالہ دینا۔۔۔ اس کی عادت بنتا جارہا تھا۔

"وہ بھی تو ان کے ساتھ اسلام آباد رہنے کے بجائے یہیں آپ کے ساتھ رہتی تھی۔"

"اس کی بات اور تھی۔" امی نے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے بات اچک لی۔

"اس کی بات اور۔۔۔ اور میری بات اور کیسے۔۔۔ جب یہ اسے ساتھ نہیں لے کر گئے تو مجھے ساتھ لے جانے پر اصرار کیوں اور اگر آپ انگبین کو اپنے ساتھ رکھ سکتی تھیں تو مجھے کیوں نہیں۔" اس کے بحث بڑھائے چلے جانے پر انہیں ذرا سی ناگواری محسوس ہوئی لیکن بظاہر اس کا دل بہلاتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

"میں کیوں تم دونوں میں فرق برتنے لگی تم تو اسی کا پرتو ہو۔ مسئلہ یہ نہیں کہ میں تمہیں ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم شوہر کا گھر ہوتے ہوئے یہاں کیوں رہو بیٹا کے ساتھ تو۔۔۔"

"وہی تو میں جاننا چاہتی ہوں کہ آخر وہ بھی تو یہاں رہی ہے اس کے ساتھ نہ جانے کی وجہ کیا تھی۔" وہ نجانے کیا سننا چاہتی تھی۔ امی فوراً"۔۔۔ کہہ دینا چاہتی تھیں کہ اس کے نہ جانے کی وجہ بھی اس کی ضد تھی جو اس وقت تم لیے بیٹھی ہو مگر مصلحتاً" اصل بات چھپا لینا مناسب جانا تاکہ احمریں اپنی ضد میں اور پکی نہ ہوجائے۔ اصل میں وہ اب بہو کو ساتھ رکھنے پر قطعاً" تیار نہ تھیں۔ انگبین کی بار تو انہوں نے مجبوراً" اس کی مرضی اس لیے چلنے دی کہ خود عارب اسے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ دوسرے ان کا مزاج احمریں سے میل نہیں کھا رہا تھا۔ جب سے وہ ان کی بہو بنی تھی اس کے تیور انہیں اکھڑے اکھڑے لگ رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس کے یہاں رہنے سے ساس بہو کے تعلقات میں کوئی بگاڑ پیدا ہو جہاں تک تتلی کا تعلق تھا اس کے بارے میں وہ مطمئن تھیں۔ احمریں بالکل ماں کی طرح اس کی دیکھ بھال کرتی تھی اس کی تکلیف اور بھوک پر بے چین ہوجایا کرتی۔

"آپ نے بتایا نہیں کہ اس کے ساتھ نہ جانے کی وجہ کیا تھی؟" احمریں نے سوال ان سے کیا لیکن سوالیہ نگاہیں عارب پر جمی تھیں۔

"دراصل ان دنوں عارب کی مجبوری تھی اسے فلیٹ نہیں مل رہا تھا اس لیے اس نے خود منع کردیا۔"

"خود منع کردیا۔" اس نے پُرسوچ انداز میں دہرایا۔

"لیکن اب فلیٹ بھی مل چکا ہے' سب کچھ سیٹ کر کے رکھا ہے اس نے پھر تم کیوں انکار کر رہی ہو۔" امی شاید اور بھی کچھ حربے آزماتیں اسے منانے کے لیے' لیکن تتلی کی آواز پر لپک کے اٹھیں۔ احمرین بھی ساتھ ہی کھڑی ہوئی۔

"آپ بیٹھیں آنٹی! میں دیکھتی ہوں۔ بھوک لگی ہوگی' فیڈر بنانا ہے۔"

"نہیں' تم بیٹھو۔ آتا ہے مجھے فیڈر بنانا اور ویسے بھی کچھ دن تو مجھے پوتی کے لاڈ اٹھا لینے دو' آخر مجھے بھی تو لگے کہ میں دادی بن گئی ہوں۔ کل تو تم دونوں اسے لے جانے والے ہی ہو۔" انہوں نے دانستہ جتایا' وہ کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

"احمرین! پلیز ایک بار پھر سوچ لو۔" امی کے باہر نکلتے ہی عارب نے منت بھرے انداز میں اسے رضامند کرنا چاہا' اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ اسے یوں کسی کے آگے گڑگڑانا پڑے گا مگر عشق..... عشق کیا کچھ کروا جاتا ہے انسان سے۔

"تم نہیں جانتیں مجھے اس دن کا کتنا انتظار تھا' کتنی دعائیں کی تھیں میں نے کہ تم ایک بار وہاں قدم رکھ دو' وہ گھر ہے احمرین! جس میں تم قدم رکھو گی تو وہ جنت بن جائے گا' میری جنت..... تم ایک بار وہاں آ کے دیکھو تو سہی' میرے عشق کی شدتوں پر از خود ایمان لے آؤ گی۔ وہاں کا چپہ چپہ میں نے تمہارے لیے سنوارا ہے' بالکل ویسے..... جیسے میرے دل کا چپہ چپہ تمہارے.....۔"

"بس کیجئے' اللہ کے لیے بس کیجئے۔" جو وہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کے سسک پڑی۔ عارب کے لیے اس کا ردِ عمل ناقابل فہم بھی تھا اور غیر متوقع بھی۔

"احمرین! کیا ہوا..... کیا کہہ دیا میں نے۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ کبھی مت بھولیے گا کہ میں انگبین کی بہن ہوں' سوکن نہیں۔ میں کیسے آپ کے اس ارمانوں سے سجے گھر میں قدم رکھوں جہاں قدم رکھنے کی اجازت میری بہن کو نہ مل سکی۔

میں کیوں آپ کے لیے جنت سجاؤں جبکہ آپ نے میری بہن کے لیے دوزخ دہکا رکھی تھی۔"

"میں نے' احمرین میں نے۔" وہ ہکا بکا رہ گیا' انگبین سے ہزار کوشش کے باوجود وہ محبت نہیں کر سکا تھا' بس اتنی کمی رہ گئی تھی ورنہ اس نے اس بے ضرر لڑکی کے تمام حقوق ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ خود اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوتی تو شاید وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات مان لیتا کہ بہرحال یہ اس کا حق تھا۔

"ہاں آپ نے' اتنا انجان بننے کی ضرورت نہیں' آپ نے اس کی ہر خواہش کو پامال کیا' اس کا ہر حق غصب کیا۔"

"یہ سب تم سے کس نے کہا؟"

"اس کے آنسوؤں نے' جب جب میں نے اس کے آنسوؤں کا سبب جاننا چاہا' وہ ٹال گئی لیکن دیکھ لیجئے۔ ابھی آنٹی نے خود اعتراف کیا ہے کہ اسے آپ کے ساتھ جانے کی کتنی خواہش تھی لیکن آپ اسے اپنے ساتھ رکھنے پر تیار نہیں تھے اور آپ تیار ہوتے بھی کیوں؟؟"

"تم غلط سمجھ رہی ہو' اصل بات یہ نہیں ہے بلکہ.....۔" اس نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"بس کیجئے' کتنے پردے ڈالیں گے آپ اپنی مکروہ شخصیت پر۔"

"بکواس بند کرو احمرین!" یہ طعنہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ "اپنے خود ساختہ مفروضوں میں الجھ کر تم میرا نقطۂ نظر سننے پر تیار ہی نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اسے کیا غم تھا' غم تھا بھی یا نہیں۔ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ.....۔"

"کہ وہ جلد از جلد مر جائے' ہے ناں..... تاکہ آپ کا رستہ صاف ہو۔"

"احمرین! تم..... تم میرے بارے میں اتنی غلط سوچ رکھتی ہو۔" وہ دکھ کے مارے ڈھے گیا۔ "اتنی بدگمان ہو مجھ سے' میرا یقین کرو' یہ جو تم کہہ رہی ہو' میں نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں تمہیں چاہتا ہوں اور بہت پہلے سے چاہتا آ رہا ہوں لیکن میں نے

کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ تمہیں یوں بھی پایا جا سکتا ہے۔"

"جو شخص ایک مقدس رشتے کی پامالی کرتے ہوئے ایک "شجرِ ممنوعہ" کو چاہنے کی جسارت کر سکتا ہے' وہ اس ناجائز چاہت کے حصول کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

وہ سر تھام کے رہ گیا۔

"وہ احمرین! میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں۔ میں جو کہتا ہوں تم اس کا الٹا مطلب نکال لیتی ہو' میں کہوں بھی تو کیا؟" وہ ہار مان گیا۔

اپنا آپ دکھا سکتا تھا
میں بھی آگے جا سکتا تھا
لیکن میں مجبور بہت تھا
اسی لیے تو دور بہت تھا

✲ ✲ ✲

فلیٹ کا لاک کھولتے ہوئے خود بخود اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر کچھ سوچ کے لب سہمے ہوئے انداز میں سکڑ گئے۔ بے دلی سے دروازہ کھولنے کے بعد بھی اس نے قدم آگے نہ بڑھایا۔ دروازے کو وا کرتے ہی اچانک اوپر سے پھولوں کی برسات ہوئی۔ وہ چپ چاپ کھڑا اپنے قدموں سے ذرا آگے گرے پھولوں کو دیکھنے لگا' جو کسی اور کی پذیرائی کرنے کے منتظر تھے۔

یہ سارا اہتمام اس نے فون پر ہدایت دے کر اپنے دوست سے کرایا تھا۔ بیڈ روم کے پنکھے پر بھی پھولوں کی پتیاں رکھوائی تھیں' آن کرتے ہی پھولوں کی پتیاں گرنا شروع ہو جاتیں۔ جب اس کے لاکھ سمجھانے اور امی کی بار بار نصیحت کرنے پر بھی وہ آنے پر رضامند نہ ہوئی تب بھی اس کا دل نہ چاہا' فون کر کے یہ سارے انتظامات نہ کروانے کا کہنے کو۔

"نہ جانے وہ کیا سوچے۔"

یہ خیال آتے ہی وہ رک گیا اور اب بجھے ہوئے دل کے ساتھ کسی دلہن کی طرح سجے فلیٹ کو دیکھنے لگا۔

اس کے بیڈ روم کی تو گویا شان ہی نرالی تھی۔ اس نے احمرین کی دلہن بنی ہوئی انلارج تصویر سامان میں سے نکالی اور سامنے کی دیوار پر آویزاں کر دی۔ گویا دلہن کے ماتھے پر ست رنگا ٹیکا سجا دیا۔

موتیا رنگ کے عروسی لباس میں' ہلکے پھلکے زیورات اور لائٹ سے میک اپ میں بھی وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی وسعت بلیک آئی لائنر کی حد بندی میں اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ لانبی پلکیں اٹھتے اٹھتے جھکی تھیں یا شاید دیر تک جھکے رہنے کے بعد دھیرے سے اٹھ رہی تھیں جب اس کا یہ پوز کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہوا۔ وہ سب کچھ بھلائے اسی دلکش منظر کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔

تایا جان کا اپنی فیملی کے ساتھ اچانک ہی عمرے پر جانے کا پروگرام بن گیا اور انہوں نے اپنے گروپ میں بڑی پھوپھو کے ساتھ ساتھ ابو اور امی کو بھی شامل کر لیا۔ عارب کو کچھ امید بندھی۔ وہ اکیلی وہاں کیسے رہ سکتی تھی۔ اس کی شدت سے خواہش تھی کہ ایک بار وہ یہاں آئے ضرور..... وہ اسے اتنا پیار دے گا' اتنی محبت لٹائے گا کہ وہ اس کے جذبوں پر ایمان لانے پر مجبور ہو جائے گی۔

لیکن اس کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ اپنی امی کے ساتھ جہلم جانے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھی۔ امی الگ پریشان ہوئیں اس کا فیصلہ جان کر۔

"کیا اونگی بونگی ہانک رہی ہو میرو!" وہ اپنی ناگواری چھپا بھی نہ سکیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے عید کا تحفہ
خوبصورت و مقبول ناول
★ میرے خواب ریزہ ریزہ — 300/ ★ لا حاصل — 180/
★ اک دیا جلائے رکھنا — 300/ ★ شہر دل کے دروازے
چاروں ناول ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ فری
• خوبصورت سرورق • خوبصورت چھپائی • مضبوط جلد • آفسٹ پیپر
شائع ہو گئے ہیں
آج ہی قریبی بک اسٹال سے حاصل فرمائیں
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی فون 2216361

"یہ جہنم جانے کی کیا تک ہے بھلا؟"

"یہ کیا بات ہوئی بہن جی! بچیاں کیا میکے نہیں آیا جایا کرتیں۔" عارب کی ساس برا مانتے ہوئے بولیں۔

"ضرور آتی جاتی ہیں مگر بچیاں اپنے شوہروں کے گھر بھی تو بسایا کرتی ہیں۔"

وہ چپ کر گئیں کیا کہتیں... اس معاملے میں بیٹی ان کی ایک سننے پر تیار نہ تھی۔

"آنٹی! میں شادی کے بعد ایک بار بھی وہاں رہنے نہیں گئی۔ امی آئی ہوئی ہیں' اب ان کے ساتھ چلی جاتی ہوں' بعد میں پتا نہیں کب موقع ملے۔ آپ کو تو پتا ہے عارب "سسرال" جانا پسند نہیں کرتے۔" اس نے عارب کو دیکھتے ہوئے بطور خاص یہ جملہ جتا کر کہا۔

"ہفتہ دس دن رہنے کے بعد میں اسلام آباد چلی جاؤں گی۔" اس نے تسلی دی۔ حالانکہ اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر وہ ان کی روانگی والے روز کوئی بدمزگی نہیں چاہتی تھی' اس لیے ان کے اطمینان کے لیے وعدہ کرلیا۔ پتا نہیں انہوں نے یقین کیا یا نہیں مگر مزید اصرار نہ کیا۔

اور وہ جو دل میں جانے کیا کیا سوچ کر آیا تھا کہ اسے منانے کے لیے یہ کہے گا' وہ کہے گا' دل کی دل میں لے کر رہ گیا۔

"تم بہت بری ہو احمریں! بہت بری۔" اس نے چپکے سے گلہ کیا۔ وہ انجان بنی تتلی کو فراک پہناتی رہی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

"اتنی بری ہو کہ تم سے نفرت ہو جانی چاہیے مگر پتا نہیں کیوں یہ نفرت کم بخت ہوتی ہی نہیں۔ اتنی بری ہو تم کہ تم سے محبت کے دعوے سے مکر جانا چاہیے مگر یہ محبت بھی کم بخت مکرتی نہیں۔"

اس کے لہجے میں کچھ تھا کہ تتلی کے مخملیں گالوں پر بے بی لوشن ملتے ہوئے اس کے ہاتھ کپکپا اٹھے۔ اس نے نظر اٹھا کے اپنے نزدیک نیم دراز عارب کو دیکھا۔ صرف اس کا لہجہ ہی شکستہ نہیں تھا' بلکہ وہ پورا کا پورا کھنڈر نظر آرہا تھا۔ احمریں کو اپنے اندر کچھ ٹوٹتا محسوس ہوا۔ کمزور پڑنے کے خوف نے اسے اگلے ہی پل وہاں سے نکلنے پر مجبور کردیا۔

اسلام آباد سے آتے ہوئے اس نے احمریں کے دل سے تمام کدورتیں مٹا لینے کا جو عزم کیا تھا' وہ اس کی مزید بڑھی ہوئی اجنبیت دیکھ کے اپنے دعوے سے دستبردار ہو گیا۔ اسے نہ اپنے جذبوں کی رسوائی منظور تھی' نہ ہی اپنی محبت کی ذلت۔ وہ چپ چاپ اسے جہنم جاتا دیکھتا رہا۔

باری باری سارے گئے
دریا پار اتارے گئے
اک دو اپنے جیسے ہی
اکھڑپن میں مارے گئے

☆ ☆ ☆

وہ یہاں آتو گئی تھی مگر دل سے بے چینی نہ جارہی تھی۔

"کیا میں نے کچھ غلط کیا' اگر نہیں تو پھر یہ اضطراب کس لیے۔ کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھ سے کوئی جرم ہو گیا ہو' جیسے میں نے کسی کا دل توڑ دیا ہو' کیا اس شخص کا دل توڑنا ناجائز نہیں جس نے میری بہن کا دل دکھایا۔"

اس نے بڑھتے ہوئے احساسِ جرم کی پشیمانی کم کرنے کے لیے دلیل دی مگر جواب میں صرف سناٹا تھا' وہ اور گھبرا گئی۔

"تم بہت بری ہو احمریں! بہت بری۔" کسی نے بہت دکھ سے گلہ کیا۔

"ہاں' ہاں میں بری ہوں مگر صرف بروں کے ساتھ۔ تم کون سا اچھے نکلے جس نے نکاح کے بول ادا کرنے کے چند منٹ بعد ہی بددیانتی کا مظاہرہ شروع کردیا۔ کیا میں بھول سکتی ہوں تمہاری وہ پہلی نظریں جنہوں نے خطرے کا الارم تو تب ہی میرے دل میں بجا ڈالا تھا مگر ان کا اصل مفہوم مجھے تب پتا چلا جب شادی کی رات تم نے خود اقرار کیا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو' آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے جب سے تم نے مجھے دیکھا... اف... گھن آتی ہے یہ سوچ کر کہ کوئی

شخص اس قدر مکروہ اور غلیظ ذہنیت والا بھی ہو سکتا ہے کہ پہلو میں دلہن بٹھا کے کسی اور پر نظریں ڈال رہا ہو اور وہ کسی اور بھی کوئی غیر نہیں' اس کی منکوحہ کی سگی بہن۔ شاید انگبین سب جان چکی تھی۔ یہی وجہ تھی اس کے دکھ کی' اسی لیے درد اس کی آنکھوں میں ٹھہرا رہتا تھا۔

کاش ایسا نہ ہوا ہوتا... کاش عارب مصطفیٰ! تم نے یہ سب نہ کیا ہوتا تو مجھے اپنی بہن کو دیا ہوا عہد نبھانے میں کتنی سہولت رہتی۔ امی نے تو کہا تھا کہ اگر میری مرضی نہیں تو وہ کوئی زبردستی نہیں کریں گی مگر میں... میں خود غرضی نہ دکھا سکی۔ تمہیں مجھ سے محبت ہوتی مگر... مگر ایک بیوی کی حیثیت سے... میرے بیوی بننے کے بعد جبکہ تم تو اپنے اس عشق کی داستانیں مجھے سنا رہے تھے جو تمہیں اپنی بیوی کی بہن سے ہوا تھا۔ اس شرمناک تفصیل کو سننے کے بعد میں کیسے تمہیں قبول کرلوں۔"

"کمال ہے میرو! تتلی کب سے روئے جارہی ہے اور تم نجانے کن خیالوں میں مگن ہو۔" امی نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

"سوری امی! مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" وہ نادم ہو کے ان کی گود میں مچلتی تتلی کو لینے لگی۔ وہ کچھ دیر کھڑی اسے تتلی کو ٹہلاتے' چپ کراتے دیکھتی رہیں۔

"پتا نہیں کیوں میرو' مگر مجھے لگتا ہے کہ جیسے کسی عجلت بھرے جذباتی فیصلے نے تمہیں مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ کہیں تم اب اپنے فیصلے پر پچھتا تو نہیں رہی ہو۔"

وہ جو ننھی تتلی کی قلقاریاں دیکھتے ہوئے اپنے پژمردہ ذہن کی تکان اتار رہی تھی' چونک کے رہ گئی۔

"امی! آپ کیسی باتیں کررہی ہیں' میں نے پوری رضامندی کے ساتھ یہ ذمہ داری اٹھائی تھی۔ پچھتانے یا گھبرانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تو پھر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم خوش نہیں ہو' تمہارے چہرے پر خوشی کے وہ رنگ نہیں جو نوبیاہتاؤں کے چہروں پر ہوتے ہیں' تم میں وہ نکھار اور شگفتگی نہیں جو سہاگنوں کا سنگھار ہوتی ہے۔" انہوں نے کریدا۔

"یہ سوال آپ نے کبھی انگبین سے کیوں نہیں کیا امی؟" اس کے سوال پر وہ گڑبڑا گئیں۔

"آپ کو میری ناخوشی نظر آگئی جب کہ وہ... میں آپ سے اکثر کہا کرتی تھی کہ بیٹا بہت بجھی بجھی سی رہنے لگی ہے۔ اس کی آنکھیں ہر وقت روئی روئی سے رہتی ہیں اور آپ ہمیشہ ٹال دیا کرتی تھیں' میرا وہم قرار دے کر۔"

اسی وقت فون کی بیل نے امی کی توجہ بانٹ لی۔

"ہاں بہزاد بیٹا! جیتے رہو۔"

"بس بیٹا! اب تو بالکل ٹھیک ہیں۔ ویسے ہی آدھی بیماری تو بچوں کو دیکھنے سے دور ہو جاتی ہے' تمہارے ماموں بھلے چنگے ہیں' جب سے بیٹی اور نواسی گھر آئی ہوئی ہے۔"

"ہاں ہاں... اپنی میرو... تتلی کہتے ہیں... نہیں اصل نام تو الفت ہے۔ ہاں بھئی مشکل نام میرو کے سوا کون رکھ سکتا ہے۔ ضرور بیٹا! ضرور آؤ' تمہارا اپنا گھر ہے... ہاں ابھی کچھ روز رہے گی... اچھا بیٹا خدا حافظ... آپا کو میرا سلام کہنا... آؤں گی کسی روز۔" مسکراتے ہوئے انہوں نے ریسیور رکھا۔ احمریں استعجاب سے انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

"بہزاد کا فون تھا؟" وہ اثبات میں جواب ملنے پر پھر بولی۔ "پھوپھو کی ناراضی ختم ہو گئی۔"

"ابھی کہاں' بار بار تو وہ مانگنے سے رہیں۔"

"بار بار۔" وہ الجھی۔

"ہاں... بس... وہ..." وہ ٹالنے کے انداز میں بولیں۔

"دیکھو غصہ ان کا بھی بے جا نہیں' مگر انہیں بھی ہماری مجبوری دیکھنا چاہیے۔ اگر تو ہم نے کسی اونچی جگہ کا لالچ کرتے ہوئے بہزاد سے مالی یا تعلیمی لحاظ سے برتر رشتے کو فوقیت دی ہوتی تو ان کا گلہ جائز تھا لیکن ہم نے تو صرف بیٹی کی خواہش کا پاس کیا۔ کوئی اور لڑکی آئی ہوتی تو ہم نواسی کی شکل دیکھنے کو ترس جاتے اور نجانے

کیا سلوک کرتی وہ بن ماں کی بچی سے' کیوں ٹھیک کیا نا۔"

"ہاں مگر یہ سب تو آپ ان سے بہت بار کہہ چکی ہیں' وہ ماننے پر کب تیار تھیں پھر اب یہ بہزاد کا فون... آنا جانا..."

"بہزاد بھلا لڑکا ہے اور تمہیں تو پتا ہے بچپن سے اس گھر میں اس کا آنا جانا ہے' اپنے ماموں سے بہت پیار کرتا ہے۔ اسے کوئی شکایت نہیں' اپنی ماں کو بھی سمجھاتا رہتا ہے' کہہ رہا تھا کہ وقتی غصہ ہے اتر جائے گا۔ تمہارے آنے کا سن کر بہت خوش ہوا' تتلی کو دیکھنے آئے گا' کل یا پرسوں۔" وہ سر ہلا کے رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"کمال ہے یار! کہاں ہیں تمہاری بیگم! تم تو بڑے دعوے کر رہے تھے کہ آغا صاحب آپ کی بیگم کی دھاک' جو پوری بلڈنگ میں پھیلی ہوئی ہے' وہ میری بیگم کے آتے ہی زیرو ہو جائے گی اور یہاں تم اکیلے ہی ہاتھ لٹکائے آ گئے۔ کہاں ہیں تمہاری بیگم اور تمہاری ننھی پری۔" سلمان آغا نے شور مچا دیا۔

"پری نہیں آغا صاحب... تتلی۔"

"ہاں یار! وہی... خیریت تو ہے۔"

"دراصل اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں' میں نے ساتھ لانا مناسب نہیں جانا کہ کہیں آب و ہوا کی تبدیلی سے طبیعت مزید خراب نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ اپنے میکے چلی گئی ہے مگر کچھ دن کے لیے' آ جائے گی جلدی۔"

"طبیعت۔" وہ شرارتاً مسکرائے۔

"کہیں یہ طبیعت کی خرابی وہ تو نہیں جو ڈیڑھ سال پہلے بھی ہوئی تھی۔"

"جی نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ جھینپ گیا۔

"شرما کیوں رہے ہو یار! اگر ایسی بات ہے تو میرا خیال ہے انہیں لے ہی آؤ' کہیں تمہاری والدہ پھر سے ان کی نگہداشت کے بہانے انہیں چند ماہ کے لیے مزید روک لیں اور تم یہاں مجنوں بنے اداس اداس گیت گنگناتے پھرو۔"

وہ اور دوسرے کئی احباب انگبین کی حادثاتی موت اور پھر احمریں کی اس سے دوسری شادی سے انجان تھے۔ بات چھپانے کی بظاہر کوئی خاص وجہ نہیں تھی' جب وہ ابو کے فون پر یہاں سے ایمرجنسی میں روانہ ہوا تو سب ہی جاننے والوں کو خبر تھی کہ اس کی بیوی کے ہاں چند روز میں ولادت متوقع ہے اور جب ان کے فون خیریت دریافت کرنے کے لیے اسے موصول ہونا شروع ہوئے تب تک نہ صرف انگبین کی وفات ہو چکی تھی بلکہ امی اسے احمریں کے حوالے سے نئے رشتے کی بابت آگاہ بھی کر چکی تھیں۔ کچھ سوچ کر اس نے صرف اپنی بیٹی کی ولادت کی خوش خبری سنائی۔ واپس آنے کے بعد سب ہی نے دریافت کیا۔

"بھابھی کہاں ہیں' تم تو کہہ رہے تھے اب وہ یہیں رہیں گی۔"

دراصل وہ بہت پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ بیتی باتوں کو بھلا کر نئے ولولے کے ساتھ خانگی زندگی کا آغاز کرے گا' اس نے ارادہ کر رکھا تھا کہ باپ بننے کے بعد وہ بچے اور بیوی کو لے کر یہاں آئے گا۔ یہ تو قسمت کی بات تھی کہ اسے اپنے ارادے پر اس طرح عمل کرنے کا موقع نہ مل سکا جیسا کہ اس نے سوچ رکھا تھا۔ انگبین بہت کم وقت کے لیے اس کی زندگی میں آئی تھی لیکن اس نے اپنے فیصلے کو جوں کا توں رکھتے ہوئے احمریں کے ساتھ آنے کا خواب آنکھوں میں سجا لیا' اسی لیے سب سوال کرنے والوں کو یہ کہہ کر ٹالا۔

"ابھی کہاں' بچی بہت چھوٹی ہے' ڈیڑھ دو ماہ تک لاؤں گا۔" چالیسویں کے بعد اس کا نکاح مقرر تھا' اس لیے دو ماہ تک کہا اور جب دو ماہ بعد بھی احمریں کے کورے جواب سے اکیلے آنا پڑا تو یہ بہانہ گھڑا۔

"امی نہیں مانتیں کہ اتنی سردی میں اسلام آباد بچی کو لے جایا جائے' ویسے بھی تمہاری بھابھی سے اکیلے بچی سنبھلتی نہیں' ذرا بڑی ہو جائے پھر لاؤں گا۔"

اور اس بار آغا صاحب کے استفسار پر اس نے احمریں کی خراب طبیعت کا بتا کر جو جواب سنا' وہ اسے

بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گیا۔

☆ ☆ ☆

"میرو! تم تو ویسی کی ویسی ہو۔" بہزاد نے اسے دیکھتے ہی تبصرہ کیا۔

"تو تمہارے اندازے کے مطابق کیا اب تک میرے سینگ نکل آنے چاہیے تھے۔" وہ کسی بات پر چڑی بیٹھی تھی' سو چڑا ہوا جواب دیا۔

"دیکھا' بدمزاجی بھی جوں کی توں ہے۔ کند ذہنی میں کچھ افاقہ ہوا یا وہ بھی....." اس نے فاتحہ پڑھنے کے انداز میں ہاتھ چہرے پر پھیرے۔

"ارے' یہ ہے تتلی؟" بھابی کی گود میں تتلی کو دیکھ کر وہ ایک دم اٹھا' اس کا بھرپور اشتیاق اور بے چینی احمریں کو چونکا گئی۔

"یہ تو..... یہ تو بالکل..... ہو بہو انگبین ہے۔" اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا اور..... شاید پلکیں بھی..... اسی لیے وہ نظریں جھکا کے تتلی کے ماتھے پر پیار کرنے لگا۔

"انگبین تمہاری بہت اچھی دوست تھی' ہے نا۔" احمریں کو کچھ خیال آیا تو وہ ساری کوفت بھلائے اس کے پاس آبیٹھی۔

"تم سے بہت سی باتیں کرتی ہوگی۔"

"یہ کیوں پوچھ رہی ہو تم۔"

"بتاؤ نا! وہ تم سے ہر بات کرتی تھی' کبھی اس نے تم سے اپنے سسرال یا شوہر کی کوئی بات کی۔" اس کے رازداری سے پوچھنے پر وہ مسکرا دیا۔

"انگبین میری بہت اچھی دوست تھی مگر شادی سے پہلے' بعد میں تو....."

"ٹالو مت۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں لیکن تم یہ ساری تفتیش کس سلسلے میں کر رہی ہو' کوئی مسئلہ ہے کیا؟" اب وہ اس کے پیچھے پڑ گیا۔

"دوست تو میں تمہارا ابھی ہوں' تم چاہو تو مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔ اگر تمہیں سسرال میں کوئی پرابلم ہے تو....."

"نہیں' پرابلم تو نہیں..... بس..... ایک الجھن سی ہے۔" وہ جھجکتے ہوئے بتانے لگی۔

"کیسی الجھن؟" وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "تم یہ مت سمجھنا کہ چونکہ تمہاری شادی پہلے مجھ سے طے تھی' اس لیے میں یہ بات کر رہا ہوں لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے تمہارا وہاں شادی کرنے کا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ ٹھیک ہے کہ تتلی کی ذمہ داری نبھانا بھی ضروری تھا لیکن یہ اس کا واحد حل تو نہیں تھا۔"

"دراصل انگبین کی اپنی خواہش تھی کہ میں ہی اس کی بچی کو پالوں۔"

"نہیں میرو! وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ..... خیر چھوڑو اس بات کو' یہ بتاؤ اس کا اتنا مشکل نام کس لیے رکھا تم نے "التفات" تمہاری مشکل پسندی کی عادت بھی نہیں گئی۔"

"بات کو بدلنے کی کوشش مت کرو' کیا کہہ رہے تھے تم کہ انگبین کیا چاہتی تھی' کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس نے یہ فیصلہ اپنی بچی کے لیے نہیں اپنے شوہر کی خوشی کے لیے کیا۔" اسے بھی خدشہ سا گزرا کہ ہو نہ ہو انگبین ضرور عارب کی گھناؤنی خواہش سے آگاہ ہو چکی ہوگی اس لیے.....

"شوہر....." اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

شوہر کی خوشی' جسے اس نے اپنا شوہر ہی تسلیم نہیں کیا۔ اس کی خوشی کا خیال وہ کیا کرتی۔" اچھا میں نے کہا نا..... چھوڑو اس بات کو۔ وہ اب نہیں رہی' میں اس کے بارے میں ایسا کچھ نہیں کہنا چاہتا جس سے اس کی روح کو تکلیف پہنچے۔"

"بات تو تمہیں کرنا پڑے گی بہزاد۔" وہ جان گئی کہ وہ ایسا کچھ علم رکھتا ہے جو وہ نہیں رکھتی۔

"میں بدمزاج ہوں' کند ذہن ہوں' مشکل پسند ہوں لیکن تم بھول رہے ہو کہ میں ضدی بھی بہت ہوں۔"

"تو پھر سنو' انگبین نے مرتے ہوئے تم سے عارب سے شادی کرنے کا عہد صرف اس لیے لیا تھا کہ وہ نہیں چاہتی تھی' تمہاری شادی مجھ سے ہو۔"

"کیا' مگر کیوں؟"

"کیونکہ وہ مجھے چاہتی تھی۔" وہ سر جھکا کر تتلی کے گال سہلانے لگا جو پتا نہیں کیسے اس کی بانہوں میں آتے ہی سو گئی تھی' حالانکہ وہ اجنبی چہروں سے خاصا گھبرا اٹھتی تھی۔

"تمہیں..... اور تم؟"

"میں بھی۔"

"تو پھر یہ عارب بیچ میں کہاں سے آگیا اور میں..... میں کہاں سے شامل ہوئی اس قصے میں۔"

"ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو چاہتے تھے' میں نے امی کو بتا رکھا تھا' وہ کہتی تھیں' مجھے جس دن ملازمت ملی وہ دوسرے روز انگبین کا ہاتھ مانگنے چلی جائیں گی۔ قسمت کی بات کہ میں ابھی فارغ ہی تھا کہ عارب کا رشتہ اس کے لیے آگیا' وہ ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر تھا۔ عمدہ ملازمت' اکلوتی اولاد' مختصر گھرانہ' صاحب جائیداد..... ماموں اور ممانی نے فوراً" ہاں کر دی۔ انگبین سے پوچھا مگر ہمارے ہاں بیٹیوں سے رضامندی بس رسمی طور پر لی جاتی ہے۔ اس نے انکار کرنا چاہا مگر جواز کیا پیش کرتی' جبکہ ممانی کے پاس عارب کی حمایت کے لیے دلائل تھے۔ وہ احتجاج کر تو رہی تھی مگر وجہ بیان نہیں کر پا رہی تھی۔ میرے بہت مجبور کرنے پر امی میرا رشتہ لے کر گئیں' وہی ہوا جس کی امید تھی' میری تعلیم بھی عارب کے مقابلے میں کم تھی۔ اگر ملازمت ملتی بھی تو اتنی شاندار نہ ہوتی' ماموں نے بہن کا دل رکھنے کو دلاسا دیا کہ بہزاد کو ملازمت مل جائے تو احمریں کے بارے میں وہ ضرور سوچیں گے۔ البتہ امی کے جانے سے انگبین کو حوصلہ ملا اور اس نے کھل کے اپنی رائے کا اظہار کیا لیکن اس کی یہ جرات بھی بے فائدہ رہی۔ وہ عارب سے بیاہ دی گئی۔ تم شاید ہاسٹل میں رہنے کی وجہ سے لاعلم رہیں۔"

"تو یہ بات تھی۔" وہ سوچنے لگی۔ اسے یاد آنے لگا' انگبین کا میکے آتے ہی گم صم ہو جانا' امی ابو سے رکھائی سے پیش آنا' وہ اسے انگبین کو سسرال میں پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات کی وجہ سمجھتی رہی۔

"اور وہ انگبین کی خراب حالت' ہاں اس روز امی اسے یہی خبر تو دے رہی تھیں کہ اس کی حالت بگڑ گئی' وہ بے ہوش ہو گئی۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ شادی کے بعد بھی وہ تمہیں بھلانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔"

"کامیاب؟" بہزاد نے اسے جتانے والی نظروں سے گھورا۔

"میرو! ناکامی یا کامیابی کا سوال تب پیدا ہوتا ہے جب کوشش کی جائے اور انگبین نے تو سرے سے ایسی کوئی کوشش کی ہی نہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔"

"وہ مجھے..... مجھے فون کرتی رہتی تھی۔" اس نے شرمندہ سا اعتراف کیا۔

"میں اسے بہت منع کرتا تھا' بہت سمجھاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ مجھے بھی اس سے محبت تھی' اس کا کسی اور کا ہو جانا مجھ سے بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اگر وہ کوئی سی بھی لڑکی ہوتی تو میں زمین آسمان ایک کر دیتا مگر میرو! وہ میرے بہت پیارے ماموں کی بیٹی تھی' میرے خاندان کی عزت اور جب وہ اپنے سسرال سے مجھے روتے ہوئے فون کیا کرتی تو میں یہ بھول جاتا تھا کہ اس لڑکی کو میں نے چاہا ہے' مجھے صرف یہ یاد ہوتا کہ میرے خاندان کی عزت خطرے میں ہے۔ میرے ماموں کی نیک نامی پر کوئی حرف نہ آجائے' اس لیے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کی مگر وہ نجانے کیوں ایسی ہو گئی تھی۔ وہ تو بہت ذمہ دار' بہت حساس' بہت ہی میچور لڑکی ہوا کرتی تھی۔ ضدی اور ناسمجھ تو میں تمہیں کہا کرتا تھا پھر پتا نہیں کہاں سے یہ بغاوت اور ضد اس کے اندر اتر آئی تھی' اسی لیے وہ اپنے شوہر کے ساتھ اس کے گھر نہیں گئی۔ فخریہ بتاتی تھی کہ میرے پاس اس کے لیے رکھائی کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ خائف ہو کے خود ہی مجھ سے کھنچا کھنچا رہتا ہے۔ میں تو سخت خوفزدہ ہو جاتا تھا اس کی باتیں سن سن کر۔ اسے سب کچھ بھلا کر اپنی نئی زندگی ایمانداری سے گزارنے کا مشورہ دیتا تھا کہ تمہیں

اس کی عاقبت نااندیشی اس کا گھر برباد نہ کر دے لیکن پتا ہے وہ کیا سمجھی' اس نے خود ہی یہ فرض کر لیا کہ میں اب اس کے بجائے تم میں انٹرسٹڈ ہوں۔ ہماری شادی طے ہو جانے کی خبر اس کے لیے شاک تھی' شاید اسے پکا یقین ہو گیا تھا۔ حالانکہ میں تم سے شادی کرنے پر صرف امی کی وجہ سے تیار ہوا تھا کہ ماموں ان کے اکلوتے بھائی ہیں' کہیں میرا انکار دونوں کے تعلقات میں بگاڑ نہ پیدا کر دے لیکن وہ کچھ اور سمجھی اور مجھ سے بدلہ لینے کی خاطر..... مجھے تم سے شادی کرنے سے روکنے کی خاطر تمہیں اپنے عہد کا پابند کر گئی۔ کس قدر غلط اندازہ لگایا اس نے میرے بارے میں۔"

"ہاں۔" وہ گم صم بیٹھی خلا میں دیکھ رہی تھی سب کچھ اس کے گمان سے کتنا مختلف تھا' بہزاد کی بات پر اس کی چپ ٹوٹی۔

"ہاں ہم کتنے غلط اندازے لگاتے ہیں اور ہوتا کچھ اور ہے۔" وہ اس کی گود میں سوئی ہوئی تتلی کو نرمی سے اپنی گود میں منتقل کرتے ہوئے اندر لٹانے چلی گئی۔

"بہزاد نہ بتاتا تو شاید میں یونہی انگبین کی مظلومیت اور بے چارگی کے بدلے اس شخص سے لیتی رہتی جو قصوروار تو ہے مگر اکیلا نہیں۔ اگر وہ بددیانت تھا تو خیانت تو میری اپنی بہن نے بھی کی۔ بیوی ہوتے ہوئے پرانی محبت سے تعلق برقرار رکھے ہوئے تھی پھر اب میں کس لیے بدلہ لوں' کس لیے خود کو یہ سزا دوں' ہاں یہ سزا مجھے ہی تو مل رہی ہے۔ زمانے بھر کی نظروں میں میں بری بن رہی ہوں اور تتلی کے ساتھ بھی انجانے میں ناانصافی ہو رہی ہے' صرف اور صرف میری وجہ سے وہ اپنے باپ کی شفقت سے محروم ہے۔"

خود احتسابی نے اسے احساس دلایا کہ وہ ایک بے مقصد جنگ لڑ رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

اور اس کارڈ نے اور اس پر لکھے چند الفاظ نے اس کو فیصلہ کرنے میں مدد دی۔ جب سے بہزاد سے بات ہوئی تھی' یہ تین دن اس نے خود سے الجھتے ہوئے گزارے تھے۔ ایک طرف اس بات کی شرمساری تھی کہ وہ انگبین پر کیے گئے ان مظالم کا حساب لینے کی کوشش کرتی رہی' جو سرے سے اس پر ہوئے ہی نہیں۔ دوسری طرف یہ خیال بھی آتا کہ عارب کون سا پارسا ہے۔ وہ خود بھی ایک قبیح حرکت کا مرتکب ہو چکا ہے۔

لیکن آج جب بھابھی نے اسے ایک ہلکے آسمانی لفافے میں ملفوف کارڈ اور سفید گلابوں کا بوکے تھمایا یہ کہہ کر کے.....

"تمہارے لیے کوریئر سے آیا ہے۔"

تو وہ فوراً" بھانپ گئی کہ یہ پیش قدمی عارب کی جانب سے ہوئی ہو گی۔ اس نے بوکے تتلی کے کاٹ کے پاس رکھا اور کارڈ کھولا۔ بے حد نفیس ہینڈ رائٹنگ میں وہ نظم اسے کچھ یاد دلانے لگی۔

کیسے اتروں پار
بادل بادل تیری آنکھیں
دریا دریا خواب
کیسے اتروں پار
چاروں جانب پھیل رہی ہے کاجل کی آواز
میرے دل کی ویرانی کو
اس کی سُندرتا سے بھر دے
مجھ پر اپنی پلکیں کر دے
اے سندر متوالی آنکھوں والی نار!
اپنی آنکھیں موند کے مجھ سے سپنے میرے لے لے
بس اتنا بتلا دے
کیسے اتروں پار
بادل بادل تیری آنکھیں
دریا دریا خواب

احمریں نے کارڈ واپس لفافے میں رکھا اور تتلی کے کاٹ کے پاس آکھڑی ہوئی۔ نرم انگلیوں سے سفید گلاب سہلاتے ہوئے اس نے نظر بھر کے تتلی کو دیکھا۔

"کیسے اتروں پار... کیسے اتروں پار....."

اس کے اندر باہر ایک ہی تکرار ہونے لگی۔

"یہ ضد کہیں مجھے بھی اس موڑ پر نہ لے آئے' جس پر انگبین کو لے آئی تھی۔ اس کی ضد..... محبت تھی اور میری ضد..... نفرت..... اور ضد کوئی بھی ہو' دیتی تو خسارہ ہی ہے۔

دنیا ویسی ہرگز نہیں جیسی کہ نظر آتی ہے' ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ وہ بہن جسے میں آئیڈیلائز کرتی رہی' وہ..... کیا پتا عارب مصطفیٰ اچھا شوہر یا اچھا بھائی نہ ہو مگر ایک اچھا باپ ہو' مجھے تتلی کے لیے یہ دوغلی زندگی جینا ہی پڑے گی۔"

وہ بالآخر ایک فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ گئی۔

☼ ☼ ☼

"گلی میں آج چاند نکلا۔"

فلیٹ کا خوبصورتی سے آراستہ کشادہ ڈرائنگ روم اس وقت نعمان آغا کی سریلی آواز سے گونج رہا تھا۔ داد دینے والوں میں ان کی خوش اندام بیگم پیش پیش تھیں جو کہیں سے تین بچوں کی ماں نہ لگ رہی تھیں۔ ان کی بڑی بیٹی' گیارہ سالہ سدرہ کی گود میں بیٹھی تتلی خوب قلقاریاں بھر رہی تھی۔ سدرہ' چاکلیٹ کینڈی کے ذرا ذرا سے پیس کر کے اس کے منہ میں ڈالتی اور وہ خوب زوردار چٹخارہ لینے کے بعد اور کھانے کے لیے مچلنے لگتی۔ عارب ساری گہما گہمی سے بے نیاز تتلی کی معصوم اداؤں میں کھویا ہوا تھا' اور احمریں حیرت و دلچسپی سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔

اس کے اچانک بغیر اطلاع کے آنے کے فیصلے پر اسے خود جی بھر کے غصہ آیا' جب فلیٹ لاک ملا۔ مسز آغا اتفاقاً" اسی وقت سامنے کے فلیٹ سے نکلیں' تعارف حاصل ہوا اور وہ پوری بلڈنگ میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اسے یہ جان کر اچنبھا ہوا کہ وہاں وہ سب ہی انگبین کی وفات سے لاعلم تھے' نہ ہی کوئی یہ جانتا تھا کہ وہ عارب کی دوسری بیوی ہے۔

"بھئی بہت دیر لگا دی تم نے' بچی پالنا سیکھنے میں۔"

"جی کیا مطلب؟۔"

"مطلب یہ کہ جب عارب نے خوشخبری سنائی کہ

وہ جلد ہی پاپا بننے والا ہے تب سے ہم تمہاری آمد کے منتظر تھے۔ اس کا بھی یہی کہنا تھا کہ اب وہ فیملی کے ساتھ سیٹ ہونا چاہتا ہے لیکن بعد میں تمہارے نہ آنے کی وجہ اس نے ہمیشہ یہی بتائی کہ تم سے اکیلے بچی نہیں سنبھالی جاتی۔"

"جی... بس... وہ..." وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ نہ سکی۔ خاصی تقویت ملی تھی یہ سن کر کہ عارب انگبین کو یہاں لانا چاہتا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی جانب سے پوری پوری کوشش کی گئی تھی فاصلے مٹانے کی۔"

فوراً عارب کو فون کر کے بلایا گیا۔ آناً فاناً شام کو ویلکم پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ عارب نے سب کے لیے ڈنر کا انتظام کیا اور تقریباً سب نے ہی ایمرجنسی کے باوجود اسے خوبصورت تحائف سے لاد دیا۔ رات بارہ ساڑھے بارہ کے بعد جب سب چلے گئے تو اس نے گھر کا تفصیلی جائزہ لیا۔ واقعی عارب سچ کہہ رہا تھا' اس نے گھر کا چپہ چپہ سجا رکھا تھا۔

"یہ گھر ہے احمریں! جہاں تم قدم رکھو گی تو یہ جنت بن جائے گا... ورنہ کھنڈر..." اسے یاد آیا۔

"اور شکر ہے کہ میں نے اسے کھنڈر بننے سے بچا لیا مگر کیا واقعی میں اسے جنت بنا پائی ہوں۔"

"احمریں...!"

اس نے پلٹ کے دیکھا' بیڈ روم کے دروازے میں ایستادہ وہ اسے پکار رہا تھا۔ جھجکتے ہوئے وہ قدم بڑھانے لگی اور اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک کے رک گئی۔ اس کی قد آور تصویر سامنے لگی تھی۔

"میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا احمریں! کہ تم نے یہاں آنے کا فیصلہ کس کے کہنے پر کیا مگر میں تمہارا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔ تم نے میرے لیے اپنے دل میں کچھ تو گنجائش پیدا کی۔"

"یہ خوش فہمی کس لیے ہوئی آپ کو۔"

لوگ کہتے ہیں تو اب بھی خفا ہے مجھ سے
تیری آنکھوں نے تو کچھ اور کہا ہے مجھ سے

وہ اس کے نزدیک ہو زانو بیٹھتا ہوا شعر گنگنانے لگا۔

"شاعری سے خاصا شغف ہے آپ کو۔" وہ یونہی ادھر ادھر کی بات کر رہی تھی' شاید اپنی بے چینی پر قابو پانے کے لیے۔

"ہوں... پہلے تو نہیں تھا... مگر تمہیں دیکھنے کے بعد از خود پیدا ہو گیا۔ جب تمہیں پہلی بار دیکھا تب ہی میں..."

"پلیز۔" اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ "پلیز یہ ذکر مت کیجئے۔" وہ گھبرا اٹھی' کہیں اس کا فیصلہ پھر سے نہ بدل جائے۔

"نہیں احمریں! تمہیں سننا ہو گا' آج تو سننا ہو گا۔ میں نے ہمیشہ تمہاری سنی' اپنی کہنی بھی چاہی تو تم نے سننے سے انکار کر دیا' لیکن آج ایسا نہیں ہو گا۔ تمہاری نفرت کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک بد کردار انسان ہوں' جو اپنی سالی پر بری نگاہ ڈالنے کا گناہ گار ہے۔ میں نے اپنی پہلی نظر کی محبت کا ذکر کیا تھا اور تم بدظن ہو گئیں کہ شاید میں اتنا کمینہ فطرت ہوں کہ دولہا بن کے پہلو میں دلہن بٹھا کے کہیں اور نظر بازیاں کر رہا ہوں' یہی بات ہے نا۔"

وہ سر جھکا کے رہ گئی۔

"اصل بات سے تم ناواقف ہو احمریں! میں پہلی نظر میں تم سے محبت ضرور کرنے لگا تھا مگر وہ پہلی نظر تب اٹھی تھی جب نہ میں تمہیں جانتا تھا' نہ تم مجھے۔"

"کیا...؟ لیکن ہم تو پہلے کبھی نہیں ملے۔" وہ حیران ہوئی۔

"شاید تمہیں یاد نہ ہو مگر وہ سفر میری زندگی بدل گیا تھا۔ لاہور سے اسلام آباد جانے والی کوچ میں تم جہلم تک کے لیے سوار ہوئی تھیں۔ سحری کا وقت تھا' تمہارے ساتھ ثنا نام کی ایک لڑکی تھی' تم نے راستے میں موبائل پر بات بھی کی تھی اپنے گھر اور تب میں تمہارے نام "ثمیرو" سے واقف ہوا تھا۔ وہ سفر ختم بھی ہو گیا تم واپس چلی بھی گئیں اور میں... میں پتا نہیں کیوں تمہاری ایک جھلک کی سوغات لیے بیٹھا رہا۔ یقین کرو احمریں! میں تب سے تمہارے عشق میں

گرفتار ہوں۔"

وہ یقین کر رہی تھی' اسے یقین کرنا ہی تھا۔ لہجہ بھی سچا تھا اور لفظ بھی...

"میں نے تمہیں کھوجنے کی کوشش کی مگر ظاہر ہے کہ میں ناکام رہا۔ امی کے مجبور کرنے پر میں نے شادی کی ہامی بھری تو ساتھ ہی اپنے دل کو پابند کر ڈالا کہ اب وہ تمہیں کھوجنے کی' راستے میں ملنے والے ہزاروں چہروں میں تلاشنے کی عادت ترک کر ڈالے گا۔ یہ پابندی لگاتے ہوئے میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ قسمت میرا کیسا امتحان لینے والی ہے۔ تم انگبین کی بہن ہو' یہ حقیقت تلخ بھی تھی اور تکلیف دہ بھی مگر بہرحال حقیقت تو تھی اور حقیقت کو تسلیم کر لینے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ احمریں! ایک چیز ہوتی ہے دل... اور بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔ ہزار بار سمجھاؤ' اونچ نیچ بتاؤ مگر اپنی ڈگر سے نہیں ہٹتا۔ اس کی بے تابیوں سے ڈر کے ہی میں تمہارا سامنا کرنے سے کتراتا تھا اور تم بے وقوف لڑکی' اس وقت تو بڑے گلے کرتی تھیں کہ آپ مجھے دیکھتے ہی منظر سے غائب ہو جاتے ہیں... بعد میں مجھ پر نظر بازیوں کا بے سروپا الزام لگاتے ہوئے تمہیں وہ سب یاد نہیں رہا۔"

اس کی استحقاق بھری ڈانٹ پر وہ خجل ہو کے بے ساختہ وارد ہونے والی مسکراہٹ کو چھپانے لگی۔

"میں تو اسی کوشش میں رہتا تھا کہ تم سے سامنا کم سے کم ہو' انگبین کے ساتھ اس کے میکے نہ جانا بھی اسی لیے تھا۔ میرا دامن بالکل صاف ہے اور کردار بے داغ۔ میں نے رشتوں پر آنچ نہیں آنے دی' یہ میں حلفیہ کہتا ہوں۔ ہاں ایک غلطی ہوئی کہ جذبوں کے بے ساختہ اظہار میں ذرا زیادہ ہی جلد بازی سے کام لیا۔ بہتر ہوتا کہ تمہیں یہ سب حقیقت پہلے ہی بتا دیتا لیکن تب اتنا ہوش ہی کہاں تھا۔ اچانک ملنے والی خوشی نے حواس کر رکھا تھا اور ویسے بھی میں نے اسی رات کہا تھا نا تم سے کہ...

بہت قریب سے دیکھیں تو منظر پھیل جاتے ہیں..."

"اونہوں۔" اس نے بات کاٹی۔

"آپ نے کچھ اور کہا تھا۔" اس نے تصحیح کی۔

"بہت نزدیک سے دیکھیں تو چیزیں پھیل جاتی ہیں۔"

"بہت اچھے... احمریں عارب مصطفیٰ! آپ تو بہت گہری نکلیں۔ کہاں اتنی بے گانگی کے مظاہرے اور کہاں یہ عالم کہ ہمارے لفظ تک اپنے اندر اتار رکھے ہیں۔" اس کے چھیڑنے پر وہ دوہری ہو گئی۔ عارب نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما۔

"تو بات ساری یہ ہے احمریں بیگم! کہ ہم سب اپنے اپنے نظریے سے بات کو دیکھتے رہے' تمہارا تو پتا نہیں۔ میرا عالم تو میں نے بتا دیا ہے کہ۔

میرے چار سو دو جھیل سی آنکھوں کا پہرا ہے..."

"اور عارب مصطفیٰ!" اس نے اپنے ہاتھ پر رکھے اس کے گندمی ہاتھ پر اپنا دایاں ہاتھ ہولے سے رکھا۔ "بے فکر رہیے' یہ پہرا اب مستقل رہے گا۔"

سعدیہ رئیس

آنچل کی چھاؤں

گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ رنگ برنگے آنچل، پھولوں اور پرفیوم کی ملی جلی مہک تھی۔ کہیں دبی دبی ہنسی تھی معنی خیز سی اور کہیں قہقہے تھے۔ لڑکیوں کا ہجوم اشاروں کنایوں میں مذاق میں مصروف تھا کچھ سمجھ میں آنے والی اور کچھ نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت لیے ساری لڑکیاں وفور شوق سے شادی کی اس تقریب میں موجود تھیں۔ اب جبکہ رخصتی کا بھی مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ دلہن گھر میں آچکی تھی بلکہ ابھی کچھ دیر قبل ہی دلہن نے گھر کی دہلیز پار کی تھی، مہندی سے سرخ، اونچی ایڑھی کی سینڈل میں پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ کچھ عورتوں کے گھیرے میں وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہی تھی۔ اسے اپنا کچھ ہوش نہ تھا، زرتار آنچل کو گھونگھٹ کی شکل میں اس کے چہرے پر کر دیا گیا تھا۔ لہنگا کسی اور نے پکڑ رکھا تھا اور دوپٹہ کسی اور نے تھام رکھا تھا، ایک بازو اس کی بڑی بہن امتل حسین نے پکڑا ہوا تھا دوسری طرف سے اس کی نند مہ پارہ اسے سہارا دیے ہوئی تھی۔ اتنے ہجوم میں اچانک ننھی سی چیخ نے سب کو چونکا دیا۔ بڑی جٹھانی سمیہ نے مڑ کر دیکھا اس کی ننھی پری گلشن کھڑی رو رہی تھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ باقی خواتین دلہن کو اس کی منزل مقصود تک لے گئیں۔

"کیا بات ہے گڑیا...؟" اس نے محبت سے بال سنوار کر اس کے آنسو پونچھے۔

"میری... میری اوئی" (اوڑھنی) اس نے اشارہ کیا۔ سامنے سمیہ کا پھوپھی زاد اقبال کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ننھی گلشن کی اوڑھنی تھی۔

"ارے اقبال بھائی! نہ تنگ کیجیے نا گڑیا کو۔"

سمیہ ساری بات سمجھ گئی تھی وہ صرف اسے تنگ کرنے کے لیے اس سے اوڑھنی لے رہا تھا۔

"اوں ہوں... پہلے وعدے کے مطابق ننھی ہمارے منی سی پپی کرے گی پھر اوڑھنی ملے گی۔" وہ لہک کر بولا۔

"نہیں... نئیں... نہیں..." گلشن بپھر کر چلا اٹھی۔

"ارے... رے رے اچھا بھئی پیسے واپس، یہ لو اپنی اوڑھنی۔" رنگین چمکتی ہوئی اوڑھنی گلشن کے گلے میں جھولنے لگی اور اس نے اٹھلا کر سمیہ کے اندر سینے میں منہ چھپالیا۔

"اچھا بھئی! اب دوستی ہو گئی، اب ایک عدد ٹافی۔" اقبال کا لالچ کام آگیا۔ گلشن اس کے پاس آگئی۔ سمیہ نے اسی میں عافیت جانی ابھی اسے بہت سے کام نمٹانے تھے۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی۔ انتہائی عجلت سے اس نے اپنا بوجھ ہلکا کیا، بھاری زیورات اور کپڑوں سے نجات حاصل کر کے وہ اپنے آپ کو ہلکا محسوس کر رہی تھی حالانکہ اس نے نہایت جلدی جلدی تمام کام کیے تھے، باہر پہنچی تو دلہن اپنی رسومات سے فراغت پا کر کمرے میں جا چکی تھی۔ سفید ڈیکوریشن کی چادر پر جا بجا پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں، ایک کونے میں اس کا پانچ سالہ بیٹا عمران خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ اس نے سکینہ کو بلا کر کمرہ صاف کرنے کی ہدایت کی۔

"ارے دلہن! کہاں تھیں۔ حد ہو گئی ساری رسمیں ہو گئیں۔" ساس نے قدرے خفگی سے کہا۔

"بس امی وہ..." خجالت سے کچھ کہنے والی تھی کہ انہوں نے ٹوک دیا۔

"اچھا دلہن اندر آگئی ہے، ذرا دیکھ لو۔" انہوں نے بڑی بہو کو ذمہ داری سونپی۔

"امی وہاں مہ پارہ ہے تو سہی۔" وہ دامن بچا رہی تھی۔

"ہاں ہاں تم بھی جاؤ۔" دوٹوک انداز تھا اس لیے اس نے خاموشی سے عمل کیا۔ کمرے میں پہنچی تو اس سے پہلے گلشن وہاں موجود تھی۔ سیج کے گرد سجی پھولوں کی لڑیاں اسے کافی متاثر کر رہی تھیں، وہ ایک ٹک انہیں دیکھے جا رہی تھی، سمیہ اس سے نظر بچا کر کھڑی تھی کہیں اسے دیکھ لیا تو شامت ہی نہ آجائے۔ نئی لکڑی اور پھولوں کی خوشبو نے مل کر حجلۂ عروسی میں عجب پراسرار سی مہک پیدا کر دی تھی۔ نیا چمکتا ہوا فرنیچر رنگین پھولوں سے آراستہ چھت اور خوب صورت شیڈز میں جگمگاتی روشنی سے کمرہ جھلمل کر رہا تھا۔ سیج پر سکڑی سمٹی نازک سی دلہن بیٹھی ہوئی تھی۔

"چلو بیٹا! اب چل کر سوؤ۔" آخر کار سمیہ کو اسے خود مخاطب کرنا پڑا، کیونکہ وہ تو ایک ٹک جگمگ کرتی چیزوں کو دیکھ رہی تھی، گھونگھٹ میں چھپی دلہن کے روپ نے اسے جکڑ لیا تھا۔

"کتنی پیاری ہے۔" وہ دل میں سوچ رہی تھی اس وقت بھی اس کی ننھی منی اوڑھنی اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی اور وہ کچھ سوچ رہی تھی یوں کہ جیسے وہ اس سحر خیز ماحول سے جانا نہیں چاہتی ہو۔ سمیہ کے کہنے پر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور وارفتگی سے تکتی رہی۔

"ننھی! تم چل رہی ہو کہ۔" سمیہ نے قدرے درشتگی سے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر لے جانے لگی۔

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔" وہ چیخ پڑی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ دلہن کو دولہا کے انتظار میں چھوڑ دیا

گیا اور ننھی گلشن کو نیند کی وادیوں میں جانا پڑا۔

☆ ☆ ☆

دوسری صبح جہاں نئی نویلی دلہن کے لیے ایک چمکتی ہوئی صبح تھی، وہاں ننھی گلشن کے لیے بھی اس صبح میں بے پناہ کشش تھی۔ وہ صبح اٹھتے ہی دلہن کے کمرے میں بھاگی تھی۔ آج منظر وہی تھا مگر تصویر بدل گئی تھی، نکھری نکھری سی دلہن اپنی دراز بھیگی ہوئی زلفیں لیے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے براجمان تھی۔ پانی کی ننھی ننھی بوندیں قدرے وقفے وقفے سے بالوں سے ٹپک رہی تھیں، گلشن کو دیکھ کر اس کے یاقوتی لب مسکرا اٹھے یوں کہ وہ سراپا مسکراہٹ بن گئی تھی۔ دوسری طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی تو ننھی گلشن کا بھی حوصلہ بڑھا اور وہ مقناطیسی کشش کے ساتھ دلہن کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی، اس کے وجود سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو سے گلشن مسحور ہو رہی تھی اور اس سے لپٹی جا رہی تھی۔

"اوں گندی بچی... پہلے منہ دھو کر کپڑے بدل کر آؤ، اچھی اچھی دلہن کو گندا کر دو گی۔"

رمیز شرارتی نظروں سے دلہن کو دیکھ کر بولا۔ وہ جھینپ گئی بے اختیار ہی اپنی انگلیوں میں پڑی انگوٹھیوں کو گھمانے لگی، گردن خود بخود جھک گئی گلشن حیران ہو رہی تھی مگر بہرحال اسے دلہن ہر روپ میں اچھی لگ رہی تھی۔

"ارے... یہ لڑکی یہاں بھی پہنچ گئی۔" مہ پارہ ناشتہ کی ٹرے سنبھالتی اندر آئی۔

"جی ہاں... خیر سے دوستی بھی ہو گئی ہے۔" رمیز نے اطلاع فراہم کی۔

"ان کی امی تو پڑی سو رہی ہوں گی۔" مہ پارہ نے خیال ظاہر کیا۔

"جی نہیں... اٹھی (اٹھی) ہیں۔" فوراً جواب حاضر تھا۔ بے اختیار اس کی حاضر جوابی پر دلہن کھلکھلا پڑی اور گلشن کے ساتھ ساتھ رمیز بھی اسے وارفتہ نظروں سے تکنے لگا۔

پھر یوں ہوا کہ ہر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ گلشن کی صبح اور شام دلہن کے ساتھ ہی گزرتی۔ ہاں ایک بات پر وہ چڑتی تھی۔ جب دلہن اس کی اوڑھنی شرارت سے چھپا لیتیں اور گلشن منہ بسورتی چیختی پھر کہیں جا کر اس کی اوڑھنی سے ملتی۔ اوڑھنی کیا تھی، رمیز کی شادی کی اوڑھنی اس نے ایسی اپنے سینے سے لگائی کہ کسی کو دینے پر آمادہ نہ تھی۔ اس کا رنگ ماند پڑ گیا تھا، ٹکے ہوئے پھول کہیں کہیں سے ادھڑ گئے تھے مگر وہ اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ سمیعہ نے بہت چاہا کہ وہ گلشن کے لیے نئی اوڑھنی بنا دے مگر وہ بالکل راضی نہ ہوئی۔ اس نے جہاں بہت سے اچھے دن دلہن کے ساتھ گزارے، شرارتیں، شوخیاں اور چہلیں کیں، وہاں بارہا اس نے دلہن کو اداس بھی دیکھا۔

جھیل سی آنکھوں میں پانی بھی بھر جاتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے یاقوتی لب یوں خاموشی اختیار کر جاتے کہ گلشن کی پیاری پیاری باتوں کے جواب میں تھرتھرا کر رہ جاتے۔ کبھی اسے دلہن کی گلابی رنگت میں اداس شاموں کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ ذہین تھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے بہت سی باتیں سمجھ میں آ گئی تھیں۔ اب تو وہ اوڑھنی بھی نہیں لیتی تھی بلکہ باقاعدہ قرینے سے اسے دوپٹہ اوڑھنا پڑتا تھا۔ کبھی شدید گرمی میں اسے یہ دوپٹہ اوڑھنا بہت کھلتا، پھر اسے یاد آتا کہ ایک شام جب دلہن نے اس سے کہا تھا کہ۔

"کیا کرو گی اس اوڑھنی کا، ابھی تو آزاد ہو پھر ساری عمر اس آنچل کی ٹھنڈی گرم چھاؤں میں گزر جائے گی۔"

اور گلشن اس وقت صرف آنکھیں پٹپٹا کر دیکھتی رہ گئی تھی مگر آج جب وہ خود ایک دلہن بن رہی تھی تو زرتار آنچل کے بوجھ سے اس کی پلکیں بھیگی جا رہی تھیں اور گردن جھکی جا رہی تھی۔ کیونکہ اب اسی آنچل میں اس کے لیے دکھ بھی تھا اور سکھ بھی۔

☆

سعدیہ چوہدری

صندل کی خوشبو

وہ اس وقت اس بڑی سڑک پر دھیمی رفتار سے چل رہا تھا' اس کے قدم تھکے تھکے سے تھے۔ شاید اب یہ تھکن اس کے وجود کا ایک ناگزیر حصہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس لمبی سی سڑک کے دوسرے سرے تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا لیکن پھر بھی اس کی آنکھوں میں ایک حسرت تھی۔ دوسرا کنارہ دیکھنے کی' دوسرا کنارہ جس پر جانے کون سا جہان آباد تھا جسے اس کی آنکھوں نے خود بنایا تھا۔ شاید کوئی ان دیکھا شہر' کوئی نئی دنیا یا پھر شاید کچھ بھی نہیں۔ اس نے اپنے قدموں کو روک لیا تھا اور ان کا رخ اپنے گھر کی طرف مڑنے والی چھوٹی سڑک پر موڑ دیا تھا۔

اس نے ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لمبی سڑک جس کا دوسرا کنارہ اس وقت دھند کے غبار میں چھپا ہوا تھا' اس پر ہنس پڑی۔ ایسے جیسے وہ اسے چیلنج کر رہی ہو' اسے غصہ آگیا لیکن وہ سڑک کے چیلنج کو پورا نہیں کر سکتا تھا' اس لیے اس نے اپنا چہرہ موڑ لیا۔ چھوٹی سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے درخت صبح کی ٹھنڈی ہوا میں لہرا لہرا کر ہمیشہ کی طرح اسے اپنی طرف بلا رہے تھے لیکن ان کی پکار پر اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ ایک زمانہ بیت گیا تھا' اس نے ان کی باتیں سننا چھوڑ دی تھیں۔ کوئی خشک پتا اپنا دل اس کے قدموں میں نچھاور کر چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ وہ اس پتے کو اٹھا کر اس کے زخم دیکھے لیکن پھر اس نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔ ایک وقت تھا جب جانے کتنے چہرے' جانے کتنے لوگ اپنے فگار دل اور زخم زخم بدن لے کر اس کے پاس آتے تھے اور وہ ان کے زخموں کو رفو کرتا تھا لیکن اب تو عرصہ گزر گیا تھا' اس نے لوگوں اور چہروں سے بچ بچ کر چلنا شروع کر دیا تھا۔ اب کوئی زخم اس کے حرفِ مسیحائی سے رفو نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وقت کے گزرتے ہوئے ماہ و سال نے خود اسے زخم زخم کر دیا تھا۔ وہ کسی اور کے زخم کیسے سیتا۔

"سنیے۔" ایک آواز آئی۔

"یہ کون بول رہا ہے۔" اس نے سوچا لیکن وہ رکا نہیں' اب وہ کسی کے لیے نہیں رکتا تھا۔

"ٹھہریے۔" اب کی بار آواز قریب سے آئی تھی پھر کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"رکیے ناں سر! میں کب سے آپ کو آوازیں دے رہی ہوں۔" اس آنے والے نے اسے روکا تھا' وہ اٹھارہ انیس سال کی ایک خوش شکل لڑکی تھی جو اس وقت تیز تیز سانس لے رہی تھی پھر اس نے اپنا سانس درست کیا۔

"میں آپ کو سر کہہ سکتی ہوں؟" آنے والی نے قدرے بے تکلفی سے پوچھا تھا۔

اس کا دل چاہا کہ وہ گھٹ سے انکار کر دے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اپنے اندر کی ناگواری کو دباتے ہوئے اس نے پوچھا تھا کہ "وہ کون ہے؟"

"اوہ' سوری میں اپنا تعارف کروانا بھول گئی۔ میرا نام "صندل شفیق" ہے۔ دراصل ہم آپ کے ساتھ والے بنگلے میں کل ہی شفٹ ہوئے ہیں۔ صبح جب میں واک کے لیے نکلی تو مجھے آپ نظر آئے لیکن آپ مجھ سے کافی آگے نکل گئے تھے' میں آپ کے پیچھے ہی

آ رہی تھی' گھر کے قریب پہنچ کر مجھے خیال آیا کہ ہمیں ایک دوسرے سے تعارف تو کروانا چاہیے' اسی لیے میں آپ کو آوازیں دے رہی تھی لیکن اتنی بار پکارنے کے بعد آپ میری طرف متوجہ ہوئے۔" اس نے خاصا تفصیلی جواب دیا تھا۔

وہ جو بھی تھی مگر بہت باتونی تھی' گھر تک پہنچنے کے

باقی رستے میں بھی وہ مسلسل بولتی رہی تھی' حالانکہ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی مگر وہ اس طرح اس سے باتیں کررہی تھی جیسے وہ ہمیشہ سے اسے جانتی ہو۔ اسے غصہ آنے لگا تھا' اسے ایسے لوگوں سے وحشت ہوتی تھی جو خوامخواہ دوسروں کی پرائیویسی میں دخل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ گزرتے ہوئے ماہ و سال میں وہ خاصا بداخلاق ہوگیا تھا لیکن اس وقت وہ اس کا لحاظ کررہا تھا۔ یہ سراسر اس کی شرافت تھی۔ گھر کا دروازہ نظر آتے ہی اس لڑکی سے جان چھوٹنے کے خیال سے اس نے خود میں ایک گہرا سکون اترتا ہوا محسوس کیا۔ وہ اپنے گھر کی طرف بڑھا تھا جب اس کی آواز آئی تھی۔

"آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ کے گھر نہیں آرہی' دراصل ابھی میں نے مما کو بتایا نہیں ہے نا! شام کو میں ان کو لے کر آپ کے گھر آؤں گی' ٹھیک ہے نا۔" وہ اس کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

وہ باوجود کوشش کے اسے کوئی سخت جواب نہیں دے سکا تھا۔ شاید یہ احساس مروت تھا جو اب بھی تھوڑا بہت اس کے اندر زندہ تھا' کسی اور جذبے کے قطعی برعکس مگر دل ہی دل میں اسے اس لڑکی کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

پہلے دن تو وہ اپنی امی کے ساتھ آئی تھی' اس کے بعد اکیلے ہی آنے لگی تھی۔ صبح سویرے وہ اس کے گھر کی بیل بجادیتی' اسے اپنے ساتھ واک پر لے جانے کے لیے پھر وہ صبح سے شام تک ڈھیروں بار اس کے گھر کے چکر لگاتی۔ کبھی کچھ دینے آتی اور کبھی کچھ لینے' کبھی وہ چاکلیٹ کیک بنا کر لے آتی' کبھی کوئی تجریدی آرٹ کا نمونہ' جس پر آڑی ترچھی سی لکیریں کھینچی ہوتیں اور وہ بڑی سنجیدگی سے کہتی۔

"دیکھیں سر! میں نے زندگی کی تصویر بنائی ہے' آپ اسے رکھ لیں۔ یہ میں نے آپ کے لیے ہی بنائی تھی۔" اور وہ چاہتے ہوئے بھی اسے واپس نہ کرپاتا۔

کبھی وہ کوئی گملا اٹھا کر لے آتی۔ "دیکھیں سر! یہ پیراڈائز برڈ "Paradise bird" ہے۔ مجھے ممانے گفٹ کیا تھا' میں آپ کے گھر لے آئی۔ اسے یہاں برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس رکھ دیتے ہیں۔" وہ عجیب سی ساخت والے خوش رنگ سے پھول کو دکھا کر کہتی اور وہ بغیر شکریہ کے اسے قبول کرلیتا۔

کبھی وہ صرف باتیں کرنے کے موڈ میں ہوتی تو بول بول کر اس کا سر کھاتی رہتی۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص اسے سن بھی رہا ہے یا نہیں۔ وہ اپنے رویے سے ڈھکے چھپے انداز میں اس کی حوصلہ شکنی کرتا۔ اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا کہ اسے یہ سب ناپسند ہے لیکن شاید وہ ضرورت سے زیادہ بے وقوف تھی جو اس کی ناگواری کو محسوس نہیں کرپاتی اور ان دس' پندرہ دنوں میں جو سب سے زیادہ حیرت انگیز بات ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ ایک بار بھی وہ دو ٹوک انداز میں اسے اپنے گھر آنے سے منع نہیں کرپایا تھا۔ اور اس بات کے لیے اسے خود پر غصہ بھی آتا تھا' اسے کوئی مجبوری نہیں تھی جو اس کی ان حرکتوں کو برداشت کرتا مگر پھر بھی جانے کیوں وہ انہیں برداشت کیے جارہا تھا۔

اس دن بھی وہ اس کے گھر آئی تھی جب وہ مارکیٹ سے واپس آیا تو وہ اسے گھر میں ہی ملی تھی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑنے لگے تھے۔ عجیب لیچر لڑکی تھی وہ۔

"ارے سر! آپ کی لائبریری میں تو کتابوں کا بہت اچھا انتخاب ہے لیکن میں نے آپ کو کبھی کوئی کتاب پڑھتے نہیں دیکھا۔" وہ اس کے سامنے ایک کتاب لیے کھڑی تھی۔ چہرے پر معصومیت تھی۔

اسے بہت شدید تاؤ آیا تھا' وہ کسی شخص کا اپنی لائبریری میں جانا پسند نہیں کرتا تھا اور وہ لڑکی اس کی غیر موجودگی میں اس کی لائبریری تک بھی پہنچ گئی تھی۔ اتنے دنوں سے وہ جس مروت سے کام لے رہا تھا' وہ ایک دم ختم ہوگئی تھی۔

"تمہیں کس نے اجازت دی کہ تم میری لائبریری میں گھسو؟ دیکھو لڑکی! بہت دن ہوگئے۔ میں مسلسل تمہیں برداشت کررہا ہوں لیکن اس سے زیادہ برداشت کی مجھ میں سکت نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنی حدود میں رہو۔ خوامخواہ میری زندگی میں دخل نہ دو' سمجھیں۔"

ایک لمحے کے غصے نے پچھلے کئی دنوں کی برداشت کو یکدم ہی ختم کردیا تھا' اس نے اس کی آنکھوں میں ہلکا سا نم اترتے دیکھا۔ چہرہ ایک دم زرد ہوگیا تھا لیکن یہ ایک لمحاتی کیفیت تھی جب وہ بولی تو اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش تھا۔

"اوکے سر! میں آپ کی پرائیویسی میں دخل نہیں دوں گی لیکن میں آپ کی لائبریری سے کچھ کتابیں پڑھنے کے لیے تو لے جاسکتی ہوں؟"

وہ اس کے لہجے کے سکون پر حیران رہ گیا تھا۔ اس لمحے وہ اس سے کچھ اور نہ کہہ سکا تھا' بس اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس وقت شام ہورہی تھی' روشنی دھیرے دھیرے اپنا چوغہ سمیٹ رہی تھی۔ وہ چھوٹا سا شہر جس میں شام ڈھلے ہی کاروبارِ زیست ماند پڑنے لگتا تھا' اس وقت اجڑنے لگا تھا۔ بازار ویران ہورہا تھا' کچھ دکاندار اپنی دکانوں کو تالا لگا رہے تھے اور کچھ لگانے والے تھے اور کچھ دکانیں ایسی تھیں جنہیں ابھی رات تک روشن ہی رہنا تھا۔ لوگ دھیرے دھیرے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے تھے اور وہ اپنے گھر سے نکل کر یہاں آیا تھا۔

شروع شروع میں ایک بڑے شہر کی زندگی چھوڑ کر اس پہاڑی علاقے میں رہنا اسے بہت مشکل لگا تھا۔ ایک میدانی علاقے کے رہنے والے کو پہاڑی زندگی بہت مشکل لگتی ہے' اسے بھی لگتی تھی۔ پہاڑیوں پر چڑھنے سے وہ تھک جاتا تھا۔ زیادہ دیر تک وہ چل نہیں سکتا تھا۔ یہاں کی سردی اسے ناقابل برداشت لگتی۔ وہ برف جسے کھڑکیوں کے پیچھے گرتا ہوا دیکھنا اسے بہت رومانی لگتا تھا' آہستہ آہستہ اسے یہ برف بھی تنگ کرنے لگی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ کسی حد تک اس زندگی کا عادی ہوگیا تھا۔ پچھلی زندگی کے برعکس یہاں بہت نیا پن تھا لیکن اس نئے پن میں اسے کوئی خوشی نظر نہیں آتی تھی۔ شاید وہ دور جب ہر نئی چیز کو دیکھنے' پرکھنے اور اسے جاننے کی جستجو انسان کے اندر زندہ ہوتی ہے' گزر چکا تھا۔ اس لیے وہ اجنبیوں کی طرح انہیں دیکھ کر گزر جاتا۔ کبھی کبھی وہ شام کے وقت یوں ہی سڑکوں پر گھومنے آجاتا تھا اور پھر کبھی سردی کے ہاتھوں اور کبھی ویرانی کے ہاتھوں مجبور ہوکر واپس گھر لوٹ جاتا لیکن اس شام نہ تو ہوا میں تیزی اور تندی تھی اور نہ ہی ویرانی اپنے نقطہ عروج تک پہنچی تھی' اس لیے وہ اپنے قدموں کو سفر پر مجبور کررہا تھا۔

دکانیں بند کرتے ہوئے کچھ دکانداروں نے اس کی طرف دیکھا تھا' دوسرے کچھ دکانداروں نے اسے اپنی طرف بھی بلایا تھا لیکن وہ کہیں نہیں رکا تھا' چلتا رہا تھا۔ ہوا اب دھیرے دھیرے سرد ہونے لگی تھی اور اس کی چادر میں گھس کر اس کا ہاتھ تھام رہی تھی۔ اس نے پروا نہیں کی تھی' اس کی آنکھوں میں تلاش تھی' کس کی...؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا۔

شاید یہ وہی تلاش تھی جو ہر آرٹسٹ کی روح کی کھڑکی سے جھانک رہی ہوتی ہے جسے وہ لفظوں' رنگوں' جذبوں اور سُروں میں تلاش کرتا ہے۔ شاید یہ کسی کے انتظار کی کیفیت تھی جو اس کے اندر گھل مل چکی تھی لیکن اس عمر میں جب انسان کا سارا انتظار اور اس کی ساری تلاش ختم ہوجاتی ہے اسے کس کا انتظار ہوسکتا تھا؟

دولت' عزت' شہرت' رشتے' محبت۔ زندگی نے اسے سب ہی کچھ تو دیا تھا' اس سے زیادہ کوئی انسان کس چیز کی جستجو کرسکتا ہے؟ جیسے انسان پرانا کپڑا پہن پہن کر اس سے اکتا جاتا ہے' ویسے ہی ان سب چیزوں کا استعمال در استعمال کرکے وہ بھی ان سے اوب چکا تھا'

ان میں سے کسی چیز کی خواہش بھی اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی تھی' زندگی اب جیسے ایک جگہ آکر ٹھہر چکی تھی اور وہ صبح کو شام اور شام کو رات کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کرتا تھا۔ دن رات کے سارے لمحے بس گزار رہا تھا۔ اگرچہ انہیں گزارنے کی کوئی خواہش اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی تھی اور درحقیقت وہ بس انہیں گنوا رہا تھا۔

اس کے پاس زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا جس کو حاصل کرنے تک وہ جینا چاہتا۔ سو زندگی بس گزر رہی تھی اور کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا کہ وہ گزر بھی نہیں رہی تھی' ٹھہر سی گئی تھی اور اس ٹھہری ہوئی زندگی میں گزرے ہوئے کچھ دنوں سے کچھ ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سا احساس..... اور وہ عجیب سا احساس یہ تھا کہ وہ لاشعوری طور پر اس لڑکی کا انتظار کرنے لگا تھا جو اس دن کی ڈانٹ کے بعد دوبارہ اس کے گھر نہیں آئی تھی' وہ سوچتا تھا کہ۔

"کہاں تو وہ لڑکی صبح صبح اس کے گھر میں آن دھمکتی تھی اور کہاں ایک ہفتے سے اس نے پلٹ کر اس کی خبر تک نہ لی۔" پھر دوسری سوچ اس کے سامنے آجاتی۔

"کہیں اس دن والی میری کسی بات پر وہ ناراض تو نہیں؟ لیکن اس کے چہرے کے ایکسپریشنز سے تو نہیں لگا تھا کہ....." وہ خود کو ڈانٹ کر اس سوچ سے پیچھا چھڑاتا رہا تھا۔

"میں یہی چاہتا تھا کہ وہ میری زندگی میں دخل نہ دے اور جب وہ چلی گئی ہے تو میں اس کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں۔" اس لمحے بھی وہ اس کی سوچ کو یوں ہی اپنے ذہن سے جھٹکنا چاہتا تھا کہ واپسی کے رستے پر اس کا گھر اسے نظر آیا تھا اسی لمحے اسے احساس ہوا تھا کہ گزشتہ دس پندرہ دنوں میں وہ اس لڑکی کا عادی ہو چکا تھا۔ کچھ ایسا تھا اس لڑکی میں کہ وہ باقی لوگوں کے برعکس اس کی زندگی کے معمولات میں داخل ہو گئی تھی اور اس لمحے اس نے خود اپنے سامنے ہار تسلیم کر لی اور اس کے گھر کے کھلے ہوئے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔

ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ وہ واپس چلا جائے لیکن جب خود سے شکست کھا ہی لی تھی تو پھر جھجک کیسی' یہی سوچ کر وہ اندر آیا تھا۔ اس کی ماما سے اس کا پوچھا تو انہوں نے بتایا تھا کہ وہ بیمار ہے' وہ اسے اس کے کمرے میں ہی چھوڑ آئی تھیں۔ انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ حیرت سے اٹھ بیٹھی تھی۔

"آئی ایم سوری سر! میں آپ کی کتابیں دینے نہیں آسکی اور آپ کو خود آنا پڑا۔" وہ اس کے آنے کے مقصد کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ شرمندہ ہو گیا کہ وہ اس کو کیسا انسان سمجھتی ہے۔

"میں کتابیں لینے نہیں آیا' تم کئی دنوں سے آئیں نہیں تو میں تمہارا حال پوچھنے آیا ہوں۔" اپنی انا کو ضرب لگاتے ہوئے وہ سچ بول گیا۔

"رئیلی سر! آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں؟" وہ انگلی سے اپنی طرف اشارا کرتے ہوئے حیرت سے بولی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے بیماری سے اترے ہوئے چہرے پر ایک دم رونق آگئی تھی' خوشی سے وہ کھل اٹھی تھی۔ اس کی خوشی دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیا۔

"اب ہم دوست بن گئے ہیں نا؟"

وہ اس کے لہجے کی امید کو توڑ نہیں سکا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ شاید دو مختلف نسلوں کے نمائندہ لوگ اچھے دوست نہ بن سکیں۔ اس نے اس کی آفر کو قبول کر لیا تھا اور وہ لڑکی اپنی ساری بیماری بھول کر تازہ دم ہو گئی تھی۔ بچوں کی طرح اس نے اپنی ایک ایک چیز اسے دکھائی تھی۔ وہ مسکرا کر دیکھتا رہا تھا۔ جب وہ گھر جانے کے لیے کھڑا ہوا تو اس نے دیکھا تھا کہ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا' لان کی لائٹ کی روشنی میں چمکتے ہوئے دو آنسو۔

"کیوں؟ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں' وہ تو ہمیشہ ہنستی مسکراتی ہوئی آنکھیں رکھتی تھی۔ یہ آنسوؤں سے بھری آنکھیں اس نے کہاں سے لیں؟" وہ خود سے سوال کر رہا تھا۔

"آپ کو پتا ہے سر! جس دن میں نے آپ کو دیکھا تھا تو مجھے سب سے پہلا خیال کس کا آیا تھا؟" وہ پوچھ رہی تھی یا شاید بتا رہی تھی۔ لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی جو اس کے لہجے کو عجیب تر بنا رہی تھی۔

"کس کا؟" اس کی آواز بس اتنی سی تھی کہ صندل اسے سن سکے۔ وہ رک کر بولی۔

"اپنے پاپا کا۔ آپ آہستہ آہستہ چل رہے تھے' آپ کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور آپ لحہ بہ لحہ مجھ سے دور ہوتے جا رہے تھے اور مجھے لگا کہ پاپا مجھ سے دور جا رہے ہیں اور پھر میں آپ کے پیچھے بھاگی تھی۔ آپ نے میری آواز' میری صدا نہیں سنی تھی۔ شاید بابا نے بھی نہیں سنی تھی۔" وہ کہیں اور کھوئی ہوئی تھی' اس کے لہجے کا مخاطب تو وہ ضرور تھا' اس کی آنکھوں کا مطلوب کوئی اور تھا۔

"اور سب سے مزے کی بات آپ کو بتاؤں؟" وہ ایک دم سے اپنے سابقہ انداز میں لوٹ آئی بلکہ پہلے جیسی صندل بن گئی۔

"وہ یہ کہ میں نے اپنے بابا کو حقیقت میں دیکھا ہی نہیں ہے وہ تو میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے۔" پتا نہیں یہ بات ہنسنے والی تھی یا نہیں لیکن وہ قہقہہ لگا کر ہنسی تھی' وہی ہنسی جس کی جھنکار وہ اس کی عدم موجودگی میں اپنے خالی گھر میں محسوس کرتا رہا تھا۔

"اور پتا ہے میں آپ کے گھر میں اسی لیے آتی تھی کہ اپنے بابا سے مل سکوں۔" وہ مزے سے بتا رہی تھی۔ اس کے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس لی تھی' ایک آوارہ سی ہنسی بہت طویل عرصے کے بعد اس کے دل کے خالی مکان میں گونجی تھی۔

اسے وہ لڑکی تھوڑی سی پاگل لگی تھی جو لمحے بھر میں بدل جاتی تھی' اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ اس آوارہ ہنسی کو اپنے دل سے بے دخل کرنا بھول گیا تھا جو اجنبیوں کی طرح اس کے دل میں کوئی سر چھپانے کا ٹھکانا ڈھونڈ رہی تھی اور غلطی سے وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔ اسے سر چھپانے کا آسرا مل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ان کے درمیان نسلوں کا فرق تھا' "جنریشن گیپ" لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان دوستی ہو گئی' بہت اچھی دوستی۔ وہ سارا دن ہنستی کھلکھلاتی رہتی۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مزے دار لطیفے لاتی اور اسے ہنسانے کی کوشش کرتی اور جب ناکام ہو جاتی تو منہ بنا کر بیٹھ جاتی۔

"جائیں سر! اب میں آپ کو کوئی لطیفہ نہیں سناؤں گی۔" اور اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر وہی آوارہ سی ہنسی اس کے دل کے خالی مکان سے نکلتی اور اس کے گھر میں چکرانے لگتی۔

"آپ کو پتا ہے سر! ایک چڑیا گھر میں ایک گدھا تھا' ایک دن کسی نے چڑیا گھر کے جانوروں کو لطیفہ سنایا'

سارے جانور ہنس پڑے لیکن وہ گدھا خاموش رہا' تھوڑی دیر بعد جب سارے جانور خاموش ہوگئے تو گدھا ہنس دیا۔ کسی نے پوچھا "میاں گدھے! تم کیوں ہنس رہے ہو؟" تو وہ گدھا معصومیت سے بولا۔ "اس لیے کہ مجھے اب وہ لطیفہ سمجھ میں آیا ہے۔"

وہ لفظ گدھا پر زور دے کر کہتی اور وہ خفگی سے اسے گھورنے لگتا پھر بیٹھے بیٹھے وہ بڑے مفکرانہ انداز میں کہتی۔

"سر! میں نے آپ کے لیے ایک چیز سوچی ہے' آپ کو پسند آئے گی۔"

"کیا؟" وہ پوچھتا۔

"وہ یہ کہ آپ خودکشی کرلیں۔" وہ اس کے اس شاندار مشورے پر حیران ہو کر دیکھتا۔ "دیکھیں جس طرح کی زندگی آپ گزار رہے ہیں' اس سے تو بہتر ہے کہ آپ خودکشی کرلیں۔" وہ وضاحت کرتی تو وہ بول پڑتا۔

"کیسی بھی سہی زندگی گزار تو رہا ہوں۔"

"گزار رہے ہیں۔" وہ طنز سے ہنستی۔ "غلط' آپ زندگی کو نہیں گزار رہے' زندگی آپ کو گزار رہی ہے۔"

"تمہیں پتا ہے میری عمر کتنی ہوگی؟" وہ اس سے پوچھتا پھر خود ہی جواب بھی دیتا۔ "پچاس سال' تمہاری عمر نہیں ہے جتنا میرا تجربہ ہے۔ تم سے بہتر جانتا ہوں میں اس زندگی کو۔" گزری زندگی کی تلخی اس کے لہجے میں سرایت کرجاتی۔

"زندگی کو سمجھنے کے لیے عمر' تجربے اور کتابوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے کہ میں آپ سے بہتر طور پر زندگی کو جانتی ہوں۔" وہ پورے وثوق سے کہتی اس طرح کہ وہ اس کا یقین توڑنے کے بجائے بات کا رخ بدل دیتا۔

☆ ☆ ☆

"سر! یہ جو "حیدر علی شاہ" ہیں نا! آپ کے ہم نام تو ہیں لیکن ان کی شخصیت آپ سے بالکل مختلف ہے۔ یہ بہت اچھا لکھتے ہیں' ان کی کہانیوں میں زندگی نظر آتی ہے' ان کے کردار زندگی اور خوشی سے بھرپور قہقہے لگاتے ہیں' اتنے زندہ دل کردار کہ انہیں پڑھ کر' ان سے مل کر انسان کا دل بھی چاہتا ہے کہ وہ زندگی سے کھیلے۔" بات کرتے کرتے صندل نے اس کی طرف دیکھا' وہ مسکرا دیا' اس کے اس طرح مشابہت اور فرق بیان کرنے پر۔

"آپ کو ان کی کتابیں ضرور پڑھنی چاہئیں۔ آپ میں زندگی سے فرار کی جو خواہش ہے' وہ ختم ہوجائے گی۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"تمہیں کیا اچھا لگتا ہے اس کی کہانیوں میں؟" اس نے بات آگے بڑھانے کو پوچھا۔

"مجھے۔" وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ "مجھے وہ ڈپس اچھا لگتا ہے جو اس کی کہانی کی ہیروئن کے گال میں اس وقت پڑتا ہے جب وہ روتے روتے ہنس دیتی ہے اور اس کی ہنسی کی دھوپ جب اس گھڑے میں رکے ہوئے نمکین پانی پر پڑتی ہے تو اس میں سے قوس قزح کے رنگ ایک ایک کرکے گزرنے لگتے ہیں اور مجھے اس کی کہانی میں اس چھوٹے سے بچے کی خوشی اچھی لگتی ہے جو گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے نشانہ لگ جانے پر اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہ خوشی سے اچھلنے لگتا ہے اور ہر بار اس کا پیر ٹوٹی ہوئی چپل سے باہر نکل جاتا ہے مگر اسے اس ٹوٹی ہوئی چپل کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔"

وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی اس نے نہیں دیکھا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے پر کتنی حیرت پھیل چکی تھی' وہ بولتی جارہی تھی۔

"اور مجھے اچھا لگتا ہے اس کی کہانی کا وہ ہیرو جو روز سائیکل پر بیٹھ کر نوکری ڈھونڈنے جاتا اور ہر روز جب وہ ناکام ہوجاتا تو بجائے اس کے کہ وہ مایوس ہوتا' وہ ہنستے مسکراتے اپنے سائیکل کے پہیوں میں لگے ہوئے کیچڑ کو میلے کپڑے سے صاف کرتا اور اگلے دن گنگناتا ہوا پھر سے نوکری کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا اور..." اس نے صندل کی بات کاٹ دی۔

"تمہیں نہیں لگتا صندل! کہ یہ شخص جھوٹ لکھتا ہے۔ بھلا روتے ہوئے بھی کوئی ہنس سکتا ہے؟" یہ بات کہتے ہوئے وہ صندل کی وہ ہنسی بھول گیا تھا جو روتے روتے اس کے چہرے پر بکھر گئی تھی۔

"بھلا وہ بچہ کیسے اچھل سکتا ہے' جس کی چپل ٹوٹی ہو اور بار بار ٹھوکر کھایا ہوا انسان ہنس کیسے سکتا ہے' گنگنا کیسے سکتا ہے؟" وہ جیسے اسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ شخص جھوٹا ہے۔

"یہی تو فرق ہے آپ میں اور حیدر علی شاہ میں کہ وہ کہتا ہے کہ زندگی ہے اور آپ کہتے ہیں کہ زندگی کہیں نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے آپ نے کسی روتے ہوئے انسان کو ہنستے ہوئے نہ دیکھا ہو لیکن اس نے دیکھا ہے اور اس نے چاہا کہ وہ دوسروں کو بھی یہ زندگی دکھائے۔ اور یہی فرق ہے آپ میں اور مجھ میں کہ آپ کو اس زندگی پر یقین نہیں آیا اور مجھے آگیا۔ جانتے ہیں کیوں؟ صرف اس لیے کہ میں زندگی کو دیکھنا چاہتی تھی' اس کے ساتھ کھیلنا چاہتی تھی' آپ اسے دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے اس لیے وہ آپ کو نظر نہیں آئی۔" وہ بہت یقین سے بولی تھی۔

"یہی کہتا تھا حیدر بھی' اس کو بھی لگتا تھا کہ دنیا کا ہر غم زندگی کی خواہش کے آگے چھوٹا ہے' وہ بھی یہی کہتا تھا جو تم کہتی ہو۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ وہ زندگی کو گد گدائے' اس کے ساتھ کھیلے لیکن زندگی نے اسے کچھ نہیں دیا' اس شخص کو مار ڈالا جو کہتا تھا کہ زندگی ہے' ہر طرف ہے' ہر جگہ ہے' وہی زندگی کے ہاتھوں شکست کھا گیا....."

احساس بے بسی' غم' دکھ' سسکیاں' چیخیں' آنسو' ایسا بہت کچھ تھا اس کے لہجے میں' اس کے لفظوں میں اور اس کی آنکھوں میں جسے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا اور جو صندل کو پہلی بار نظر آیا تھا۔ وہ حیران تھی' بہت حیران۔ کئی لمحوں تک تو وہ بول ہی نہیں سکی پھر انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کمزور سے لہجے میں پوچھا۔

"آپ حیدر علی شاہ ہیں؟" اور جواب میں اس نے اس دکھوں سے بوجھل شخص کے سر کو جھکتے ہوئے دیکھا جیسے وہ اپنے جرم کا اقرار کررہا ہو۔

"اب وہ زندگی کہاں گئی سر؟ آپ نے اسے کہاں کھو دیا؟"

وہ یقین کرتے بھی بے یقین تھی کہ اس کے اندر کبھی زندگی نے جنم لیا تھا۔

"وہ کہیں تھی ہی نہیں صندل! یقین کرو زندگی کہیں ہوتی ہی نہیں۔ ہم ساری عمر یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم زندگی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں لیکن بہت دیر سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم زندگی کے پیچھے نہیں' زندگی سے بھاگ رہے ہیں۔ لمحہ بہ لمحہ اس سے دور جارہے ہیں۔ بس وہی ایک لمحہ ہوتا ہے جب ہم اس دنیا میں آتے ہیں جو زندگی سے بھرا ہوتا ہے' باقی کا سارا وقت ہم زندگی کو کھو رہے ہوتے ہیں۔" صندل اس بار انکار نہ کرسکی تھی۔

"میں جانتی ہوں' ہمارا ہر قدم ہمیں زندگی سے دور کرتا ہے لیکن یہی قدم ہمیں ایک روز نئی زندگی کے قریب بھی تو کرتا ہے نا!" اب وہ اس کی تائید چاہتی تھی۔

"اسی اک زندگی کی آس میں ہی تو ہم سب اس زندگی کو جھیل رہے ہیں' اس عمر قید کو برداشت کررہے ہیں۔" وہ اسے بچوں کی طرح سمجھا رہا تھا۔

"لیکن! جتنی بڑی حقیقت وہ زندگی ہے' اتنی ہی بڑی حقیقت یہ زندگی بھی تو ہے۔ اگر اس دنیا اور اس زندگی کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو خدا اس دنیا کو بناتا ہی نہیں پھر صرف وہی دنیا ہوتی' اوپر والی۔" وہ اوپر کی طرف اشارہ کرکے بولی تھی۔

کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اٹھارہ انیس سال کی ایک چھوٹی سی لڑکی ہے' شاید زندگی کو سمجھنے کے لیے واقعی علم' عمر اور تجربے کی اہمیت نہیں ہوتی' وہ خاموش رہا تھا۔

"آپ کو پتا ہے سر! زندگی نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ دولت' عزت' شہرت وہ سب کچھ جس کی کوئی بھی شخص تمنا کرسکتا ہے مگر زندگی' بہت کم لوگوں کو یہ

سب کچھ ایک ساتھ دیتی ہے اور آپ وہ خوش قسمت ہیں جسے یہ سب کچھ ایک ساتھ ملا ہے۔ آپ کو زندگی سے بہت سے شکوے ہوں گے کہ اس نے آپ کو یہ کیوں دیا؟ وہ کیوں نہ دیا؟ لیکن سر! آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ آپ نے زندگی کو کیا دیا ہے؟" وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں نے؟" وہ آسمان کی طرف دیکھ کر دھیرے سے ہنسا تھا۔

"میں نے اپنے شب و روز' اپنے ماہ و سال' اپنے خیال' اپنے لفظ' اپنے رشتے سب کچھ دیا ہے اس زندگی کو لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرا' یہ مجھ سے اور مانگتی ہے۔"

"لیکن بدلے میں بہت کچھ دیا بھی تو ہے۔ آپ کے لفظ' آپ کے خیال اور آپ کا ہنر جو بہت قیمتی ہے۔ یہ سب بھی تو زندگی نے آپ کو دیا ہے۔" وہ ہر قیمت پر اسے قائل کرنا چاہتی تھی۔

"کہاں ہے وہ سب؟ کیا تمہیں کہیں یہ سب نظر آرہا ہے؟ میرے ہاتھ تو خالی ہیں۔ جو کچھ میرے پاس تھا وہ تو کچرا تھا' بے کار تھا' اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی' وہ سب کچھ بے قیمت تھا۔"

وہ سب کچھ انمول تھا۔" وہ اب بھی اپنی بات پر ڈٹی رہی۔

"اگر وہ سب کچھ بے کار نہیں تھا تو وہ کیوں چلی گئی مجھے چھوڑ کر۔" وہ ایک دم پھٹ پڑا تھا۔ "وہ بھی یہی کہتی تھی' شاید شروع شروع میں ہر عورت ہی یہی کہتی ہے اور پھر اپنی ہی کہی ہوئی باتیں بھول جاتی ہے پھر اسے لگنے لگتا ہے کہ محبت سے پیٹ نہیں بھرا جاسکتا' اسے لگتا ہے کہ لفظوں کے محل میں اس کا سانس گھٹ جائے گا۔ خیالوں کے سفر میں وہ مرسیڈیز کے سفر کا مزہ نہیں لے سکتی' کہانیوں سے گھر کا چولہا نہیں جلا سکتی اور ایک دن وہ چلی جاتی ہے' اسی چھوٹے سے گھر کو چھوڑ کر جو کبھی اسے محل لگا کرتا تھا پھر وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی کہ اس شخص کا کیا ہوا جسے وہ خوابوں کی دنیا میں اپنے سہارے لائی تھی پھر سب کچھ بھول جاتی ہے وہ۔" اس کے ایک ایک لفظ میں زہر کی سی تلخی تھی۔

لہجہ درشت تھا' لفظ خود اپنا مذاق اڑانے کے لیے اس نے چنے تھے' وہ اپنا ہی مذاق اڑا رہا تھا' وہ شخص اس لمحے اپنے دل کی باتیں اس لڑکی سے کر رہا تھا' جسے اس سے ملے ہوئے ڈیڑھ مہینہ بھی نہیں ہوا تھا اور وہ لڑکی لفظوں کی تلاش میں تھی۔ ایسے سحر انگیز لفظوں کی تلاش میں جو اس زخم زخم شخص کے دل کو بہلا سکیں۔

"لیکن سر! کسی ایک شخص کے چلے جانے سے زندگی رک تو نہیں جاتی ناں' وہ آپ کے قابل ہی نہ تھیں۔"

"اور اگر وہ شخص آپ کے لیے زندگی جیسا ہی اہم ہو تو پھر؟"

"تو بھی زندگی کسی کے لیے نہیں ٹھہرتی۔" وہ یقین کے ساتھ بولی۔ اس نے اپنی بات کے جواب میں اسے مبہم سا ہنستے ہوئے دیکھا۔

"میں بھی یہی سوچتا تھا' میں نے سوچا کہ شاید ہر کامیاب شخص ہی اپنی ازدواجی زندگی میں بد قسمت ہوتا ہے' اسی لیے میں نے خود کو سنبھالا' اپنے لیے ہی نہیں اپنے بیٹے کے لیے بھی اور تمہیں پتا ہے صندل! میرا بیٹا بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ کہتا تھا' اسے اپنی ماں کی ضرورت ہے اور وہ چلا گیا' یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے بغیر میں کتنا اکیلا رہ جاؤں گا۔ مجھے بھی اس کی ضرورت تھی لیکن وہ لوٹ کر واپس نہیں آیا۔"

کوئی بہت گہرا دکھ اس کے چہرے کی لکیروں میں بہنے لگا تھا۔ نمکین سیال کی صورت' ایک دل گیر بے بسی نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔ شاید اولاد کی محبت نے اسے توڑا تھا اور پھر وہ دنیا کے کسی رشتے پر اعتبار نہ کر سکا پھر کبھی وہ اپنے وجود کو یکجا نہیں کر سکا۔ زیست کرنے کا کوئی سبب پھر اس کے ہاتھ نہ آیا تھا۔

صندل خاموشی سے اس کے آنسوؤں کو بہتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ خود پر کٹھور پن کی جتنی چادریں اس نے چڑھا رکھی تھیں اس لمحے وہ ایک ایک کر کے خود ہی انہیں اتار رہا تھا۔ بہت دیر بعد اس کے آنسو رکے

تھے، شاید صدیوں بعد۔

"اس نے کبھی واپس آنے کا نہیں کہا؟" اس بار صندل نے بہت سوچ کر سوال پوچھا اور جواب میں اس نے ایک تلخ سچ بولا تھا۔

"نہیں۔"

"آپ نے کبھی اسے بلایا بھی نہیں۔" وہ اسے کرید رہی تھی۔

"نہیں، جب اسے میری پروا نہیں تو میں اسے کیوں یاد کروں؟ کیوں بلاؤں اسے؟" وہ بچوں کی طرح ضدی لہجے میں بولا۔

"اسے واپس بلا لیں۔" وہ سنجیدہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"اور اگر اس نے انکار کر دیا تو؟" وہ اپنے خدشے کو زبان دے رہا تھا۔

"آپ دل سے بلائیں گے تو وہ ضرور آئے گا۔" وہ بہت یقین سے بولی تھی۔

وہ خاموشی سے اس لڑکی کا چہرہ دیکھتا رہا اسے بتا بھی نہ سکا کہ وہ خود اسے چھوڑ گیا تھا تو وہ اسے کیسے بلاتا؟

☆ ☆ ☆

ان کی دوستی میں اب اعتماد بھی شامل ہو گیا تھا گو کہ اس دن کے بعد کوئی جذباتی لمحہ ان کے درمیان نہیں آیا تھا لیکن اب صندل بہت بے تکلفی سے اس سے باتیں کرنے لگی تھی۔ کبھی وہ اسے کسی کھیل میں شامل کرنا چاہتی تو کبھی وہ اسے اپنے ساتھ سیر کے لیے لے جاتی، وہ کہتی۔

"چلیں ٹینس کھیلتے ہیں۔" وہ اتنی سردی میں اس پیشکش کو فوراً رد کر دیتا تب وہ دوسری آفر دیتی۔

"تو پھر کیرم کھیلتے ہیں، وہ تو کمرے میں ہی کھیلا جا سکتا ہے نا!"

تو وہ کہتا۔ "اتنی سردی میں کیرم کھلوا کر میری انگلیاں تڑواؤ گی کیا؟" اور تب وہ ناراض ہو جاتی۔

"کسی بوڑھے شخص سے دوستی کرنے کا بس یہی نقصان ہوتا ہے۔" وہ جل کر کہتی تو وہ ہنس دیتا اور پھر اس کے ساتھ کھیلنے کے لیے راضی ہو جاتا۔

کسی دن وہ اس کے کچن میں گھس جاتی اور جو تجربے بھی وہ کر سکتی تھی، ان سب کی بھینٹ وہی چڑھتا لیکن اسے یہ سب اچھا لگنے لگا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ یہ صرف دوستی نہیں ہے، ان کے درمیان کوئی اور رشتہ بھی موجود ہے لیکن بہرحال اب وہ دونوں ایک دوسرے کے عادی ہو گئے تھے اور جب وہ لڑکی اس کی عادت بن گئی تو ایک دن اس نے کہا۔

"سر! مجھے کچھ دنوں کے لیے لاہور جانا پڑے گا، ایک ضروری کام آ گیا ہے ورنہ میں کبھی نہ جاتی۔"

پھر وہ پورے ایک ہفتے کے بعد واپس آئی تھی اور اس کے اتنی دیر سے لوٹنے پر وہ اچھی طرح اس سے ناراض بھی نہ ہو سکا تھا۔ جب اس نے اس کے اندر ایک تبدیلی محسوس کی تھی۔ پتا نہیں واقعی کوئی تبدیلی آئی تھی یا نہیں لیکن اس نے دیکھا تھا کہ وہ پہلے سے زیادہ ہنسنے لگی تھی، قہقہہ لگا کر، جانے کیوں اب اسے ہر چیز میں خوبصورتی نظر آنے لگی تھی۔ ٹنڈ منڈ سے درختوں میں بھی اور سوکھے ہوئے پتوں میں بھی۔

اس لمحے بھی وہ اسے دیکھ رہا تھا، جب وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اچانک بھاگ کر اس سے آگے بڑھ گئی تھی، اس نے دیکھا سڑک کے دونوں طرف درخت کھڑے تھے اور وہ ان کے درمیان سڑک پر دونوں بازو پھیلائے سر اٹھا کر ان کے پتوں کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے نیلے آسمان کو دیکھ رہی تھی پھر وہ بچوں کی طرح دونوں بازو پھیلائے گھومنے لگی تھی، جیسے ننھے منے سے بچے کھیلتے ہیں پھر وہ رک گئی تھی اور وہیں سے مڑ کر اونچی آواز میں بولی تھی۔

"سر! یہ آسمان میرے بازوؤں میں کیوں قید نہیں ہوتا؟" وہ ساکت کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ درختوں سے جھڑنے والے پتے جیسے آسمان سے اتر رہے تھے اور وہ ان کی بارش میں نہا رہی تھی۔

"یہ درخت، پھول، یہ پہاڑ مجھ سے اتنے دور کیوں ہیں؟ اور برف کیوں نہیں گرتی؟ یہ برف کب ہو گی؟" وہ اس کے پاس آ گئی۔

"بتائیں ناں، برف باری کب ہو گی؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"تمہیں برف بہت اچھی لگتی ہے؟"

"میں نے ہمیشہ برف کوئی وی پر دیکھا ہے یا پھر خواب میں، میں سچ مچ اسے دیکھنا چاہتی ہوں لیکن برف گرتی ہی نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں حسرت تھی یا شاید اسے ہی ایسا لگا تھا۔

"بس تھوڑے سے دنوں کی بات ہے پھر برف پڑنے لگے گی۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

"جس دن پہلی برف باری ہو گی اور آپ کھڑکیوں کے شیشوں سے پرے اسے گرتے ہوئے دیکھیں گے تو آپ مجھے یاد کریں گے؟" پتا نہیں وہ یہ سوال کیوں پوچھ رہی تھی۔

"نہیں، میں تمہیں یاد نہیں کروں گا۔" اس کے جواب پر اس نے حیرانی سے اسے دیکھا "کیونکہ ہم دونوں ساتھ میں ہی پہلی برف باری دیکھیں گے۔"

وہ ہنس دی، غیر واضح سے انداز میں۔ تب اس نے بات بدلی تھی۔

"تمہارا نام صندل کس نے رکھا تھا؟" وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔

"پتا نہیں، شاید ممانے یا پھر شاید بابا نے رکھا تھا۔" وہ بولی تھی۔

"اور تمہیں پتا ہے صندل کسے کہتے ہیں؟" اور جواباً وہ بڑی تیزی سے بولی۔

"ایک درخت کا نام ہے یہ ہے نا۔" وہ تائیدی انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔ ایک درخت کا نام ہے، جس کی لکڑی خوشبو دیتی ہے لیکن وہ جلائی جاتی ہے پھر تو تمہارا نام خاصا غیر مناسب ہوا، ہے نا!" اس نے اسے چھیڑا تھا۔

"جی نہیں، میرا نام تو بہت اچھا ہے۔ صندل کی لکڑی صرف جلائی تو نہیں جاتی اور اگر جلا بھی دی جائے تو بھی وہ خوشبو تو دیتی رہتی ہے۔ وہ خود تو جل جاتی ہے لیکن اپنے اردگرد خوشبو چھوڑ جاتی ہے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولی تھی اور وہ مسکرا دیا۔

☆ ☆ ☆

آج بھی وہ ہر شام کی طرح سیر کے لیے نکلے تھے لیکن جو عجیب بات تھی وہ یہ تھی کہ آج حیدر علی شاہ خود اسے بلانے آیا تھا اور صندل کو اس کی چال میں ہمیشہ سے زیادہ شکستگی نظر آئی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا پھر وہ دونوں سڑک کے کنارے بنے ہوئے بنچ پر بیٹھ گئے تھے۔ شاید وہ اس کے پھر لاہور جانے پر ناراض تھا۔

"سر! وعدہ، اس بار میں دو تین دن میں واپس آ جاؤں گی اور آپ اتنی سی دیر کے لیے ناراض ہو رہے ہیں اور جب میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے واپس چلی جاؤں گی تو پھر کیا کریں گے آپ؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھی لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔

اسے اس خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔ شاید اسے یقین نہیں آیا تھا۔

"میری مجبوری سمجھیں نا! اگر ضروری کام نہ ہوتا تو میں کبھی نہ جاتی۔" اور اس لمحے اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"اگر میں کہوں کہ رک جاؤ تو رک جاؤ گی؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے عجیب مان بھرے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کہیں گے کہ رک جاؤ تو میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ پورے اعتماد سے بولی۔

"تو پھر رک جاؤ۔" بہت بے قراری سے بولا۔ اس کے لہجے میں کچھ عجیب سی چیز تھی جسے وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ ایک احساس بے بسی کو وہ اپنے اندر اترتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کہا تو تھا مگر اس کا رکنا مشکل تھا۔

"رک جاؤ نا صندل!" وہی آواز پھر آئی تھی لیکن اس بار وہ آنسوؤں کے وزن سے بوجھل تھی۔ کہیں پلکوں کے کناروں سے ایک آنسو ٹوٹا تھا اور لکیروں والے چہرے سے گزرتا ہوا اس کی چادر میں گم ہو گیا تھا۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔"

اسے لگا کہ یہ کوئی عام سوال نہ تھا' اسے لگا کہ آواز اس کے گلے میں پھنس رہی ہے' وہ ان آنکھوں میں بھرے ہوئے شکوے سے اپنی نظر کو چھڑا نہیں پا رہی تھی۔

"کیا؟" بہت دقت سے ایک لفظ اس کے لبوں سے آزاد ہوا۔ اس نے اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں اس کے چہرے سے ہٹالیں تھیں اور دور درختوں کی اوٹ میں سے جھانکتے ہوئے سورج کو دیکھا۔ ایک گہری سانس لی لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز ابھی تک آنسوؤں سے بوجھل تھی۔

"کہ تمہیں کینسر ہے۔" وہ بہت رک رک کر بولا تھا۔

تو وہ وقت آ ہی گیا تھا جس سے وہ بچنا چاہ رہی تھی' وہ کچھ نہیں بول سکی' ایک اداس خاموشی اور شام اس کے ہر طرف بکھری ہوئی تھی پھر اس خاموشی کو حیدر علی شاہ نے توڑا۔

"پرسوں تمہارا آپریشن ہے؟" اس نے ہاں میں سر ہلایا پھر اس نے پوچھا تھا۔

"آپ میرے لیے دعا کریں گے؟" اس کے لہجے میں آس تھی' وہ سسک پڑا تھا۔

"وہ کون سا باپ ہے جو اپنی بیٹی کے لیے دعائیں نہیں کرتا ہوگا؟" صندل کے لبوں سے ایک لفظ نکلا تھا۔

"بابا۔" اور وہ بھی بے اختیار رو دی تھی۔ اس نے اپنی چادر اس کے گرد پھیلا دی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ کائنات تھم گئی ہے اور ساری آوازیں ایک صدا میں ڈھل گئی تھیں۔

"بابا!" اس کی زندگی سارے رشتوں سے خالی تھی۔ صرف ایک رشتہ بول رہا تھا جو خون کے ہر رشتے سے زیادہ مقدم تھا۔

"یاد ہے صندل! ایک دن تم نے مجھ سے کہا تھا کہ زندگی نے مجھے سب کچھ دیا ہے لیکن پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ ایسا کچھ تھا جو زندگی نے مجھے نہیں دیا تھا جس کی میری عمر میں کمی تھی اور مجھے جس کا انتظار تھا اور جانتی ہو صندل! وہ چیز کیا تھی۔۔۔؟ وہ ایک رشتہ تھا جو زندگی نے مجھے نہیں دیا تھا' بیٹی کا رشتہ اور تمہیں پا کر مجھے لگتا ہے کہ آج میں واقعی خوش قسمت ہو گیا ہوں۔" وہ گہری طمانیت سے بول رہا تھا۔

"دیکھنا صندل! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں اللہ سے دعا کروں گا کہ وہ میری عمر بھی تمہیں دے دے۔" اس نے جذباتی انداز میں کہا۔ صندل نے ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"صندل! تم میری زندگی لے لو' یقین کرو بیٹا! مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے اس کے کہنے سے واقعی یہ زندگی صندل کو مل جائے گی۔ اس نے بابا کی لڑکی کی آنکھوں میں زندگی کی خواہش دیکھی تھی' زندہ رہنے کی ایک معصوم سی خواہش' اس زندگی کی جو اس کے لیے بیکار تھی اور وہی زندگی کسی اور کے لیے کس قدر قیمتی تھی۔

وقت نے انہیں ایک عجیب موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ دو ایسے انسانوں کو یکجا کر دیا تھا جس میں سے ایک زندگی سے بیزار تھا اور دوسرا زندہ رہنے کی خواہش رکھتا تھا۔ ایک کے لیے زندگی بے کار تھی اور دوسرے کے لیے دنیا کی سب سے قیمتی شے اور اس کے باوجود وہ اپنی تقدیروں کو ایک دوسرے سے بدل نہیں سکتے تھے' چاہتے ہوئے بھی۔

"کوئی کسی دوسرے کی زندگی نہیں جی سکتا بابا! اور نہ اپنی زندگی کسی اور کو دان کر سکتا ہے اور اگر کر سکتا تو اب تک میری ماں جانے کتنی بار اپنی زندگی مجھے دے چکی ہوتی۔ زندگی مذاق نہیں ہے بابا! یہ بہت خوبصورت ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو میرے دل میں جھانک کر دیکھیں' جو چند سانسوں کی ہوس سے بھرا ہوا ہے۔ کبھی کان لگا کر غور سے سنئے گا۔ بابا! آپ کا دل بھی آپ سے یہی کہے گا کہ جو چند سانسیں بچی ہیں وہ اسے جینے دیں۔ بابا! پلیز' اپنے دل کو اجازت دیں کہ وہ جی سکے' پلیز بابا! پلیز۔" وہ ایک بار پھر رو دی تھی۔

اور وہ زندگی سے بیزار رہنے والا شخص اس لمحے

تڑپ رہا تھا' چاہتے ہوئے بھی وہ اسے تسلی نہیں دے پا رہا تھا۔

"آپ نے مجھے بیٹی کہا ہے نا بابا! تو آپ اپنی بیٹی کی ایک بات نہیں مانیں گے؟" وہ پوچھ رہی تھی اور وہ اسے کبھی انکار نہیں کر سکتا تھا' اس لمحے تو بالکل بھی نہیں۔

"بابا! آپ زندگی کو پھر سے جینا شروع کر دیں' جب میں آپ کی اداس آنکھیں دیکھتی ہوں تو میرا دل کرتا ہے کہ میں کہیں سے ڈھیر ساری خوشیاں لا کر ان میں بھر دوں۔ میں جانتی ہوں' میرے بعد میری ماما اکیلی رہ جائیں گی اور میں ان کے لیے جینا چاہتی ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں آسمان سے ڈھیر ساری زندگی لاؤں اور اسے اپنے اندر بھر لوں۔ ہنسوں' کھلکھلاؤں' زندگی سے بھرپور قہقہے لگاؤں اور کچھ وقت اور گزار لوں' یہاں پر' اس زمین پر' اپنی مما کے ساتھ اور آپ کے ساتھ۔ لیکن میں جانتی ہوں' زندگی مجھ سے روٹھتی جا رہی ہے لیکن آپ کے پاس تو ابھی زندگی ہے پھر آپ کے دل میں اسے بھرپور طریقے سے جینے کی خواہش کیوں نہیں ہے؟ مجھ سے ایک وعدہ کریں بابا! میرے بعد آپ زندگی سے روٹھے نہیں رہیں گے' پلیز وعدہ کریں بابا۔"

اس کا ہر عضو اس لڑکی سے وعدہ کر رہا تھا' جینے کا وعدہ۔ اس نے اپنے دل و زبان سے بھی اقرار کیا تھا' تب وہ پھر بولی تھی۔

"اور یہ بھی وعدہ کریں کہ آپ پھر سے لکھیں گے' آپ کے لفظ آپ کے انتظار میں ہیں' ان کا انتظار ختم کر دیں' انہیں اپنا لیں بابا!" اس نے یہ وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ صندل اس سے زیادہ زندگی کو جانتی تھی پھر وہ واپسی کے لیے اٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆

پھر دو دن مسلسل اس نے صندل کے لیے دعائیں کیں۔ سارا دن شہر میں ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہی تھیں اور پھر رات کو موسم کی پہلی برف باری ہوئی تو اسے صندل سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد آیا اور اسے یاد کرتے ہوئے اس نے اور بھی شدت سے اللہ سے اس کے لیے زندگی مانگی تھی۔

کہتے ہیں اوپر والا بہت مہربان ہے' وہ ہماری دعاؤں میں کوئی کٹوتی نہیں کرتا' وہ ہماری کسی دعا کو رد نہیں کرتا' انہیں قبول کر لیتا ہے' یا تو اسی لمحے یا بعد کے لیے سنبھال کر رکھ لیتا ہے اور یا پھر انسان کے کسی گناہ یا کسی کوتاہی کو اس دعا کے بدلے ختم کر دیتا ہے لیکن وہ کسی دعا کو رد نہیں کرتا اور جو دعا دل سے نکلی ہو' وہ تو کبھی رد ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے بھی یہی لگا تھا کہ ساری کائنات ہاتھ باندھے کھڑی ہے اور اس کی دعا آسمان کے سات پردوں کے پیچھے بیٹھے خدا تک پہنچ رہی ہے اور پھر شاید اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ خدا نے صندل کو زندگی عطا کی تھی' ایک بدی زندگی۔

☆ ☆ ☆

تیسرے دن صندل واپس آ گئی تھی۔ (اپنے وعدے کے مطابق) اسی شہر میں جہاں اس نے ایک پچاس سال کے بوڑھے سے دوستی کی تھی اور وہ ڈھیر سارے پھول لے کر اس سے ملنے آیا تھا' وہ سوئی ہوئی تھی' بہت احتیاط سے اس نے ان پھولوں کو اس کے سرہانے رکھا تھا کہ کہیں وہ جاگ نہ جائے' بہت دیر تک وہ خاموش کھڑا اس کے چہرے کو دیکھتا رہا تھا پھر وہ اسے ڈسٹرب کیے بغیر واپس مڑ گیا تھا۔

دروازے کی دہلیز میں رک کر اس نے مڑ کر ایک بار پھر اس کے چہرے کو دیکھا' جانے کیوں بے اختیار دو آنسو اس کے گالوں پر بہہ گئے تھے' اس نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا۔

"آپ رو کیوں رہے ہیں؟" روتے روتے ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی اور اسے مسکراتا دیکھ کر اسے صندل کے چہرے پر لمحے بھر کے لیے ایک مسکراہٹ نظر آئی جو فوراً "معدوم ہو گئی تھی۔

شاید اس کا وہم تھا' وہ تو آنکھیں موندے ویسے ہی لیٹی تھی' سفید لباس میں پرنور چہرہ لیے' وہ مسکرائی

نہیں تھی اور اب کی بار رویا تو پھر اپنے آنسوؤں کو روک نہیں سکا تھا' صندل واپس آگئی تھی اس کے پاس' ہمیشہ کے لیے۔ اس کا آپریشن ناکام ہو گیا تھا اور اس کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔

اسے زندگی عطا کر دی گئی تھی' ایک بہت لمبی زندگی جو موت کی حد کے بعد شروع ہوتی ہے اور وہ وہاں صندل سے ملنے نہیں آیا تھا' اس کے بے جان ساکت وجود کو آخری بار دیکھنے آیا تھا' آخری بار۔

☼ ☼ ☼

31 دسمبر 2002ء

میں حیدر علی شاہ ہوں' ایک کامیاب ادیب' قلم کار جس کے حرفوں میں زندگی بستی تھی' قہقہے لگاتی تھی اور آنکھ مچولی کھیلتی تھی' لوگ اس کے لفظوں سے زندگی کا مطلب سیکھتے تھے اور پھر ایک دن وہ خود ہی زندگی کا مفہوم بھول گیا تب ایک پیاری سی پری اس کی زندگی میں آئی' اسے زندگی کا مطلب سمجھانے اور پھر اس "کامیاب ادیب" نے زندگی کا مطلب اس چھوٹی سی پری سے سیکھا' وہ جو زندگی گزارنا بھول گیا تھا' اسے اس لڑکی نے زندہ رہنا سکھایا' جینا سکھایا۔

☼ ☼ ☼

1 جنوری 2003ء

میں زندگی سے بیزار تھا' ہر رشتے سے بیزار تھا' مجھے لگتا تھا سارے لوگ جھوٹے ہیں' فریبی ہیں' میں ہر رشتے کو پہن کر اسے اتار چکا تھا پھر صندل ایک نیا رشتہ لے کر میرے پاس آئی' ایک ایسا رشتہ جس سے پیارا رشتہ میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا' بیٹی کا رشتہ اور اس ایک رشتے نے میرے دل سے سارے شکوے اتار دیے اور مجھے واقعی جینا آگیا۔

وہ کہتی تھی "بابا! لکھو" اور میں نے لکھنا شروع کر دیا ہے' لوگ کہتے ہیں میرے لفظوں میں جادو ہے' یہ زندگی اور جذبوں سے بھرے ہوئے ہیں۔" اور میں مسکرا دیتا ہوں اور ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں صندل کی طرف سے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ میرے نہیں' اسی کے لفظ ہیں۔ وہ لفظ جو اگر وہ زندہ ہوتی تو ایک دن خود انہیں لکھتی۔

☼ ☼ ☼

12 جنوری 2003ء

اس نے کہا تھا۔ اپنے بیٹے کو واپس بلا لو' اگر آپ دل سے اسے بلائیں گے تو وہ ضرور واپس آئے گا اور میں نے اسے بلایا دل سے اور سچ مچ وہ واپس آگیا۔ وہ کہتا ہے "بابا! اب میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اور میں ہنس دیتا ہوں اور اس لڑکی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جسے مجھ سے زیادہ اس کے لوٹ آنے کا یقین تھا۔ میں نے اور اس نے مل کر یہاں ایک اسکول بنایا ہے جہاں ننھے ننھے فرشتوں جیسے بچے پڑھنے آتے ہیں اور جب فارغ ہو کر وہ معصوم چہروں سے میری طرف دیکھتے ہیں اور اپنی چہکتی ہوئی معصوم آواز میں مجھ سے فرمائش کرتے ہیں کہ میں انہیں کہانی سناؤں تو میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے اور میں انہیں خوشیوں کی کہانیاں سناتا ہوں اور ایک پری کی کہانی سناتا ہوں جو جادو کی چھڑی گھما کر سارے طلسم ختم کر دیتی ہے اور پتھر بنے ہوئے انسان جاگ جاتے ہیں۔

اور وہ کہانی سناتے ہوئے مجھے صندل بہت یاد آتی ہے جس نے ایک دن جادو کی چھڑی گھما کر مجھے پتھر سے انسان بنایا تھا۔

☼ ☼ ☼

23 جنوری 2003ء

"ایک دن میں نے صندل سے کہا تھا کہ اس کا نام بہت غیر مناسب ہے لیکن اب مجھے لگتا ہے اس کا نام بہت اچھا تھا اور کسی نے بہت سوچ سمجھ کر اس کا نام صندل رکھا تھا' وہ واقعی صندل جیسی تھی۔ صندل جس کی لکڑی جل جاتی ہے لیکن جس فضا میں جلتی ہے اسے معطر کر دیتی ہے' خوشبو بھر دیتی ہے' میری زندگی کی فضا بھی صندل کی خوشبو سے بوجھل ہے۔ میں جانتا ہوں وہ جا چکی ہے' خاک ہو چکی ہے' راکھ ہو چکی ہے لیکن اس کی خوشبو میرے کمرے' میرے

گھر کے در و دیوار' میرے دل کے موسموں میں اور میری زندگی میں رچ بس چکی ہے۔"

اس نے ڈائری بند کر دی' کمرے کے باہر برف گر رہی تھی اور کھڑکی کے شیشوں پر سفید دھبے ڈال رہی تھی' اس نے آگے بڑھ کر آتشدان میں آگ جلائی۔ صندل کی لکڑی جل جل کر کمرے کو گرم کرنے لگی اور ایک مانوس اور معصوم مہربان خوشبو بن کر فضا میں بکھرتی جا رہی تھی' کمرے میں اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا لیکن وہ کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

کھڑکی سے باہر گرتی ہوئی برف نے جھانک کر کھڑکی کے شیشے سے آنکھیں لگا کر اندر دیکھا تھا' وہاں کوئی نہیں تھا لیکن وہ اب بھی کسی سے باتیں کر رہا تھا' برف نے کان لگا کر سنا تھا' وہ کہہ رہا تھا۔

"میں جب بھی اپنے آتشدان میں صندل کی لکڑی جلاتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ تم میرے پاس ہو' بہت پاس اور ابھی تم کچن سے میرے لیے گرم گرم سوپ بنا کر لاؤ گی یا ابھی لائبریری سے مجھے آوازیں دیتی ہوئی آؤ گی اور کہو گی۔

"یہ کتاب بہت اچھی ہے' اس میں زندگی رہتی ہے۔ آپ اسے پڑھیں' یہ آپ کو بھی زندہ کر دے گی۔" اور میں کہوں گا۔

"نامعقول لڑکی! یہ میری ہی کتاب ہے۔" اور میری بات پر تم کھلکھلا کر ہنس دو گی۔

وہ ذرا دیر کو رکا اور اپنا ہاتھ اپنے سانس کے سامنے رکھ کر اسے محسوس کیا۔ صندل کی خوشبو اس کے اندر اتر گئی تھی۔

"تمہاری خوشبو نہیں جاتی صندل! میرے گھر سے' میرے دل سے اور نہ کبھی یہ جائے گی۔ تم میرے دل کی سرزمین کو بھی خوشبودار کر گئی ہو' اب چاہے یہاں نیم کا درخت لگا دیا جائے' وہ بھی خوشبو دے گا' اب یہاں خوشبو کی نسل ہو گی جو سارے در و بام کو مہکا دے گی۔" اس نے اپنے ہاتھ کو ایک بار پھر اپنی سانس کے راستے میں رکھا تھا۔

"عجیب ہوتی ہے یہ صندل کی لکڑی' یہ اس ہاتھ میں بھی اپنی خوشبو چھوڑ جاتی ہے جو اسے جلاتا ہے۔" وہ سوچ رہا تھا اور ایک آنسو چپکے سے اس کی آنکھوں کے کناروں سے پھسل گیا تھا پھر دوسرا پھر تیسرا۔۔۔ اور پھر کسی نے دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"زندگی کو رونے میں ضائع نہیں کرتے' آپ کو رونا نہیں ہے' ہنسنا ہے اور ان لوگوں کو ہنسانا ہے جو ہنسنا بھول گئے ہیں۔"

یہ صندل کی آواز تھی جو بہت مدھم تھی لیکن جسے اس نے اور کھڑکی کے شیشے سے لگی ہوئی برف نے' دونوں نے واضح طور پر سنا تھا اور اسے لگا کہ اس کے آنسو اس کے دامن میں نہیں گرے تھے صندل کی آگ نے آگے بڑھ کر انہیں سمیٹ لیا تھا اور وہ شوں کی آواز کے ساتھ ختم ہو گئے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے آنسو پونچھ دیے۔

صندل کی آگ پھر جل اٹھی تھی۔ باہر گرتی ہوئی برف نے ایک گہری سانس لی۔ ان کی باتوں پر ہولے سے مسکرائی اور کھڑکی کے شیشے کو مکمل طور پر ڈھانپ دیا تھا تاکہ انہیں کوئی اور نہ دیکھ سکے اور پھر آگے بڑھ گئی تھی۔

عمیرہ احمد

تھوڑا سا آسمان

فاطمہ ایک بے حد بدصورت لڑکی تھی۔ بی اے بی ایڈ کرنے کے بعد وہ ایک اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ اپنی بدمزاجی کی وجہ سے وہ اپنے گھر والوں کے لیے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی دوست کی مدد سے یتیم خانے سے ایک بچہ حاصل کیا اور شہر سے دُور جا کر رہنے لگی۔ وہاں ایک کولیگ کے حالات دیکھ کر اس کا مزاج بہتر ہونے لگا اور پھر اسے کوڑے کے ڈھیر سے دو بچے ملے وہ انہیں بھی گھر لے آئی۔

کئی سالوں بعد فاطمہ کے پاس موجود تینوں بچے شہیر، ثانی اور ٹوی اب جوان ہو چکے ہیں اور بہترین اوصاف کے مالک ہیں۔ ٹوی کو اداکار بننے کا شوق ہے۔

منصور علی نے دبئی میں بہت پیسہ کمایا تھا اور اب پاکستان میں اپنا بزنس سیٹ کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں صبغہ اور امبر کا نکاح اپنے بھائی مسعود علی کے بیٹوں اسامہ اور طلحہ کے ساتھ کیا۔ ان کی بیٹی امبر اور بیوی منیزہ کو اپنی دولت کا بہت غرور تھا جبکہ صبغہ مختلف عادات کی مالک تھی۔

ہارون کی زندگی کا مقصد پیسہ کمانا تھا۔ اس نے اپنی تایا زاد شائستہ سے اس کے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود چھپ کر کورٹ میرج کی تھی اور شادی ڈکلیئر نہ ہونے کی وجہ سے اپنا پہلا بچہ یتیم خانے میں ڈال دیا تھا۔ شائستہ مکمل طور پر ہارون کمال کے زیر اثر تھی مگر کبھی کبھی ماضی کا آسیب اسے تنگ کرنے لگتا۔ ہارون کمال اور شائستہ دونوں ہائی سوسائٹی کی تمام تر بُری روایتیں اپنا چکے تھے۔ ہارون کمال نے ایک تقریب میں امبر کو دیکھا تو دل و جان سے فریفتہ ہو گیا اور اس تک پہنچنے کے لیے ہارون کمال نے منصور علی سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیے اور اس کے ساتھ مل کر ایک نٹی فیکٹری کی بنیاد رکھی۔ اس طرح اس کے گھر تک رسائی حاصل کر لی۔

صاعقہ کو اس کے شوہر نے بیٹا پیدا نہ کر سکنے کے جرم میں گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کی چار بیٹیاں تھیں۔ اس نے اپنے حالات سے عاجز آ کر غلط ذرائع سے پیسہ کمانا شروع کر دیا۔ جب اس کے پاس پیسہ آ گیا تو اس کا شوہر بھی اس کے گھر آنے جانے لگا۔ اس کی بیٹیاں بے تحاشا خوبصورت تھیں۔ منجھلی بیٹی نے اپنے گھر کے حالات سے فرار کی خاطر ایک شخص سے شادی کی مگر وہ شخص اپنے گھر والوں کے بہکاوے میں آ کر تنگ کرنے لگا اور بالآخر اس کے ہاتھوں صاعقہ کی بیٹی کا قتل ہو گیا۔

صاعقہ کی چھوٹی بیٹی رخشی کے حسن سے متاثر ہو کر امبر نے اس سے دوستی کر لی، اسے جب رخشی کی بہن کے قتل کا علم ہوا تو اس نے ان کی ہر ممکن مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔

اسی سلسلے میں امبر نے منصور علی کو رخشی سے ملوایا۔ منصور علی، رخشی کے بے پناہ حسن سے بُری طرح متاثر ہو گئے اور اسے اپنی سکریٹری بنا لیا اور اسے گھر بھی لے کر دے دیا۔ اب منصور علی کا زیادہ تر وقت رخشی کے ساتھ گزرنے لگا اور گھر پر ان کی توجہ کم ہو گئی اور وہ اپنی بیوی منیزہ سے جھگڑنے بھی لگے۔ ہارون کمال نے منصور علی کو اُکسایا کہ وہ رخشی سے شادی کر لیں ورنہ رخشی کسی اور سے شادی کر کے انہیں چھوڑ دے گی۔

۲۷

ستائیسویں قسط

"اتنا خوف مت کھایا کریں امی! دنیا میں کوئی بھی چیز پائیدار نہیں ہوتی پھر باپ اور بیٹی کی محبت پائیدار ہو سکتی ہے؟ ہاں بڑی محبت ہوتی تھی کبھی منصور علی کو امبر سے مگر تب اس کی زندگی میں میں نہیں تھی۔" رخشی نے بے حد لاپروائی سے کہا۔

"پھر بھی مجھے بہت ڈر لگتا ہے رخشی! اگر کہیں امبر نے واقعی منصور علی کو مجبور کر دیا کہ وہ تمہیں چھوڑ دے تو؟" صاعقہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"میں زندگی میں کسی اگر مگر پر یقین نہیں رکھتی' آپ بھی اس اگر مگر سے نکل آئیں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو ترپ کا پتہ میرے ہاتھ میں ہے اور میں جانتی ہوں اسے کیسے استعمال کرنا ہے۔"

صاعقہ کچھ دیر رخشی کو دیکھتی رہی پھر اس نے گہرا سانس لیا۔ "بعض دفعہ تم مجھے بہت ڈرا دیتی ہو رخشی۔"

"صرف میں؟ آپ کو تو کوئی کبھی بھی کسی بھی وقت ڈرا سکتا ہے۔ ڈر کے علاوہ کسی اور چیز کو آپ نے اتنے سالوں اتنی محبت سے نہیں پالا۔"

"تمہاری اور میری زندگی اور تمہارے اور میرے حالات میں بہت فرق ہے۔" صاعقہ نے کمزور سے لہجے میں اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

"اور یہ فرق آپ نے اور میں نے خود پیدا کیا ہے۔"

"نہیں حالات نے پیدا کیا تھا۔" صاعقہ نے کہا۔

"حالات کچھ نہیں ہوتے۔ کچھ بھی نہیں۔"

"تمہارے لیے اب یہ بات کہنا بہت آسان ہے کیونکہ تمہاری زندگی کچھ اور طرح سے گزر رہی ہے۔"

"ہاں میرے لیے یہ بات کہنا آسان ہے اور میری زندگی اگر اچھی گزر رہی ہے تو اس میں صرف میرا ہاتھ ہے' صرف میرا۔" رخشی اب بھی اپنی بات پر جمی ہوئی تھی۔

"زندگی میں پہلی بار جب آپ اس رستہ پر چلنا شروع ہوئی تھیں تو آپ کو ہر خوف دل سے نکال دینا چاہیے تھا خوف تو اس آدمی کو ہوتا ہے جسے رسوائی کا اندیشہ ہو' بے عزتی کا خوف ہوا می! ہم جیسی عورتوں کو کیسا خوف.... عزت ہمارے پاس ہوتی نہیں۔ رسوائی وہ ہے جو ہمیں ہر صورت میں ملنی ہی ہوتی ہے۔ پھر کیسا خوف.... جانے دیں سب کچھ جھلکنے دیں لوگوں کی نظروں میں نفرت اور حقارت.... رسنے دیں ان کی زبانوں سے زہر ہمیں فرق نہیں پڑتا ہمیں فرق نہیں پڑنا چاہیے۔" وہ کھڑکی سے باہر کسی چیز پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

"بے خوفی بڑی نعمت ہوتی ہے.... بے خوفی سے جینا سیکھ لیں امی۔" وہ واپس مڑی مگر کمرے میں اپنی جگہ پر آنے کے بجائے وہیں کمرے کی کھڑکی سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے بازو سینے پر لپیٹے ہوئے تھے۔

"امبر کون ہے؟ امبر کیا ہے؟ منصور علی کی بیٹی اور میں۔ میں منصور علی کی زندگی ہوں محبت ہوں میں اس کی۔ مجھے وہ امبر کے لیے تو اپنی زندگی سے نہیں نکال سکتا۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"مرد کس کے لیے کس کو اپنی زندگی سے نکال سکتا ہے۔ یہ تم نہیں جانتیں۔ مرد قابل اعتبار نہیں ہوتا جو شخص تمہارے لیے اپنی بیوی کو اور خاندان کو دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ کیا کبھی ان کے لیے تمہارے ساتھ یہ سب کچھ نہیں کر سکتا اور میں اس دن سے خوفزدہ ہوں جب وہ یہی کرے گا۔" صاعقہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"وہ فی الحال کچھ نہیں کر سکتا اور میں فی الحال میں جیتی ہوں مستقبل کے خوف کو ایک گٹھڑی میں باندھ کر سر پر لیے نہیں پھرتی۔" وہ ابھی بھی غیر متزلزل تھی۔

"کیا تم امبر سے بات کرو گی یا پھر اسے اسی طرح ٹالتی رہو گی؟" صاعقہ نے بات کا موضوع بدل دیا۔

"آپ کے خیال میں کیا مجھے امبر سے بات کرنی چاہیے۔" رخشی نے ماں سے مشورہ لیا۔

"تمہیں پہلے منصور کو بتانا چاہیے کہ امبر تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے اور اسے اس بات سے بھی خبردار کر دینا چاہیے کہ ہو سکتا ہے وہ تمہارے اور منصور علی کے اس رشتے کے بارے میں ہی بات کرنا چاہتی ہو۔ پھر اس صورت میں تمہیں سچ بولنا چاہیے یا جھوٹ' یہ تمہیں منصور علی بہتر بتا سکتا ہے اور خود وہ بھی ذہنی طور پر اپنی فیملی کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔" صاعقہ نے اپنی طرف سے رخشی کو ایک بہت مناسب مشورہ دیا تھا مگر رخشی اس کی تجویز پر یوں مسکرائی جیسے یہ ایک بچکانہ تجویز ہو۔

"میں منصور علی سے بات نہیں کروں گی' میں اس سے کوئی مشورہ نہیں لوں گی۔ میں امبر سے بات کروں گی دیکھوں تو سہی کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے۔ منصور علی کو بعد میں بھی سب کچھ بتایا جا سکتا ہے۔"

"مگر تمہیں تو امبر سے سب کچھ چھپانا ہے۔ کیا کہو گی...." صاعقہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"ضروری تو نہیں کہ مجھے امبر سے سب کچھ چھپانا ہی ہے اگر وہ کسی شک کا اظہار کرے گی تو میں اس کی تصدیق کر دوں گی۔ بلی کو کبھی نہ کبھی تو تھیلے سے باہر آنا ہی ہے۔" رخشی نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی۔

"رخشی! اس سے بات کرنے سے پہلے ایک بار پھر سوچ لو یہ نہ ہو کہ بعد میں تم پچھتاؤ۔" صاعقہ نے رخشی کو فون کی طرف بڑھتے دیکھ کر کہا۔

"میں پچھتاووں پر یقین نہیں رکھتی اگر امبر اتنی بے چین ہو رہی ہے مجھ سے بات کرنے کے لیے تو مجھے اس سے بات کرنی چاہیے۔ آفٹر آل وہ میری بیسٹ فرینڈ ہے۔" اس نے صاعقہ سے مزید کچھ کہے بغیر فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف حسب توقع امبر ہی تھی۔ امبر اس بار رخشی کی آواز سن کر کچھ دیر کے لیے کچھ نہیں بول پائی۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ پہلے کی طرح اس بار بھی صاعقہ فون اٹھائے گی۔

"میں امبر بول رہی ہوں۔" چند لمحوں کے بعد اس نے کہا رخشی نے بڑی گرم جوشی سے کہا۔

"ہاں امبر کیسی ہو تم؟ امی نے مجھے تمہارے فون کے بارے میں بتایا تھا میں اصل میں کچھ دیر کے لیے باہر گئی ہوئی تھی۔ واپس آئی تو امی نے بتایا کہ تم بار بار کال کر رہی ہو۔ میں ابھی تمہیں کال کرنے ہی والی تھی کہ تمہاری کال آ گئی۔ ہاں کہو کیا بات ہے۔"

امبر بولنے کے لیے لفظوں کا انتخاب کرتی رہی' بات کا آغاز کرنا اس کے لیے مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

"میں' میں تم سے تمہارے اور پاپا کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔" بالآخر اس نے کہا۔

"میرے اور منصور علی کے بارے میں؟" رخشی نے حیرت ظاہر کی۔ امبر کو اس بے تکلفی نے تکلیف پہنچائی جس بے تکلفی سے اس نے منصور علی کا نام لیا تھا۔

دوسری طرف رخشی کے دل کی دھڑکن چند لمحوں کے لیے بے ترتیب ہوئی صاعقہ کا اندازہ ٹھیک نکلا تھا۔ امبر واقعی اس کے اور منصور کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی' تھوڑی دور بیٹھی صاعقہ بھی اس کے منہ سے نکلنے والا جملہ سن کر کچھ چونک گئی۔ اس کی اور رخشی کی نظریں ملی تھیں۔

"میں چاہتی ہوں' تم پاپا کے پاس سے جاب چھوڑ دو۔" امبر نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "وہ رخشی سے یہ نہیں کہہ سکی تھی کہ وہ اس کے اور منصور علی کے افیئر کے بارے میں سب جان گئی ہے ایک دوست اور اپنے باپ کے افیئر کے بارے میں بات کرنا... اس وقت اس کے لیے زندگی کا مشکل ترین کام ثابت ہو رہا تھا۔

"کیوں؟" رخشی نے اطمینان سے سوال کیا۔

"اس کیوں کا جواب دینا ضروری نہیں ہے۔ بس میں یہ چاہتی ہوں' تم یہ جاب چھوڑ دو۔" امبر نے اس بار تلخی

سے کہا۔

"پر کیوں کا جواب ضروری ہوتا ہے امبر! تم ایک حکم دے رہی ہو مجھے، مجھے پتہ تو چلنا چاہیے آخر تم یہ حکم کیوں دے رہی ہو؟" رخشی کا اطمینان بے مثال تھا۔

"میں تم سے اس کی وجوہات پر بحث کرنا نہیں چاہتی، صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم یہ جاب چھوڑ دو۔"

"یہ جاب چھوڑ دوں تو کیا کروں؟" رخشی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"وہ تمہارا مسئلہ ہے۔ تم اتنی سمجھ دار ہو چکی ہو کہ کہیں اور جاب ڈھونڈ سکو۔ تمہیں اب کسی کی مدد کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" امبر نے اکھڑ انداز میں دوٹوک لہجے میں کہا۔

"اسی لیے تو میں یہ جاب چھوڑنا نہیں چاہتی۔ ابھی تم نے سمجھ داری کی بات کی ہے تو میری سمجھ داری تو مجھ سے یہی کہہ رہی ہے کہ میں یہ جاب نہ چھوڑوں۔ منصور علی کے ساتھ کام کرنا مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔" رخشی نے کہا۔

"مگر تمہارا پاپا کے ساتھ کام کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔" امبر غرائی۔

"تم نے خود مجھے منصور علی کے پاس جاب دلوائی تھی۔"

"میں نے تمہیں پاپا کے پاس جاب نہیں دلوائی تھی۔ میں نے صرف پاپا کو جاب دلوانے کے لیے تمہاری مدد کرنے کا کہا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم پاپا کے پاس ہی جاب کرنے لگو گی۔"

"تم نے منصور علی سے میری سفارش کی۔ منصور علی نے مجھے رکھ لیا۔ انہیں سیکرٹری کی ضرورت تھی، مجھے جاب کی۔"

"اگر میری ہی سفارش پر تمہیں انہوں نے جاب دی تھی تو پھر اب میں یہی چاہتی ہوں کہ تم ان کے پاس کام نہ کرو۔"

"تو امبر! یہ بات تم غلط آدمی سے نہیں کہہ رہیں؟ تمہیں یہ سب منصور علی سے کہنا چاہیے۔ انہوں نے مجھے جاب پر رکھا تھا، وہی مجھے جاب سے نکال سکتے ہیں۔"

"دوسرے لفظوں میں تم مجھ سے یہ کہہ رہی ہو کہ تم جاب نہیں چھوڑو گی۔"

"دوسرے لفظوں میں؟ میرا خیال ہے کہ میں بہت صاف لفظوں میں تمہیں یہی بتا رہی ہوں کہ میں جاب نہیں چھوڑوں گی۔" رخشی نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا۔ پھر بولی "تم وجہ بتانے پر تیار نہیں میں جاب کیوں چھوڑوں تو پھر میں تمہاری ایک فضول سی ضد نما خواہش پر اپنی جاب تو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"وجہ! وجہ جاننا چاہتی ہو تم؟ نہیں رخشی! تم اتنی معصوم نہیں ہو کہ وجہ نہ جانتی ہو۔"

"معصوم تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ آج کی دنیا میں اگر کوئی معصوم تمہیں نظر آئے تو مجھے ضرور دکھانا۔ معصوم تو تم بھی نہیں ہو۔" رخشی کے لہجے کی سرد مہری اب عروج پر تھی۔

"نہیں۔ میں معصوم نہیں ہوں۔ میں بے وقوف ہوں۔ دنیا کی سب سے بڑی بے وقوف۔ میں نے اپنی آستین میں تم جیسا سانپ پال لیا۔" امبر کو اس کے الفاظ نے بڑی طرح مشتعل کیا۔

"تو کیا میں نے تمہیں کاٹ لیا؟" رخشی کو امبر کی بات نے جیسے محظوظ کیا۔ "میں نے تمہیں نہیں کاٹا امبر؟ تم میری بیسٹ فرینڈ ہو۔" اس کا لہجہ تمسخر لیے ہوئے تھا۔

"نام مت لینا دوستی اور دوست کا اپنی زبان سے۔ تم جیسی لڑکیاں اس لفظ کا مطلب نہیں جانتیں۔"

"اوکے... مجھ جیسی لڑکیاں اس لفظ کا مطلب بھی نہیں جانتیں... بس تم نے یہی بتانے کے لیے مجھے فون کیا تھا۔"

"مجھے شرم آ رہی ہے تم سے یہ کہتے ہوئے کہ تم، تم نے میرے پاپا کو ٹریپ کر لیا ہے۔ تم ان کے ساتھ افیئر چلا رہی ہو صرف چند مادی چیزوں کے لیے تم، تم انہیں بے وقوف بنا رہی ہو۔" امبر نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ سب کچھ تمہیں کس نے بتایا ہے؟" رخشی نے اپنے اعصاب پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ مت پوچھو کہ یہ سب کچھ کس نے بتایا ہے۔ تم نے دنیا کو اندھا سمجھ لیا ہو گا مگر دنیا اتنی اندھی نہیں ہے۔ کبھی نہ کبھی تو تمہارا بھانڈا پھوٹنا ہی تھا۔"

"امبر کافی لعنت ملامت ہو چکی ہے اب بس کرو۔ تم چونکہ غصے میں ہو اور تم سمجھ نہیں پا رہیں کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو اور کیا کہہ رہی ہو۔ اس لیے میں برا نہیں مان رہی ورنہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو اس کے بعد مجھے تمہاری شکل تک نہیں دیکھنی چاہیے۔ بات کرنا تو دور کی بات ہے۔"

"تم میری شکل نہیں دیکھو گی رخشی! میں خود تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم سے دوستی میری زندگی کی سب سے بھیانک اور خوفناک غلطی ہے۔ سب سے خوفناک۔ ممی ٹھیک کہتی تھیں تم اس قابل نہیں تھیں کہ تمہارے ساتھ تعلق رکھا جاتا۔"

"تم اور تمہاری ممی کے فرمان۔" رخشی ہنسی۔

"رخشی! میرے پاپا کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ تمہارا بہت برا حشر ہو گا۔ میں تمہیں خبردار کر رہی ہو۔"

"امبر! تم ایک بار پھر غلط آدمی سے اپنی بات کہہ رہی ہو۔ میرا خیال ہے، یہ درخواست بھی تمہیں منصور علی کے سامنے ہی پیش کرنی چاہیے میں اس سلسلے میں بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

"تمہیں شرم آنی چاہیے اپنی حرکتوں پر۔ تم نے میرے پاپا کو ٹریپ کر لیا ہے!" انہیں بے وقوف بنا رہی ہو تم۔"

"اچھا؟... مگر تمہارے پاپا تو کہتے ہیں۔ انہیں مجھ سے محبت ہے۔" امبر کچھ دیر اس کی بات کے جواب میں کچھ بول نہیں پائی۔ رخشی اس طرح منصور علی کی بات کو کھلم کھلا دہرائے گی۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔

"انہیں تمہارا اصلی چہرہ دیکھنے میں دیر نہیں لگے گی اور جب وہ تمہارا اصلی چہرہ دیکھ لیں گے تو وہ تمہیں دھکے مار کر نکال دیں گے۔"

"کہاں سے؟ رخشی نے بے حد انجان بن کر کہا۔ اپنے آفس سے؟ اپنے دل سے؟ یا پھر اپنے گھر سے؟" امبر کے حلق کو جیسے کسی نے دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔

"گھر سے؟"

"ہاں۔ تمہیں نہیں پتا۔ میں تو سمجھ رہی تھی تمہیں پتہ ہو گا۔ آخر تمہیں ہر چیز کا تو پتہ ہی ہے، اس بات کا کیوں پتہ نہیں ہے کہ میں ان کے گھر میں رہتی ہوں۔" رخشی نے بڑے ناز اور انداز سے رک رک کر گھر کا ایڈریس دہرایا۔

"تمہارے پاپا نے یہ گھر مجھے لے کر دیا ہے، میری شادی کے تحفے کے طور پر؟" امبر کے سر پر جیسے کسی نے بم بلاسٹ کر دیا تھا۔

"ویا تو انہوں نے اور بھی بہت کچھ تھا مجھے مگر یہ ذرا یادگار قسم کا تحفہ تھا۔ اس لیے تم سے اس کا ذکر کر رہی ہوں۔" رخشی اس طرح بتا رہی تھی جیسے امبر نے یہی سب کچھ سننے کے لیے فون کیا تھا۔

"اب تم خود سوچو، صرف جاب ہوتی تو میں چھوڑ دیتی مگر میں تو ان کی بیوی بھی ہوں۔ یہ دوسرا والا عہدہ کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟"

امبر کا پورا وجود جیسے آندھیوں کے کسی جھکڑ کی زد میں آیا ہوا تھا۔

"منصور نے بڑے اصرار کے ساتھ شادی کی ہے مجھ سے بے چارے پہلی شادی، بیوی اور بچوں کے ہاتھوں بہت تنگ تھے۔" رخشی نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"میں اگر تمہاری ممی اور تمہیں نہ جانتی ہوتی تو میں کبھی ان کی بات پر یقین نہ کرتی... کیونکہ ویسے دیکھنے میں اتنے خوش باش لگتے ہیں مگر تمہارے گھر کا ماحول تو میں نے خود دیکھا ہی ہوا ہے" وہ ذرا اس "خاندانی ماحول سے تنگ آ گئے تھے۔" رخشی بہت روانی سے کہتی جا رہی تھی۔

"اب تو چند ماہ ہو گئے ہیں ہماری شادی کو۔ بہت خوش ہیں ویسے منصور علی۔ ان کی خوشی کا اندازہ تو تمہیں ان کے اپنے گھر سے غائب رہنے سے بھی ہوتا ہو گا۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"اچھا چلو اگر تمہیں یہ کہہ کر تسلی ہوتی ہے تو تم یہی سمجھ لو۔" رخشی نے اس طرح کہا جیسے اسے امبر کو تسلی دینا مقصود ہو۔

"پاپا تم سے کبھی شادی نہیں کر سکتے۔"

"کیوں وہ مجھ سے شادی کیوں نہیں کر سکتے... اگر وہ میرے ساتھ افیئر چلا سکتے ہیں اور تم کم از کم افیئر کے بارے میں تو یہ نہیں کہہ سکتیں کہ وہ بھی میرا گھڑا ہوا جھوٹ ہے تو پھر وہ مجھ سے شادی کیوں نہیں کر سکتے۔" رخشی نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"پاپا کو تم سے شادی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایک خوشگوار شادی شدہ زندگی گزار رہے ہیں۔" امبر نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ جواب میں رخشی بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی "اتنی بری طرح کہ کوشش کے باوجود وہ اگلے کئی سیکنڈز تک اپنی ہنسی پر کنٹرول نہیں کر پائی۔

"اف... مائی گاڈ! تم نے مجھے بہت ہنسایا ہے امبر! میں نہیں جانتی تھی تمہارا سینس آف ہیومر اتنا اچھا ہے، مائی گڈنیس۔ خوشگوار شادی شدہ زندگی۔" اس نے ایک بار پھر ہنسنا شروع کر دیا۔

"تم اپنی ممی اور ان کی نیچر کو تو بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ تم ہی مجھے بتاؤ... کیا ان کے ساتھ کوئی مرد خوش رہ سکتا ہے۔"

"شٹ اپ۔"

"یو شٹ اپ!" رخشی نے امبر کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں اب تک تمہارا لحاظ کر رہی تھی اور بہتر ہے تمہارے اور میرے درمیان لحاظ کا رشتہ ضرور قائم رہے ورنہ آگے چل کر بڑی مشکل ہو جائے گی۔" رخشی نے اس بار بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"آگے چل کر؟ کون سا آگے رخشی! تم، تم تمہارا نہ کوئی آگے ہے نہ پیچھے۔ اوکے تم نے پاپا کے ساتھ شادی کر لی ہو گی۔ مگر کتنے دنوں کے لیے؟ یہ زندگی بھر کا رشتہ تو ہو نہیں سکتا۔ اس کے بعد تم کیا کرو گی؟ کہاں جاؤ گی۔"

"یہ تمہاری بد قسمتی ہے امبر! یا پھر منصور علی کی خوش قسمتی کہ میں نے ان کے ساتھ ساری عمر رہنے کا فیصلہ کیا ہے ویسے مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تمہیں بڑی جلدی میری بات پر اعتبار آ گیا ہے ورنہ کچھ دیر پہلے تو تم یہ ماننے پر تیار ہی نہیں تھیں کہ منصور علی نے مجھ سے شادی کر لی ہے۔" رخشی نے تمسخر آمیز انداز میں کہا۔

"تم نے پاپا سے ان کی جائیداد ان کے پیسے کے لیے شادی کی ہے اور یہ بنیاد قائم نہیں رہے گی۔"

"ہر رشتے کی بنیاد میں کہیں نہ کہیں پیسہ ضرور آتا ہے پھر کیا ہے۔ مان لیا میں نے منصور علی سے پیسے کے لیے شادی کی ہے۔ تو کیا برائی ہے اس میں۔ ہر آدمی میں کچھ نہ کچھ تو دیکھا جاتا ہے۔ میں نے منصور میں پیسہ دیکھ لیا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہاں۔ تمہارے جیسی لڑکیوں کو تو نہیں پڑتا۔ وہ تو ان کو پڑتا ہے جن کا کوئی خاندان ہو۔ حسب نسب ہو۔ تم جیسوں کو کیا فرق پڑتا ہوگا۔"

"ویسے منصور علی نے مجھ سے محبت کی شادی کی ہے اگر تمہارے خیال میں رشتے یا تعلق کی بنیاد محبت پر ہونی چاہیے تو پھر منصور علی کی طرف سے اس بنیاد میں محبت ہی شامل ہے۔" وہ اب بھی مذاق اڑانے والے موڈ میں تھی۔

"مجھے اب اندازہ ہوا رخشی! تمہاری بہن کو کیوں قتل کیا گیا تھا... اس نے بھی یہی کچھ کیا ہوگا۔" امبر نے کہا۔
ریسیور پر رخشی کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی... اس کے ہونٹ بھنچ گئے... پہلی بار اس کے چہرے سے وہ تمسخر آمیز مسکراہٹ غائب ہوئی تھی جو اس پوری گفتگو کے دوران اس کے چہرے تھی۔

"میری بہن کا نام مت لو۔" وہ غرائی۔

"کیوں نہ لوں۔ میں لوں گی اس کا نام تم تمہاری امی تمہاری بہنیں سب ایک جیسی ہو' یہی سب کچھ کرتی ہوگی... اسی لیے تو تمہارے فادر نے چھوڑ دیا تمہیں۔ اسی لیے تمہارے محلے والوں نے تم لوگوں کو سپورٹ نہیں کیا۔" کیونکہ وہ تم لوگوں کو' تمہارے حربوں اور ہتھکنڈوں کو اچھی طرح جانتے تھے' صرف میں احمق تھی جو تمہیں اور تمہاری اصلیت کو نہیں جان سکی۔" رخشی نے کچھ کہنا چاہا پھر چپ رہی۔

"میں دیکھوں گی۔ تم پاپا کے ساتھ کیسے رہتی ہو۔ میں تمہیں پاپا کی زندگی' ان کے گھر' ان کے دل ہر جگہ سے نکال باہر پھینکوں گی۔ تم جانتی ہو۔ پاپا میری بات کبھی نہیں ٹال سکتے اور مجھے تمہیں ان کی زندگی سے باہر نکالنے کے لیے اپنی جان بھی دینی پڑی تو میں دے دوں گی۔" امبر کہتی جا رہی تھی۔

"تب تم جان لو گی کہ کوئی وہ جس کی بنیاد صرف پیسے پر رکھی ہو خون کے رشتے سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ تم نے پاپا سے شادی کر کے صرف روپیہ حاصل کیا ہے مگر تم نے میری نظروں میں اپنی عزت کھو دی ہے مگر تم نے اسی چیز کو ترجیح دی ہے۔ جس کی تمہیں پروا ہے۔" امبر نے ریسیور پٹخ دیا۔

رخشی کچھ دیر ریسیور ہاتھ میں لیے رہی پھر اس نے ریسیور نیچے رکھ دیا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"کیا ہوا؟" صاعقہ نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"یہ آپ جان ہی گئی ہیں کہ کیا ہوا ہے... سب کچھ تو سنا ہے آپ نے۔" رخشی نے بیڈ پر بیٹھ کر گہرا سانس لیا۔

"اب کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟ کچھ نہیں ہوگا۔ پہلے کیا ہو گیا ہے۔ جو اب ہوگا۔ آپ کے پاس بس ایک ہی سوال ہے۔ جو آپ ہر وقت کر کے مجھے پریشان کرتی رہتی ہیں۔" رخشی نے بے حد بیزاری سے کہا۔

"تمہیں اب منصور علی کو فون کر کے یہ سب کچھ بتا دینا چاہیے بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اسے یہاں بلواؤ۔" صاعقہ کو بے چینی ہو رہی تھی۔

"کوئی آسمان سر پر نہیں گر پڑا کہ میں منصور کو فوراً یہاں بلواتی پھروں... دیکھ لوں گی سب کچھ صبح۔"

"اور اگر امبر اور اس کی ماں نے منصور علی سے اس بارے میں اسی وقت بات کر لی تو مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" صاعقہ نے کہا۔

"تو کر لیں امبر اور اس کی ممی بات آپ بھی دیکھ لیں کتنا اثر رہ گیا ہے ان کی باتوں میں۔ منصور صبح یہاں ہو گا یہ بھی ممکن ہے وہ۔ ابھی رات کو ہی آ جائے پھر آپ اپنے سارے خدشات اس کے ساتھ بیٹھ کر ڈسکس کر لیں۔" رخشی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"پھر بھی رخشی! احتیاط تو لازمی ہے۔"

"تو کریں۔ آپ ہیں نا ہر قسم کی احتیاطوں کے لیے۔ مجھے معاف رکھیں اس سب کچھ سے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔" رخشی کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی صاعقہ قدرے متفکر انداز میں اسے جاتے دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

امبر نے ریسیور رکھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس کا سر اب بری طرح چکرا رہا تھا۔ اسے منیزہ کے کہنے کے باوجود ان کی اس بات پر دل سے یقین نہیں آیا تھا کہ رخشی اور منصور کے درمیان کوئی افیئر ہے مگر جواب اس نے رخشی کے منہ سے سنا تھا۔ وہ اس سے بہت بدتر صورت حال تھی۔ اسے رخشی کی ڈھٹائی پر حیرت ہو رہی تھی اور منصور علی پر رنج اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ منیزہ کو یہ خبر کیسے سنائے گی اور منیزہ کا ردعمل اس خبر پر کیا ہو گا۔

لیکن اسے منیزہ کو یہ خبر سنانی نہیں پڑی۔ فون کا ریسیور رکھنے کے ٹھیک دو منٹ بعد ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر منیزہ اندر آ گئیں۔ امبر حواس باختہ ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ منیزہ بے حد طیش میں تھیں۔

"سن لیا تم نے سن لیا یہ سب تھا جس کو روکنا چاہتی تھی میں۔" منیزہ بلند آواز میں چلائیں۔

"ممی... ممی! آپ... آپ۔" امبر بات کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

"میں نے اس ذلیل کی ہر بات فون پر سنی ہے... ہر بات اور یہ سب کچھ۔ یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے امبر! تمہاری وجہ سے۔" وہ اس کے سر پر کھڑی بری طرح چلا رہی تھیں۔

"تم نے اسے یہ سارے راستے دکھائے تھے۔ تم ہاتھ پکڑ کر اسے ہر جگہ پہنچاتی رہی ہو' وہاں بھی جہاں اسے نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ بار بار منع کیا تھا... مگر تم...... تم پر خدمت خلق کا بھوت سوار تھا۔ تم نے ماں کی بات نہیں سنی۔ اب تسلی ہو گئی تمہاری۔ سکون مل گیا تمہیں۔"

"ممی! مجھے سکون ملے گا... میری تسلی ہو گی۔ آپ...... آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" وہ بے اختیار رونے لگی۔

"میں' میں کیسی باتیں کرتی ہوں۔ میں ایسی ہی باتیں کرتی ہوں یہی کچھ کہتی رہی ہوں تم سے اور تم...... تم نے امبر اپنے گھر کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تم نے آگ لگا دی ہے اپنے گھر کو۔"

"میں نے آگ لگائی ہے نا... میں ہی بجھاؤں گی۔ آپ دیکھ لیجیے گا' میں پاپا سے اس کو طلاق دلوا دوں گی۔ میں آج ہی پاپا سے اس کو طلاق دلوا دوں گی۔"

"اس کے بعد کیا ہو گا۔ تمہارے باپ اور میرے درمیان جو تعلق تھا' وہ ختم ہو گیا۔ اس شخص نے میرے بیس سال کے ساتھ کو منٹوں میں پس پشت ڈال دیا۔ میں اس شخص کو رخشی کے ساتھ خوش رہنے دوں گی نہ اس گھر میں' میں اس کی زندگی کو جہنم بنا دوں گی۔" منیزہ اب بھی بری طرح چلا رہی تھیں۔

"وہ کہتا ہے کہ میں نے اس کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ میں اسے بتاؤں گی جہنم ہوتا کیا ہے۔" منیزہ کہتے ہوئے دروازے کو پوری طاقت سے پٹخ کر باہر چلی گئیں۔

امبر روتے ہوئے اٹھ کر ان کے پیچھے ہی نیچے چلی آئی۔ منصور علی ابھی تک گھر نہیں آئے تھے۔ امبر لاؤنج میں بیٹھنے کے بجائے باہر پورٹیکو میں آ کر منصور علی کا انتظار کرنے لگی۔

ایک گھنٹے کے اس انتظار میں اس نے کئی بار منصور علی کے موبائل پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی... منصور علی کا موبائل ہر بار آف ملتا رہا۔ امبر کو لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے دل کو مٹھی میں لے کر مسل رہا تھا... منصور علی اور رخشی دونوں کے اکٹھے ہونے کا تصور اسے پاگل کیے دے رہا تھا... اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ منصور علی اس طرح چوری چھپے اپنی بیٹی کی عمر کی ایک لڑکی کے ساتھ شادی کر سکتے ہیں اور لڑکی بھی وہ جو ان کی بیٹی کی بہترین

دوست تھی۔

ایک گھنٹے کے بعد اسے گیٹ پر منصور علی کی کار کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ منصور علی نے گیٹ کھلتے ہی دور پورٹیکو میں کھڑی امبر کو دیکھ لیا تھا۔ ان کی چھٹی حس خبردار کرنے لگی تھی۔ وہ پہلے بھی اکثر فرمائشوں کے لیے اسی طرح پورٹیکو میں ان کا انتظار کرتی رہتی تھی مگر پچھلے چند ماہ سے منصور علی اور امبر کے درمیان بھی ایک نامحسوس کھچاؤ تھا۔ وہ توقع نہیں کر رہے تھے کہ وہ اس وقت وہاں کسی فرمائش کے لیے کھڑی ہوگی۔ خاص طور پر منیزہ کے ساتھ ایک دن پہلے ان کے ہونے والے جھگڑے کے بعد۔

گاڑی روک کر وہ نیچے اترے اور پھر امبر کے ستے ہوئے چہرے اور وجود کو نظرانداز کرتے ہوئے اندر لاؤنج کی طرف چلے گئے۔ امبر کے دل کو جیسے دھکا سا لگا۔ منصور علی نے آج تک کبھی اس کو اس طرح نظرانداز نہیں کیا تھا اور اب وہ اس کو دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے۔ وہ ان کے پیچھے ہی لاؤنج میں چلی آئی۔ منصور علی نے اپنے پیچھے اس کے قدموں کی آواز سنی تھی مگر وہ رکے نہیں۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" وہ لاؤنج سے گزر جانے والے تھے جب امبر نے انہیں روک دیا۔ منصور علی نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"میں صبح بات کروں گا اس وقت میں تھکا ہوا ہوں۔ سونا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے بے حد سنجیدگی کے ساتھ امبر سے کہا۔

"آپ تھکے ہوئے ہیں' آپ سونا چاہتے ہیں اور ہم سب کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی پروا ہے آپ کو؟" وہ طرح تلملائی۔

"تمیز سے بات کرو امبر! میں اس لہجے کا عادی نہیں ہوں۔" منصور علی نے زندگی میں پہلی بار اسے جھڑکا۔

"کیوں تمیز سے بات کروں میں آپ سے' آپ نے جس بری طرح ہم سب کو Let Down کیا ہے' اس کے بعد بھی میں آپ سے تمیز سے بات کروں۔"

"کیا کیا ہے میں نے؟" وہ بلند آواز میں دھاڑے۔

"آپ جانتے ہیں' آپ نے کیا کیا ہے۔ آپ کا کیا خیال تھا۔ رخشی کے ساتھ آپ کی شادی کا مجھے پتہ نہیں چلے گا۔"

چند لمحوں تک منصور علی اسی طرح بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ رخشی سے اپنی شادی کا انکشاف امبر کے منہ سے سن کر انہیں اس وقت واقعی شاک لگا تھا۔

"مجھے شرم آرہی ہے کہ آپ میرے باپ ہیں۔ میں نے اسے آپ کے پاس جاب کے لیے بھجوایا تھا اور آپ نے اس سے شادی کرلی' یہ سوچے بغیر کہ آپ کا ایک گھر ہے' بیوی ہے' بچے ہیں' آپ کی اپنی بیٹیوں کی شادی ہونے والی ہے۔" منصور علی پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہے تھے۔

"خاندان والے اور دوسرے لوگ کیسے کیسے مذاق اڑائیں گے ہمارا آپ کا اس عمر میں آکر دوسری شادی۔ پاپا آپ کو..... آپ کو کچھ تو سوچنا چاہیے تھا۔"

"میری شادی سے تمہارا کوئی تعلق ہے نہ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں تم ایک لفظ بھی مت کہنا۔" منصور نے اپنی خاموشی توڑی اور بے حد سرد لہجے میں امبر سے کہا۔

"کیوں نہ کہوں' کیا میرا مسئلہ نہیں ہے آپ کی شادی' ہم سب کو متاثر کر رہی ہے اور کرے گی۔ کیا سوچ کر آپ نے رخشی سے شادی کی ہے اس جیسی خودغرض اور مادہ پرست لڑکی سے۔ بڑا خاندانی حسب و نسب کی بات کرتے تھے۔ آپ اب رخشی سے شادی کرتے ہوئے وہ خاندانی حسب و نسب کہاں گیا۔ اب آپ کو یاد نہیں رہا کہ رخشی

کا کوئی خاندان نہیں ہے۔ وہ ایک آوارہ لڑکی ہے۔"

"اپنا منہ بند رکھو تم' سمجھیں۔ مجھے تمہاری تقریروں اور نصیحتوں کی ضرورت نہیں ہے اگر منیزہ یہ سمجھتی ہے کہ وہ تمہیں استعمال کر سکتی ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔" منصور علی غرائے۔

"ممی مجھے استعمال کریں گی؟... کیوں کریں گی وہ... یہ تو میں احمق تھی جس نے آپ کو اور رخشی کو قریب ہونے کا موقع دیا... میں نے ممی کی ایک بات نہیں سنی' حالانکہ وہ صحیح کہہ رہی تھیں۔"

"میں اب تم سے اور کچھ سننا نہیں چاہتا... دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنا منہ بند کرلوں تو آپ رخشی کو طلاق دے دیں ابھی اور اسی وقت۔"

"میں رخشی کو کسی قیمت پر طلاق نہیں دوں گا۔ یہ تم بھی سن لو اور جا کر اپنی ماں کو بھی سنا دو... وہ میری بیوی ہے اور رہے گی... اگر تم لوگوں کو میری شادی کا پتہ چل گیا ہے تو بہت اچھا ہوا ہے۔ لیکن اگر تم لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تم لوگ میرے اور رخشی کے درمیان علیحدگی کروا سکتے ہو تو یہ تم لوگوں کی بھول ہے۔"

"پاپا! آپ' آپ کو رخشی میں کیا نظر آیا ہے... اس نے صرف پیسے کے لیے آپ سے شادی کی ہے۔" امبر نے دل گرفتگی کے عالم میں کہا۔

"تم لوگ بھی تو صرف پیسے کے لیے مجھ سے چپکے رہنا چاہتے ہو۔ صرف پیسے کی وجہ سے تو میری جان نہیں چھوڑ رہے۔ تمہیں میرے اور رخشی کے بارے میں کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے... یہ میرا اور منیزہ کا معاملہ ہے۔ تم بیچ میں آؤ گی تو بہت پچھتاؤ گی۔ اس معاملے سے دور رہو۔" منصور علی نے اسے خبردار کیا۔

"تمہیں میری دوسری شادی پر اعتراض ہے... رخشی ناپسند ہے تو بھی اپنا منہ بند رکھو... ویسے بھی تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ تم طلحہ کے گھر چلی جاؤ گی پھر اس گھر کے معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں رکھو گی تم۔" منصور علی نے اسے بری طرح جھڑکتے ہوئے کہا۔

"آپ جب تک رخشی کو طلاق نہیں دیتے' میں اس گھر سے کہیں نہیں جاؤں گی... طلحہ سے شادی بھی نہیں کروں گی۔"

"تو مت کرو' یہ میرا دردِ سر نہیں ہے اگر اس انتظار میں بیٹھی رہو گی تو پھر تو تمہیں ساری زندگی ہی بیٹھنا پڑے گا۔"

"آپ تو مجھ سے بہت محبت کرتے تھے پاپا! کبھی میری کسی خواہش کو رد نہیں کرتے تھے اور اب۔"

"وہ میری غلطی تھی۔ میں نے تمہیں سر پر چڑھایا' خود سر بنا دیا۔ آج اسی لیے تو تم مجھ سے زبان درازی کر رہی ہو... اتنا لاڈ پیار نہ کرتا تو مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے سے پہلے تم سو بار سوچتیں۔" منصور علی نے تلخی سے کہا۔

"آپ نے اپنے اور ہمارے درمیان ایک دو ٹکے کی لڑکی کو لا کر کھڑا کر دیا ہے اور آپ' آپ چاہتے ہیں کہ ہم بولیں بھی نہ' احتجاج بھی نہ کریں۔"

"کون سا گناہ کیا ہے میں نے دوسری شادی کر کے۔ بہت سارے لوگ کرتے ہیں۔ کیا ہر ایک کی اولاد تمہاری طرح زبان دراز پر اتر آئی ہے۔"

"آپ کو دوسری شادی کرنی تھی تو بہت سال پہلے کرتے یا اپنی عمر کی کسی عورت سے کرتے۔ میری دوست سے شادی کرلی آپ نے' آپ کو شرم تک محسوس نہیں ہوئی۔"

"شٹ اپ' جسٹ شٹ اپ۔ یہ سب منیزہ کی تربیت ہے۔ اس نے تم لوگوں کو میرے سامنے لا کر یوں کھڑا کر دیا ہے کہ تمہیں بات کرنے کی تمیز تک نہیں رہی اگر بات کرنے کا طریقہ اور سلیقہ سیکھنا ہے تو جا کر رخشی سے

سیکھو دیکھو جا کر۔ اس میں کتنی تہذیب ہے۔"

"میں رخشی سے جا کر تہذیب سیکھوں جو لڑکی دوسروں کے گھروں کو اجاڑتی ہے۔ دوسروں کے باپ پر ڈورے ڈالتی ہے۔ میں اس سے جا کر بات کرنے کا طریقہ اور سلیقہ سیکھوں تاکہ میں بھی دوسروں کے گھر اجاڑنا سیکھ جاؤں دوسروں کے باپ کے ساتھ فلرٹ کرنے میں مجھے بھی آسانی ہو۔"

منصور علی نے پوری قوت کے ساتھ کھینچ کر تھپڑ امبر کے منہ پر مارا۔ امبر دم بخود رہ گئی۔

"رخشی تمہارے بارے میں جو کہتی ہے۔ بالکل ٹھیک پہچانا ہے۔ اس نے تمہیں۔"

"کیا کہتی ہے وہ میرے بارے میں؟ یہ کہ میں بے وقوف ہوں' پاگل ہوں' احمق ہوں میں نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری ہے۔" امبر اب رو رہی تھی۔

"آپ نے پاپا! ہم سب کو ڈبو دیا۔ میں آپ کو کیا سمجھتی تھی اور آپ کیا نکلے ہیں۔ بہت ہی عام سے انسان' ایسا انسان جس کی کوئی اخلاقیات نہیں ہے۔ رخشی کا قصور نہیں ہے۔ وہ تو اسی کام کے لیے نکلی تھی۔ قصور آپ کا ہے جس نے اپنے آپ کو اس کا نشانہ بننے دیا جو اپنی بیٹی کے علاوہ کسی دوسری لڑکی کو بیٹی نہیں سمجھ سکتا۔"

"امبر! اپنا منہ بند کر لو ورنہ۔۔۔" منصور علی کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

"ورنہ کیا کر لیں گے آپ۔۔۔ مار ڈالیں گے مجھے بس یا کچھ اور بھی۔ یہ جو تکلیف ابھی پہنچائی ہے آپ نے' یہ ہر تکلیف سے بڑی ہے' موت سے بھی۔ ایک وقت آئے گا جب آپ بہت پچھتائیں گے۔ اپنے اس فیصلے پر بہت پچھتائیں گے آپ۔" وہ بری طرح رو رہی تھی۔

"اس وقت آپ کے اس پچھتاوے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔۔۔ وقت آپ کے ہاتھ سے نکل چکا ہو گا۔ رخشی آپ کو چھوڑ دے گی پھر آپ کو پتہ چلے گا آپ نے اپنا گھر ایک غلط عورت کے ہاتھوں تباہ کیا۔ پھر آپ پچھتائیں گے مگر تب ہم نہیں ہوں گے آپ کے پاس۔۔۔ آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہو گا' کچھ بھی نہیں۔"

وہ روتے ہوئے لاؤنج کی سیڑھیاں تیزی سے چڑھ گئی۔ منصور علی کا پارہ اس وقت آسمان سے باتیں کر رہا تھا اندر اپنے بیڈ روم میں جانے کے بجائے وہ واپس پورچ میں آ گئے۔

اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اگلے پندرہ منٹ میں رخشی کے گھر پر تھے۔ رخشی ابھی سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ اپنے بیڈ روم میں تھی۔ اس نے منصور علی کا استقبال بڑی خوش دلی سے کیا۔ مگر منصور علی کے چہرے کو دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ منصور علی بہت اشتعال میں ہیں۔

"آج امبر نے فون کیا تھا مجھے۔" رخشی نے بلا تمہید منصور علی کو بتانا شروع کر دیا۔ منصور علی کے ماتھے پر پڑے ہوئے بل کچھ گہرے ہو گئے۔

"کب؟"

"بہت بار رنگ کرتی رہی ہے' یہ سمجھ لیں سارا دن ہی میں اس کو Avoid کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے مجھے اس سے بات کرنی ہی پڑی۔" رخشی نے چہرے پر سنجیدگی لاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا اس نے تم سے؟"

"اس نے جو کچھ کہا' وہ میں اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی۔ اس نے بے حد بے عزتی کی ہے میری' اسے ہماری شادی کا پتہ چل گیا ہے۔ اسے بھی اور آپ کی پہلی بیوی کو بھی۔۔۔ اور وہ مجھے دھمکیاں دے رہی تھی۔"

"میں حیران ہوں کہ انہیں اس شادی کے بارے میں کیسے پتہ چلا۔ کون ہے جو انہیں بتا سکتا ہے۔" منصور علی بڑبڑائے۔

"منیزہ بے حد چالاک عورت ہے۔ آپ خود ہی تو بتا رہے تھے کہ پچھلے کچھ عرصے سے آپ دونوں کے

درمیان جھگڑے ہوتے آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے' منیزہ نے ہی کسی سے آپ کی جاسوسی کروائی ہو۔"

"ہاں' اس جیسی عورت سے کچھ بعید نہیں ہے' وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔" منصور علی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"پھر اب' اب کیا ہو گا؟ وہ لوگ تو آپ کے لیے بہت سے مسائل کھڑے کر دیں گے۔ خاص طور پر آپ کا خاندان امبر تو مجھ سے بھی کہہ رہی تھی کہ وہ آپ سے ابھی اور اسی وقت مجھے طلاق دلوا دے گی۔" رخشی نے پریشان نظر آنے کی پوری کوشش کی۔

"ہاں میں گھر سے ہی آ رہا ہوں' بہت بدتمیزی کی ہے اس نے میرے ساتھ بھی۔ لیکن میں اسے صاف صاف بتا آیا ہوں کہ میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

"اور آپ کی بیوی۔" رخشی نے دانستہ طور پر بات ادھوری چھوڑی۔

"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے' وہ جو چاہے کرتی رہے۔ خاندان اکٹھا کرنا چاہتی ہے تو خاندان اکٹھا کر لے۔" منصور علی کے لہجے میں ترشی تھی۔

"یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے منصور۔۔۔ اگر میں آپ کی زندگی میں نہ آتی تو۔۔۔ میں اسی لیے آپ سے شادی سے انکار کر رہی تھی۔ میں اسی سب سے بچانا چاہتی تھی آپ کو۔۔۔ مگر آپ نے میری کسی بات پر غور نہیں کیا۔"

"مجھے تمہارے ساتھ اپنی شادی کے فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے اور نہ ہی یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں ایک ناکام ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے ہر قیمت پر ختم ہونا ہی تھا۔ تم میری زندگی میں نہ آتیں تو کوئی اور آ جاتا۔"

"کوئی اور آ جاتا لیکن میں تو نہ آتی' کم از کم مجھے یہ پچھتاوا تو نہ ہوتا جو اس وقت ہو رہا ہے۔" رخشی نے اپنے لہجے کی افسردگی میں کچھ اضافہ کیا۔

"میں تمہیں بتا رہا ہوں رخشی! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ میری زندگی میں تم آئی ہو اور اس شادی کے بارے میں مجھے جلد یا بدیر اپنے گھر والوں کو بتانا ہی تھا۔۔۔ کچھ زیادہ جلدی پتہ چل گیا انہیں۔۔۔ مگر ٹھیک ہے جو ہوا' صحیح ہوا۔"

"میں نے تو امبر سے بھی جھوٹ بولنے کی بہت کوشش کی تھی مگر اسے سب کچھ پتہ تھا۔ اس نے میری کسی بات کو مانا ہی نہیں' مجھے اتنا برا بھلا کہا کہ۔" رخشی نے توقف کیا۔

"وہ پاگل ہے' اپنی ماں کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے۔ تم اس کی پروا مت کرو۔"

"میں نے اس سے کہا کہ وہ ان وجوہات پر غور کرنے کی کوشش کرے جن کی وجہ سے منصور علی دوسری شادی کر چکے ہیں۔ مگر وہ تو کچھ سننے پر تیار ہی نہیں تھی۔ اس کی زبان پر بس ایک ہی بات تھی کہ میں نے اسے دھوکہ دیا اور اب میرے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں آپ کو چھوڑ دوں' آپ سے طلاق حاصل کروں۔" رخشی بڑی متانت سے سب کچھ بتا رہی تھی۔

"اس نے کہا کہ اس نے مجھے آپ کے پاس جاب کے لیے بھیجا ہے۔۔۔ اب میں اس کے کہنے پر جاب اور آپ کو چھوڑ دوں۔"

"میں نے کہا نا وہ پاگل ہے۔۔۔ تمہیں اس سے کہنا چاہیے تھا کہ تم کبھی مجھے نہیں چھوڑو گی' چاہے وہ کچھ بھی کر لے۔" منصور علی نے مداخلت کی۔

"میں نے اس سے ایسا ہی کہا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں نے منصور علی سے محبت کی وجہ سے شادی کی ہے۔۔۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے کیونکہ وہ ایک اچھی زندگی نہیں گزار رہے تھے' میں انہیں دوبارہ کسی تکلیف میں کبھی

نہیں ڈال سکتی۔" رخشی کہتی گئی۔

"مگر جواب میں وہ تو مجھے دھمکیاں دینے لگی۔ کہنے لگی کہ میرا خاندان خراب ہے اور میرے ساتھ بھی وہی ہو گا جو میری بہن کے ساتھ ہوا... مجھے تو لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ابھی کل تک میری دوست تھی... اتنی خود غرض دوست۔" رخشی نے تبصرہ کیا۔

"یہ سب اس کی ماں کا قصور ہے... اس کے منہ میں اپنی ماں کی زبان ہے۔"

"وہ چھوٹی بچی تو نہیں ہے کہ خود سے کسی چیز کے بارے میں کوئی فیصلہ ہی نہ کر سکے۔ ٹھیک ہے منیزہ اس کے کان بھرتی ہو گی مگر اسے ان احسانات کو تو یاد رکھنا چاہیے جو آپ اس پر کرتے رہے۔ اولاد میں اس قدر طوطا چشمی میں تو حیران ہو رہی ہوں۔" رخشی کو کچھ اور زہر اگلنے کا موقع مل رہا تھا... وہ یہ موقع کیسے ضائع کرتی۔

"میں سوچتی ہوں' آپ کے لیے امبر کی محبت اب کہاں گئی جس کا وہ ہمیشہ ڈھنڈورا پیٹا کرتی تھی۔ انہیں آپ ہاتھ سے نکلتے لگ رہے ہیں تو انہوں نے شور مچا دیا ہے کیونکہ انہیں یہ بھی تو اندیشہ ہے کہ آپ کی دوسری شادی کی صورت میں ان لوگوں کے ہاتھ سے آپ کی جائیداد بھی چلی جائے گی۔"

"ہاں جانتا ہوں' انہیں اس وقت کیا کیا اندیشے ستا رہے ہیں۔ میں نے صرف اسی وجہ سے تم سے شادی کی ہے کیونکہ میں اس گھر کے ماحول سے تنگ آ گیا تھا۔"

"مگر اپنی عادتوں اور حرکات پر تو کبھی غور نہیں کریں گے یہ لوگ... سارا الزام آپ کے اور میرے سر ہی دھر دیں گے۔" رخشی نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

"میں کسی الزام تراشی سے نہیں ڈرتا... نہ ہی تمہیں ڈرنا چاہیے۔ میں دیکھ لوں گا' منیزہ کیا کرتی ہے۔ میں نے شادی کی ہے۔ مذہبی اخلاقی' قانونی معاشرتی... ہر لحاظ سے جائز کام ہے یہ۔ پھر مجھے یا تمہیں شرمسار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

"میں اب اس گھر میں نہیں جاؤں گا... جب تک کہ ان سب کو اپنے رویے کے غلط ہونے کا احساس نہیں ہو جاتا میں ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھوں گا۔" منصور علی نے تہیہ کیا۔

"اور آپ وہاں نہیں جائیں گے تو وہ لوگ یہاں آ جائیں گے۔"

"کیسے آ جائیں گے' انہیں اس گھر کا ایڈریس کیسے پتہ چل سکتا ہے۔"

"اگر انہیں آپ کی شادی کا پتہ چل سکتا ہے تو پھر اس گھر کا معلوم کرنا کیا مشکل ہے... ابھی تک تو امبر یہی سمجھتی رہی ہے کہ یہ فون نمبر پرانے گھر میں ہی ہے لیکن اگر اب انہوں نے شک ہونے پر فون کے ٹرانسفر ہونے کا پتہ کروایا تو انہیں بڑی آسانی سے یہاں کا نمبر مل جائے گا۔" رخشی نے بڑی چالاکی کے ساتھ بات کرتے ہوئے کہا۔ "اور اگر وہ لوگ یہاں آ گئے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ آپ کی بیوی کس طرح کی باتیں کرے گی اور میں' میں اس بار کچھ بھی برداشت نہیں کروں گی۔"

"تم چوکیدار سے کہہ دینا وہ کسی کو اندر ہی نہیں آنے دے گا نہ کوئی اندر آئے گا' نہ تمہیں کسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔" منصور علی نے اپنی طرف سے مسئلے کا حل نکالتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

منیزہ منصور علی کے جانے کے بعد ایک بار پھر امبر کے کمرے میں چلی آئیں' امبر اپنے بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی رو رہی تھی۔

"منصور کہاں گیا ہے؟" منیزہ نے آتے ہی پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ' کہاں گئے ہیں۔" امبر نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر کہا۔

"تمہاری بات ہوئی ہے اس سے؟" امبر نے کوئی جواب نہیں دیا' وہ اسی طرح روتی رہی۔

"امبر! میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔ سیدھی طرح اٹھ کر میری بات کا جواب دو۔" منیزہ نے اس بار بلند آواز میں کہتے ہوئے اس کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"کی ہے میں نے ان سے بات۔ وہ بدل گئے ہیں ممی! وہ پہلے والے پاپا نہیں رہے۔"

"مجھے تم صرف یہ بتاؤ کہ اس نے کہا کیا ہے؟"

"وہ رخشی کو طلاق دینے پر تیار نہیں ہیں' آپ کو پتا ہے ممی انہوں نے مجھے تھپڑ بھی مارا ہے۔"

"میں جانتی تھی۔ میں پہلے ہی جانتی تھی کہ وہ رخشی کو طلاق نہیں دے گا' بڑھاپے کے عشق کا بھوت اتنی جلدی سر سے نہیں اترتا۔" وہ کمرے میں ٹہلنے لگیں۔

"اب تم دیکھنا' میں کیا کرتی ہوں... میں منصور علی اور رخشی دونوں کو مزہ چکھا دوں گی۔ میں حشر کر دوں گی ان دونوں کا۔"

"ممی! آپ مسعود انکل کو بتائیں' وہ پاپا کو سمجھائیں گے تو شاید پاپا کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔" امبر نے اپنے گیلے گالوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"مسعود انکل؟... یہ سب ملے ہوئے ہیں... سب ایک جیسے ہیں منصور' مسعود' طلحہ' اسامہ سب... یہ سب کچھ ان لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا اور ان لوگوں نے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔"

"ممی! ایسا نہ کہیں' شبانہ آنٹی نے ہی تو ہمیں پاپا اور رخشی کے بارے میں انفارم کیا تھا۔"

"شبانہ نے کیا تھا مسعود نے تو نہیں کیا تھا۔ طلحہ نے تو نہیں کیا تھا۔ اسامہ نے تو نہیں کیا تھا' مسعود نے تو شبانہ کو بھی منع کیا تھا کہ وہ مجھے رخشی کے بارے میں نہ بتائے۔ ان لوگوں نے جان بوجھ کر میرا گھر تباہ کیا ہے۔ جان بوجھ کر... یہ سب... سب ملے ہوئے ہیں آپس میں۔ میں ان میں سے کسی کو بھی معاف نہیں کروں گی۔" منیزہ اب بلند آواز میں بولتے ہوئے کمرے کے چکر لگا رہی تھیں۔

"ہو سکتا ہے ممی! انکل مسعود کو یا طلحہ اور اسامہ کو اس سب کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہ ہو۔"

"تم اپنا منہ بند کرو' ختم کرو ان کی حمایت۔ ان لوگوں کو پتہ نہیں تھا کہ رخشی اور منصور کیا گل کھلا رہے ہیں' میں مانتی پر تیار نہیں ہوں۔ میں تو گھر کے اندر رہنے والی عورت تھی چوبیس گھنٹے منصور کے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ مگر یہ تینوں اس کے ساتھ ہوتے تھے۔"

"ممی! پاپا اب کہاں ان کے ساتھ ہوتے تھے... وہ تو اپنے نئے آفس میں' نئی فیکٹری میں ہوتے تھے۔"

"جہاں بھی تھا وہ' ان تینوں سے اس کی حرکات چھپی نہیں رہ سکتی تھیں مگر انہوں نے اس کی پردہ پوشی کی۔ اسے کھل کھیلنے کا موقع دیا۔" منیزہ یک دم بات کرتے کرتے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"میں صبح رخشی کے گھر جا رہی ہوں۔ میں وہاں جا کر اسے دھکے دے کر وہاں سے نکال دوں گی... تمہیں میرے ساتھ وہاں چلنا ہے۔"

"میں کبھی اس کے سامنے نہیں جاؤں گی' کبھی نہیں۔ میں کبھی اس کے سامنے جا کر بھیک نہیں مانگوں گی کہ وہ میرے باپ کی زندگی سے نکل جائے۔ مجھے اس سے جو کہنا تھا میں اس سے فون پر کہہ چکی ہوں۔ ممی! میں تو اب دوبارہ کبھی اس سے فون پر بات تک نہیں کروں گی۔"

"تم کیوں اب اس سے بات کرو گی جو کچھ تم نے کرنا تھا' وہ تو تم کر چکی ہو۔ اپنی سہیلی کو میری سوکن بنا کر لے آئی ہو تمہیں کیا ضرورت رہی ہے اب اس سے بات کرنے کی۔" منیزہ نے تند و تیز لہجے میں کہا۔

"ممی! آپ آپ بھی مجھے ہی الزام دے رہی ہیں۔" امبر ایک بار پھر رونا شروع ہو گئی۔

"یہ سب کچھ پاپا نے کیا ہے... پاپا ایسے نہ ہوتے تو رخشی ہوتی یا کوئی بھی ہوتی۔ یہ سب کچھ کبھی نہیں ہونا تھا۔ غلطی پاپا کی ہے۔ وہ رخشی سے شادی نہ کرتے تو کسی اور کے ساتھ کر لیتے۔"

"میرا شوہر اور اولاد دونوں میرے دشمن نکلے ہیں... میں تو دونوں کو ہی الزام دوں گی تمہیں بھی' اسے بھی اور جہاں تک رخشی کے گھر جانے کا تعلق ہے۔ تم نہیں جانا چاہتیں نہ جاؤ میں جاؤں گی میں اس سے بات کروں گی اگر اس پر اثر نہیں ہوا تو پھر میں اس کو دھکے دے کر وہاں سے نکلوا دوں گی بلکہ میں پولیس کو بلوا کر رخشی اور اس کے تمام گھر والوں کو گرفتار کروا دوں گی۔" منیزہ کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگیں۔

"آپ کے وہاں جانے کا کیا فائدہ ہو گا۔ آپ سمجھتی ہیں کہ رخشی آپ سے خوفزدہ ہو جائے گی... ممی! وہ آپ کی بات تک نہیں سنے گی۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے... تم دیکھنا میں اسے کس طرح منصور سے الگ کرتی ہوں۔ منصور کا خیال ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی' اس نے شادی کر لی ہے تو میں اسے قسمت کا کھیل کہہ کر قبول کر لوں گی۔ میں تو اسے سبق سکھا دوں گی' اسے بھی اور اس کی اس نئی نویلی دلہن کو بھی۔"

"آپ کو جو بات بھی کہنی ہے ممی! آپ کو پاپا سے کہنی چاہیے۔ رخشی سے کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے' وہ آپ سے بھی وہی سب کچھ کہے گی جو اس نے مجھ سے کہا ہے۔ اس نے اگر میری لعنت ملامت کی پروا نہیں کی تو آپ کی لعنت ملامت کی کیا پروا کرے گی۔"

"تم نے اسے پیسے کی آفر نہیں کی ہو گی۔ میں اسے پیسہ دینے کی آفر کروں گی... اس سے کہوں گی کہ وہ پیسہ لے لے اور منصور کی زندگی سے نکل جائے۔"

"پیسے کی آفر۔" امبر نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "آپ اسے کتنا پیسہ دے سکتی ہیں پاپا سے زیادہ پیسہ دے سکتی ہیں؟ نہیں دے سکتیں... پاپا اس کی مٹھی میں ہیں۔ وہ جتنا روپیہ چاہے ان سے نکلوا سکتی ہے۔ پھر وہ احمق تو نہیں ہے کہ آپ کی چند لاکھ کی آفر کو قبول کر لے۔ اسے رہنے دیں ممی! اس سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بات کرنی ہے تو پاپا سے کریں... بلکہ ماموں سے کہیں' وہ پاپا سے بات کریں' انکل مسعود سے کہیں وہ پھر بھی کسی نہ کسی حد تک پاپا پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ پاپا ان کی بات سنیں گے۔ وہ انہیں بالکل سرے سے رد نہیں کر سکتے۔"

"تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو... میں جو کرنا چاہتی ہوں' کروں گی تم اتنی عقل مند اور سمجھ دار ہوتیں تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ اب تمہیں ماں کو عقل سکھانا یاد آ گیا ہے۔" منیزہ نے طنزیہ لہجے میں اس سے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں بے وقوف اور احمق ہوں۔ میں تو اس بات پر بحث کر ہی نہیں رہی ویسے بھی مان رہی ہوں کہ میں بے وقوف ہوں' آپ بار بار کیوں جتا رہی ہیں مجھے۔" امبر نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بار بار جتا رہی ہوں کیونکہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" منیزہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

"اوہ منیزہ بھابھی کو تمہاری شادی کا پتہ چل گیا۔" ہارون کمال نے چونکنے کی اداکاری کی۔ "حیرت ہے کیسے پتہ چلا انہیں؟"

منصور علی اگلے دن صبح سیدھا ہارون کمال کے آفس آئے تھے اور انہوں نے آتے ہی ہارون کمال کو پچھلے چند دن میں ہونے والے تمام واقعات کے بارے میں بتا دیا۔ ہارون کمال کا ردِ عمل منصور علی کے لیے غیر متوقع نہیں

تھا' وہ حیران ہوا تھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا کہ اسے کیسے پتہ چلا مگر اسے پتہ چل گیا ہے۔" منصور علی نے کہا۔

ہارون کمال چند لمحے خاموش رہا۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ منیزہ تک یہ خبر پہنچانے کا ذریعہ کیا ہوگا۔ وہ رخشی کو منصور علی سے بھی زیادہ بہتر جانتا تھا۔

"بہت برا ہوا۔"

"ہاں بہت برا ہوا مگر یہ تو کبھی نہ کبھی ہونا ہی تھا۔"

"منیزہ بھابھی یا امبر نے اگر تمہارے ساتھ جھگڑا کیا ہے تو وہ تو تمہارے لیے غیر متوقع نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے وہ اتنا بڑا قدم ہے کہ وہ اتنی آسانی سے تو اسے قبول نہیں کر سکتیں۔" ہارون کمال نے کہا۔

"جانتا ہوں میں کہ وہ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے قبول نہیں کر سکتیں مگر انہوں نے جو کچھ مجھ سے کہا ہے۔ میں اس کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ میرا خون کھول رہا ہے۔" منصور علی نے غصے کا اظہار کیا۔

"اب تم آگے کی سوچو' آگے کیا ہونے والا ہے تمہارے ساتھ۔"

"میں تیار ہوں ہر چیز کے لیے۔" منصور علی نے کندھے جھٹکے۔

"منیزہ بھابھی نے اب تم سے یہی مطالبہ کرنا ہے کہ تم رخشی کو طلاق دے دو۔"

"یہ مطالبہ کرنا نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں وہ یہ مطالبہ امبر کے ذریعے کر چکی ہے مگر میں رخشی کو طلاق نہیں دوں گا' کسی قیمت پر بھی نہیں۔"

"دیکھ لو' آگے چل کر تمہارے مسائل میں اور اضافہ ہوگا۔"

"اس سے زیادہ کیا اضافہ ہوگا۔"

"اگر تم نے رخشی کو طلاق نہ دی تو منیزہ بھابھی اپنے لیے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہیں۔ ضروری تو نہیں ہے کہ اب وہ تمہارے ساتھ رہنے پر رضامند ہوں۔"

"اگر اس نے طلاق کا مطالبہ کیا تو میں بڑی خوشی کے ساتھ اس کا یہ مطالبہ پورا کر دوں گا۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے اس کو اپنے ساتھ رکھنے کا۔"

"تو پھر تمہارے بچوں کا کیا ہوگا۔ ان کے بارے میں سوچا ہے کچھ تم نے؟"

"امبر اور صبیحہ کی تو شادی ہو جائے گی۔ باقی تینوں بچے چاہیں تو اسی گھر میں میرے پاس رہ سکتے ہیں یا پھر اپنی ماں کے پاس چلے جائیں۔" منصور علی بے حد سرد مہری سے کہتے گئے۔

"لیکن میں نہیں سمجھتا۔ طلاق تک نوبت آئے گی۔ منیزہ یہ آرام و آسائش کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ طلاق لے کر وہ کہاں جائے گی بھائی رکھیں گے اسے' ہونہہ!" منصور علی نے حقارت سے کہا۔

"سوچ لو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے خاندان والے سارے اکٹھے ہو کر تمہیں رخشی کو طلاق دینے پر مجبور کر دیں۔ آخر خاندانی دباؤ کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔" ہارون کمال نے کہا۔

"خاندان؟ کون سا خاندان؟ مسعود بھائی تو اس سلسلے میں مجھ سے بات کرنے کی جرات کبھی نہیں کریں گے۔ اور اگر انہوں نے کی بھی تو میں انہیں جھڑک دوں گا اور جہاں تک منیزہ کے خاندان کا تعلق ہے۔ تو میں ان کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں دیتا۔ مجبور ہونے کی تو بات دوسری ہے۔ آخر میں لیتا کیا ہوں ان سے کہ میں ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جاؤں۔ نہیں ہارون کمال! میرے خاندان میں سے کوئی مجھے سمجھانے کے لیے آگے آنے کی حماقت نہیں کرے گا جو کرے گا' وہ منہ کی کھائے گا۔"

"اب دیکھو تم نے فیصلہ کر لیا ہے تو میں تمہیں کیا کہہ سکتا ہوں۔ صرف دعا ہی کر سکتا ہوں تمہارے حق میں

اور دوست کے طور پر تو تم ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ پاؤ گے۔" ہارون کمال نے انہیں یقین دلایا۔

"اگر میں یہ نہ جانتا کہ رخشی کے ساتھ تمہاری بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے تو شاید میں بھی تمہارے فیصلے پر کچھ جز بز ہوتا مگر رخشی بہت اچھی لڑکی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر اچھی بیوی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر منیزہ بھابھی سے تمہاری طلاق ہو بھی جاتی ہے تب بھی تم رخشی کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہو۔"

ہارون کمال نے ایک ہمدرد دوست کا کردار نبھاتے ہوئے کہا۔ منصور علی نے اسے ممنون انداز میں دیکھا۔

☆ ☆ ☆

"بیگم صاحبہ' باہر ایک عورت آئی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ انہیں آپ سے ملنا ہے۔" چوکیدار نے اندر آکر رخشی کو بتایا۔

"نام پوچھ کر آؤ اس عورت کا۔" رخشی نے چوکیدار سے کہا۔

"نام نہیں بتا رہی وہ۔ بہت بدتمیزی سے بات کر رہی ہے۔ میں نے اس سے بار بار اس کا نام پوچھنے کی کوشش کی ہے مگر اس کی ایک ہی ضد ہے کہ آپ اس کا نام کیا اس کو بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔" رخشی کا ماتھا بے اختیار ٹھنکا۔

"کیا حلیہ ہے اس عورت کا؟" اس نے چوکیدار سے پوچھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ چوکیدار نے جواباً اس عورت کا حلیہ اسے بتانا شروع کر دیا۔ رخشی کا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا' وہ منیزہ ہی تھیں۔

رخشی کچھ دیر تک بالکل بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ وہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ پچھلی رات کی گفتگو کے بعد منیزہ اگلے ہی دن اس طرح اچانک اس کے گھر آن پہنچیں گی۔ منصور علی اس وقت آفس جا چکے تھے اور یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ رخشی نے اس دن آفس نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر اب وہ بے اختیار پچھتائی۔

"تم اس سے کہہ دو کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔" رخشی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"مگر میں تو انہیں بتا چکا ہوں کہ آپ گھر پر ہی ہیں۔" چوکیدار نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا اس سے۔" رخشی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "بس تم جا کر اس سے کہہ دو کہ میں گھر پر نہیں ہوں اگر وہ پھر بھی ملنے پر اصرار کرے تو تم اس سے کہہ دو کہ میں اس سے ملنا نہیں چاہتی۔" رخشی نے ایک بار پھر میگزین اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے جی۔ میں جا کر کہہ دیتا ہوں۔" چوکیدار کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ رخشی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے لیے منیزہ کا وہاں آنا غیر متوقع نہیں تھا۔ صرف اس وقت فوری طور پر آجانا غیر متوقع ثابت ہوا تھا۔

"بیگم صاحبہ! وہ عورت بہت شور مچا رہی ہے۔ جانے پر تیار ہی نہیں ہے۔ وہ آپ کو بھی ادھر سڑک پر کھڑے ہو کر گالیاں بک رہی ہے۔ بہتر ہے آپ اس سے خود بات کر لیں۔" چوکیدار نے دوبارہ اندر آکر بے چارگی کے انداز میں کہا صاعقہ نے لاؤنج میں آتے ہوئے چوکیدار کی بات سن لی۔

"کس عورت کی بات کر رہا ہے' یہ کون عورت آئی ہے؟"

"منیزہ۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر یہ کہ وہ باہر کھڑی مجھ سے ملنے کے لیے اصرار کر رہی ہے۔ میرے نہ ملنے پر وہ شور کر رہی ہے۔" رخشی نے کہا۔

"تو تم اس کو اندر بلوا کر بات کر لو... زیادہ سے زیادہ جھگڑا ہی کرے گی۔"

"نہیں، میں اس کو اندر تو کسی قیمت پر نہیں بلواؤں گی۔ میں نے یہاں اپنے گھر میں ملازموں کے سامنے تماشا نہیں لگوانا۔" رخشی نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"تو پھر تم کیا کرو گی۔ وہ تم سے بات کیے بغیر تو نہیں ٹلے گی۔"

"میں اس سے انٹر کام پر بات کر لیتی ہوں۔ تم جاؤ جا کر اس سے کہو کہ وہ مجھ سے انٹر کام پر بات کر لے۔" رخشی نے آخری جملہ چوکیدار سے کہا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"آپ بھی بعض دفعہ حد کر دیتی ہیں امی! مجھے اس کو اندر بلوانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ آپ جانتی ہیں اس عورت کو۔ اس عورت نے کیسی زبان استعمال کرنی تھی میرے اور منصور کے بارے میں اور ملازم پوری کالونی میں سب کچھ بتا دیتے۔ کیا عزت رہتی میری یہاں۔" چوکیدار کے باہر نکلتے ہی رخشی صاعقہ سے الجھنے لگی۔

صاعقہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ کچھ متفکر ہو کر اس کے قریب صوفہ پر بیٹھ گئی۔ رخشی اٹھ کر انٹر کام کے پاس گئی اور اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ گیٹ پر منیزہ کی آواز اس کے کانوں میں آنے لگی۔ وہ چوکیدار کے ساتھ لڑ رہی تھی۔

"کس لیے آئی ہو تم یہاں پر۔" رخشی نے انٹر کام پر منیزہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارا دماغ درست کرنے آئی ہوں۔" منیزہ نے جواباً غرا کر اس سے کہا۔ "ایک بار دروازہ کھول کر تم مجھے اندر تو آنے دو۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ یہاں کس لیے آئی ہوں۔"

"یہ میرا گھر ہے... میں جس کو چاہوں، اندر آنے دوں جس کو چاہوں نہ آنے دوں۔ تم کون ہوتی ہو مجھے دروازہ کھولنے پر مجبور کرنے والی۔"

"اپنا گھر..... شکل دیکھی ہے تم نے اپنی، اپنا گھر؟ کبھی خواب میں بھی تم نے اور تمہاری ماں نے ایسا گھر دیکھا ہے جسے تم اپنا گھر کہہ رہی ہو۔"

"اپنی بکواس بند کرو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" رخشی نے غصے سے کہا۔

"تمہارے جیسی طوائف سے ملنے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ میں تم سے صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ تمہیں جتنی رقم چاہیے مجھ سے لو اور میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دو۔"

"تمہارا شوہر صرف تمہارا نہیں میرا بھی شوہر ہے۔" رخشی نے کہا۔

"تم جیسیوں کے ایسے بے شمار شوہر ہوتے ہیں۔ تم اس کی جگہ کسی اور کو پھانس لینا، جلد یا بدیر تم نے اس کو چھوڑنا تو ہے ہی تو بہتر نہیں کہ رسوا ہوئے بغیر چھوڑ دو۔" منیزہ نے ہتک آمیز انداز میں کہا۔

"تم چھوڑ دو اس کو، تم کیوں نہیں چھوڑ دیتیں اسے۔" رخشی نے سلگ کر کہا۔

"میں نہیں چھوڑ سکتی اسے، میرے پانچ بچوں کا باپ ہے۔ وہ پورے خاندان کے ساتھ علی اعلان بیاہ کر لایا ہے مجھے۔ خاندانی بیوی ہوں میں اس کی۔ تمہاری طرح چوری چھپے والا نکاح نہیں کیا اس نے میرے ساتھ۔" منیزہ کے لہجے کی حقارت بڑھتی جا رہی تھی۔

"میں اس کو نہیں چھوڑوں گی۔ تم اپنے شوہر سے جا کر کہو کہ وہ مجھے چھوڑ دے۔"

"تم مجھے اندر آنے دو، میں اندر آ کر تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں تم سے اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی، یہاں سے چلی جاؤ۔" رخشی نے کہا۔

"تم احسان فراموش ہو رخشی! جانور سے بھی بدتر ہو۔ میری بیٹی سے بھیک لیتی رہی ہو۔ اس کی اترن پہنتی رہی ہو کبھی سوچو ان احسانوں کے بارے میں جو اس نے تم پر کیے تھے۔" منیزہ اور تلملائی۔

"ہاں اترن پہنتی رہی ہوں پہلے تمہاری بیٹی کی... اب تمہاری پہن لی ہے۔ عادت ہو گئی ہے مجھے احسان لینے کی۔ ایک اور احسان لے لیا ہے میں نے اپنے سر..... جاؤ دفع ہو جاؤ۔" اب رخشی نے سرخ چہرے کے ساتھ کہتے ہوئے انٹر کام پٹخ دیا۔

"میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں گیٹ پر جا کر اس عورت کا گلا دبا دوں۔" رخشی نے واپس صاعقہ کے پاس آتے ہوئے کہا۔

"اپنے آپ پر قابو رکھو۔ اتنا غصے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" صاعقہ نے رخشی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، خود اس کے اپنے ہاتھوں کو توتے اڑے ہوئے تھے۔

"آپ کو تو پتہ ہی نہیں ہے یہ عورت کس طرح کی زبان استعمال کرتی ہے۔ آپ اس عورت کی زبان سن لیتیں تو آپ کو بھی اس پر میری ہی طرح بلکہ مجھ سے بڑھ کر غصہ آتا۔" رخشی کہتی ہوئی ایک بار پھر صاعقہ کے پاس بیٹھ گئی۔

اس سے پہلے کہ وہ صاعقہ سے کچھ کہتی، چوکیدار تقریباً بھاگتا ہوا اندر آیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"بیگم صاحبہ! اس عورت نے سڑک پر لوگوں کو اکٹھا کیا ہوا ہے۔ آس پاس کے گھروں سے نوکر نکل کر گیٹ پر آ گئے ہیں۔ وہ آپ کے اور صاحب کے بارے میں بہت بری بری باتیں کر رہی ہے۔" چوکیدار نے بے چارگی سے کہا۔

"کرنے دو، تم گیٹ پر مت جاؤ، اندر ہی رہو۔" رخشی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہ گیٹ کو زور زور سے بجا رہی ہے آپ باہر نکل کر دیکھیں، کتنا ہنگامہ مچایا ہوا ہے اس نے بیگم صاحبہ! بہتر ہے کہ اسے اندر بلا کر آپ اس سے بات کر لیں ورنہ وہ کہہ رہی ہے کہ وہ یہاں سے نہیں جائے گی۔" چوکیدار نے رخشی کو مشورہ دیا۔

رخشی اس کے مشورے پر عمل کرنے کے بجائے اٹھ کر لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ پورٹیکو میں آتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ چوکیدار غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ منیزہ نے واقعی باہر طوفان اٹھایا ہوا تھا، وہ بلند آواز میں بول رہی

شگفتہ محمود کی مرتب کی ہوئی
کھانا پکانے کی مزیدار
ترکیبوں کی
رنگا رنگ کتاب
خاتون کا دسترخوان
شائع ہو گئی
منگوانے کا پتہ: ۳۷، اردو بازار کراچی

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے،

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے' لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حد عزت سے محفوظ رکھیں۔

تھی۔

"گیٹ کی جھریوں میں سے بہت دور سے بھی اسے منیزہ اور اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے لوگ نظر آرہے تھے' منیزہ نے بھی گیٹ کی جھریوں میں سے اسے دیکھ لیا تھا۔ اب اس نے طیش کے عالم میں دروازہ پیٹنا شروع کردیا تھا۔ وہ رخشی کو بلند آواز میں گالیاں دے رہی تھی رخشی کو' صاعقہ کو' ان کے خاندان کو۔

رخشی کی آنکھوں میں خون اترنے لگا تھا۔ وہ شہر کے ایک پوش علاقے میں رہتی تھی۔ ایسا علاقہ جہاں لوگوں کو ایک دوسروں کے گھروں میں جھانکنے یا ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت کا شوق نہیں ہوتا مگر منیزہ نے اس کے گیٹ کے باہر اتنا شور مچایا ہوا تھا کہ آس پاس کی چند کوٹھیوں کے ٹیرس' کھڑکیوں اور بالکونیوں میں گھر کی خواتین اور مرد آگئے تھے۔ بعض میں گھر میں موجود نوکر کھڑے تھے۔

رخشی گیٹ سے اندر کچھ فاصلے پر کھڑی ان نظروں کی تضحیک اور تحقیر کو اپنے وجود میں سوئیوں کی طرح چبھتا محسوس کررہی تھی۔ منیزہ نے جیسے سرِبازار اسے برہنہ کردیا تھا۔

اسے بہت سال پہلے اپنی گلی میں صاعقہ کی ظفر کے ہاتھوں ہونے والی پٹائی یاد آئی۔ سبزیاں اور پھل پوری گلی میں پھیل گئے تھے۔ وہ روتے ہوئے سبزیوں کو' پھلوں کو شاپر میں ڈال رہی تھی۔ لوگوں کی نظریں ہنسی۔ تمسخر تضحیک وہ پھر پانچ سال کی رخشی بن گئی تھی۔ ماں کو باپ کی پٹائی سے نہ بچاسکنے والی رخشی' سبزیوں اور پھلوں کو اکٹھا کرتے روتی ہوئی رخشی۔

"رخشی! اندر آجاؤ۔ یہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" صاعقہ نے اس کا بازو پکڑا۔ رخشی نے جھٹکے کے ساتھ اپنا بازو چھڑایا' کیا اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

"نہیں مجھے یہاں سے نہیں جانا۔ مجھے دیکھنا ہے' یہ مجھے اور کیا کہے گی اور کیا کرے گی۔"

"تم دفع کرو اسے۔" صاعقہ نے کہا۔

"نہیں' میں اسے دفع نہیں کروں گی میں صاعقہ نہیں ہوں امی! میں صاعقہ نہیں بنوں گی' میں کبھی صاعقہ نہیں بنوں گی۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"اس عورت کو ہر چیز کی قیمت چکانی پڑے گی۔ ہر چیز کی' اپنی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی۔ میں اسے اس طرح روند دوں گی کہ یہ دوبارہ اٹھ نہیں سکے گی۔ اس بار میں' میں صرف سبزیاں اور پھل بچاتی نہیں پھروں گی۔ میں سبزیاں اور پھل اکٹھے نہیں کروں گی' میں ہاتھ پکڑوں گی۔"

صاعقہ کو تو اس کی کسی بات کی سمجھ نہیں آئی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

حاشقہ حسین

ہماری آج کی نوجوان نسل سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا جو اپنی تخلیق کے مقصد سے بھی بے خبر ہے۔ جو جانتی ہی نہیں اسے کیا اعلا نصب العین دے کر دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

بقول اقبال!

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا جس کا تو ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

(یا اللہ یہ کون سی زبان بول رہی ہیں۔ تدبر' گردوں' اپنی عقل کے تو تین فٹ اوپر سے گزر گیا) میں نے دل میں سوچا۔

"ذرا سوچیے' ہم اس غلامی کے کلچر سے کب نجات پائیں گے۔"

درس کا ایک حصہ نیند کے جھونکے کی نذر ہوگیا۔ ہوسکتا ہے میں مزید سوتی رہتی مگر قانتا نے وہ زور کی چٹکی کاٹی کہ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ ساری نیند ہوا ہوگئی۔ میں نے دو تین انتہائی ناقابل اشاعت باتیں اسے کہیں اور گھور کر دیکھا مگر جونہی درس دینے والی لڑکی کو اپنی طرف متوجہ دیکھا' میں کھسیا گئی اور فوراً" عاجزی سے گردن جھکادی۔ گویا ساری محفل میں مجھ سے زیادہ شریف اور نیک کوئی نہ ہوگا۔ ان کا بیان ابھی تک جاری تھا۔

میں نے دو تین جمائیاں لیں' بڑی مشکل سے چھپ چھپ کر مگر آگے پیچھے والے... لگتا ہے کسی اور کو کوئی کام ہی نہ تھا' سب گھور گھور کر مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ مگر وہی ازلی لاپروائی۔

"ہونہہ! دیکھتے ہوں تو دیکھیں۔" میں نے جل کر سوچا اور گھور کر قانتا کو دیکھا۔

"کہاں پھنسوادیا۔" خدا خدا کر کے درس ختم ہوا' میں الحمدللہ نیند پوری کرچکی تھی' لہٰذا کافی فریش محسوس کررہی تھی۔ میل ملاقات کا سلسلہ جاری تھا۔ قانتا ہر ایک سے ایسے محبت و عقیدت کے ساتھ مل رہی تھی گویا فرصت ہی فرصت ہو۔ میں نے جل کر اس کے کان میں کہا۔

"اب چلو بھی! کیا آخری ملاقات ہے؟" اور اس

نے مجھے جوابا" غصے سے گھورا مگر مجال ہے جو مجھ پر اثر ہو' وہ بھی قانتا کے غصے کا۔ وہاں سب ہی اسٹوڈنٹ تھے' کوئی کالج' کوئی یونیورسٹی کا۔ ہم دونوں بہنیں بھی یونیورسٹی سے ڈائریکٹ آئی تھیں' بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ میں نے پھر قانتا کو کہنی ماری۔

"اس سے پہلے کہ میں جان سے گزر جاؤں' گھر چلی چلو۔" وہ جس سے بات کر رہی تھی' وہ غالبا" میزبانوں میں سے تھیں۔

"ارے کھانا لگنے والا ہے' کھا کر جانا۔" میں نے مارے مروت کے انکار کیا مگر وہ تو بضد ہی ہو گئیں۔

کھانا دیکھ کر مزید بھوک ہوا ہو گئی۔ "یہ کیسا کھانا ہے' چاول میں بوٹی نہیں۔ رائتے کے نام پر پانی کے ٹب میں ایک چمچہ دہی گھول لائے ہیں۔ میں' نہیں کھاتی' ابھی ابھی گھر چلو۔"

"پاگل ہو' کھانے کے بعد تو اصل پروگرام ہے۔ "آج کے دور میں دین کا کام کیسے کریں۔" میں تو قطعا" نہیں چلوں گی۔ تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔" اب وہ کھل کر سامنے آگئی۔

"جھوٹی۔" میں بے چارگی سے چلائی۔ "تم نے کہا تھا صرف ایک گھنٹے کا پروگرام ہے۔"

"غلط۔" اس نے فورا" کہا۔ "میں نے کہا تھا کہ سہ پہر تک کا پروگرام ہے' مزا آیا تو بیٹھ جائیں گے۔"

میں نے دل میں جل کر کہا۔ "سیاسی بیان" اور بظاہر بہت پیار سے سمجھایا۔

"دیکھو پیاری! امی پریشان ہوں گی' کچھ ان کی پریشانی کا ہی لحاظ کر لو۔"

"اس کی تم فکر ہی نہ کرو۔" اس کے پاس گویا ہر پریشانی کا حل تھا۔ "میں نے امی کو بتا دیا تھا کہ ہم تربیت کے پروگرام میں جائیں گے۔"

"ایسے خالی پیٹ' بھوکا مار کر کون سی تربیت ہو گی۔" میں نے احتجاجا" پلیٹ چھوڑ دی۔

"افوہ بھئی! خالی پیٹ ہی تو دراصل تربیت ہوتی ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ اس موضوع پر لیکچر دیتی' میں نے اسے ٹوک دیا۔ مجھے پتا تھا اب وہ قرآن' حدیث' تاریخ' فقہ کے حوالے دیتے ہوئے بولتی چلی جائے گی۔ اتنے میں ایک پیاری سی لڑکی ہمارے پیچھے سے بولی۔

"ارے قانتا! یہ تم ہو۔" پھر وہی محبت کے عظیم مظاہرے مگر پھر بھی وہ لڑکی مجھے اچھی لگی۔ خوبصورت نفیس سا سوٹ اور دوپٹے کے ہالے میں اس کا خوبصورت چہرہ دمک رہا تھا۔ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ قانتا نے تعارف کروایا۔

"یہ عائشہ ہیں' ڈاؤ میڈیکل کالج میں پڑھتی ہیں۔" میں نے ہاتھ ملایا۔ اس نے میرے ہاتھ میں زبردست قسم کا کلب سینڈوچ دیتے ہوئے کہا۔

"اسے چکھ کر دیکھو' میری امی نے گھر پر بنایا ہے۔ بازار سے سوگنا اچھا ہے۔"

"ارے نہیں یار! ہم تو کھا چکے۔" میں نے مروتا" کہا۔ قانتا نے بھی مجھے نہ لینے کا اشارہ کر دیا تھا مگر وہ بھی پیچھے ہی پڑ گئی۔

"مجھے پتا ہے تم نے کیا کھایا ہو گا۔ پلیز لے لو' دراصل میں اسے بیگ میں بھول گئی اور کھانا کھا لیا۔ اب تو یہ ضائع ہو جائے گا' جب تک میں گھر پہنچوں گی۔"

یہ سن کر میں نے فورا" لے لیا۔ ضائع ہونے سے بہتر ہے۔

میں اس پر یہ احسان کر ہی دوں اور ایک لقمہ لیتے ہی میرے منہ سے نکلا "واؤ' زبردست" قانتا اور عائشہ باتیں کرتے ہوئے ہنس دیں۔

نکلتے نکلتے میں نے عائشہ کو دیکھا۔ چند لوگوں کے ساتھ جنہوں نے کھانا نہیں کھایا تھا' وہ دسترخوان پر بیٹھی کھا رہی تھی۔ وہی غریبانہ چاول ... اب تو مزید غریبانہ ہو گئے تھے' ساتھ میں پانی ملا رائتہ۔ بے اختیار مجھے خود پر افسوس ہونے لگا۔ قانتا پر غصہ بھی آیا۔ میں نے دل میں سوچا سارے فساد کی جڑ وہ ہی تھی۔

گھر جا کر میں پشیمان سی رہی۔ قانتا سے بھلا کیسے

چھپ سکتا تھا۔ اوپر تلے کی ہم دو ہی بہنیں تھیں' دوست بھی' سہیلیاں بھی' یونیورسٹی فیلو بھی۔ کسے بغیر بھی ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے تھے مگر یہاں آکر اختلاف ہو جاتا بلکہ اختلاف تو چھوٹا لفظ ہو گا۔ خلیج تھی' دراڑ تھی جو پاٹے نہ بھرتی تھی۔

"آخر ہوا کیا ہے' کچھ پتا تو چلے۔" اس نے کم از کم دسویں مرتبہ مجھ سے پوچھا اور میں پھٹ پڑی۔

"تمہیں پتا ہے یہ نیکی والے جراثیم مجھ میں ہیں نہیں پھر بھی تم گھسیٹ گھسیٹ کر مجھے ایسے پروگرامز میں لے جاتی ہو۔ خوامخواہ دوسروں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔"

"ہیں۔ یہ دوسرے کون ہیں' یعنی مجھ سے بھی زیادہ مظلوم کوئی ہو سکتا ہے۔" اس نے سنجیدہ گفتگو کو مزاحیہ رنگ دینے کی کوشش کی جس میں کافی حد تک ناکام رہی۔

میں نے غصے سے کہا۔ "وہ تمہاری عائشہ' اس نے اپنا پیزہ' چکن' مکھن سے بھرا سینڈوچ مجھے دیا اور خود بعد میں بیٹھ کر وہ سادے چاول کھا رہی تھی۔"

"تمہیں افسوس ہوا۔" قانتا نے کہا اور میں نے چڑ کر کہا۔

"ظاہر ہے۔"

"مگر تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ وہ کون سا جذبہ ہے جو انسان کو اپنے حصے کی نعمتیں' خوشی خوشی دوسروں کے حوالے کر دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو آدمی کو محض اوپر سے نہیں اندر سے پورا کا پورا بدل دیتی ہے۔ کبھی تو سوچا کرو یار!" قانتا نے کہا اور میں یکدم خاموش ہو گئی۔

بچپن سے ایک ہی ماحول میں پلے بڑھے' ایک ہی طرح کی تربیت' وہی ماں باپ' رشتہ دار مگر پھر بھی ہم دونوں میں یہ فرق کیوں؟ میرے دل میں یہ سوال ابھرا۔

اور یہی سوال جب میں نے ابا جی کے سامنے اٹھایا تو وہ مسکرا دیے۔

"بیٹا جی! یہ تو اپنے اپنے یقین اور ایمان کا معاملہ ہے۔"

"پر ابا جی یقین تو مجھے بھی ہے۔" میں نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"ہاں ہو گا ہی..." ابا جی نے تائیدا" کہا "ایسا ہی جیسا یہودی کے گھر پیدا ہونے والا یہودی' ہندو کے گھر پیدا ہونے والا ہندو ہوتا ہے۔ باپ دادا کے مذاہب کی پیروی کون نہیں کرتا؟" اور میں کھسیا گئی۔

"افوہ ابا جی...! اب ایسا بھی نہیں ہے۔ صبح یونیورسٹی جانا' پھر گھر کی ذمہ داریاں' ٹیوشن پڑھانا پھر اتنا وقت انسان کہاں سے نکالے کہ یہ جستجو کرتا پھرے کہ کیا صحیح ہے؟ پھر بھی ہم غنیمت ہیں کم از کم بڑے بڑے گناہ تو نہیں کرتے۔"

ابا جی نے فورا" گردن ہلا دی "ہاں بیٹا جی! بہت اچھے... انسان خود کو جھوٹی تسلی دینا چاہے تو کون اسے روک سکتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

زندگی اتنی مہلت کہاں دیتی ہے کہ آدمی رکے اور رک کر سوچے۔ سمسٹر شروع ہوئے اور پھر وہی "پھر بعد میں سوچیں گے' امتحان کے بعد ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔" والی سوچوں نے دل کو اطمینان دلا دیا۔

امتحان ختم ہوئے تو گویا زندگی نے ایک نیا آغاز لیا۔ اس دن قانتا اور میں ساتھ ہی یونیورسٹی سے آئے۔ میرے بیگ میں سی ڈیز دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"تم کیا آج ہی پیدا ہوئی ہو؟ یہ نئے تازہ ترین گانوں کی سی ڈیز ہیں۔" میں نے اس پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے' امتحانوں کے لیے تم نے فلمیں' گانے' تفریح سب چھوڑ رکھا تھا۔" اس نے کہا اور میں نے اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے کہا۔

"امتحانوں کے لیے نہیں' بے وقوف اچھے نتائج کے لیے... کچھ نہ کچھ قربانی تو دینی پڑتی ہے۔"

اس نے بڑی سمجھ داری سے گردن ہلاتے ہوئے

کہا۔ ”یہی چیز تو میں تمہیں سمجھاتی ہوں کہ اچھے نتائج کے لیے کچھ نہ کچھ قربانی تو دینی پڑتی ہے تو تمہاری سمجھ میں بات نہیں آتی۔“

”مگر یہ تو وقتی بات تھی نا! تم تو کہتی ہو ساری زندگی کے لیے سب کچھ چھوڑ دو۔“ میں نے کہا۔

”کون سی زندگی کی بات کر رہی ہو؟ یہی نا، جس کے بارے میں جب اللہ سوال کرے گا کہ تو نے تو بڑی طویل عمر گزاری؟ اور بندہ کہے گا، نہیں میرے رب میں تو وہاں صبح یا صبح کا بھی ایک حصہ رہا ہوں۔“ قانتا نے کہا۔

لیکن میرا تمام تر دھیان سی ڈیز کی طرف تھا۔ اس لیے میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

”پلیز یار! اپنا یہ درس بعد پر اٹھا رکھو۔“ اور مڑ کر جانے لگی۔ اس نے جاتے جاتے کہا۔

”بات کو کم از کم سن لیا کرو۔“ میں نے رکے بغیر کہا۔

”میری دوستیں کہتی ہیں سنیں گے تو عمل بھی کرنا پڑے گا، بائے بائے۔“

بات یہ نہیں ہے کہ ہمیں پتا نہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو عموماً یہ باتیں پتا ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی معلومات ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے رویے نہیں بدلتے، یہ شاید ہماری بد نصیبی ہوتی ہے۔

پہلے میں گانوں کی سی ڈیز لگاتی تو قانتا ادھر ادھر ہو جاتی تھی یا پھر سمجھانے کی کوشش کرتی مگر ان چھٹیوں میں اس نے نئی حکمت عملی تیار کی۔ نامعلوم کہاں سے وہ اصلی مجاہدوں کی آواز میں ریکارڈ کیے گئے ترانے لے آئی۔ اب برابر کا مقابلہ ہوتا۔ جتنی دیر گانے بجتے اتنی دیر وہ عجیب و غریب لحنوں اور تلفظ پر مشتمل ترانے سننے پڑتے۔ میں نے بڑا سخت احتجاج کیا مگر ابا جی کی انصاف پسند طبیعت نے برابری کا فیصلہ سنا دیا، اور میں تلملاتی رہ گئی۔

لیکن کب تک؟ آہستہ آہستہ وہ ترانے خاص طور پر ایک جس کی شاعری بہت پُرسوز تھی اور آواز روح میں اترتے ہوئے محسوس ہوتی اثر کرنے لگے۔ اس دن میں فرصت سے الماری صاف کر رہی تھی۔ کپڑوں کے ڈھیر کے ڈھیر، بنانے کا شوق تھا۔ رکھنے کا سلیقہ کچھ خاص نہیں۔ ”درحقیقت وقت ہی نہیں ملتا۔“ جب امی زیادہ باتیں سناتیں تو میں یہی جواب دیتی اور واقعی یہ سوچ کر تو مجھے پسینہ آگیا کہ مجھے اس ڈھیر کا جواب دینا پڑے گا۔

ایسے پس منظر میں وہ ترانہ چل رہا تھا اور بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ دل کے کسی حصے میں آگاہی کا احساس ہوا۔

”خدا کوئی ہے ضرور....“ ایک جستجو سی ہوئی۔ ”وہ جو ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے، اسے محسوس کرنا چاہیے۔ کھوجنا چاہیے۔“

”یہ ایک لمحہ تھا آگہی کا۔ شعور کا، اگر میں اسے آنچل میں محفوظ کر لیتی، کہیں باندھ کر رکھ لیتی.... مگر پھر وہی زندگی، وہی زندگی کی مصروفیات، لیکن میں نے قانتا سے شیئر کیا تھا، وہ بہت خوش ہو کر کہنے لگی۔

”ہو سکتا ہے یہ تمہارا ٹرننگ پوائنٹ ہو۔“

اتفاق سے اسی ہفتے امی کی عزیز سہیلی، دور کی رشتہ دار صالحہ آپا ملاقات کرنے آئیں پہلے وہ آتی تھیں تو میں ادھر ادھر ہونے کی کوشش کرتی تھی کہ کہیں لیکچر نہ شروع ہو جائے، بقول خود ان کے انہوں نے اپنے لیکچرز سے بڑے بڑے گناہ گاروں کو سیدھا کر دیا ہے۔ اسی لیے بڑی آس کے ساتھ میں ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔

”آپا! نیک بننے کا کوئی آسان سا فارمولا بتا دیں۔“

انہوں نے پہلے مجھے گھور کر دیکھا پھر دیکھا میرا مذاق کا کوئی موڈ نہیں تو گویا ہوئیں۔ ”نماز میں دل لگاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں لگتا، نہ دل نہ دھیان....“

کہنے لگیں۔ ”گناہ چھوڑ دو۔“

”نہیں چھٹتے۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔

انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔ ”پھر تم نیک نہیں ہو سکتیں۔“

”جو اللہ کو منظور....“ میں نے گردن جھکا لی۔

اب وہ بھڑک گئیں۔ ”غضب خدا کا، تم لوگ تو

کفار مکہ سے بھی گئے گزرے ہو، وہ بھی یہی تو جیہات پیش کرتے تھے کہ اگر اللہ چاہے تو ہمیں کان سے پکڑ کر نیکی کے راستے پر چلا دے۔ آخر ہو تو ہندوؤں کی اولاد، خون کا اثر تو ہو گا ہی۔“

میں ایک لمحہ کے لیے تو ہکا بکا رہ گئی پھر کہا۔

”یہ سب ڈھکوسلہ ہے، اپنی اپنی دکان چمکانے کا ذریعہ.... آپ ذرا مجھے بتائیے، میں اگر نماز پڑھنا چاہوں تو کس مسلک کی پڑھوں؟ اپنے معاملات پر (روزمرہ کے) کس کی رائے کے مطابق فیصلہ کروں؟ کوئی دو مولانا کسی ایک خیال پر متفق نہیں ہوتے۔ غضب خدا کا اگر ہم کفار مکہ سے بدتر ہیں تو آپ دین کی بات کرنے والے بھی تو یہود و نصاریٰ کے علماء کے استاد ہیں۔ وہ کتاب کا علم خود تک چھپا کر محدود رکھتے تھے اور آپ لوگ ہمیں قرآن سے قریب ہی نہیں ہونے دیتے کہ ہم اسے حاصل کر سکیں....“

یہاں تک بھی انہوں نے مشکل سے سنا، اس دوران ہی انہوں نے برقع پہنا، غصہ سے مزید کچھ باتیں مجھے سنائیں اور روانہ ہو گئیں۔ میں نے بھی خود کو تھپکی دی۔

مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

رات تک میں یہی سمجھتی رہی میں نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، بحث میں انہیں چاروں شانے چت کر کے۔ مگر قانتا کا اترا اترا چہرہ بار بار سامنے آجاتا، نگاہوں میں شکایت.... بالآخر مجھ سے صبر نہ ہوا۔

”ایسا کیا جرم کر دیا میں نے۔“ میں نے کہا۔

”تم بہتر جانتی ہو گی۔“ اس نے بے رخی سے منہ پھیر کر کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ مجھے غصہ آنے لگا۔ ”تم مجھ سے عیسائیوں جیسے رویے کی امید رکھتی ہو، کسی نے ایک تھپڑ مارا آپ نے دوسرا گال بھی پیش کر دیا۔ یہ بھی بھلا کوئی انصاف ہے۔“ میں نے تصور ہی تصور میں خود کو تھپکی دی۔ ”آنکھ کے بدلے آنکھ، میں نے تو دین کا ایک حکم پورا کیا۔“

اب اس سے صبر نہ ہو سکا۔ قانتا نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اپنے پاس بٹھایا پھر بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ ”میں تم سے ناراض نہیں ہوں لیکن مجھے تمہارے رویے پر افسوس ہوا۔ کچھ بھی تھا وہ ہماری بڑی ہیں۔“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”خدا کے لیے یہ بزرگی، یہ لحاظ اور عمر کا حوالہ مجھے مت دو۔ یہ کیا بات ہوئی ہمارے اکثر بزرگ ذہنی طور پر بچوں سے بدتر ہوتے ہیں۔ بات بات پر طعنے دینا، فوراً بدلہ لینے کے لیے کھڑے ہو جانا، سامنے والے کو خوامخواہ ذلیل کرنا، نیچا دکھانا۔ عمر بڑھنے پر تو ان کا کوئی اختیار ہی نہیں تو پھر بزرگی کاہے کی۔ ایک ایسی چیز جو خود بخود مفت میں مل رہی ہے ہمارے بزرگ اسے غلط استعمال کرتے ہیں۔ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اپنی عمر کا۔“

حسب معمول بولتے بولتے میری آواز اونچی ہو گئی۔ قانتا کی عادت تھی ایسے موقع پر میرے سامنے سے ہٹ جاتی تھی۔ اس نے یہی کیا۔ کھڑکی کے سامنے جا کر باہر دیکھنے لگی، مجھے اپنا آپ چغد، بے وقوف محسوس ہوا، سامنے کوئی نہیں اور میں چلائے جا رہی ہوں۔ مجھے اور غصہ آیا میں نے اور تیز آواز میں کہا۔

”کم از کم بات تو سنو! اٹھ کر چل دیں۔“

اس نے پلٹ کر دیکھا، وہ مسکرا رہی تھی اور صورتحال کو محسوس کر کے مجھے بھی ہنسی آگئی۔

”ذرا خود ہی اپنا تجزیہ کرو، بزرگوں کے جن رویوں سے تمہیں شکایت ہے۔ جو اخلاقاً بے حد برے سمجھے جاتے ہیں وہ سب تم میں موجود ہیں۔ تم جو کچھ کہہ رہی تھیں، سب خود تم پر ہی صادق آرہا تھا۔ کیا فائدہ ایسے تجزیے کرنے کا جس میں انسان دوسروں کے بخیے ادھیڑتا رہے اور خود کو بھول جائے۔“ میں کھسیا گئی۔

”لیکن یار!“ میں نے مدافعتی لہجے میں کہا۔ ”آپا کو تم مجھ سے بہتر جانتی ہو، اپنی بہو پر کتنے ظلم کرتی ہیں، سارے خاندان کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور چلی ہیں دوسروں کو تبلیغ کرنے۔“

”دیکھو، پھر وہی حرکت۔“ اس نے مجھے تنبیہی

نظروں سے گھورا۔ "اگر دین کے معاملے میں یہ دیکھو گی تو اس کا مطلب ہے تمہیں سنجیدگی سے دین حاصل کرنے میں دلچسپی ہی نہیں ورنہ تم اپنی اصلاح کی فکر کرتیں' تاکہ دوسروں کی۔ ایک حدیث کا مفہوم میرے ذہن میں ہے کہ یہ مت دیکھو کون دے رہا ہے یہ دیکھو کیا دے رہا ہے۔"

اس نے بات ہی ختم کردی۔

کہتے ہیں طلب سچی ہو تو منزل آسان ہو ہی جاتی ہے۔ کچھ ہی دنوں میں یونیورسٹی میں ایک بڑے مشہور اسکالر کے لیکچر کا اہتمام کیا گیا' میں اور قانتا بڑے شوق سے گئے انہیں سننے۔

"بعض لوگوں کو دل میں اتر کر بات کرنے کا فن آتا ہے۔" لیکچر کے دوران میں نے قانتا سے کہا۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔

"زمین تیار ہو' ہل چلایا گیا ہو اور اللہ کی رضا بھی ہو تو پھر بیج پھلنے پھولنے لگتا ہے۔"

"اللہ چاہے تو بنجر زمین پر بھی فصل کھڑی ہو جائے۔"

"بنجر زمین پر اگتا تو ہے مگر جنگلی پودے' کیکر اور دیگر حشرات الارض اس دن شہر کے مضافات میں گئے تھے' تو کیا تم نے دیکھا نہ تھا کہ جس زمین پر محنت کی گئی تھی۔ وہ لہلہا رہی تھی گندم کے پودوں سے اور جو بنجر بے آباد تھیں وہاں جنگلی پودے' خودرو جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ اس دنیا میں اسباب آپ کو خود پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ اللہ بھی بندے کی طلب کے مطابق بلکہ صرف طلب نہیں' کوشش و سعی کے مطابق ہی نوازتے ہیں۔" وہ بول ہی رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"خواتین کا تعلق کسی زمیندار گھرانے سے لگتا ہے۔" کسی دوسرے نے اضافہ کیا۔

"نہیں زرعی یونیورسٹی سے۔" اور ہم دونوں کھسیا کر مسکرانے لگے۔

سوال جواب کے لیے دیے گئے وقت میں ڈاکٹر صاحب کے پاس کاغذوں کا پلندہ جمع ہو گیا۔ میں نے بھی ہمت کر کے ایک سوال جو ہمیشہ مجھے پریشان کرتا تھا۔ لکھ کر دے دیا اور خوب لمبا چوڑا لکھا۔

"اتنے فرقے ہیں' کس کو پکڑیں' کس سے لگائیں اور مزید تلخ تجربات کے حوالے کہ جی فلاں مسلک والے کہتے ہیں' فلاں مسلک کی نماز صحیح نہیں۔ آدمی کے اعمال قبول نہیں ہوتے۔ سب سے آخر میں' میں نے پوچھا آپ کا تعلق کس فرقے سے ہے؟"

مزید اربات یہ ہوئی کہ اتنے لمبے سوال کے جواب میں تو باتوں کا ڈھیر لگ جانا چاہیے تھا' عالم صاحب نے ایک ہی سوال میں سارا جواب دے دیا۔

"آپ کے گھر میں قرآن نہیں ہے کیا؟" اور اس لمحے میں جتنا شرمندہ ہوئی اتنا کبھی نہ ہوئی تھی۔ اب کیا کہتی' قرآن ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا' سمجھنے کا وقت ہی نہیں۔ میں یونیورسٹی کی طالبہ جو بے شمار کتابوں کو سال بھر میں کھنگالتی ہوں۔ اسے یہ ایک کتاب پڑھنے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ اباجی کہا کرتے ہیں۔ کوئی لمحہ ہوتا ہے جو آدمی کے اندر کی دنیا بدل ڈالتا ہے' میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس ایک لمحے کے بعد بھی جب میں نے قرآن سے تعلق جوڑنے کے بارے میں سوچا۔ میں نے باقاعدہ قرآن پڑھا غالباً" دو مہینے یا شاید ڈیڑھ۔

اسی دوران یونیورسٹی میں دوستوں سے ڈسکشن کے دوران یہ ساری باتیں ہوئیں۔ انہی میں ایک تیز و طرار لڑکی نے کہا۔

"یار! اگر قرآن پڑھنے یا سمجھنے سے اختلافات دور ہوتے تو سب سے زیادہ تو یہ علماء ہی قرآن پڑھتے ہیں اور انہی میں اختلاف سب سے زیادہ ہے؟"

اور میں ایک لمحے کے لیے بالکل خاموش رہ گئی۔

گھر جا کر بھی میں سوچتی رہی اور ظاہر ہے قانتا سے کہاں یہ معاملہ چھپا رہ سکتا تھا۔ جب اسے بتایا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"یہ بتاؤ' تمام علماء کی قبروں میں تم جاؤ گی۔ جواب دینے کے لیے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر یہ تمہارا سر درد تو نہیں کہ وہ کیوں آپس میں اختلاف کرتے ہیں؟" پھر سنجیدگی سے بولی۔

"ذرا اطمینان سے بیٹھو اور میری بات سنو' تم بیمار ہوئیں اور دو الگ الگ ڈاکٹروں کے پاس گئیں۔ کیا دونوں کی رائے ایک ہوتی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہم نے سائیکالوجی پڑھی تھی کالج میں گیا' فرائڈ اور ایڈلر کے خیالات یکساں تھے۔" اور میں نے پھر نفی میں گردن ہلادی۔

"دیکھو' نقطہ نظر مختلف ہونا الگ چیز' ہر دو آدمی ایک ہی چیز کو اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنی سوچ کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ جیسے سائیکالوجی کے اسکول آف تھاٹ تھے۔ ان میں سے کوئی دوسرے کو صریحاً" غلط نہیں کہتا اور کہہ بھی نہیں سکتا' ایسے ہی یہ دین کے اسکول آف تھاٹس (طرز فکر) ہیں۔ اور ہمارا یہ کام نہیں کہ ہم دوسرے کے گریبان میں جھانکتے پھریں' ہمیں تو اپنی فکر کرنی ہے بس۔ ویسے بھی دین سب سے پہلے دوسروں کی محبت و خیر خواہی سکھاتا ہے' نہ کہ نفرت۔ تمہیں یاد نہیں ڈاکٹر صاحب نے اپنے لیکچر میں کیا کہا تھا کہ تمام فرقوں میں ننانوے فیصد باتیں مشترک ہیں۔ ایک فیصد پر اختلاف ہے اور ظاہر ہے وہ عین انسانی ہے۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہم خود اپنی تربیت' اپنی فکر کریں۔ اور اگر تم واقعی سیریس ہو تو نماز تو ماشاء اللہ تم پڑھتی ہی ہو۔ ایسا کرو روزانہ دو رکعت نماز حاجات کے پڑھا کرو اور خوب خشوع و خضوع کے ساتھ۔ رو رو کر اللہ سے دعا کیا کرو کہ وہ تمہیں ہدایت دے دے اور صحیح راستہ دکھادے۔"

اور اسی خلوص کی تو مجھ میں کمی تھی۔ آپ ایک پورے ماحول' سیٹ اپ کا حصہ ہوتے ہوئے۔ چاہیں بھی تو اس سے نکل نہیں سکتے۔

البتہ دوستوں کا وہ نظریہ میں نے بالکل رد کردیا تھا کہ "سنو گے تو عمل کرنا پڑے گا۔" اس لیے میں ہر سننے والی جگہ پر ضرور جاتی اور ان سے بھی کہتی کہ "یار مجھے اور تمہیں یقین ہے کہ سال کے آخر میں امتحان ہے اور ہمیں ذاتی طور پر استاد پسند ہو یا نہ ہو' مضمون کڑوی گولی لگے پھر بھی ہم لیکچر اٹینڈ کرتے ہیں۔ گرمی ہو' سردی ہو' ڈگری حاصل کرنے کے لیے سفر کرتے ہیں' محنت و ریاضت کرتے ہیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ امتحان ہوگا۔ ہم لیکچر لیں یا نہ لیں' پڑھیں یا نہ پڑھیں۔ اور پھر جس کی جتنی استطاعت ہے بلکہ استطاعت سے بڑھ کر ہی تیاری کرتا ہے تو جب دنیا کے معاملے میں ہم اتنے سمجھ دار ہیں تو دین کے معاملے میں ہماری عقلیں کیوں خبط ہو جاتی ہیں اور ہم اتنے معصوم' بے نیاز اور سیدھے ہو جاتے ہیں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں پاتے اور ہم کہنے لگتے ہیں کہ سنیں گے تو عمل کرنا پڑے گا۔"

"بے وقوف ہو تم بھی' بھئی! اس لیے کہ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔" سمیرا بولی۔

مگر اب کی مرتبہ میں سن کر گم صم نہ ہوئی۔ میں نے کہا۔ "جتنا وہ غفور الرحیم' مہربان ہے' اتنا ہی جبار' قہار۔ انصاف کرنے والا بھی ہے اور جس سورۃ ملک کو آپ رات سونے سے پہلے پڑھتی ہیں' ذرا سمجھ کر بھی دیکھیں۔ صاف صاف لکھا ہے۔

"جو کہ آنکھیں کھول کر' بالکل سیدھے راستے پر رواں دواں ہے اور جو منہ اوندھائے چل رہا ہے۔ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟" اور ایسے ہی سوال قرآن میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں کہ اے انسانو! کچھ عقل ہی سے کام لو۔ کائنات میں غور و فکر کرو۔"

"ایک تو یار! تم نے بات بات میں درس دینا شروع کردیا ہے۔ لگتا ہے اوور ڈوز ہو گئی ہو۔" سمیعہ نے میری بات کاٹ دی۔ میں نے بھی بات کا موضوع بدل دیا' کیونکہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اوور ڈوز دے رہی ہوں۔

ہم نے بلڈنگ میں ہی سائرہ آنٹی کے گھر ہفتہ واری کلاس کا اہتمام کیا تھا جہاں سب مل کر بیٹھتے' سائرہ آنٹی نے خود کسی مدرسے سے تجوید پڑھی تھی۔ اب ہمیں پڑھا رہی تھیں۔ ساتھ میں سورۃ ملک بھی حفظ

کروا رہی تھیں' ہم آٹھ لڑکیاں تھیں۔ تین یا شاید چار مہینے میں ہی ریگولر جا سکی' پھر وہی ناغے شروع ہو گئے۔ بالآخر یہ سلسلہ بھی اپنے انجام کو پہنچا۔ وہی زندگی اور وہی زندگی کی مصروفیات۔ لیکن ایک تڑپ تھی۔ کہیں اندر کوئی کسک تھی۔ وقت تو بڑے پیار سے' دھیمے دھیمے ہمیں گزارتا چلا جاتا ہے۔ فکر تو ہمیں ہی کرنی چاہیے کہ نامعلوم کب سفر ختم ہو جائے اور وہ ہمیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکے۔

☆ ☆ ☆

رمضان آئے تو گویا پورے معاشرے پر نیکی کی روح غالب آگئی۔ اماں کو میں نے دیکھا۔ تلاوت سنتے سنتے رو پڑتیں۔ نماز میں' دعا میں خوب روتیں۔ آخری طاق راتوں میں' میں قانتا کے ساتھ رت جگوں میں گئی۔ وہاں خود قانتا دعا کراتے کراتے رو پڑی لیکن میری آنکھ سے آنسو نہ ٹپکا۔

بہت پہلے کہیں درس میں سنا قرآن ہی کا حصہ یاد آگیا کہ "ان کے دل پتھر ہیں' بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت" کیونکہ پتھر پر بھی مسلسل پانی پڑے تو وہ پھٹ پڑتے ہیں۔ ٹوٹ جاتے ہیں۔

اور پھر میں نے سوچا کوئی سلسلہ ہو جو مستقل ہو' مسلسل ہو۔ قانتا سے ذکر کیا تو اس نے بھی بڑی حوصلہ افزائی کی۔

"مگر اس کے لیے بہت وقت چاہیے یار۔" میں نے کہا۔ "تم جیسے لوگوں کو فرق نہیں پڑتا۔ پیدائشی نیک! لیکن ہم جیسے لوگوں کو خود پر بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"ہر آدمی کی اپنی اٹھان ہوتی ہے' کچھ لوگ تھوڑا کھاتے ہیں۔ دبلے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ تھوڑا کھا کر خوب پھیل جاتے ہیں۔ میں اور تم ایک جیسی نیکی کریں تو اجر برابر نہیں ہوتا ہوگا۔ کیونکہ تمہیں وہ نیکی کرنے کے لیے اتنی محنت کہاں کرنی پڑتی ہے' جتنی ہم جیسوں کو۔

(واللہ اعلم (اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے) وہ مسکرا کر کہتی۔

ہاں بس ایک فکر تھی مجھے رونا نہیں آتا تھا۔ ان ہی دنوں میری ماموں زاد بہن صدف رہنے آئی۔ اس کا چھوٹا سا بیٹا واکر (چاند گاڑی) میں بیٹھا مسلسل اس کی طرف لپکتا تھا۔ جتنے پیار مارتا اتنا پیچھے' ماں سے دور ہوتا جاتا۔ (جب بچے نیا نیا واکر چلانا سیکھتے ہیں تو پیچھے ہی یعنی الٹا چلاتے ہیں۔)

وہ جتنا ہمک ہمک کر ماں کی گود کا شیدائی ہو رہا تھا' اتنا ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔

بالآخر وہ اپنی سعی مسلسل سے تھک گیا یا مایوس ہو گیا اور اس نے رونا شروع کردیا۔ ماں لپک کر گئی اور اسے گود میں لے لیا۔ بس اسی لمحے نہ معلوم کیسے میری آنکھوں میں ڈھیروں پانی اتر آیا اور میں نے چپکے سے اپنے مالک سے کہا۔

"اے میرے رب! نہ معلوم کیسی سعی مسلسل ہے کہ خود کو پیچھے ہٹتا ہوا محسوس کرتی ہوں۔ اب تو ہی آگے بڑھ کر تھام لے تو یہ ڈر' خوف' واہموں' اندیشوں بھری رات ختم ہو اور ایک نئی سحر طلوع ہو۔"

زہرہ ممتاز

شریکِ سفر

ناولٹ

آصفہ، شرجیل کی منگیتر تھی اور شرجیل کو بچپن سے بے حد چاہتی تھی۔ شرجیل بے حد مغرور اپنی چلانے والا اور ماں بہن کے کہے پر چلنے والا مرد تھا۔ ساتھ ہی وہ آصفہ پر اپنا حق بھی جماتا تھا۔ طلعت، آصفہ کی بہت قریبی سہیلی اور کزن تھی۔ آصفہ اور طلعت یک جان دو قالب تھیں مگر طلعت آصفہ کی شرجیل کے لیے دیوانگی پر اسے سرزنش کرتی رہتی تھی۔ عروسی جوڑے کے رنگ پر آصفہ اور شرجیل میں اختلاف ہوا جس پر طلعت نے آصفہ کو اپنی مرضی کا رنگ بنوانے پر زور دیا۔ اور آصفہ نے سُرخ رنگ کا جوڑا بنوالیا۔ شرجیل کو اس کا یہ عمل اپنی ہتک محسوس ہوا۔ شادی کے فوراً بعد ہی شرجیل، اس کی والدہ اور بہن کے رویوں نے آصفہ کو مضمحل کر دیا۔ اس کے گھر والوں نے اس کی کیفیت کو شدّت سے محسوس کیا۔ چوتھی کی دعوت میں شرجیل جان بوجھ کر نہ آیا۔ اس پر بدمزگی ہوئی، جس کے بعد دوسرے روز شرجیل، آصفہ کو لینے آیا تو سخت برہم تھا۔ شرجیل کی والدہ اور بہن نے بات کو بالکل غلط رنگ دے دیا تھا۔ شرجیل نے آصفہ کو ان سب سے معافی مانگنے کو کہا۔

آصفہ پر اس کے سسرال والوں کے مظالم جاری تھے۔ اس کا شوہر شرجیل بھی ہر معاملے میں اپنے گھر والوں کا ہی ساتھ دیتا تھا اور آصفہ پر ہاتھ اُٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آکر آصفہ کے سسر نے آصفہ کا پورشن علیحدہ کر دیا مگر اس سے بھی کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ آصفہ کی کزن طلعت کی شادی ہوگئی اور وہ اپنے گھر میں خوش تھی۔ آصفہ کے دیور رو جیل نے ایک لڑکی سمیعہ کو شادی کے لیے منتخب کیا تو حسبِ عادت اس کی والدہ عالیہ بیگم نے اس کی مخالفت

کی مگر روجیل اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آصفہ کی نند شرین کی شادی کی تاریخ طے ہو جانے کی وجہ سے عالیہ بیگم مجبور ہو گئیں اور روجیل کی بات مان کر سمیعہ کے گھر رشتہ لے کر چلی گئیں۔ یوں وہ روجیل کی ضد کے آگے جھک گئیں مگر انہوں نے سمیعہ سے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ شرین کی شادی ہو گئی۔ ساتھ ساتھ آصفہ پر مظالم جاری رہے۔

۱۸
اٹھارہویں قسط

"کیا کہا تھا تم نے' اس بار گئیں اپنی ماں کے گھر تو واپس نہ آؤ گی' جب اپنی مرضی ہو گی تب آؤ گی۔"

وہ تپتا' جھلستا' انگارے برساتا اس کے سامنے کھڑا تھا' وہ سچ مچ سہم گئی۔ اپنی ہر سچی بات' اپنا ہر ٹھیک اندازہ کہ وہ حق پر تھی' وہ ٹھیک کر رہی تھی' لیکن آپ کی ہر سچائی کو ثابت کرنے والا کوئی تو ہو' اُمید کسی سے تو ہو' مگر کس سے؟ شرجیل جیسے جیون ساتھی سے۔ کم ہمت' کم اعتبار' ہر وقت مجبور ہو جانے والا۔

وہ بکھر گئی اور پھر بکھر گئی۔

اس نے پلٹ کر اپنے گھر کی طرف دیکھا' غصے سے بے قابو ہوتے اپنے شوہر کو دیکھا اور اپنے چھوٹے سے بیگ میں سامان سمیٹنے لگی۔

اپنے بچے کو گود میں اٹھایا' دوسری طرف کاندھے پر اپنا بیگ لٹکایا اور باہر کی طرف چل پڑی۔

"ٹھہرو' رکو' اکیلی کہاں جاؤ گی' میں خود تمہیں تمہارے ماں باپ کے حوالے کرنے جاؤں گا۔ کہہ دوں گا کہ اپنی امانت اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھیں' ہم سے تو نہیں سنبھلتی۔" لپک کر شرجیل اس کے پیچھے گیا' لیکن آصفہ نے کان بند کر لیے تھے' دل بند کر لیا تھا۔ بس آنکھیں کھلی رکھیں جو پلٹ کر دیکھنا نہ چاہ رہی تھیں۔

"ارے رُکو آصفہ! سن کیوں نہیں رہی ہو۔"

لیکن وہ باہر سڑک تک نکل گئی تھی' اسی دم پاس سے گزرتے ایک رکشے کو ہاتھ دیا جو فوراً رک بھی گیا اور وہ بہت تیزی سے اس میں سوار ہونے لگی۔

"پاگل ہو' رک جاؤ۔ میں کہہ رہا ہوں' میں تمہیں اس طرح نہیں جانے دوں گا۔" اس نے بہت ہلکی آواز میں کہا۔

"جب مجھے آپ کے گھر سے چلے ہی جانا ہے تو طریقوں پر غور کرنا حماقت ہے۔"

وہ بھی بہت نیچی آواز میں جواب دے کر رکشہ میں بیٹھ گئی۔

شرجیل کچھ دیر تو الجھا' جھنجلایا پھر صورتِ حال کو سمجھ کر اسے اچانک عجیب دکھ نے آگھیرا۔

آصفہ اس کے گھر سے چلی گئی۔

اس نے مار کھائی' طعنے سہے' بھوک کاٹی' کیسے کیسے ظلم برداشت کیے' انجام یہی ہونا تھا تو اس کی ساری تپسیا تو بے کار گئی' اس کا ضبط رائیگاں گیا۔

"چلی گئی' سچ مچ دفع ہو گئی۔" عالیہ بیگم کو یقین نہ آ رہا تھا' حالانکہ شرین بار بار کہہ رہی تھی کہ اس نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

"خدا کا احسان' میرے بچے کی جان چھوٹی۔"

"چل شرین! اب میں مجھے بھی تیرے گھر چھوڑ آؤں۔"

وہ اطمینان سے ہوئیں تو شرین کے مسئلے کی طرف دھیان دیا' لیکن شرین اپنے بالوں کو اونچے جوڑے میں باندھ کر لاپروائی سے ٹانگ پھیلا کر بیٹھ گئی۔

"چھوڑیں امی! کل چلی جاؤں گی۔ آج موڈ نہیں ہو رہا۔" اسی وقت شرجیل اپنی ماں کے پاس چلا آیا۔

"ارے تم نے جینا حرام کیا ہوا تھا کہ آصفہ جائے گی تو میں اپنے گھر جاؤں گی۔ اب آصفہ چلی گئی تو تمہارا یہاں رکنے کا جواز... چلو اٹھو' میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑتا ہوا واپس اسپتال جاؤں گا۔" شرجیل رکھائی سے کہنے لگا۔

"بیوی کو نکال کر کیا بہن کو گھر سے نکالیں گے' جب میں کہہ رہی ہوں کہ آج میرا جی نہیں چاہ رہا ہے تو آپ زبردستی کریں گے کیا؟"

شرجیل کی مثال ایسی ہی تھی کہ آپ کھوئے' آپ ہی روئے۔

"امی! اس کو سمجھانے والا دنیا میں کوئی پیدا نہیں ہوا کیا۔" وہ دھم دھم کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

سمیعہ اتنی دلبرداشتہ ہوئی تھی کہ اپنے کمرے سے نکلنے کا اور اپنے ہی گھر کے لوگوں سے (اب سسرال ہی اس کا گھر تھا) ملنے کا اس کا جی نہ چاہ رہا تھا۔

شام ڈھلنے لگی تھی' اس کو خبر تھی' کھانا وہ نہ پکائے گی تو اس گھر میں چولہا ہی نہ جلے گا۔ اس کے ساتھ آصفہ والے سارے سلوک دہرائے جاتے تھے۔ وہ اتنا گھیرے میں نہ آتی تھی لیکن اب اس نے انجام کو اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ اندر سے وہ کپکپا اٹھی تھی۔

جب اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بے خبر چھت کو گھور رہی تھی۔ اس نے زندگی بھر میں ایسی وحشت اور یوں تنہائی کا مقابلہ نہ کیا تھا۔

دستک بہت بڑھی تو وہ اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے شرین کھڑی تھی۔

"خیریت ہے بھابھی! آپ اتنی دیر سے کمرے میں گھسی ہوئی ہیں' ہم سمجھے جانے کیا ہو گیا ہے۔" وہ یوں کہہ رہی تھی جیسے خدانخواستہ اس کے مر ہی جانے کا گمان کر رہی ہو۔ یوں بھی وہ اس وقت اتنی قنوطی ہو رہی تھی کہ کوئی اچھی بات نہ سوچ سکتی تھی۔

"امی جان کو تو ایسی فکر لاحق ہوئی ہے' جانے کہاں سے کہاں تک خیالات چلے جاتے ہیں۔"

اس کا دل اتنا ہولا تھا کہ شرین کی بات کے جواب میں شیطان نے پورا زور لگایا کہ وہ اپنا ضبط گنوا کر رکھ دے' لیکن اتنا کچھ دیکھ اور سن کر وہ برداشت کر رہی تھی تو اب کیونکر ہار جاتی۔ یوں بھی شرین سے نہ الجھنے کی اس نے پہلے دن سے ٹھان لی تھی۔

"بس ذرا نیند زیادہ آ گئی اسی لیے سر بھاری ہو رہا تھا۔"

"آپ کے بھی ٹھاٹ ہیں' شادی کے بعد بھی اپنی مرضی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ جب چاہا سو لیا جو چاہا کھا لیا اور نصیب دیکھیں۔ راتوں کو بھی نہیں جاگنا پڑتا' کوئی ستانے والا ہی نہیں۔" شرین کو یوں بھی دل لگی کے لیے کوئی معاملہ چاہیے تھا۔

"امی جان کہاں ہیں اور کھانا بن گیا یا نہیں۔ مجھے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے یوں کہا کہ جیسے شرین کی کوئی بات سنی ہی نہ ہو۔

"آپ کھانا پکائیں گی تو کھائیں گے نا' یہ امی جان اسی لیے آپ کو بلا رہی تھیں۔"

"بھلا اس وقت تک کھانا ہی نہیں پکا' آخر تم اتنے گھنٹوں سے کیا کر رہی تھیں۔"

"آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں گھر بھر کے لیے کھانا پکاتی پھروں گی۔ یوں بھی میں تو یہاں مہمان ہوں۔"

"تم اور مہمان..... مہمان اسے کہتے ہیں جو واپس جانے کا نام ہی نہ لے۔" اس نے کڑک لہجے میں کہا۔

"افوہ! تو آپ نے بھی اپنی اوقات دکھانا شروع کر دی' ارے میں اپنی ماں کے گھر ہوں۔ میری مرضی' چاہے جتنے دن رہوں' آپ مجھے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی ہیں۔"

"یہی تمہاری ماں کا گھر ہے اور اب یہی میرے میاں کا گھر بھی ہے' میں پورا حق رکھتی ہوں اعتراض کرنے کا۔"

"امی..... او امی! کہاں ہیں آپ' سب میرے دشمنوں کو ہی آپ نے اپنے گھر میں پالا ہے۔" وہ چیختی چلاتی ماں کے کمرے کی طرف جانے لگی تو سمیعہ بھی اس کے پیچھے ہی چل دی۔

"لیجیے اب یہ آپ کی چھوٹی لاڈلی بہو نے بھی مجھے طعنے دینے شروع کر دیے۔" شرین نے کہا اور اس سے پہلے کہ عالیہ بیگم کچھ سمجھتیں اور اسے جواب دیتیں سمیعہ نے فوراً" بات بڑھائی۔

"دیکھیں امی! کہہ رہی ہے کہ یہ میری ماں کا گھر ہے اور اسے پروا بھی نہیں کہ کھانا اب تک نہیں پکا تو پکا بھی لیا جائے' آخر سب گھر والے کیا کھائیں گے۔"

"ہائیں، کھانا پکانا میرا کام تھوڑی ہے۔ آپ کا گھر ہے، آپ پکائیں۔" وہ بولی تو سمیعہ ہنس دی۔

"چلو تم نے مان لیا کہ یہ میرا گھر ہے، تمہارا نہیں۔" عالیہ بیگم صرف سمیعہ کی تیزی اور چالاکی پر غور کرتی رہ گئیں۔

"یہ میں نے کب کہا کہ میرا نہیں۔ میرے ماں باپ کا گھر، میرا ہی ہوا۔"

"جب تمہارا ہی ٹھہرا تو تم پروا کیوں نہ کرو اس گھر کی، ایک بات پر ٹک ہی نہیں رہیں۔"

"دیکھ رہی ہیں امی! ایک ذرا سا کھانا پکانے کے لیے کتنی تاویلیں گڑھ رہی ہے۔ آپ کی بیٹی کو اتنا کام چور تو نہیں ہونا چاہیے امی جان!"

"تم کس سے الجھ رہی ہو سمیعہ! یہ اپنی مرضی کی مالک ہے، ویسے بھی یہ تو دو چار دن کی مہمان ہے، اسے مت تنگ کرو۔"

ان کا لہجہ جانے کیوں دب سا گیا تھا یا وہ کسی اور طرح ظاہر ہونے کے چکر میں تھیں۔

"ٹھیک ہے امی! پھر کھانے کا کیا انتظام کریں، آج تو میری طبیعت عجیب سی ہے، مجھ سے کچھ نہ پکایا جائے گا۔" وہ بھی لاپروا اور بے نیاز ہی بنی رہی۔

اور عالیہ بیگم سر ہلا کر سچ مچ نہ پکائے جانے کا حل سوچنے بیٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

آصفہ اپنی ماں کے گھر کی دہلیز پر سر جھکا کر چلی آئی۔ نہ روئی، نہ چلائی۔ اپنا بیگ اور پرس چپ چاپ جا کر اپنے کمرے میں رکھ دیا۔ گود میں سوئے ہوئے بیٹے کو بستر پر آرام سے سلا دیا اور خود ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کروں، اتنی دیر میں اپنی ماں کو اپنے پیچھے کھڑا محسوس کیا۔

"کیسی ہیں امی آپ! اور گھر میں سب لوگ کیسے ہیں؟" وہ بہت نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"سب ٹھیک ہیں، تم ٹھیک تو ہو۔" وہ بھی خود کو نارمل ظاہر کرنا چاہ رہی تھیں، حالانکہ آصفہ کا یوں بے وقت اکیلے میکے چلے آنا۔ ان کا یہ اندازہ تھا کہ وہ رکشہ میں آئی تھی، کیونکہ باہر گیٹ پر رکشہ رکنے کی آواز آئی تھی اور آصفہ کی صورت پر صاف لکھا نظر آتا تھا کہ اس کی قسمت کی لکیر بابو سیوں کی زد میں ہے لیکن وہ اسی کی خاطر پوز کر رہی تھیں کیونکہ وہ خود بھی اپنے حالات پر چپکی بیٹھ رہنے کی ٹھانے ہوئے تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں، یہاں رہنے کے لیے آئی ہوں، آپ کو بہت گلہ تھا نا کہ میں آپ کے پاس کم آتی ہوں۔" (اب ہمیشہ کے لیے آگئی ہوں۔)

آصفہ اتنی دلیر جانے کیسے ہو گئی تھی، بہت کچھ سہہ کر چپ رہنا تو اس نے سیکھ ہی لیا تھا، اب چھپانا بھی سیکھ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے، کچھ کھاؤ گی پیو گی یا ابھی آرام کرو گی۔" امینہ بیگم بیٹی کی صورت دیکھ دیکھ کر گھبرا رہی تھیں۔ ایسی صورت حال سے بڑے بڑے دل گردے والے لوگ پناہ مانگتے ہیں۔ وہ جی ہی جی میں یہی ورد کر رہی تھیں کہ جو کچھ وہ سوچ رہی ہیں، وہ غلط ہی ہو۔

"امی! ابھی میں آرام کروں گی، منا بھی سو رہا ہے تو میری بھی کچھ تھکن دور ہو جائے گی۔ شام تک ابو بھی آجائیں پھر سب مل کر چائے پئیں گے اور باتیں کریں گے۔"

اور ابو آئے تب تک وہ اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی۔ ایک ٹھہراؤ سا اس کے اندر آگیا تھا۔

"السلام علیکم ابو جی!" وہ جلال صاحب کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

وہ ابھی آفس سے کچھ ہی دیر پہلے آئے تھے اور شاید امینہ بیگم نے ابھی اس کے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا تھا، جب ہی وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"او ہو ہماری آصفہ آئی ہے۔ بھئی بیگم! پہلے نہیں بتایا بلکہ فون ہی کر دیتیں، میں کچھ فروٹ یا گرم گرم سموسے اور دہی پھلکیاں وغیرہ ہی لے آتا۔"

جلال صاحب بیٹی کی صورت دیکھ کر ہی خوشی سے

پھولے نہ سمارہے تھے' کچھ غور کرنے یا سوچنے اور فکر کرنے کی حد تک نہ پہنچے تھے۔ یوں بھی آصفہ جب بھی آتی ان کی اس سے اسی طرح ملاقات ہوتی۔ یہ کوئی انہونی بات نہ تھی جس پر وہ تردد کرتے۔

"ہاں تو کیسی ہے ہماری آصفہ! اور ہاں ہمارا ننھا شہزادہ کہاں ہے۔" انہوں نے تیزی سے نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں یوں رو رہا ہے جیسے کچھ کھو گیا ہو۔" امینہ بیگم نے چائے دانی میز پر رکھتے ہوئے آصفہ کو دیکھا۔

"ارے بیگم! آپ تو بچے کے رونے میں فلسفہ تلاش کررہی ہیں۔" وہ چپ چاپ چائے پیالیوں میں انڈیلنے لگی اور ایک ایک پیالی اپنے امی اور ابو کی طرف بڑھاتے ہوئے خود بھی چائے پینی شروع کردی۔

"ارے خالی چائے کیوں پی رہی ہو' یہ بسکٹ یا کیک لو اور کباب تو میں نے تمہارے لیے ہی تلے ہیں۔ رات کو طلعت اپنے میاں کے ساتھ آئی تھی تو میں نے بنائے تھے۔"

"امی! طلعت آئی تھی' کیسی ہے وہ۔" اپنی گہری دوست کے ذکر پر اس کے لہجے میں ایک ملال سا گھل گیا۔

"بہت اچھی ہے بلکہ شادی کے بعد اور اچھی ہوگئی ہے۔ اپنے میاں کے ساتھ خوش بہت ہے نا۔"

اسے لگا یہ پہلا جھٹکا اسی کی ذات کی دیواروں پر دڑاریں ڈالنے کے لیے لگایا گیا ہو۔ جیسے دنیا کی ہر لڑکی اپنے گھر میں اپنے میاں کے ساتھ خوش رہ رہی ہو' سوائے اس کے۔

وہ چائے کی پیالی بہت جلدی میں ختم کرکے اٹھ گئی۔ "منا رو رہا ہے نا۔"

"آصفہ! تم نے کچھ کھایا کیوں نہیں' میں تو چائے کے ساتھ لنچ کررہا ہوں' بھوک بہت لگی ہے۔" جلال صاحب نے اسے اٹھتے دیکھ کر کہا۔

"لیکن میں نے دوپہر کو کھانا اچھی طرح کھالیا تھا ابو جی! اب اس وقت کچھ کھاؤں گی تو طبیعت خراب ہوجائے گی۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"بھئی بیگم! اسے خود خبر ہے کہ طلعت بہت خوش ہے' اتنی وضاحتیں نہ دیا کرو' اسے گراں گزرتا ہوگا۔ کوئی آدمی اپنا نصیب خود تو نہیں بناتا۔"

"کمال کرتے ہیں آپ! اس نے خود ہی تو پوچھا کہ طلعت کیسی ہے اور اتنی سی بات سے کچھ نہیں ہوا' اس کا مزاج دوپہر سے ایسا ہی ہے۔ وہ آج اپنے گھر سے کچھ عجیب انداز میں آئی ہے۔" وہ حیران سے ہوئے اور کچھ متردد بھی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ کوئی مسئلہ ہے یا بات ہے۔" انہوں نے اپنی بیگم سے پوچھا۔

"ایک تو آپ کے بچے آپ کی طرح بولتے اتنا کم ہیں' ان کے سامنے ہم زیادہ بولنے لگیں تو ہم بے وقوف دکھتے ہیں۔" وہ چڑ کر کہنے لگیں۔

"اب آصفہ دوپہر کو جب سے آئی تھی ایسا منہ بنا کر بیٹھی ہوئی تھی کہ سچ مچ کوئی اس سے کیا بات کرے۔"

"ہوں' میں خود پوچھتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگے۔

"عالیہ کو بیٹی دے کر کیسے خوار سے ہوگئے ہیں ہم' خدا ایسی غلطی ہم سے آئندہ بیس صدیوں میں نہ کروائے۔" امینہ بیگم کا چائے پینے کا جی بھی نہ چاہ رہا تھا۔

"آصفہ! اب تک بچے کو چپ نہیں کرا سکی ہو بیٹا۔" جلال احمد یوں ہی ہلکے پھلکے انداز میں کہنے لگے لیکن وہ مسلسل روئے جارہا تھا۔ جب سے اٹھا تھا قابو میں ہی نہ آرہا تھا اور شاید امی کی اس نئی نوکرانی کو بچے سنبھالنا بھی نہ آتا تھا۔

"ارے ابو! آپ بیٹھیں' میں اسے دیکھتی ہوں۔"

"چھوڑو تم اسے' اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرو اور بچے کو مجھے دے دو۔" کچھ ہی دیر میں امینہ بیگم آئیں تو انہوں نے بچے کو آصفہ کی گود سے لے لیا اور اسے لے کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"جی ابو! آپ یہی پوچھنے آئے ہیں کہ میں ٹھیک ہوں یا نہیں۔ یہ بات تو آپ جانتے ہیں کہ میں پہلے دن سے ہی اپنے گھر میں خوش نہیں ہوں اور اب میں نے سوچ لیا ہے کہ جب ناخوش ہی رہنا ہے تو میں وہاں

کیوں رہوں۔ اس دنیا میں اور بہت سے ٹھکانے ہیں۔" تھوڑی دیر کے لیے جلال صاحب حیرانی سے بیٹی کو دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر گزری تو آصفہ نے باپ کو ٹھنڈے لہجے میں ساری بات جو سمیعہ کی شادی سے شروع ہوئی تھی اور اب تک گزری تھی' یوں بتائی جیسے کسی اور کی بات بتا رہی ہو۔ دراصل وہ اپنے طور پر ایک فیصلے تک پہنچ گئی تھی اور اب جب وہ خود قائل تھی' اسے دنیا میں کسی کو قائل کرنا یا کسی کا سامنا کرنا مشکل نہ لگ رہا تھا۔

"ٹھیک کیا ہے تم نے اور ٹھیک سوچا بھی ہے۔ یہی بات بہت دنوں سے ہم تمہیں سمجھا رہے تھے۔"

☼ ☼ ☼

شرمین پلٹ کر اپنے گھر واپس چلی تو گئی لیکن اس کا مزاج ہنوز کوہ پیما ہی تھا۔ وہ اپنے مطلب کی ہر بات سے یاری کرتی اور دوسروں کی غرض کی قطعی پروا نہ کرتی۔ پلٹ کر آئی تھی تو اس کے میاں نے سمجھا تھا کہ کچھ سدھر کر آئی ہوگی' لیکن اس کا مزاج مزید بدتر ہوگیا تھا۔

صبح ناشتے کی میز پر اس نے یکے بعد دیگرے چھ انڈے تل کر رکھ دیے۔ ڈبل روٹی کے سلائس پورے کھول کر ٹرے میں سجا دیے اور چائے پورا تھرماس بھر کر میز پر رکھ دیا۔

"جی ناشتہ تیار ہے۔" کی صدا لگا کر اس نے خود کرسی گھسیٹی اور ناشتہ کرنا بھی شروع کردیا' حتیٰ کہ اس کا میاں بھی ابھی ناشتے کے لیے نہ پہنچا تھا۔

"ارے شرمین! بھوک بہت زیادہ لگی ہے کیا؟"

"کیا کروں' ناشتے کے بعد کاموں کی لائن لگی پڑی ہے۔ سارے گھر کا کام میری اکیلی جان پر ڈال کر بڑی بھابی کیسے مزے سے میکے چلی گئی ہیں۔"

"توبہ کرو تم اتنے دنوں میکے رہ کر آئیں تو انہوں نے مجال ہے کہ اف بھی کی ہو' سارے گھر کا کام کرتیں اور کسی کو پتا بھی نہ لگتا کہ کام ہوا ہے۔"

"آپ کو تو بڑی بھابھی سے انوکھا عشق ہے' ہر کام ان ہی کا بھلا لگتا ہے۔"

"اوہ گاڈ! کیسی فضول باتیں کرتی ہو' شرمین! تمہاری زبان حد درجہ خراب ہے۔"

"میری زبان خراب ہے' کام خراب ہیں' میں خود خراب ہوں پھر کیوں بٹھائے رکھا ہے آپ نے مجھے اپنے اس قید خانے نما گھر میں۔"

وہ خود تو ناشتا تقریباً کرہی چکی تھی' اب اسے پروا نہ تھی کہ باقی لوگ کچھ کھائیں بھی یا بھوکے رہیں۔

اس کی ساس اسی وقت ناشتے کے لیے دونوں بچوں (اس کی نند کے دو بچے رہنے آئے ہوئے تھے) کو ساتھ لیے آرہی تھیں۔ ایک تو شرمین کی تلخ کلامی' مزید ناشتے کی میز پر پھیلا پھوہڑپن سے رکھا ناشتہ۔ ان کا بھی دماغ تپ گیا۔

"صبح ہی صبح تم دونوں میاں بیوی شیطان کو اپنے پاس بلا کر بیٹھ جاتے ہو۔"

"ہاں میں ہی قصوروار ہوں' کب سے اٹھی بیٹھی ہوں' سب کے لیے ناشتہ تیار کیا پھر بھی کوئی کریڈٹ نہیں۔"

دراصل بڑی بھابھی میکے بہت کم جاتی تھیں اور شرمین خود ناشتہ بہت کم تیار کرتی تھی' اس لیے اسے لگ رہا تھا بغیر کسی کے کہے سنے کام کرکے اس نے بڑا تیر مارا ہے۔

"یہ ناشتہ اگر تم نہ تیار کرتیں تو ہی بہتر تھا۔" اس کی ساس نے بے ترتیبی سے پھیلی انڈے کی پلیٹوں کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"یہ اتنے ڈھیروں انڈے کس کے لیے بنا ڈالے ہیں۔"

"کیوں' سب ناشتہ نہیں کریں گے' بچے بھی تو ہیں۔"

"سب ملا کر بھی ہم پانچ لوگ ہیں اور تم نے چھ انڈے بنائے ہیں اور وہ بھی بغیر کسی سے پوچھے۔ میں تو گرمیوں میں انڈا کھاتی ہی نہیں' نہ ہی یہ بچے شوق سے انڈا کھاتے ہیں اور جس طرح تم نے گھنٹہ بھر پہلے

یہ انڈے بنا کر رکھ ڈالے ہیں' کوئی شوقین آدمی بھی انہیں کھانا پسند نہ کرے۔"

"دیکھ لیا آپ نے' کوئی کام کرو وہ غلط' یہ عزت افزائی ہے میری اس گھر میں۔" وہ چیخنے ہی لگی۔

"ارے جب غلط کام کرو گی تو ڈانٹ تو پڑے گی۔ ایک ناشتہ کیا بنایا ہے تم نے' چیزوں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ ڈبل روٹی بھی یوں کھول کر پھیلا دی ہے جیسے چڑیوں کو دانہ ڈالا ہو' ڈبل روٹی یوں پیش کی جاتی ہے۔ یہ بھی ساری برباد ہو کر رہ گئی۔"

"لیجیے اماں نے کم بخشا تھا کہ اب بیٹے بھی حساب لے رہے ہیں۔" وہ پیر پٹخ کر وہاں سے اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"دو دو پیسے کی چیزوں کے لیے مرتے ہیں سب اس گھر میں۔" اس کی بڑبڑاہٹ کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔

"اس کی ماں نے اچھی خاصی لڑکی کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔"

اس کی ساس بھی بیچاری بڑبڑ کرتی باقی گھر کا سارا کام خود کرنے لگ گئیں۔ جانتی تھیں کہ اب شرمین ہاتھ نہ آئے گی اور زبردستی اس سے کوئی کام کروایا تو وہ الٹا ستیاناس ہی کرے گی۔

اچھی صورت دیکھ کر لڑکی پسند کی تھی' کیا خبر تھی کہ اندر سے سیرت ایسی کھوٹی نکلے گی۔

"اس سے اچھی تو میری دبے رنگوں کی بچیاں بھلی ہیں' اپنے گھر اور بچوں کو سنبھالے اپنے سسرال میں عزت سے بیٹھی تو ہیں۔" پھر وہ دیر تک کام والی نوکرانی کے سامنے اپنی قسمت کو روتی رہیں اور انہیں خود سے زیادہ اپنی بیٹے کی پروا تھی۔ حقیقت میں تو اس کی زندگی برباد ہوئی تھی۔ وہ کتنا صبر والا کہ بیوی کی ہر جا و بے جا برداشت کر رہا تھا۔

"لیکن جی کب تک برداشت کریں گے' مردوں میں اتنا حوصلہ کہاں ہوتا ہے۔"

"حوصلہ تو بہت ہے میرے بیٹے میں' دیکھو کہ اس کی بیوی کتنا ستا سکتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"جس گھڑی سے بچ بچ کر اتنے دن کاٹ لیے تم وہی نامراد گھڑی سر پر لیے کھڑے ہو گئے۔" وہ خود سر جھکائے اپنے کمرے میں بیٹھا اس خالی پن سے لڑ رہا تھا جس کا اس نے نہ کبھی تصور کیا تھا' نہ جس سے کبھی ڈرا تھا لیکن اب وقت کا پہلا ناگوار احساس ہی اتنا بھاری تھا' وہ خود جھنجلا سا گیا تھا۔ اب سامنے باپ کو دیکھ کر بوکھلا گیا۔

وہ کھڑا ہو گیا مگر اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

"آخر تم کس طرح سب کچھ بگاڑ کر بیٹھ گئے۔" وہ اتنے پریشان اور مایوس ہوئے تھے' آفس سے آ کر جب انہیں اس بات کا علم ہوا۔

وہ اب بھی کچھ بھی نہ بولا۔

"شرجیل! میں تم سے کہہ رہا ہوں' روز کے ڈراموں' روز کے جھنجٹ سے تم نے کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔"

وہ اسے شرمندہ کر رہے تھے' لتاڑ رہے تھے اور یہ صرف اتنا کچھ اس کے لیے کافی نہیں تھا' وہ اپنے عمل پر اتنی جلدی نادم ہوا تھا کہ جس کا اسے خود اندازہ نہ تھا اور ایسا شخص کہ جسے اپنے اعمال کا خود ٹھیک اندازہ نہ ہو وہ کامیابی کی طرف جا ہی نہیں سکتا۔

"آپ بیٹھیں پلیز ابو!"

"اب کہاں بیٹھوں' تمہارے گھر میں رونق رہی نہ دل میں جگہ۔"

"ابو! میں بہت پریشان ہوں' میں بہت بکھر گیا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"ابھی سے بکھر گئے ہو' ابھی تو بہت بکھیرے جاؤ گے۔" سہیل احمد نے بیٹے کی صورت دیکھ کر مایوسی سے کہا۔

"آپ نے ابو! آپ نے اس گھر کا سارا انظام برباد کیا ہے' صرف آپ کی وجہ سے آپ کی ساری اولاد پریشان حال اور برباد ہے۔ اگر آپ نے پہلے بہت پہلے ان ساری خرابیوں اور غلطیوں کو دور کر دیا ہوتا تو ہم

یوں نہ بکھرتے۔" اسے کوئی راہِ فرار' ندامت مٹانے کا کوئی تو راستہ چاہیے تھا۔

"جب میری کمزوریوں سے سبق ملا ہی تھا کہ وہ غلطیاں ہیں تو تم نے کیوں اپنی کمزوریوں کو نہ سنوارا۔ قدم قدم پر ٹوکا اور سمجھایا لیکن تمہاری جذباتیت اور بے صبرے پن کا علاج ممکن ہی نہ ہوا۔"

آج انہیں اپنی بیوی اور بیٹی سے زیادہ شرجیل پر غصہ آ رہا تھا اور ان کا غصہ جائز تھا' اس لیے شرجیل زیادہ بحث نہ کر سکا۔

☼ ☼ ☼

سب کچھ جیسے ختم ہو گیا' وہ اس گھر سے نکل کر اس گھر تک چلی آئی تو جیسے ایک ہی رات میں ساری قباحتیں' رنجشیں' شکوے' مظالم' دھوکے سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اف کیا یہ سب اتنا آسان تھا۔

یہ راستہ جو کھلا تھا اور جانے کہاں تک جا رہا تھا' اس پر آنے میں اس نے کتنے دن لگا دیے۔ جیسے اس نے ابھی ابھی سوچنا شروع کیا تھا' ابھی سوچنا سیکھا تھا۔

اس نے صبح اٹھ کر امی جان کے ساتھ ناشتہ بنایا تھا' سکون سے اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا تھا اور اب معمول کی طرح گھر کے دوسرے کاموں اور اپنے بچے میں یوں مگن ہو گئی جیسے یہی اس کی روزمرہ کی روٹین ہو۔

جب دوپہر کو شرجیل کا فون آیا تو وہ اخبار کی سرخیاں دیکھ رہی تھی۔ امی جان نماز میں مصروف تھیں اور شانی باہر صحن کی صفائی کر رہی تھی' اس لیے فون اسی نے اٹھایا تھا۔ شرجیل کی آواز سن کر اس نے فوراً فون بند کر دیا۔

لیکن اسی وقت گھنٹی دوبارہ بجی اور مسلسل بجتی رہی' کچھ دیر وہ نظر انداز کرتی رہی پھر فون اٹھا لیا۔

"جی فرمایئے۔" اس نے اجنبی انداز میں پوچھا۔

"آصفہ! کیسی ہو؟"

"جب آپ کے گھر میں رہتی تھی تو آپ نے کبھی نہ پوچھا کہ کیسی ہو۔"

"سنو' رات کو تیار رہنا' میں تمہیں لینے آؤں گا۔"

اتنی آسانی سے' اتنی جلدی وہ ہار گیا۔ اس نے تو کہا تھا وہ کبھی اسے لینے نہ آئے گا۔ یہ کیسا شخص ہے۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس نے سختی سے منع کر دیا۔

"دیکھو ابھی چلی آؤ' جتنی دیر لگاؤ گی واپسی مشکل ہوتی چلی جائے گی۔"

"میرا خیال ہے کہ میں واپسی کے دروازے بند کر کے ہی آئی ہوں۔" اس نے بھی لمبی بات کرنا نہ چاہی۔

"ذرا سی بات کے لیے اتنے بڑے بڑے فیصلے نہ کرو جو نباہ نہ سکو۔"

"ذرا سی بات..... جو کچھ میں نے سہہ لیا' وہ آپ کو ذرا سی بات ہی لگے گی۔"

"جب تم نے اتنا برداشت کیا تو تھوڑا حوصلہ اور کر لو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دیکھو' میں اتنی جلدی شرمندہ ہو کر تمہیں لینے آ رہا ہوں۔"

لیکن اس کے ذہن نے فوری تنبیہہ کی کہ یہ کوئی اتنی اچھی بات بھی نہیں کہ وہ اتنی جلدی نادم ہو گیا ہے' یہ اس کے تھڑدلے پن کا ہی ثبوت ہے پھر کب بدل جائے' بگڑ جائے' کہنا مشکل ہے۔

"آپ نے تو کہا تھا عمر بھر مجھے نہ بلائیں گے۔" اس نے کہہ ہی دیا۔

"وہ تو یونہی غصے میں کہہ دیا تھا۔"

"آپ یوں غصے میں جانے کیا کچھ کر سکتے ہیں' کبھی بھی کچھ کر سکتے ہیں۔" اب اس نے پکا تہیہ کر لیا تھا کہ سارے حساب برابر کر کے رہے گی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے آصفہ! ایک دن ماں کے گھر رہ کر اتنی دلیر ہو گئی ہو۔" وہ خود اتنا الجھا ہوا تھا اور ضرور کم عقل بھی تھا کہ بجائے اس کے کہ پہلے اپنی الجھنوں کو دور کرتا پھر آصفہ کو بلانے آتا پھر بلا رہا تھا اور پھر ضرور مشکلوں میں کھونا چاہ رہا تھا۔

آصفہ نے فون بند کر دیا اور پھر دوبارہ گھنٹی بجی تو

ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دیا۔

شام کو وقار اس کے پاس آیا' دراصل اگلے دو دنوں میں وہ کچھ الجھا ہوا تھا' اسی لیے بہن سے کچھ کہہ سن نہ سکا مگر آج اس نے بات کرنا ضروری سمجھا' اسی لیے اس کے کمرے میں چلا آیا۔

بات کیا ہوئی تھی' یہ تو اسے ابو جی نے صبح آفس جاتے ہوئے تفصیل سے بتا دیا تھا اور اس بار آصفہ کی سمجھ کی اس نے خود داد دی۔

"جو کچھ کیا تم نے بالکل ٹھیک ہی کیا۔ مذہب' معاشرہ' قانون کوئی نہیں کہتا کہ عورت ناجائز ظلم سہے یا اپنے حقوق سے منہ موڑ کر جیے۔"

"وقار! اب تک میری نیت صاف ہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آخری حد تک عورت کو اپنے گھر کے لیے سمجھوتے کرنے چاہئیں۔"

"یہ خیال بھی ٹھیک تھا لیکن تم نے حد سے زیادہ برداشت کر لیا۔"

"لیکن میری برداشت کو ان لوگوں نے شاید مذاق جانا' میری بے وقوفی سمجھا یا اپنی بڑائی مان لیا' میں نے سمجھا کہ اب چپ رہنا بلکہ اس گھر میں رہنا ہی بے وقوفی ہے۔"

"ٹھیک ہے' اب تم جس طرح چاہو اور جو چاہو کرنا۔ کوئی بھی فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا۔ عالیہ بیگم کو اتنے زعم میں تم نے ہی مبتلا کر دیا کہ وہ تمہیں لاوارث ہی سمجھنے لگیں۔"

وقار کو آصفہ کی دور اندیشی اور سمجھ داری پر خوشی ہی ہوئی تھی۔

"عالیہ آنٹی کے واسطے میں نے کچھ نہیں کیا' میں تو سب کچھ صرف اپنے گھر اور شوہر کے لیے ہی کرتی رہی مگر وہ کم ظرف اور کم فہم نکلا۔"

☆ ☆ ☆

تہنیت چائے بنا کر پیالی اپنی ماں کے آگے رکھ چکی تھی اور اب اپنی پیالی سامنے رکھ کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر گیٹ پر گھنٹی بجی۔ وہ اٹھنے لگی کہ آمنہ بیگم نے اسے روک دیا۔

"رکو بیٹا! میں دیکھتی ہوں' شام ڈھلنے کا وقت ہے' جانے کون ہو۔" وہ کچھ حیران سی ہوئی' وہ تو دن رات صبح شام گیٹ کھولنے کے لیے دوڑا کرتی تھی' یوں امی جان نے کبھی روکا نہ تھا۔

بہرحال وہ رک گئی اور امی جان نے باہر گیٹ جا کر کھولا۔

دیکھا کہ کون آیا ہے۔

اور جب پلٹ کر وہ واپس آئیں تو ان کے پیچھے سر جھکائے آتے وقار کو دیکھ کر اس کی جان جیسے سولی پر لٹک کر رہ گئی۔

اس طرح وقار اکیلا عام دنوں میں گھر نہیں آتا تھا' سوائے بہت ضروری کام کے۔ عموماً وہ خالہ کو لے کر آتا تھا یا کبھی چھٹی والے دن چکر لگا لیا۔

اسے بجھائی تو دے رہا تھا اور وہ لاشعوری طور پر انتظار بھی کر رہی تھی کہ وقار ضرور آئے گا' لیکن اب اسے امی جان کے ساتھ دیکھ کر اس کی جان نکل رہی تھی۔

وہ کوئی بھی شکایت کر سکتا تھا' ان کے سامنے اس سے کوئی الٹی سیدھی بات پوچھ سکتا تھا۔

"تم آئے' یہی بہت بڑی بات ہے' آج کل مصروف بہت زیادہ ہو گئے ہو نا۔" آمنہ بیگم اپنے اس بھانجے کو دیکھ کر بے وجہ کسی آس میں پڑ جاتی تھیں۔

"بس خالہ! کام بھی ضروری ہیں نا' اب تو آفس سے اٹھتے ہوئے بھی دیر ہو جاتی ہے پھر ابو کے بہت سے کام بھی میں نے اپنے ذمے لیے ہیں۔ ان کی ذمہ داریاں بٹانا بھی ضروری ہیں نا۔"

وہ بات کرتے ہوئے کئی بار تہنیت کو دیکھ چکا تھا اور اس کی بے چینی محسوس بھی کر چکا تھا۔

"دراصل میں یہ بتانے آیا تھا کہ آصفہ آئی ہوئی ہے' طلعت کو بتا دیجئے گا اور تہنیت کو گھر بھیج دیں تو وہ خوش ہو گی۔" اس نے کہا تو تہنیت کچھ مطمئن ہوئی لیکن یہ اطلاع امینہ خالہ فون پر بھی دے سکتی تھیں' وہ پھر الجھی۔

"کل کالج سے واپسی پر چلی جانا' میں بھی دوپہر کو آجاؤں گی۔" آمنہ بیگم نے تہنیت سے کہا۔

"کیوں روزانہ کالج آنا جانا لگا رکھا ہے اس نے خالہ! بے وجہ اپنی انرجی اور آپ کا پیسہ ضائع کر رہی ہے۔"

اسے اتنا غصہ آیا وقار پر کہ جی چاہا کہ سنا کر رکھ دے۔ ذرا سی اس کی کمزوری اس کے ہاتھ کیا آئی تھی' وہ اس کی خود مختاری اور خودداری کے درپے ہو گیا تھا۔

اس کی امی ویسے ہی اس کے کالج جانے سے کچھ مطمئن نہ تھیں۔ یہ ان کا کمزور سا حوصلہ تھا جسے وقار جان بوجھ کر چھیڑ رہا تھا کیونکہ ان کی مخالفت کی حقیقت سے سب ہی واقف تھے۔

"کیا کروں' تم تو جانتے ہو عجب سر پھری سی لڑکی ہے یہ۔ اگر میری مانے تو آج ہی کالج جانا چھوڑ دے' بس اپنے ابا کی شہ پر ہے۔" امی کا جواب اسے پتا تھا۔

"اگر سر پھری ہے تو پھر تو آپ کو اسے زیادہ باندھ کر رکھنا چاہیے' کسی دن کوئی الٹی سیدھی حرکت کر ڈالی تو ہم سب کے گلے مصیبت پڑ جائے گی۔" وقار اس کے آنکھیں دکھانے اور چڑنے کی قطعی پروا نہ کر رہا تھا۔

"وقار!" اب وہ چیخ پڑی۔ "تم زیادہ ہی پھیل رہے ہو' تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میری ماں کو یوں میرے خلاف ورغلاؤ۔" اب اس نے تیزی سے کہا اور وقار یوں ہنسا جیسے اسے جلانا ہی اس کا مقصد ہو۔

"اچھا تم مجھ سے کون سی دشمنی نکال رہے ہو۔" وہ جل کر بولی۔

"اتنا چھوٹا سا دل ہے تمہارا' تم تو ذرا سا مذاق برداشت نہ کر سکیں۔ میں تو یونہی تمہیں چھیڑ رہا تھا ورنہ اب تو خالہ بھی قائل ہو گئی ہیں کہ میری یہ چھوٹی لاڈلی بیٹی ضرور پڑھ لکھ کر نام اونچا کرے گی۔" اب وہ سمجھ گئی کہ وقار سچ مچ اسے تنگ کر رہا تھا۔

"سچ یہ ہے کہ میں تو اب اس فکر میں ہوں کہ اس کے فرض سے بھی فارغ ہو جاؤں' اسی لیے آج بھی کسی سے کہہ رہی تھی بلکہ بہت لوگوں کو کہہ رکھا ہے۔" وہ اتنی چڑی کہ وہاں سے اٹھ گئی۔

"اوہو خالہ! آپ مائیں بھی بس بیٹیوں کو چین نہیں لینے دیتیں' ابھی اس کو پڑھنے دیں' ابھی اسے کہاں اس جھنجٹ میں ڈالنے کا سامان کر رہی ہیں۔ آپ خود ابھی طلعت کی جدائی کا تازہ غم لیے بیٹھی ہیں۔"

اب وقار اس کی حمایت کر رہا تھا۔ وہ دروازے کے دوسری طرف کھڑی سن رہی تھی۔

"تمہیں کیا خبر ہماری فکروں اور ہمارے خدشات کی۔" خالہ کے چہرے پر تفکرات کی اتنی لکیریں دیکھ کر وقار بھی کچھ الجھن میں پڑ گیا۔

"خالہ! ماشاء اللہ تین بیٹیاں تھیں' ان کے ہوتے ہوئے آپ کبھی یوں فکر مند نہ ہوئیں اور اب ایک رہ گئی ہے تو اس کے لیے اتنی پریشان ہو رہی ہیں۔"

"ہاں' مجھے بھی لگتا ہے تہنیت کی فکر میں نے کچھ زیادہ ہی اپنے ذہن پر سوار کر لی ہے۔"

☆ ☆ ☆

سمیعہ کھانا پکا کر ابھی کچن سے نکلی ہی تھی کہ عینی آپا آ گئیں۔

"ارے عینی! تم بغیر اطلاع کے آ گئیں۔" اسے دیکھتے ہی عالیہ بیگم نے کہا۔

"آئی نہیں ہوں امی جان! بس یوں سمجھیں کہ بھیجی گئی ہوں۔" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جیسے کوئی جائزہ لے رہی ہو' کہنے لگی۔

"تم کیوں بھیجی گئی ہو؟" انہیں تشویش ہوئی۔

"آصفہ بھابھی کہاں ہیں؟" سوال کے جواب میں اس نے سوال ہی کیا۔

"کیوں' اس سے تمہیں کیا کام ہے۔" وہ چڑ سی گئیں۔

"کام کیا ہونا تھا' بس یہی پوچھنا تھا کہ وہ گھر میں ہیں یا نہیں۔"

"گھر میں رہنا اور گھر کو بسانا اس کا مزاج ہی کہاں تھا' چلی گئی ہے اپنے باپ کے گھر۔" انہوں نے بیزاری سے کہا۔

"اوہ امی! آپ ہر معاملے کو اتنا سرسری کیوں لیتی ہیں۔ آپ کو خبر نہیں کہ اگر آپ کی بہو اس گھر میں نہیں بس سکتی تو آپ کی بیٹیوں کو بھی اپنے گھر میں مسائل کا سامنا ہے۔ میری ساس اور نندوں نے آصفہ بھابھی کے بارے میں پوچھ پوچھ کر میرا جینا حرام کردیا ہے اور آپ کو میں کیسے سمجھاؤں کہ اس گھر میں جو کچھ ہوا کرے، وہ مجھے بتا تو دیا کریں، آخر یہ میرا میکہ ہے۔"

عینی آپا بہت زیادہ طیش میں آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنی نند سے سنا تھا۔

"تو آپ کی اماں نے آصفہ کو گھر سے نکال کر ہی دم لیا۔" وہ اتنی حیران ہوئی تھیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں، اگر ہوتی تو مجھے آپ سے پہلے خبر ہوتی۔" وہ ڈٹ کر تردید بھی نہ کرسکیں، لیکن شرمندگی چھپا کر پھر بھی بات کرنے لگی تھیں۔

"ارے تمہیں کیا خبر ہوگئی، یہ کوئی جھوٹ تو نہ کہے گی۔ یوں بھی یہ بات تو ہر ایک کو پتا لگ گئی ہے۔" اس کی ساس نے کہا تو وہ بھی چونکیں۔

"یونہی ملنے ملانے گئی ہوں گی یا ان کے میکے میں کوئی تقریب وغیرہ ہوگی۔"

"تم کیوں پردہ داریاں کررہی ہو، تمہاری ماں نے اس بے چاری کو ایک دن بھی اپنے گھر میں سکون سے رہنے ہی کہاں دیا ہے۔" وہ عجیب مشکل میں پڑ گئیں۔

"اور ایسا ہی ہے تو صبح جاکر خود صورت حال معلوم کرکے آیئے گا۔ کمال ہے، آپ کو امی تو بڑی بیٹی کو بھی کچھ نہیں سمجھتی ہیں۔ کم سے کم آپ کی تو بتانا چاہیے تھا آپ کے گھر میں، جو کچھ ہوا ہے۔" اور اسی لیے آج عینی آپا اپنی ماں کے گھر آئی تھیں۔

"چلو تم ٹھنڈی ہو، پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر ساری بات تمہیں سمجھاؤں گی۔"

"اب کیا سمجھنا اور سمجھانا امی جان! بات تو وہی ٹھیک ہے جو سارا زمانہ کہہ رہا ہے۔"

"ہاں تو پھر سارے زمانے سے ہی تم پوچھ لینا، میرا دماغ نہ چاٹو۔" وہ غصے سے کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں اور وہ لاؤنج میں کھڑی ہوکر عجیب سی باتیں سوچنے لگیں۔

"سمیعہ بھابھی! آپ کیسی ہیں؟ سوری، وہ پریشانی میں، میں نے آپ کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔" وہ ڈائننگ ٹیبل کے ایک کنارے بیٹھی سلاد کاٹ رہی تھی۔

"ہاں، ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں کیا حال ہیں۔"

"آپ نے سنا نہیں، حال تو بہت بے کار ہیں۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولیں۔

"کیا ہوا تھا، وہی شرمین کا جھگڑا پھر چلا ہوگا۔"

"جھگڑے تو سب چلتے ہیں لیکن ان کو گھر سے نکالنے والے شرجیل بھائی ہیں۔"

"اچھا، مجھے ایسا ہی کچھ لگ رہا ہے۔ اتنے بے عقل آدمی ہیں شرجیل بھائی اور آپ دیکھیں بھابھی! کہ اس گھر میں کسی کو یہ احساس نہیں کہ ایک گھر کے بننے اور بگڑنے سے دوسرے ساتھ رہنے والے لوگوں کے گھروں کی دیواروں میں بھی دراڑیں پڑ رہی ہیں۔ امی جان بہت بے رحم لگتی ہیں، بھی بھی اپنی سگی اولاد کے بارے میں کچھ نہیں سوچتیں۔" عینی آپا آج بہت زیادہ اپ سیٹ تھیں۔

"یہاں کوئی کسی کو اچھی بری بات نہیں سمجھاتا آپا۔" سمیعہ نے ایک بات کہی۔

"چلو کھانا لگاؤ سمیعہ! کچھ اور پکایا یا نہیں۔ اب عینی بھی آئی ہے، بچے ہیں۔" اسی وقت عالیہ بیگم واپس لاؤنج میں آئیں، انہیں شاید عینی اور سمیعہ کا ساتھ بیٹھنا اور بات کرنا پسند نہ آیا تھا۔

"اب اس وقت کیا پکاؤں، قیمہ پکایا ہے نا، سلاد ہے، اچار ہے، سالن بہت ہوجائے گا۔" اس نے کہہ کر کچن کا رخ کیا اور کھانا لگانے لگی۔

"اونہہ، یہ لڑکی تو میری بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتی۔"

"آپ کی باتیں سن کر اور مان کر بڑی والی نے کیا سکھ پالیا۔" زچ ہوکر عینی آپا نے سوچا اور اپنی ماں سے ناراضی کا اظہار کرنے کے لیے سمیعہ کے پاس کچن

میں چلی گئی۔ اسی وقت سمیعہ نے حبیب خان کو آواز دے کر نان لانے کے لیے کہا۔

"اب روٹی بھی گھر میں نہ بناؤ گی۔" عالیہ بیگم نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"بنائی تو ہیں لیکن کم پڑیں گی، قیمے کے ساتھ ویسے بھی نان بہت مزہ دے گا۔" سمیعہ نے کچھ زیادہ اعتراض انہیں نہ کرنے دیا۔

☆ ☆ ☆

اس سے ہسپتال میں نہ کام ڈھنگ سے ہوتا تھا، نہ کسی سے صحیح طرح بات ہورہی تھی۔ دو تین دن میں وہ اتنا پریشان اور جھلایا سا ہوگیا تھا کہ اس کے کولیگ بھی اس کی بدمزاجی محسوس کرنے لگے تھے۔

اب بھی وہ اکیلا ایکسرے لیبارٹری میں بیٹھا بار بار اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔ عجیب سی سوچ اس کے ذہن میں آرہی تھی۔ حد یہ تھی کہ وہ اپنے ہی خیالات اور اعصاب پر گرفت کھوتا جارہا تھا۔ کبھی وہ سوچتا اسے اپنے سر کو دیواروں سے ٹکرانا چاہیے، کبھی خیال آتا کہ سب چھوڑ کر جنگل میں نکل جانا چاہیے۔ وہ تین دن میں یوں دیوانہ ہوا پھر رہا تھا جیسے چند اور دن گزرے تو مر ہی جائے گا۔ اسے خبر ہی نہ تھی کہ آصفہ اس کے لیے اتنی اہم ہے۔

اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ اتنی بڑی غلطی کررہا ہے۔ اس نے بہت غلطیاں کی تھیں، لیکن پکڑ میں نہ آیا تھا۔ آصفہ اتنی نرم دل، اتنی رحم دل، اتنی بھولی فطرت والی عورت تھی کہ ادھر روتی، ظلم سہتی، ادھر بھول جاتی مگر اب وہ پتھر ہوگئی تھی اور اس کے لہجے کی اجنبیت اور انداز کا روکھا پن اسے احساس دلا رہا تھا کہ شاید اس نے اسے کھو ہی دیا ہے۔

وہ ایک ہی رُخ پر ضرب لگاتے لگاتے بھول گیا تھا کہ وہ کوئی دیوار نہیں، ایک جیتا جاگتا وجود ہے جسے اگر ہوش آیا تو شاید وہ کوئی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہی بن جائے۔

"ڈاکٹر شرجیل! ایسا کیا مسئلہ ہوگیا ہے، آپ تو بالکل ہی بدحواس سے ہورہے ہیں آج کل۔"

ڈاکٹر غزالہ بہت دیر سے اسے ڈھونڈ رہی تھی، اس کی بے چینی بھی محسوس کرچکی تھی۔ آخر اس کی کولیگ ہی تھی اور اس کی قریبی دوست بھی۔ خیالات اور انداز زندگی میں بہت فرق آگیا تھا مگر بہرحال ساتھی کو دوست کی حیثیت دینے کے لیے اس کی کمزوریوں کو بھولنا پڑتا ہے۔

"پلیز ڈاکٹر غزالہ! میں عجب آدم بیزار سا ہورہا ہوں، آپ کسی اور دوست کی کمپنی تلاش کرلیجیے۔" وہ اس کے رویے پر نالاں ہوئی لیکن اٹھی نہیں۔

"میں اپنے لیے کمپنی تلاش نہیں کررہی، آپ کو کمپنی دینے کے خیال سے آپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔ آخر کیا الجھن ہے، کبھی کبھی شیئر کرنے سے دل ہلکا ہوجاتا ہے۔"

"ایسی سختی پڑی ہے زندگی میں کہ کسی طرح دل ہلکا نہیں ہوسکتا۔" وہ خود پر ہنسا۔

"ڈاکٹر شرجیل! آپ تو بزدلوں جیسی بات کررہے ہیں۔"

"میں بزدل ہی تو ہوں، کم ہمت بھی ہوں، بے اعتبار اور جھوٹا بھی۔ ایسا برا آدمی بیزار اور پریشان ہی رہ سکتا ہے کہ نہیں۔" ڈاکٹر غزالہ اسے اچھا خاصا جان چکی تھی لیکن پھر بھی اس سے خفا ہونے کے بجائے خود ہی اس سے ہمدردی بھی کرنے لگ جاتی۔

"آپ بتائیں تو سہی کہ کیا ہوا ہے۔"

"کچھ نہیں، حد ہوگئی۔ بس میں نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا ہے۔" وہ یکدم سے بول گیا تو ڈاکٹر غزالہ کو اتنا شاک لگا کہ کچھ دیر تو وہ ساکت سی بے یقینی سے شرجیل کا چہرہ دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر اس کے سامنے سے چلی گئی۔

"اوہ گاڈ! یہ آدمی سچ مچ کمینہ اور کم ظرف ہے۔" وہ بری طرح الجھ گئی۔ لمبی راہداری پر تیز تیز چلنے لگی۔

"اس نے اس بے چاری عورت کو گھر سے ہی نکال دیا، اسے کوئی کچھ کہنے والا نہیں تھا۔" وہ اس کے سامنے بیٹھی رہتی تو اسے اتنی گالیاں دیتی کہ ان کا آپس

میں جھگڑا ہی ہو جاتا۔

"لیکن ڈاکٹر غزالہ! آپ اس سے ہمدردی کرنے گئی تھیں' وہ تو بتا ہی چکا تھا اور مسلسل کہہ ہی رہا تھا کہ اس نے برے کام کیے ہیں' اچھے کام تو کیے نہیں۔ جب آپ اسے دوست مان ہی رہی ہیں تو برائی سے سمجھوتہ بھی لازم ہے۔"

وہ اسی رفتار سے پلٹ کر واپس ڈاکٹر شرجیل کی طرف جا رہی تھی۔

"تم نے اس بے چاری عورت کو گھر سے ہی نکال دیا۔" وہ پھر اس کے سامنے بیٹھی کہہ رہی تھی۔

"ڈاکٹر غزالہ! میں بے حد شرمندہ ہوں' مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس طرح اس گھڑی کو واپس لے آؤں۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔"

"تو اب جاؤ نا اس کے پاس' اسے منا کر لے آؤ' اس سے معافی مانگ لو۔"

"نہیں مانے گی وہ' کسی طرح نہیں مانے گی۔ میں نے اس کو اتنا ستایا ہے اور اتنی معافیاں مانگی ہیں کہ اب اسے میری معافی تلافی پر کوئی اعتبار نہیں رہا ہے۔"

"تم نے کوشش کی؟"

"بہت فون کیے ہیں۔"

"فون نہیں' خود جاؤ۔ جا کر روبرو بات کرو' آمنے سامنے بیٹھ کر بات زیادہ صاف ہوتی ہے۔"

"اپنی بے عزتی سے ڈرتا ہوں۔ اب وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں ہے' بڑی محفوظ جگہ پر ہے' بہت عزت اور نام والا ہے اس کا میکہ۔ یہی وہ فخر ہے جس کو اس نے کبھی نہیں جتایا' ورنہ اونچے خاندان کی لڑکیاں تو تگنی کا ناچ نچا کر رکھ دیتی ہیں۔"

"تم نے اس کو اتنا خوار کیا اور اب ذرا سی اپنی بے عزتی سے ڈرتے ہو۔ کیا ہو گا' زیادہ سے زیادہ وہ تمہارے ساتھ نہیں آئے گی یا اس کے گھر والے تمہیں برا بھلا کہیں گے۔ سوچو اس نے تمہارے گھر میں کیا کچھ سہا ہے۔"

وہ سر ہلانے لگا۔ ڈاکٹر غزالہ اب اسے سمجھانے بیٹھ گئی تھی' یہی دوستی کا تقاضا تھا۔

"ٹھیک ہے' میں چل جاؤں گا۔" وہ مان رہا تھا' یہی سب باتیں وہ خود بھی سوچ رہا تھا' لیکن اس کی کم ہمتی آڑے آ رہی تھی۔

"کل پر اگر ٹالا تو اس کا مطلب ہے کبھی نہ جاؤ گے' آج کی بات کرو۔" وہ اسے اکسانے لگی۔ "دیکھو شرجیل! درمیان میں جتنے زیادہ دن گزریں گے' فاصلہ بڑھتا جائے گا اور پھر جو کچھ آج آپ سوچتے ہیں' آج کر سکتے ہیں' چند دنوں بعد نہ کر سکیں گے' سب کچھ بدل جائے گا' بات بنانی بہت مشکل ہو جائے گی۔" اس نے خود بھی یہ باتیں سوچی تھیں لیکن اب غزالہ کہہ رہی تھی تو زیادہ سمجھ میں آ رہی تھیں۔

"تھینک یو ڈاکٹر غزالہ! آپ نے مجھے حوصلہ دیا ورنہ میں اس قابل بھی نہیں ہوں۔"

"دیکھیں' جب آپ اپنی غلطیوں کو پہچانتے ہیں تو اس کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ آپ سوچ سمجھ کر ہر فیصلہ کریں' بات کبھی آپ کے ہاتھ سے نہ نکلے گی۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اور پھر ہسپتال سے نکل کر وہ اپنے والد کو لینے چلا گیا جنہیں فون کر کے وہ کہہ چکا تھا۔

"آج ہسپتال سے جلدی فارغ ہو گئے؟" سہیل صاحب نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بیٹے سے پوچھا' وہ اس کی پریشانی اور بے چینی محسوس کر رہے تھے۔

"بس طبیعت بہت اپ سیٹ ہو رہی تھی۔ سوچا جلدی اٹھ جاؤں۔" وہ گاڑی چلاتا رہا۔

"میں آصفہ کو لینے جا رہا ہوں۔" تھوڑی ہی دیر گزری تو اس نے باپ کو بتایا۔

"اس کے منع کرنے کے باوجود..... وہ اب نہیں آئے گی۔"

"تو کیا میں کوشش نہ کروں۔" وہ الجھا۔

"ایسا کام کیا کیوں کہ اب اس سے معافی مانگنے اس کے گھر جانا پڑے۔" وہ بھی الجھ گئے۔ اپنے باپ اور چچا کے سامنے شرمندگی کے خیال سے ان کی پیشانی پر پسینہ آ رہا تھا۔

"بہرحال اب اس کا حل تو نکالنا ہے نا ابو!"

"ٹھیک ہے، جب تم نے کام بگاڑا تو بھی مجھ سے نہ پوچھا تھا اب کیوں پوچھ رہے ہو۔"

"میں نے سوچا کہ ضرورت پڑے تو آپ ساتھ چلیں گے۔"

"ہرگز نہیں، میں اس معاملے میں کہیں نہیں ہوں اور یہ بھی یاد رکھنا کہ تمہارے حالات اور خیالات ویسے ہی ہیں، وہ پلٹ کر آئے گی تو ضرور پھر تکرار ہوگی۔"

"نہیں ابو! میں دوبارہ ایسی غلطی کبھی نہ دہراؤں گا۔" اسے باپ کی طرف سے ایسی امید نہ تھی۔ انہوں نے صاف منع ہی کر دیا۔

"ایسا کرو، مجھے یہیں اتار دو، میں رکشہ لے کر گھر چلا جاؤں گا، تم آصفہ کو لینے چلے جاؤ۔"

"نہیں نہیں، میں آپ کو گھر تک چھوڑ کر پھر چلا جاؤں گا۔" اس نے گاڑی کا رخ گھر کی طرف ہی رکھا۔

"نہیں، میں کہہ رہا ہوں نا، بس یہیں رک جاؤ۔ نیک کام کے لیے جا رہے ہو تو اتنے رخ نہ بدلو اور وہاں تمہاری اماں کو پتا چلا تو سو سوال کریں گی۔"

بات شرجیل کی سمجھ میں بھی آ گئی۔ اس نے سہیل صاحب کو سگنل سے آگے رک کر اتارا اور خود گاڑی بھگا کر لے گیا۔

شرجیل کو دیکھ کر امینہ بیگم تھوڑی دیر تو حیران ہوئیں پھر اسے اندر بلایا اور اطمینان سے بٹھایا اور کہا کہ میں آصفہ کو بلاتی ہوں۔

آصفہ خود بھی شرجیل کی آمد کا سن کر پہلے بہت حیران ہوئی پھر اپنی امی سے کہا۔

"اس سے کہہ دیں، آصفہ گھر پر نہیں یا سو رہی ہے۔"

"پاگل ہوئی ہو، وہ خود چل کر آیا ہے تو اس سے بات تو کرو۔ شکر کرو کہ ہمارے کوئی پاؤں پڑنے کے بجائے اسے خود خیال آیا، تم سے رابطہ تو رکھا ہے اس نے۔ یوں بھی آدمی جب اپنی غلطی مان لے تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔"

"یعنی اگر وہ مجھے لینے آیا ہے تو میں اس کے ساتھ واپس چلی جاؤں۔" وہ ماں کی صورت دیکھنے لگی۔

"تو کیا نہیں جاؤ گی۔" انہوں نے الٹا سوال کیا۔

"آپ میرے سب حالات سے واقف ہیں امی جان! پھر بھی۔" اس کا دل دکھ کر رہ گیا۔ امینہ بیگم اس کی کیفیت جان گئیں پھر کہنے لگیں۔

"بیٹا! تمہارے کسی فیصلے میں ہم نہ کچھ کہیں گے، نہ تم پر دباؤ ڈالیں گے لیکن سمجھانا تو فرض ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا، بگڑ جائے گا تو تم ہی سہہ نہ سکو گی۔"

وہ بالکل چپ سی ہو گئی پھر اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

شرجیل آصفہ کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ اسے وہ دن یاد آیا جب وہ بڑے ماموں کے ڈرائنگ روم کے دروازے کی اوٹ میں کھڑی ڈرائنگ روم کے اندر بیٹھے اس شرجیل کو دیکھ رہی تھی جو اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ گھر کی نوکرانی مانا آئس کریم دے رہی تھی اور وہ بس اچھے اچھے خواب اور خیالوں میں الجھی مسکراتی رہتی تھی۔ کیسا بھولپن اور معصومیت کا زمانہ تھا۔ نہ زمانے کی سفاکی کا احساس تھا، نہ وقت کا خوف تھا۔ یوں لگتا تھا، یہ شخص مل گیا تو خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔

اب یہی شخص سامنے بیٹھا تھا تو لگتا تھا، نہ کوئی خواب آنکھ میں ہے، نہ کوئی خوشی مٹھی میں۔

"آؤ آصفہ! رک کیوں گئی ہو، کیسی ہو۔ اوہ کتنے دن ہو گئے تمہیں دیکھے ہوئے۔" وہ یوں کہہ رہا تھا، جیسے اس کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر مر رہا ہو۔ اس کا حال کچھ مجنوں جیسا بھی لگ رہا تھا۔

"شرجیل! میں نے کہا تھا کہ آپ یہاں نہ آئیے گا۔"

"پھر کہاں جاؤں، تم یہاں ہو تو میں تمہارے پیچھے یہیں تک آ سکتا ہوں۔"

"مجھے چند دنوں کے لیے چھوڑ دیں شرجیل! میں ابھی فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں۔"

"پاگل ہوئی ہو، کون سا فیصلہ کرنا چاہ رہی ہو۔ بس گھر چلو، بات بڑھائیں گے تو فاصلہ بہت بڑھ جائے گا۔" وہ سیدھے صاف لہجے میں کہہ رہا تھا۔

وہ سوچنے لگی، اس نے فیصلہ کر لیا تھا، ابھی شرجیل کی کوئی بات نہ ماننے کا سخت ارادہ کر لیا تھا لیکن امی جان نے جو کچھ کہا، وہ ایک لمحے میں ساری دیواریں توڑ دینے والی بات تھی۔ وہ پھر یکدم سے مجبور اور بے بس ہو گئی، اسے لگا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں، ساری زندگی کبھی وہ خود اپنے حساب سے کوئی فیصلہ نہ کر سکے گی۔

جب کچھ بھی نہ کر سکے گی تو یہاں کیوں بیٹھی ہے، شرجیل کے ساتھ جا کر اپنے گھر میں ہی رہنا چاہیے۔ چاہے پستی رہے، مرتی رہے یا ہر وقت ڈوبتی رہے۔

"اوہو شرجیل میاں آئے ہیں، بڑے کمال کی بات ہے۔ اللہ میاں نے اتنا حوصلہ دیا ہے کہ پلٹ کر ہمیں اپنی صورت دکھا سکو۔" اسی وقت جلال صاحب ڈرائنگ روم کے اندر آئے تھے۔

"السلام علیکم انکل! میں آصفہ کو لینے کے لیے آیا ہوں۔" وہ جلدی سے کہہ گیا۔

"بہت خوب، تم بڑے ہوشیار نکلے۔ کبھی بیوی کو گھر سے نکال باہر کرتے ہو، کبھی واپس لے جانے کی بات کرتے ہو اور یہاں سارے لوگ تمہارے خیال میں بے وقوف بیٹھے ہیں کہ جو تم کہو، کرو، مانتے چلے جائیں گے۔" وہ جلال میں آ گئے۔

"انکل! آصفہ جانے کے لیے راضی ہے، آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ کبھی کبھی انسان بہت زیادہ پریشانی اور ٹینشن میں غلطی کر بیٹھتا ہے۔"

"تم نے کوئی ایک غلطی نہیں کی جس کی معافی مانگنے چلے آئے ہو اور یوں بھی ابھی تمہارے بارے میں کسی گنجائش کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ابھی آصفہ بہت سوچنے اور غور کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے، تم چلے جاؤ اور اسے ڈسٹرب کرنے یا ستانے کا خیال دل سے نکال دو۔"

انہوں نے اتنی دو ٹوک بات کی کہ آصفہ یا شرجیل کسی کے کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہی۔

"تو کیا میں چلا جاؤں؟" اس نے آصفہ کی طرف دیکھا۔

"نہیں، آپ بیٹھیں۔ میں آپ کے لیے چائے بھجواتی ہوں اور اگر کھانا نہ کھایا ہو تو کھانا بھی کھا کر جائیں۔" آصفہ کے کہنے پر شرجیل کی پیشانی پر غصے کی لکیریں ابھر آئیں، لیکن پھر فوراً ہی وہ خود پر قابو پا گیا۔

"آصفہ ٹھیک کہہ رہی ہے، آرام سے بیٹھو۔ کھانا وانا کھاؤ، اپنے بچے سے ملو، یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔" پھر جلال انکل نے یہ پیش کش دہرائی تو وہ بولا۔

"اپنا گھر کیسے سمجھوں، آپ لوگ میری بات نہیں سن رہے، آخر میں خود ہی چل کر اپنی بیوی کو لینے آیا ہوں۔ آصفہ! تمہیں تو سوچنا چاہیے۔"

"سوچنے کا ہی تو کہہ رہی ہے ہم اسے کچھ دنوں کے لیے بھول جاؤ۔"

"درمیان کا وقت طویل ہو جائے تو جذبے ٹھنڈے بھی پڑ سکتے ہیں۔"

"یہی تو دیکھنا ہے کہ لگن کتنی سچی ہے، وقت کے ساتھ مٹ جاتی ہے کہ بڑھتی ہے۔"

اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ جلال انکل اس سے ایسی باتیں کریں گے لیکن وہ بات کہہ کر اب کمرے سے باہر چلے گئے۔

"میں منے کو بھجواتا ہوں، شرجیل کو اپنے بیٹے سے ضرور ملنا چاہیے۔" جاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"آصفہ! یہ گیا پاگل پن ہے، ختم کرو ساری بات۔ یوں تماشا نہ بناؤ۔"

"میں اپنے میکے میں بیٹھی ہوئی ہوں۔ اس میں تماشے کی کیا بات ہے۔ پلیز، شرجیل! اصولاً آپ کو ابھی یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، جب میں نے منع کیا تھا۔"

"نہ آؤں گا تو سر پکڑ کر روؤ گی، آ گیا ہوں اسی لیے شیر بن رہی ہو۔" وہ چڑ گیا۔

"دیکھ لیا نا آپ کے اندر کی کدورتیں یوں آسانی سے مٹ نہیں سکتیں۔"

اسی وقت نوکرانی بچے کو گود میں لیے آئی۔ شرجیل نے بچے کو گود میں لے لیا اسے خوب پیار کیا اور وہ چلا چلا کر رونے لگا۔

"اسے بھی برا لگا ہے میرا آنا۔"

"سلوک کا احساس شاید خدا نے اسے بھی دیا ہے۔ جب آپ نے مجھے گھر سے نکال باہر کیا تو یہ بھی ساتھ تھا نا۔"

"میں چلتا ہوں۔ اب بھی سوچ لو۔ اپنے گھر چلو تو بہت سے فیصلے ہم مل کر کرلیں گے۔"

"اس نے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔

"اچھا خدا حافظ۔" اس نے جیسے کچھ نہ سنا۔

"اتنی سنگ دل اور بے رحم ہوگئی ہو۔ تم شاید نہیں جانتیں، میرے گھر میں اور میرے دل میں ویرانی چھا گئی ہے۔" وہ پھر اسے پھسلانے لگا۔

"اپنے کام کی طرف دھیان دیں، ماں باپ کی خدمت کریں۔ دھیان بٹ جائے گا۔"

"اونہہ! طنز کر رہی ہو۔" وہ پھیکی ہنسی ہنسا۔

"اچھی بات کو آپ طنز کہہ رہے ہیں۔"

وہ پلٹنے لگی تو شرجیل نے بھی جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

"میرے بیٹے کا خیال رکھنا۔ کہیں تمہاری ضد اسے خوار نہ کردے۔" وہ نئی بات میں اسے الجھانے لگا۔

"میں اپنے بچے کے لیے بہت اچھا سوچ سکتی ہوں۔"

"بچے کے لیے ماں باپ دونوں کی اچھی سوچ کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"آپ اتنی اچھی باتیں صرف تھوڑی دیر کے لیے کیوں کرتے ہیں جیسے ادھاری ہوں۔ ان باتوں کی پہلے بہت ضرورت تھی۔"

"آپ کمال کرتے ہیں، کیوں اسے اس طرح لوٹا دیا؟ اس سے کوئی ڈھنگ کی بات بھی نہ کی۔" امینہ بیگم اپنے شوہر پر غصہ نکالنے لگیں۔

"بھلا وہ اس قابل ہے کہ اس سے اچھی بات کی جائے!" جلال احمد کی آنکھوں میں ابھی تک وحشت اتری ہوئی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ، داماد تو ہے ہمارا اور اگر کچھ غلطی کی تھی اس نے تو اس کی تلافی کے لیے ہی آیا تھا۔ آصفہ سے روز فون پر معافی مانگتا ہے، پھر کیا کرنا چاہیے، مرد ہے بار بار پلٹ کر تھوڑی آئے گا۔" امینہ بیگم کے دل کے اپنے خدشات تھے۔

"تو کیا ہم اس کے پلٹ کر آنے کی آس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ارے اب اس چوکھٹ پر ناک بھی رگڑے گا نا تو جب تک آصفہ اشارہ نہ کرے گی میں اسے معاف نہ کروں گا۔ داماد ہے تو ٹھیک ہے، نہ بھی رہے تو مجھے پروا نہیں۔" وہ بھی غصے سے کھول رہے تھے۔

"جلال صاحب! آپ صرف غصے میں ہی سب باتیں سوچ رہے ہیں، ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرلیں، بیٹی کو بٹھائے رکھنا اتنا آسان تو نہیں ہے۔"

"امینہ بیگم! میں آپ سے کہوں گا کہ آپ غور کرلیں، ہماری پھول جیسی بچی کو انہوں نے کیسا ستایا ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ بچے کی پیدائش کے وقت آصفہ ہمیں تو اسپتال پہنچی ہوئی ملی تھی۔ وہ خود نہ گری تھی، سیڑھیوں سے گرائی گئی تھی۔" وہ اپنی بیگم کو جوش دلانے لگے۔

"یہ بات تو میں اسی وقت جان گئی تھی۔ عالیہ بیگم کے چہرے پر لکھا ہوا تھا، آصفہ کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہا تھا لیکن......"

پھر وہ چپ ہوگئیں، یہ بات انہیں یاد آئی تو ان کی زبان بھی گنگ ہی رہ گئی۔ ذہن وکالت کرنا بھول گیا۔ اپنی بیٹی کی تکلیف وہ وہ گھڑی یاد آئی جب وہ اپنی اور اپنے بچے کی زندگی کے لیے لڑی تھی تو انہیں خود ہر دوسری بات بھول گئی۔

"کیا ہوا۔ آپ کیوں رک گئیں۔ ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا نا، اولاد کا دکھ زبان روک رہا ہے نا۔ بتاؤ بیگم! ہم اپنی بچیوں کو اسی لیے اتنے ناز و نعم سے پالتے ہیں کہ شوہر کے گھر جاکر وہ خوشی کا مطلب ہی بھول جائیں

شرافت اور نیکی کا درس دے کر ہم نے اس سے کہا تھا کہ کبھی کسی کو دکھ نہ دینا، سسرال کو اپنا گھر سمجھنا اور کوئی کام ایسا نہ کرنا کہ والدین کی عزت پر حرف آئے۔"

"وہ بے چاری اسی بات پر ڈٹی رہی۔ اتنی نیک سیرت ہماری بچی کی ان لوگوں نے ذرہ برابر قدر نہ کی۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، اب ہم آصفہ ہی کی مرضی پوچھیں گے۔"

"آصفہ کی مرضی وہاں پلٹ کر جانے کی ہرگز نہ ہوگی اور ہوئی بھی تو میں نہ جانے دوں گا۔ اس تھرڈ کلاس آدمی کے ساتھ ایک بار بھیج کر غلطی ہوگئی۔ دوبارہ غلطی نہ ہوگی۔" وقار ابھی آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح اس کی آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ رات وہ بہت دیر سے سویا تھا اور الجھن میں گھڑی کا الارم بھی سیٹ کرنا بھول گیا تھا اس لیے صبح سوتا ہی رہ گیا اور تیزی سے باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے اس کے منہ سے نکلا۔

"آصفہ ناشتہ جلدی تیار کرنا!" اور اسی دم اسے اپنی بات کے خالی پن کا احساس ہوا تو ٹھنڈی یخ چوٹ جیسی لہر سارے جسم میں دوڑ گئی۔ کبھی کبھی دل یوں بے اندازہ دکھتا ہے کہ ہم چلتے چلے جاتے ہیں اور دل دکھتا چلا جاتا ہے۔

وہ پانچ منٹ میں نہایا، دو منٹ میں تیار ہوا لیکن جوتے پہنتے ہوئے موزے اسے نہ ملے۔ کتنا ڈھونڈا، کہیں کوئی جوڑی دروازے کے پیچھے سے ملی، کوئی موزہ پلنگ کے نیچے سے برآمد ہوا، کوئی ڈریسنگ ٹیبل پر ٹشو باکس کے نیچے پڑا تھا اور کوئی تکیے کے نیچے دبا ہوا ملا۔ لیکن سارے موزے میلے تھے اور اسے کتنی شدید چڑ تھی استعمال شدہ موزے دوبارہ پہننے سے، وہ آصفہ کو کئی بار بتا بھی چکا تھا۔

"دیکھو میں ایک بار کا پہنا ہوا جوڑا دوبارہ پہن لوں گا لیکن موزے دوسرے دن ہرگز نہ پہنوں گا اور اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا اس وقت، میلے موزے پہننے کے سوا۔ کیونکہ پانچ منٹ وہ پہلے ہی گنوا چکا تھا۔

چار دن میں اس کا کمرہ کباڑ خانہ بن چکا تھا۔ کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہ رہی تھی۔ آصفہ کیسے صبح ہی صبح بوتل کے جن کی طرح ہر چیز اس کے لیے تیار رکھتی تھی۔ تولیہ، کپڑے، موزے، ٹائی، ناشتہ، چائے۔ اف چائے کے بغیر تو اس کا سر گھوم رہا تھا۔ روز تو وہ ناشتہ حبیب خان سے منگواتا اور چائے خود بنانے لگا تھا۔ امی کے پاس جاؤ تو وہ خود تو سوئی ہوئی ملتی تھیں اور سمیعہ بھابھی سے کہنا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔

اس وقت بھی وہ امی کی طرف گیا صرف اس آس میں کہ شاید ناشتہ تیار ہو رہا ہو۔ چائے بن رہی ہوگی تو وہ خود سمیعہ سے چائے مانگ لے گا۔ لیکن وہاں سب سوئے ہوئے تھے، حبیب خان نے بتایا کہ عینی آپا آئی ہوئی ہیں لیکن وہ بھی اپنے بچوں کے ساتھ سوئی ہوئی ہیں۔ اسے فقط ایک پیالی چائے کی کتنی طلب ہو رہی تھی، لیکن وہ چڑتا جھنجلاتا گاڑی نکال کر اسپتال کی طرف روانہ ہوگیا۔

"اونہہ امی جان نے میری بیوی کو تو گھر سے نکلوا دیا لیکن ایک بار بھی پلٹ کر نہیں پوچھا ہے کہ بیٹا تمہارا کیا حال ہے یا تمہارا گھر کیسا ہے۔ ناشتہ کیسے بناتے ہو، اپنی چیزیں کیسے سمیٹتے ہو، رات کو اکیلے سوتے ہوئے گھبراتے تو نہیں۔ تنہائی تو محسوس نہیں کرتے۔ کسی چیز کی تکلیف ہو تو بتانا لیکن نہیں وہ تو آصفہ کو اس کے گھر سے نکلوا کر خود اسے بھی بھول گئی تھیں۔ رات کو صرف کھانے کے لیے اسے روکتیں، وہ بھی اس لیے کہ وہ بے شرم بن کر اسپتال سے سیدھا ان کے پاس آجایا کرتا تھا۔ نہ جائے تو وہ پلٹ کر پوچھنے بھی نہ آئیں۔ جس طرح کل رات کو وہ اتنی دیر سے گھر لوٹا، آصفہ کے پاس سے ہو کر شہر میں ادھر ادھر گھومتا پھرا تھا رات بارہ بجے کے بعد گھر لوٹنے کا خیال اسے آیا تھا۔

رات کو عینی آپا بھی تھیں مگر کوئی اسے پوچھنے یا جھانکنے نہیں آیا۔ وہ غصے میں بھوکا ہی سو گیا تھا اور اس وقت بھی بھوکا اسپتال جا رہا تھا۔ اسے ہر کسی پر خاص کر

اپنی ماں پر اتنا غصہ آیا کہ جی چاہا اب پلٹ کر انہیں کبھی اپنی صورت نہ دکھائے۔

☼ ☼ ☼

رات وہ اسپتال سے سیدھا اپنے گھر کی طرف ہی چلا آیا۔ اپنے کمرے میں بہت دیر تک بے وجہ ادھر ادھر ٹہلتا رہا اور پھر اکتانے لگا تو گھر سے باہر نکل گیا ابھی سڑک تک آیا تھا کہ پیچھے سے عینی آپا کا بچہ دوڑتا ہوا آیا۔

"ماموں! آپ کو میری امی بلا رہی ہیں۔" عینی آپا دروازے کے پاس کھڑی تھیں وہ بیزار سا پلٹا اور بڑی بہن کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"کہیں جا رہے تھے؟" عینی آپا نے پوچھا۔

"کہاں جاؤں گا! آوارہ گردی کرنے جا رہا تھا۔"

"کیوں بھئی گھر میں بیٹھو' امی کے پاس نہیں آئے' وہ تمہیں یاد کر رہی تھیں۔"

"وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے اپنے بچوں کو یاد کرنے کا کام خوب کر لیتی ہیں۔" شرجیل کا دماغ تپا ہوا تھا اس کے منہ سے اچھی بات اس وقت نہ نکل سکتی تھی۔

"شرجیل بھائی ایسے کیوں کہہ رہے ہیں؟ چلیں اندر تو چلیں۔" انہوں نے بھائی کا ہاتھ تھام لیا۔

"کوئی کام ہو تو بتائیں ورنہ مجھے یہاں بیٹھ کر گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔"

"کام تو بہت ہیں تم مجھے اندر اپنے کمرے میں بیٹھنے کے لیے تو لے جاؤ۔" اس نے جھلاتے ہوئے کمرے کا لاک کھولا اور چابی پھر جیب میں ڈالتے ہوئے بستر پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ عینی آپا بھی اندر آکر سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"اوہ گاڈ یہ تمہارے کمرے کا کیا حال ہے' صفائی نہیں ہوتی یہاں کیا؟"

"خیال کرنے والی کو میں نے نکال دیا اب کسی کو کیا ضرورت پڑی کہ یہاں دھیان دے۔"

"کیوں نکال دیا! میں یہی پوچھنے آئی ہوں۔" عینی آپا کی پیشانی پر تردد کی لکیریں تھیں۔

"اب پوچھنے آئی ہیں؟ آپ کو بھی وقت نہ ملا ہو گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"ارے بھائی میں تو کل سے آئی ہوئی ہوں کل رات بارہ بجے تک تمہارا انتظار کیا' گھر آئے ہی نہیں پھر میرے بچے کو دو دن سے بخار آرہا ہے اسی کے پیچھے جاگتے جاگتے کل اتنا تھک گئی تھی کہ سوچا تھا تھوڑی دیر لیٹتی ہوں مگر آنکھ ہی لگ گئی اور صبح بھی جلدی اٹھ نہ سکی۔"

وہ اپنی مجبوری سنا رہی تھیں اور شرجیل سوچ رہا تھا کہ اللہ نے یہ خوب نظام بنایا ہے کہ ہر انسان کو شریک حیات جیسی نعمت سے نوازا ہے وہی اس کا ساتھی ہوتا ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت زندگی کے سفر پر اپنی تمام ترجیحات کو ایک دوسرے کے لیے وقف رکھتے ہیں۔ مرد اپنے گھر اپنے بیوی بچوں کے لیے روزی کماتا ہے' اسی کے لیے محنت کر کے روٹی مہیا کرتا ہے اور عورت اپنے شریکِ سفر کی چھوٹی چھوٹی ضرورت کے لیے بڑے بڑے مقاصد قربان کر دیتی ہے۔ شرجیل جیسے بیوقوف کم ہی ہوتے ہیں کہ بے جا اور غلط باتوں میں آکر اپنا ہی گھر برباد کر لیتے ہیں۔

"بہت انتہائی قدم اٹھا لیا تم نے ہمارے گھر کے جھگڑے تو روز کے ہیں۔"

ٹھیک ہی بات تھی ان کی۔

"پتہ نہیں عینی آپا! مجھے کیا ہو گیا تھا۔ آپا! آپ دیکھ تو رہی تھیں' امی اسے کسی طرح بخشتی ہی نہ تھیں۔" اتنا اونچا قد' چوڑی پیشانی اور بڑی بڑی آنکھوں والے شرجیل کا دل بھر آیا۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

"غلطی تمہاری ہے میرے بھائی! امی کو ہم سمجھا نہیں سکتے لیکن ہم خود تو سمجھ رکھتے ہیں۔ شرمین کی فضول باتیں کیا تمہاری دیکھی سنی نہ تھیں یا امی کا رویہ؟ تم کیوں باتوں میں آگئے۔"

عینی آپا بھائی کی حالت دیکھ کر اور پریشان ہو گئیں۔

"میں اس لمحے کو کوس کوس کر تھک گیا ہوں آپا۔" وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر رہ گیا۔

"اس کو جا کر لے آؤ بھائی۔ امی کے کہنے کا انتظار نہ کرو۔" "عینی آپا نے بات یوں کہی جیسے بہت پتے کی ہو۔

"میں گیا تھا' میں نے فون بھی بہت کیا لیکن وہ اب اس طرح نہیں آئے گی۔ اس کے والدین نہیں بھیجیں گے۔" پھر شرجیل نے اپنے جانے کی کچھ تفصیل بتائی۔

"ہے تو یہ حقیقت ہم نے آصفہ کے معاملے میں بہت بے رخی اور بے وقوفی برتی ہے۔ وہ ایک بامروت اور اچھی لڑکی تھی اس لیے ہم نے اس کو بہت پیس ڈالا۔ ورنہ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ایسا سلوک چار دن بھی برداشت نہ کرتی۔ وہ خاندان' مرتبے' دولت ہر چیز میں تم سے برتر ہے بھائی مگر مجال ہے جو کبھی اس نے اس بات کو جتایا ہو۔"

"کتنی حیرانی کی بات ہے یہی بات پہلے ہم میں سے کسی کی سمجھ میں نہ آئی' اب سب کو سوجھ رہی ہے۔"

"شاید اس لیے کہ اب اس نے اپنی مرضی سے اپنے معاملے میں اپنے خاندان کو شامل کیا ہے' اور اب اس کے خاندان تک بات گئی ہے تو نمٹنا مشکل ہے۔"

"کیا مشکل ہے اگر ابو چاہیں تو بات ابھی بن جائے' میں نے ان سے کتنا کہا لیکن وہ ساتھ چلنے کے لیے راضی نہ ہوئے۔" شرجیل کو مشکل سے کوئی ہمدرد میسر آیا تھا۔

"نہیں وہ تو کبھی تمہارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ ان کے لیے جلال انکل کی دو باتیں سن لینا ممکن نہ ہوگا۔ وہ قطعی برداشت نہ کریں گے' تم جانتے ہو وہ درجنوں بار امی سے بھی اسی بات کی بنیاد پر جھگڑ چکے ہیں کہ کوئی اونچ نیچ ہوئی تو وہ اپنے باپ اور چچا کا سامنا نہ کر سکیں گے۔"

"جب وہی کچھ نہیں کر سکتے تو کسی کی بھی کیا آس رکھوں' میں خود تو ناکام ہو چکا ہوں۔"

"تم دادا جان سے بات کرو۔ وہی آصفہ بھابھی کو منا سکتے ہیں۔" "عینی آپا سب سے زیادہ ٹھیک بات کر رہی تھیں۔

"لیکن دادا جان پہلے میری گردن پکڑیں گے پھر آصفہ کو منائیں گے۔" "اب عینی آپا اٹھیں اور کمرے کی پھیلی ہوئی چیزیں سمیٹنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

طلعت اور تہنیت آئیں تو آصفہ ان سے مل کر اتنی خوش ہوئی کہ کچھ دیر کے لیے سب کچھ بھول گئی۔

"تم بتاؤ جواد صاحب کیسے ہیں۔" آصفہ نے ہنس کر پوچھا۔

"بہت اچھے' ہمیشہ کی طرح اتنے ہی پیارے۔" طلعت نے کھل کر تعریف کی۔

"افوہ بھئی اچھے بھی' پیارے بھی۔" وہ اور کھل کر ہنسیں۔

"کیا کروں بھئی بندہ تعریف کے لائق ہو تو اس کی تعریف کرنی ہی چاہیے نا۔"

"ضرور کرو تعریف! اب تمہارے لیے زمانے بھر کے دوسرے کام تو ختم ہو کر رہ گئے ہیں نا۔" تہنیت نے چڑایا۔

"اور تو سارے کام ختم ہو گئے ہیں' تمہاری فکر کرنی پڑتی ہے اس لیے ذرا دماغ دکھ جاتا ہے۔"

"ارے واہ میری فکر میں دماغ دکھانے کا مشورہ کس نے دیا ہے۔"

"کیا کروں اللہ میاں سے دعا مانگتی رہتی ہوں کہ میری ایک بیوقوف' منہ پھٹ اور بے صبری بہن کے لیے بھی اچھا رشتہ بھیج دے۔" اب طلعت اور آصفہ ہنس دیں اور تہنیت نے غصے میں گود میں رکھا تکیہ کھینچ کر طلعت ـــ کو دے مارا۔

"ذرا شادی ہو گئی اور میاں اچھا مل گیا تو ان محترمہ کا دماغ ہی خراب ہو گیا ہے۔ بس ذرا سال بھر پورا ہونے دو' شوہر صاحب اپنی اصلیت پر آئیں گے تو تم سے پہچانے نہیں جائیں گے' پھر اپنے دکھ رونے کے لیے ہم جیسے مخلص دوستوں کا کندھا ہی چاہیے ہوگا۔" وہ تنک کر بولی۔

"نہ نہ اللہ نہ کرے' تہنیت! ایسے مت بولو' اللہ اس کے میاں کو ہمیشہ اتنا اچھا اور نیک ہی رکھے۔ عورت ان مردوں کے آسرے پر ہی تو سب کچھ چھوڑ کر ان کے گھر جاتی ہے۔" آصفہ کے دل پر تو ایسی بات فوراً اثر کرنے والی تھی۔

"وہ میں تو مذاق کر رہی تھی' ورنہ اس کے لیے تو ہر وقت دعا ہی کرتی ہوں۔"

"چھوڑو بھئی مذاق کی بات میں کیا سیریس ہو گئے۔"

"طلعت! جزا دامیر بہت پوزیسو ہے نال۔"

"حد سے زیادہ! اتنا کہ کبھی کبھی بہت غصہ آنے لگتا ہے۔ لیکن محبت اتنی کرتا ہے کہ اس کے لیے اس کمزوری سے سمجھوتہ کر لیتی ہوں۔"

"ہاں اگر مرد غصہ کرتا ہے تو پیار بھی دیتا ہے' جبھی تعلق بھلا لگتا ہے۔" تہنیت نے کہا۔

"ہر چاہنے والے پر حقوق کی ادائیگی فرض ہونا چاہیے۔"

سمیعہ اپنے کپڑے پریس کر کے الماری میں لٹکا چکی تو عالیہ بیگم کے لیے دلیہ پکانے کچن کی طرف آ گئی' انہیں کچھ بدہضمی ہو گئی تھی اس لیے انہوں نے سمیعہ سے کہا تھا کہ دوپہر کے وقت وہ سوائے دلیے کے کچھ نہ کھائیں گی۔

"کیا ہوا۔ کھانا تیار ہے' ہے تو نکال دو۔" ابھی وہ کچن میں گئی ہی تھی کہ اس کی ساس کی آواز آئی۔

ابھی ظہر کی اذان ہوئی ہی تھی۔ عموماً" وہ دو بجے کھانا کھایا کرتی تھیں۔

"بس امی! تھوڑی دیر میں ہو جائے گا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"بھئی مجھے تو تھوڑا سا دلیہ ہی کھانا ہے' ایک پیالے میں ڈال کر دے دو۔"

"دلیہ ہی ابھی بنانے کے لیے رکھا ہے' ابھی تو ایک ہی بجا ہے۔"

"ایک چھوٹا سا کام تم نے ابھی تک نہیں کیا جبکہ میں نے تمہیں صبح ناشتے پر ہی بتا دیا تھا کہ دلیہ کھاؤں گی۔" عالیہ بیگم چڑ گئیں۔

"جی امی! ہے تو چھوٹا سا ہی کام' ابھی ہو جائے گا۔"

"تمہارا اپنا ہی حساب کتاب ہے' بھئی اگر دلیہ پہلے بنا لیتیں تو کیا حرج تھا۔"

"ہم روزانہ دو بجے کھانا کھاتے ہیں اور دو بجنے میں ابھی بہت دیر ہے۔"

"اچھا اب کھانا بھی میں اپنی بھوک کے وقت نہ کھاؤں۔ گھڑی دیکھ کر تمہارے حساب سے کھاؤں۔"

"خوامخواہ میں بات بڑھا رہی ہیں آپ امی! بس تھوڑی دیر صبر کر لیں۔" وہ بھی چڑ گئی۔

"توبہ اللہ کی پناہ ہے کیسی تیز زبان ہے اس لڑکی کی' منہ سے بات چھینتی ہے۔" وہ ابھی اور بھی کچھ کہتیں لیکن اپنی ساس اور سسر کو گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

"خیریت ہے عالیہ! کس پر برس رہی ہو۔"

"السلام علیکم دادی جان' دادا ابا۔" اسی وقت سمیعہ نے بڑھ کر سلام کیا۔

"بس کھانے کے لیے کہہ رہی تھی' بھوک لگی ہے مگر بہو بیگم کہہ رہی ہیں ابھی وقت نہیں ہوا دو بجے کھانا ملے گا۔" وہ ہنس کر اپنے شوہر کو دیکھنے لگیں۔

"امی پلیز' ایک دلیہ ہی تو بن رہا ہے آپ خود سوچیں دادی جان کتنی جلدی بن جاتا ہے۔"

"کچھ اور نہیں پکایا دوپہر کے کھانے کے لیے' بھئی ہم کھانا کھا کر نہیں آئے؟" اب کمال صاحب بھی کچھ مسکرا رہے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی عالیہ بیگم کی بیزاری محسوس کر چکے تھے۔

"نہیں دادا جان قورمہ پکایا ہے' مونگ کی دال بھگو کر رکھی ہے اور ابھی چاول بھی پکا لوں گی' آپ نا بھی کہتے تو ہم آپ کو کھانا کھائے بغیر تھوڑی جانے دیتے۔"

"مگر شرط یہ ہے کہ کھانا دو بجے کے بعد ہی ملے گا۔" وہ ہنسنے لگے۔

"آپ خود ہی بتادیں دوپہر کے کھانے کے لیے دو بجے کا وقت موزوں ہے یا نہیں اور ہم روزانہ دو بجے کے بعد ہی کھانا کھاتے ہیں آج ہی امی جان کو جلدی کھانے کا جی چاہا ہے۔"

وہ پھر وضاحت کرنے لگی اور پھر کچن میں جاکر کھانا پکانے کا بقیہ کام نمٹانے لگی۔ روٹی خود ہی اس نے اپنی مرضی سے باہر سے منگوالی۔ مونگ کی بھنی ہوئی دال بھی اس نے جلدی جلدی مسالہ ڈال کر تیار کرلی اور ابھی دو بجے ہی تھے کہ اس نے کھانا بھی میز پر لگادیا۔ وہ ہر کام پھرتی اور ترتیب سے کرتی تھی۔ کاموں کے بارے میں وہ پہلے ہی طے کرلیتی کہ اتنا کچھ وہ کرسکے گی۔

"روٹی گھر میں نہیں بنائی۔ بنالیتیں تو میں بھی ایک آدھ کھالیتی، تمہیں خبر ہے کہ میرا ہاضمہ خراب ہے، باہر کی روٹی تو ہرگز نہیں کھاؤں گی۔"

عالیہ بیگم اب اسے کسی کی موجودگی کی پروا کیے بغیر مسلسل ٹوک دیا کرتی تھیں، پھر وہ بھی سب کے سامنے ہی وضاحت کرتی۔

"آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ آپ صرف دلیہ کھائیں گی۔ روٹی پکانے کا تو قطعی وقت نہیں تھا، تھوڑے وقت میں جتنا کام ہوسکتا تھا میں نے کرلیا۔"

"سمیعہ بیٹی! ہم نے تمہیں بے وقت آکر پریشان کردیا، صبح سے تمہاری دادی کو کہہ رکھا تھا کہ فون کردینا لیکن یہ بھول گئیں بلکہ بھول کیا گئیں مجھے یقین ہے کہ جان بوجھ کر نہ کیا۔ ان عورتوں کو بہوؤں کو آزمانے کا بہت شوق ہوتا ہے نا۔"

دادا جان نے کہا تو سمیعہ ہنس دی۔ دادا جان نے کہا سمیعہ کے لیے لیکن عالیہ بیگم نے اشارہ اپنی طرف جان کر اور مزاج خراب کرلیا۔

"آپ ناحق مجھے بدنام کررہے ہیں، میں نے فون ملایا تو تھا مسلسل انگیج تھا۔"

"یہ سمیعہ ہی کسی سے بات کررہی ہوگی۔ فون تو اس کا بس چلے تو گلے میں لٹکالے۔"

"کیا کروں دادا جان! سارا دن اکیلی بور ہوتی ہوں، میرے تو والدین دوست احباب سب اسلام آباد ہی میں ہیں نا، کوئی نہ کوئی فون ضرور کرتا ہے میں خود کسی کو نہیں کرتی۔"

"ہاں تو اب روحیل آئے تو اس سے کہنا کارڈلیس لگوالے۔ کمرے میں یا ادھر ادھر لے جانے میں آسانی رہتی ہے۔"

"ہاں تو پھر وہ اپنی جگہ پر کبھی ملے گا ہی نہیں۔ کوئی ایمرجنسی فون بھی نہ ملا کرے گا۔"

"اپنے ایمرجنسی فون کے لیے تم ایک موبائل رکھ لو نا عالیہ۔"

وہ جی کڑا کرکے دلیہ کھاتی رہیں۔ سمیعہ کی من مانی انہیں اتنی کھلتی تھی کہ وہ ہر وقت اس طرح چڑی ہوئی اور بیزار ہی رہتی تھیں۔ ابھی روٹی کے ساتھ اپنی مرضی سے اس نے مٹھائی بھی منگوالی تھی اور وہ خود کھا نہ سکتی تھیں، اس لیے انہیں سمیعہ کی یہ من مانی اور بری لگی تھی۔

"کھانا پسند آیا یا نہیں دادا جان؟" وہ لوگ کھا چکے تو سمیعہ نے پوچھا۔

"بہت اچھا تھا۔ قورمہ تو تم نے لاجواب بنایا تھا اور مونگ کی دال بھی ہم دونوں میاں بیوی کو بے انتہا پسند ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"فارغ ہوچکی ہو بیٹا تو آصفہ کو بلالیتا، اس سے بھی بہت دن ہوئے نہیں ملے۔" سمیعہ برتن سمیٹ چکی تو دادی جان نے کہا۔

"وہ تو چار دن سے اپنی امی کے ہاں ہی رہ رہی ہیں۔" سمیعہ نے فوراً جواب دیا تو عالیہ بیگم نے غصے سے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"چار دن! کیوں خیریت ہے عالیہ؟"

"چار دن کہاں؟ آج دوسرا ہی دن ہے سمیعہ بھول گئی ہے، اس کے بیٹے کی طبیعت خراب تھی اور اسے خود بھی کچھ نزلہ وغیرہ ہورہا تھا میں نے کہا جاؤ اپنی ماں کے ہاں آرام کرلو۔" ان کے یوں صاف جھوٹ بولنے پر سمیعہ دنگ رہ گئی۔

"اچھا طبیعت زیادہ خراب تو نہیں، بیٹا ذرا فون تو ملاؤ۔"

دادا جان عالیہ بیگم کے جھوٹ کو صاف بھانپ گئے تھے اور دراصل وہ صورت حال جانچنے کے لیے ہی یہاں آئے تھے، کیونکہ انہیں اپنے بھائی جلال احمد کے ذریعے آصفہ کا سب احوال معلوم ہوچکا تھا۔

"نہیں ابا جان! اب ایسی بھی طبیعت خراب نہیں۔ آپ فکرمند نہ ہوں اور آج تو وہ آ ہی جائے گی۔ آپ تو رات تک یہیں رہیں گے، پھر آئے تو ہی خیریت معلوم کرلیجیے گا۔"

عالیہ بیگم کی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کمال عروج کو پہنچ چکی تھی۔ آصفہ کے لوٹ کر آنے کا قطعی کوئی امکان نہ ہوتے ہوئے انہوں نے کیسے صاف طور پر جھوٹی بات کہی۔

"نہیں تم فون تو ملاؤ سمیعہ بیٹا۔" وہ بھلا عالیہ بیگم کے کہنے پر رکنے والے تھے۔

"ہیلو آصفہ! کیسی ہو بیٹا! طبیعت ٹھیک ہے اور تمہارے بیٹے کا بخار کیسا ہے۔" انہوں نے اپنی بہو کے جھوٹ کو مکمل دہرایا اور ابھی اگلی بات کرتے کہ عالیہ بیگم اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ادھر سے آصفہ یہی کہہ رہی تھی کہ نہ اس کی طبیعت خراب ہے نہ اس کے بیٹے کو بخار ہے۔

"پھر گھر آجاؤ بیٹا! ہم یہاں کھانے پر آئے ہوئے ہیں۔ رات تک رکیں گے۔" انہوں نے آصفہ سے کہا تو وہ یکدم کنفیوز ہوگئی۔ بھلا تایا جان کو کیا جواب دے۔

"کیا ابھی آنا نہیں چاہ رہی ہو؟" ادھر سے خاموشی پر اس کے تایا جان نے پھر پوچھا۔

"جی تایا جان! ابھی نہیں آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے پھر ہم خود اپنی بیٹی سے ملنے آجائیں گے۔" انہوں نے فون رکھ دیا اور اپنی بیوی کی صورت دیکھنے لگے۔

"سمیعہ! کیا یہ حقیقت ہے کہ شرجیل نے اسے خود گھر سے نکالا ہے؟" دادا جان نے سیدھا اس سے سوال کیا، لیکن ابھی وہ جواب دیتی کہ اس سے پہلے دادی جان نے کہا۔

"ارے اس سے کیوں پوچھ رہے ہیں، اس سے کچھ مت پوچھیں۔ یہ تو خود اپنے شوہر اور والدین سے دور یہاں اکیلی عالیہ کے آسرے پر بیٹھی ہوئی ہے۔ عالیہ کی فطرت کو مزید آزمائیں گے کیا؟ آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے سیدھا اپنے بیٹے اور بہو سے پوچھے گا، یا پھر شرجیل سے ہر بات کا حساب لے لیجیے گا۔"

اپنی بیگم کی بات انہیں بالکل درست لگی۔

عالیہ ہی کے گھر میں بیٹھ کر سمیعہ سے اس کے خلاف کوئی بات کہلوانی خطرناک ہی تھی۔ سمیعہ بااعتماد اور نڈر لڑکی ضرور تھی لیکن عالیہ بیگم کی فطرت بڑی کمینی تھی۔

شام کو چائے بنا کر اس نے سب کو دی ہی تھی اسی وقت سہیل صاحب بھی آگئے۔ اپنے والدین کو دیکھ کر انہیں اپنی شامت اعمال صاف دکھائی دینے لگی اور چائے پیتے ہی کمال صاحب نے پوچھا۔

"آصفہ کو گھر سے نکال کر جھوٹی سچی کہانیاں گھڑنے کے بجائے آپ میاں بیوی کو کہیں چھپ کر بیٹھ جانا چاہیے تھا۔" عالیہ بیگم بھی اب لاؤنج میں موجود تھیں۔

"دیکھیں سہیل صاحب اپنے والد سے کہہ دیں مجھ سے اس طرح بات نہ کریں۔ آصفہ کو گھر سے اس کے شوہر نے نکالا ہے۔ ہم نے کچھ نہیں کہا، یہ غیر کی بیٹی آپ کے سامنے کھڑی ہے اس سے پوچھ لیں۔"

"عالیہ! تم نے کبھی نہ اپنے بڑوں کا ادب کیا ہے نہ ان کا مان رکھتی ہو۔ اپنے چھوٹوں کو کبھی تم سکون سے رہنے نہیں دیتیں۔ آخر کو اکیلی رہ جاؤ گی تو کیسے زندگی گزارو گی۔" ان کی ساس یکدم طیش میں آکر آج بہت دنوں بعد انہیں نصیحت کرنے چلی تھیں۔

"اماں! میں جانتی ہوں کہ آپ نے زندگی میں کبھی مجھے دعا نہیں دی؟ اب بھی اکیلے رہ جانے کی بددعا دے رہی ہیں لیکن دیکھیے گا کہ میرے دونوں بیٹے ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گے۔"

"آپ کو میں کہہ رہا ہوں کہ اب آپ درمیان میں نہ بولیے گا۔" کمال صاحب کو بہت غصہ آگیا پھر انہوں نے خود ہی بات شرجیل کے آنے تک ٹال دی۔

رات کو شرجیل پھر اسپتال سے ہو کر اپنے ہی گھر چلا آیا' اسے بلایا گیا۔ اپنے دادا اور دادی کو دیکھ کر وہ بھی سٹپٹا گیا' لیکن پھر کچھ مطمئن بھی ہوا کہ آخر اس کی مشکل کا کوئی حل بھی نکلے گا۔ کھانے کے بعد کمال صاحب نے شرجیل سے پوچھا۔

"اپنی بیوی کو اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہتے؟"

"خدا نہ کرے دادا جان! وہ میرے بیٹے کی ماں ہے' میں تو اسے لینے بھی گیا تھا۔"

"تم اسے لینے گئے تھے' مجھ سے پوچھے بغیر' بتائے بغیر تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اب میں واپس اسے اس گھر میں آنے دوں گی۔" عالیہ بیگم اتنے زور سے بولیں کہ شرجیل پھر گڑبڑا گیا۔

"گھر تو وہ واپس آئے گی نا امی جان۔"

"نہیں آئے گی۔ بس تم اسے تین لفظ لکھ کر بھیج دو' یہی میرا فیصلہ ہے' ابا جان آپ جا کر اپنے بھائی کو بتا دیجیے گا۔"

وہ بات بنانا چاہتا تھا اور اس کی ماں سرے سے اسے ختم ہی کر دینے کے درپے تھیں۔ وہ پھر اپنا سر پیٹتا رہ گیا۔

"سہیل احمد! جب تمہارے گھر میں سارے فیصلے طے ہو چکے ہیں اور بڑوں کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی ہے تو ہماری موجودگی یہاں بے معنی ہے' لیکن یاد رکھنا اگر تمہارے گھر سے یہ غلط کام ہوا تو ہم ساری عمر تمہاری صورت نہ دیکھیں گے۔"

"دادا جان پلیز۔ آپ ناراض نہ ہوں' ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ بیٹھیں' یہاں رہیں پلیز ہمارے پاس۔" شرجیل اب دادا کو منانے لگا۔

"کیسے نہیں ہوگا۔ اب آصفہ کا نام تمہاری زبان پر آیا تو میں اس گھر میں نہ رہوں گی۔"

"امی پلیز! وہ میرے بیٹے کی ماں ہے۔ اس کی گود میں میرا بچہ ہے' میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تو ہمیں چھوڑ دینا۔ اپنی زندگی سے نکال دینا۔" پھر عالیہ بیگم کی ضد تھی ان کی بے جا ہٹ تھی اور سب مجبور تھے کہ وہ قطعی لحاظ نہ کرتی تھیں۔

انہیں سہیل احمد نے بہت سمجھایا' دوسرے دن روحیل کراچی آیا اسے بھی بلایا گیا تھا۔ وہ بھی اپنی ماں کو سمجھانے لگا' لیکن ان کے دماغ پر بھوت سوار تھا۔ ان کی زبان پر ایک ہی لفظ تھا آصفہ کے لیے۔ کوئی سمجھا نہ سکا کوئی ان کی ضد توڑ نہ سکا۔

"کیا ملے گا تمہیں اپنے بیٹے کی زندگی برباد کر کے۔" سہیل احمد کہنے لگے۔

"برباد کیوں' میں اس کی دوسری شادی کروں گی۔"

"اونہہ تم اس کی کسی بھی بیوی کو برداشت نہ کر سکو گی۔ کیسے حسد نے جنم لے کر ڈیرہ جما لیا ہے تمہارے دل میں' یہ اچھا جذبہ نہیں ہے' یہ تمہیں خود بھی برباد کر دے گا۔"

"آپ میری پروا نہ کریں اور مجھے نہ سمجھائیں۔ میں کسی طرح اب آصفہ کو برداشت نہ کروں گی۔"

روحیل' شرجیل تھک گئے' سمیعہ تو حیران اور پریشان قدم قدم پر اپنی حیثیت بھول جاتی اس گھر میں۔

"کیا آپ آصفہ بھابھی کو چھوڑ دیں گے شرجیل بھائی؟" آخر اس کی بے تابی ختم ہی نہ ہوئی تو وہ ایک رات کو شرجیل کے کمرے میں آئی۔ روحیل بھی ساتھ تھا اور اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کبھی نہیں چھوڑوں گا' چاہے ساری زندگی معاملہ یونہی چلتا رہے۔" اس نے سمیعہ کی طرف دیکھ کر تلخی سے کہا۔

"معاملہ یونہی کیسے چلے گا۔ فیصلہ بہت ضروری ہے۔"

"کروں گا میں کچھ نہ کچھ کروں گا روحیل! یا تو پھر ایک دن پاگل ہو جاؤں گا۔" اس کا دماغ یونہی پک رہا تھا آج کل۔

ادھر آصفہ اب منٹ بھر کے لیے فون پر بات بھی نہ کرتی تھی وہ جانے فیصلے کے کون سے راستے پر چل رہی تھی۔ کبھی کہتی میں ٹھہر کر تھوڑا عرصہ خاموشی سے زندگی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ کبھی لگتا اب وہ پلٹ کر آنے والی راہ پر دیکھنے والی ہی نہیں۔ کبھی شرجیل کو وہم ہوتا کہ وہ پچھتانے لگی ہے کہ اس نے اتنی زندگی شرجیل کے ساتھ برباد کیوں کردی۔

"شرجیل بھائی! آپ نے اپنی ماں کی ناجائز باتوں میں ان کا ساتھ دے کر ان کو بھی گناہ گار کیا' خود بھی پچھتائے اور آصفہ بھابھی کا بھی برا انجام کیا ہے۔ میں تو صاف بات کہوں گی کہ اگر اب ان سب کی تلافی آپ کر سکیں تو ٹھیک ہے ورنہ معاملہ ختم کردیں۔ ایک عورت کسی مرد پر ناجائز قربان ہوجانے کے لیے پیدا نہیں ہوتی ہے۔" سمیعہ بڑے دنوں سے شرجیل کے لیے جی میں بھڑاس لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا چاہتی ہے آصفہ' ایک بار ڈھنگ سے اس سے پوچھ کر دیکھو۔"

"کیا پوچھوں! کوئی بات تھوڑی کرتی ہے وہ' اور مجھے تو یوں بھی کچھ نہیں بتاتی' اپنے ابا سے ہی ساری باتیں کرتی رہتی ہے۔" امینہ بیگم کئی دنوں کا دل میں مچلتا شکوہ اپنی ماں سے بیان کررہی تھیں۔

"تم ساتھ بیٹھ کر سن لیا کرو پھر اپنے میاں سے پوچھ لیا کرو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے غم میں بڑی باتوں اور مسئلوں کی اہمیت گم ہوجاتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ بیٹھ کر پوچھو تو آصفہ ہر بات زیادہ تفصیل سے تمہیں ہی بتائے گی۔" نانی جان اپنی بیٹی کو سمجھا رہی تھیں۔

"میں اتنا تو سمجھ رہی ہوں کہ اب وہ واپس جانے کا خیال دل میں نہیں رکھتی ہے۔"

"ٹھیک ہی ہے نا یہ عالیہ تو ہماری بچی کی زندگی برباد کرکے رکھ دے گی۔ اور شرجیل میں کون سے ہیرے جڑے ہیں کم بخت صبح شام ماں کی تسبیح پڑھتا ہے۔ بیوی بچوں کو کیا دیکھے گا۔ اچھا ہی ہے ابھی فیصلہ ہوجائے' ابھی ہماری آصفہ کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی اسے اچھے سے اچھا بر مل جائے گا۔ اس شرجیل نام کی بلا سے تو جان چھوٹے۔"

نانی جان تو بہت دور کی سوچنے لگی تھیں اور ان کی سوچ نے امینہ بیگم کے دماغ میں بھی بتی جلادی۔

"اماں! ابھی یہ تو بہت دور کی باتیں ہیں' آصفہ کے سامنے کچھ نہ کہیے گا۔"

"ارے مجھے پاگل سمجھا ہے کیا' کسی سے کچھ نہ کہوں گی۔ یہ ہم ماں بیٹی کے درمیان راز سمجھو' میں تو تمہیں اس لیے خبردار کررہی ہوں کہ مائیں بیٹیوں کی فکر کرسکتی ہیں اس طرح کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔"

نانی جان یوں بھی شرجیل کے رشتے پر کبھی خوش نہ ہوئی تھیں۔ "مجھے تو یہ بات بھی کھٹکتی ہے اماں کہ عالیہ یا سہیل بھائی دونوں میں سے کوئی بھی نہ آیا ہے نہ فون کیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کمال بھائی کو تو کچھ خبر ہی نہ تھی۔ ساری بات انہوں نے ہی بتائی تھی۔"

"کیا بتائیں گے کسی کو' منہ چھپا کر بیٹھے ہیں کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ کسی سے کہہ سکیں گے۔ لاوارث بے یارومددگار سمجھ لیا ہماری بچی کو گھر سے کیسے نکال دیا۔ ایک بار عالیہ ملے تو اس کا جینا حرام کردوں۔"

☼ ☼ ☼

"اتنا سب کچھ ہوگیا سمیعہ! تم نے مجھے کچھ بتایا بھی نہیں۔"

"ابو جی نے سختی سے منع کیا تھا اور میں نے بھی سوچا کہ آپ کو پریشان کرنے سے حاصل کچھ نہ ہوگا پھر ابو جی نے خود ہی آپ کو بلایا' لیکن سب بے فائدہ ہے۔ آپ کی امی کو کوئی سمجھا نہیں سکتا۔ دراصل انسان تو انسان ہی ہے نا اس کو اتنی زیادہ اونچائی پر پہنچا دینا کہ وہ پھر کبھی نیچے کا تصور ہی نہ کرے زیادتی بھی ہے اور نادانی بھی۔" سمیعہ کہہ رہی تھی۔

"اب ہمارے گھر میں ہر مقام پر امی جان ابو سے

آگے نکل کر کھڑی رہیں تو انہیں عادت پڑ گئی' ہر جائز ناجائز میں انہوں نے اپنی ہی برتری چاہی۔ اب یہ بے جا ضد ہی ہے نا ان کی' اپنے بیٹے کو ہی تباہ کرلیں گی۔ شرجیل بھائی کم ہمت ضرور ہیں لیکن کبھی کبھی بہت جنونی ہوجاتے ہیں اور ان کا جنون خطرناک ہے۔"

"ان کے ساتھ زیادتیاں بھی تو بہت ہورہی ہیں۔ گھر ان کا تباہ ہورہا ہے' بیوی ان کی چلی گئی ہے اب بے چارے کا نہ کھانے کا پتہ ہے نہ سونے کا' جانے کیا ناشتہ کرتے کہاں چائے پیتے ہیں' ان کے کپڑے چیزیں دیکھنے والا بھی کوئی نہیں۔ امی جان تو ان کے کھانے پینے کی بھی پروا نہیں کرتیں اور مجھے بھی کچھ نہیں کہا اور میں اپنی مرضی سے کرنے لگوں گی تو نہ معلوم کتنی ناراض ہوجائیں یا کیا کہہ بیٹھیں۔"

"پھر بھی تھوڑا بہت تو خیال کرلیا کرو' ناشتہ کھانا وغیرہ تو انہیں دے دیا کرو۔"

"پتہ نہیں امی جان کیا سوچتی ہیں' پہلے رات کا کھانا یہاں کھاتے تھے شرجیل بھائی' اب چند دن نہیں آتے تو امی جان نہ خود پوچھتی ہیں نہ پوچھنے کے لیے کہتی ہیں۔"

"حبیب خان سے کہہ کر بلا لیا کرو نا پلیز میری خاطر ان کا خیال رکھ لو۔ میں بہت دعا کرتا ہوں ان شاء اللہ ضرور ان کی مشکل کا کوئی حل نکلے گا۔"

"دراصل میں نے کل آصفہ بھابھی سے ملنے کا سوچا ہے' میری بات ان کی سمجھ میں ضرور آئے گی۔"

"میں بھی ساتھ چلوں؟"

"نہیں ابھی نہیں۔ اس کے گھر والے جانے کیا سلوک کریں۔ تمہارا جانا اچھا نہ لگے گا۔ کسی نے تمہیں کچھ کہہ دیا تو میں برداشت نہ کرسکوں گا۔"

"نہیں میں آپ کی خاطر بہت کچھ برداشت کرلوں گی۔"

"تمہارا مجھے اعتبار ہے مگر پھر بھی ابھی میرے ساتھ نہ جانا۔"

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم روحیل بھائی! آپ کب آئے اسلام آباد سے۔" آصفہ روحیل کو اپنے گھر میں دیکھ کر خوش ہوئی۔

"دو دن ہی ہوئے ہیں۔ آپ سے ملا نہیں تھا تو مزہ نہیں آرہا تھا۔" روحیل آصفہ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں آصفہ بھابھی! نظر تو بہت خوش آرہی ہیں۔" وہ بہت جانچ کر مودب لہجے میں اس سے بات کررہا تھا۔ آصفہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے آنے کا کیا مقصد ہوگا۔

"اپنے والدین کے سائے میں تو سب ہی خوش رہتے ہیں' بدنصیب ہی ہے وہ اولاد جسے والدین کی چھت بھی چین نہ دے سکے۔" اس نے کہا تو روحیل نے سر ہلایا۔

"اچھا برا نصیب بنانا تو اب انسان کے اپنے ہاتھ میں نہیں۔"

"سمیعہ کیسی ہے' اسے ساتھ نہیں لائے۔ بہت دن ہوئے ملاقات بھی نہیں ہوئی' وہ خود آئی بھی نہیں نہ فون کیا۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"ساتھ کیسے لاتا' جانے یہاں کیا سلوک ہوتا۔ اس کا تعلق آپ کے سسرال سے ہے' جس سے آپ ناراض ہوئی بیٹھی ہیں' اب کوئی اسے سخت سست کہہ جاتا تو آپ جانتی ہیں میں برداشت کرسکتا تھا۔"

"تو آپ کے خیال میں یہاں سب آپ لوگوں کو سخت سست کہنے کے لیے تیار بیٹھے ہوئے ہیں گویا آپ بھی سسرال والے ہی بن کر آئے ہیں' میں تو سمجھتی تھی بھائی بہن کی محبت میں کھنچا چلا آیا ہے۔" آصفہ نے طنز سے کہہ کر روحیل کی طرف دیکھا۔

"دیکھیں نا جب آپ کی طرف سے اعلان جنگ ہوگیا ہے تو پھر آپ جانتی ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔"

"نہیں میں نے کوئی اعلان جنگ نہیں کیا روحیل بھائی! آپ غلط قسم کی بات کررہے ہیں۔" اس نے

بھی اپنا لہجہ دھیما کرلیا۔

"خاندان بھر میں بات پھیل گئی۔ ہر کسی کو داستان غم سنائی جارہی ہے تو یہ کیا مقصد ہوا۔ دادا جان تو اتنے مشتعل ہیں کہ ہم سے ناراض ہی ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔"

"دیکھیں جب بات پھیلی ہے تو آپ کیوں گھبرائے رہے ہیں۔ جو کچھ ہے سچ ہی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب ایک چیز سامنے آجائے تو لوگ تماشا تو دیکھیں گے۔"

"آصفہ بھابھی! آپ ایسی تو نہیں تھیں۔ وہ مروت، وفا، ایثار، سب کیا دکھاوا تھا۔ جب وقت پڑا تو آپ نے تو کوئی چیز اپنی پٹاری سے نہ نکالی۔" روحیل نے بھی کہہ دیا۔

"مروت، وفا، ایثار! بس عورت سے آپ لوگ یہی توقع کرتے ہیں۔ بدلے میں چاہے اسے کچھ نہ ملے دکھوں کے سوا۔ دیکھیں ہر حال میں وہاں پڑی ہوئی تھی آپ کے گھر میں حتیٰ کہ آپ کی ماں نے میری اور میرے بچے کی جان تک لینے کی کوشش کی، حرف شکایت زبان پر نہ لائی۔ میرے گھر، زیور، میری عزت نفس، کوئی چیز اس گھر میں میری نہ تھی۔ میں سب سہہ گئی لیکن جب آپ کے بھائی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے گھر سے باہر نکالا تو میں نے کہہ دیا تھا کہ اب اس کے بلانے پر بھی نہ جاؤں گی۔ اپنی مرضی ہوگی تو پلٹوں گی۔ میرے اندر سے ساری مروت، ساری وفا اور محبت کو کھینچ کر آپ کے بھائی نے مٹی میں ملادیا۔ اس نے میری ایک نہ سنی، وہ جانتا تھا کہ میں غلط نہیں تھی۔ لیکن صرف اپنی بہن کی جھوٹی ضد، اپنی ماں کی انا پر اس نے مجھے قربان کرکے رکھ دیا، یہی سمجھ کر کہ ایک بے وقوف سی لڑکی ہے۔ دو دن بعد منانے جاؤں گا تو دم ہلاتی ہوئی میرے پیچھے چلی آئے گی۔

سچ ہے روحیل بھائی! ہم لڑکیاں اتنی ہی بے وقوف ہیں، ایک گھر کے لیے پتہ نہیں کیا کیا چھوڑنے پر راضی ہوجاتی ہیں۔ لیکن میرا وہ مان جو ٹوٹ گیا ہے کبھی نہ جڑے گا۔ مجھے اسی چیز سے وحشت تھی کہ میری داستان گھر گھر کہی جائے۔ میرے حال پر ہر کوئی آنسو بہائے۔ میرے دکھ کا ہر دیوار پر اشتہار لگا ہو۔ روحیل بھائی! مجھے اس چیز سے نفرت تھی، اس چیز سے بچنے کے لیے میں نے کبھی اپنی سگی ماں کو اپنے دکھ نہ بتائے، میرے دکھوں کو جان کر میرے باپ کا دل ویران ہوجاتا لیکن میں انہیں مطمئن کرتی رہتی۔

مگر اب سب ختم ہوگیا۔ میرا وہ مان جو ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگیا اسے آپ کا بھائی کبھی نہ جوڑ سکے گا اس کے گھر میں، میں نے بہت کچھ سہا اور اس نے سمجھ لیا کہ کھلی سڑک پر بھی جب چاہے وہ مجھ پر پتھر برسالے گا۔ اس نے غلط سمجھا، میں کوئی لاوارث اور گری پڑی لڑکی نہیں ہوں۔ اپنے گھر میں اس نے مجھے لاوارث بنادیا تھا۔"

اس کی آنکھوں سے قطار در قطار موتی کی لڑیوں کی طرح آنسو بہہ رہے تھے اور اس نے ان آنسوؤں کو نہ روکا۔

"تھوڑی دیر وہ دونوں ہی چپ رہے۔

"میں نے سوائے تایا جان کے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ لیکن میں کسی کو روک بھی نہیں سکتی۔ جب تک میں اس گھر میں تھی یہ سب میری اپنی باتیں تھی۔ اس گھر سے نکل گئی تو سب — کچھ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب کوئی ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے میں کچھ نہیں کرسکتی۔ ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑ رہی تھی۔

"آصفہ بھابھی سارا قصور میرے بھائی کا ہے تو اب اسے سزا بھی ایسی ہی مل رہی ہے وہ اتنا بے چین اور ادھورا ہے کہ آپ گمان نہ کرسکیں گی۔"

"اپنے بھائی کی وکالت مت کریں روحیل بھائی! اب میں اس بارے میں کچھ کہنا سننا نہیں چاہتی۔ کیا ضرورت ہے، اتنے لوگ کہہ سن رہے ہیں۔ میرے کچھ کہنے کی کہاں گنجائش ہے۔" اب اس کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ اپنا گھر چھوڑے ہوئے آج اسے آٹھ دن ہوگئے تھے اس نے سوچا تھا وہ بالکل نہ روئے گی۔ نہ اس بے وفا شخص کو یاد کرے گی۔ لیکن روحیل نے آکر اس کا عہد تڑوادیا۔

روحیل نے دروازے سے باہر جھانکا۔ شاید نوکرانی سامنے سے جارہی تھی۔

"سنو! ایک گلاس اور پانی کا جگ دے جاؤ۔" یہ وہی نوکرانی تھی جس نے امینہ بیگم کے کہنے پر روحیل کو آصفہ کے کمرے تک پہنچایا تھا۔ جب تک پانی آیا اور روحیل نے اسے گلاس تھمایا، تب تک وہ اسی جوش اور آواز کے ساتھ رو رہی تھی۔

"بس آصفہ بھابھی ختم کریں، پلیز چپ ہوجاؤ۔ آپ کے گھر والے مجھے نہیں چھوڑیں گے کہ ان کی بیٹی کو اس طرح رلادیا۔"

وہ بمشکل چپ ہوئی، ایک گھونٹ پانی پیا اور پھر اسے کچھ خیال آیا تو اٹھ کر واش روم کی طرف جانے لگی۔

"ایک منٹ، آپ بیٹھیں۔" وہ منہ دھو کر اچھی طرح چہرہ رگڑ کر تولیے سے خشک کیا۔ بالوں کو پھر سے کھول کر ہاتھ میں لپیٹتے ہوئے سخت سا جوڑا بنا کر کلپ میں ڈالتے ہوئے آئینے میں دیکھا۔

آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، باقی چہرہ ٹھیک تھا۔ سرسر کرتی ناک کو ٹشو پیپر سے پونچھ کر وہ باہر آئی۔

"سمیعہ تو پیچھے ہی پڑ گئی تھی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔" وہ بیٹھی تو روحیل نے بات بدلنے کے لیے کہا۔

"تو آپ لے آتے میرا خود اس سے ملنے کا اتنا دل چاہ رہا ہے میں تو روز آس لگاتی ہوں کہ شاید وہ فون ہی کرے۔"

"یہ آپ کی بھول ہے کہ وہ اسی سسرال میں رہ رہی ہے جہاں آپ رہ کر آئی ہیں۔" روحیل ہلکے سے مسکرایا۔

"لیکن میرے اور اس کے حالات میں فرق ہے۔"

"فرق نہیں ہے، فرق بنایا گیا ہے۔" روحیل نے کہا تو آصفہ نے بھی سر ہلادیا۔

آصفہ کے پاس وہ کافی دیر بیٹھا پھر جلال انکل اور

امینہ آنٹی سے بھی بات چیت ہوئی، لیکن آصفہ نے تو جتا ہی دیا تھا کہ اس کے موضوع پر بات نہ کی جائے۔ آنٹی اور انکل نے بھی یہی رویہ رکھا اور وہ ناکام ہی لوٹ آیا۔

"آپ کس طرح مانیں گی آصفہ!" اسلام آباد جانے سے ایک دن پہلے پھر روحیل نے اسے فون کیا۔

"آپ کیوں مجھے منانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی تو میں نے خود یہ کوشش نہیں کی۔" وہ ابھی تک اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔

"میں واپس جا رہا ہوں بھابھی! اور یقین کریں صرف اپنے بھائی کے لیے ہی تین دن کے لیے کراچی آیا تھا۔ اب ناکامی کا سوچ رہا ہوں تو بہت غصہ آ رہا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"بھائی کے لیے آپ کیا کر سکتے ہیں، ہر انسان کو اپنا گڑھا خود کھودنا پڑتا ہے۔"

"ایسی خطرناک باتیں نہ کرو۔"

"اک وقت میں یہ باتیں خطرناک لگتی ہیں اور دوسرے لمحے میں یہی حقیقت نظر آتی ہیں۔ خیر چھوڑیں۔ آپ ہنسی خوشی جائیں، کن چکروں میں پڑ گئے ہیں۔ ہم نے خود اپنی پروا چھوڑ دی ہے۔ آپ ہمارا غم نہ کریں۔"

وہ اسی طرح ظالم بنی رہی۔

"بھابھی! پھر میں شاید اگلے پورے مہینے نہ آسکوں گا۔"

"اوہ گاڈ تو پھر سمیعہ کو ساتھ لے جائیں نا"

"اس بار سوچا تھا کہ ساتھ ضرور لے جاؤں گا، لیکن یہاں حالات ایسے ہو گئے ہیں۔"

"اف حالات آپ کو لگتا ہے کہ حالات بدلیں گے بے چاری کو تنہا یہاں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔"

"ہاں وہ خود بہت اپ سیٹ ہے، لیکن خود ہی کہہ بھی رہی ہے کہ ابھی یہیں رہ جاتی ہوں اور وہ صرف بے چاری اکیلی یہاں تنہا نہیں ہے میں بھی بہت تنہائی محسوس کرتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"ارے آپ تو ویسی ہی زندگی گزار رہے ہیں۔ کام کاج اور بس کوئی فکر نہ فاقہ وہ بے چاری تو اپنا گھر، شہر اپنے سب لوگ چھوڑ کر آپ کے لئے یہاں چلی آئی ہے اور ستم یہ کہ آپ بھی یہاں نہیں ہیں۔"

"اچھا اس کی پروا کر رہی ہیں، سوچیں میں بھی شادی شدہ ہوتے ہوئے کنواروں جیسی زندگی گزار رہا ہوں۔ اب تو دوست بھی مذاق اڑاتے ہیں کہ شادی ہوئی بھی ہے یا یونہی ڈرامہ رچایا تھا۔" آصفہ ہنسنے لگی اور پھر چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

اس نے باتوں باتوں میں سب بتایا تھا کہ شرجیل اسے کتنا یاد کرتا ہے۔ کتنا پریشان اور دکھی ہے، نہ کوئی اس کے کھانے کی پروا کرنے والا ہے نہ رہنے کی۔

وہ چپ چاپ اپنے بستر پر چادر تان کر لیٹ گئی۔

شادی شدہ ہوتے ہوئے تنہائی۔ شرجیل بھی ایسی ہی زندگی گزار رہا تھا۔ جانے اس کا احساس بڑھ رہا ہو گا کہ ختم ہو رہا ہو گا۔

"محبت مٹ بھی تو جاتی ہے۔ وقت زیادہ گزر جائے تو ختم بھی ہو جاتی ہے۔ مادیت کا زمانہ ہے ہر چیز مایا ہے کسی شئے میں ٹھہراؤ نہیں۔ کسی شئے کو ابدیت نہیں ملی۔ پھر جذبے کہاں ہمیشہ رہ سکتے ہیں۔"

روحیل کا کہنا ہے، وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ اسے خود اپنی محبت کی سمجھ نہیں ہے، اگر سمجھ لے تو جنت جیسا ایک محل بنا کر تمہیں اس دنیا میں ہی جنت جیسی جگہ پر رکھے۔

☆ ☆ ☆

سمیعہ فون پر اپنی ماں سے بات کر رہی تھی کہ عالیہ بیگم ٹھٹک گئیں، اس کی ایک بات پر ان کے قدم رک گئے۔

"میری طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ ڈاکٹر کو دکھا دیا ہے، کل رپورٹ ملے گی۔"

وہ اتنی حیران ہوئیں۔ سمیعہ اچھی خاصی چالاک تھی۔ وہ کب ڈاکٹر کے پاس گئی اس کی طبیعت کی گرانی، انہیں کچھ نظر کیوں نہیں آیا عالیہ بیگم کو اتنا شاک لگا کہ وہ اپنے کمرے میں دو گھنٹے تک بیٹھی الجھتی ہی

رہیں۔ سوچتی ہی رہیں۔

ان کے دل سے حسد' ان کے ذہن سے رقابت اور ان کی روح سے شیطانیت کو کوئی الگ نہیں کر سکتا تھا۔ عجیب طرز پر وہ سوچتی تھیں کہ ان کے بچے صرف ان کی طرف مائل رہیں۔ کسی اور طرف نہ سوچیں اور بچہ ہو گیا تو شرجیل کی طرح رو حیل بھی بیوی کی محبت میں ایسا الجھے گا کہ پھر نکل ہی نہ سکے گا۔

جیسے شرجیل آصفہ کے غم میں ماں کو بھلا بیٹھا ہے۔ ماں کے کہنے میں آکر بیوی کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ وہ سوچ سوچ کر اتنا ہلکان ہوئیں کہ سر دکھنے لگا۔

پھر وہ کمرے سے باہر نکلیں تو ان کے دماغ میں ایک خیال جم سا گیا تھا۔

"خیریت تو ہے امی جان! آپ بے وقت لیٹی ہوئی ہیں۔" سمیعہ نے انہیں دیکھا تو پوچھا۔

"بس بیٹا ذرا طبیعت بوجھل سی ہو گئی تھی۔ سر درد کی گولیاں منگوا لینا حبیب خان سے۔"

"جی اچھا امی! کھانا لگا دوں؟"

"ہاں لگا دو۔ اب بھوک بھی لگنے لگی ہے۔"

ان کا لہجہ سمیعہ کے ساتھ بیٹھا اور نرم ہو گیا۔ سمیعہ بھی ان کے مزاج کے مطابق چلتی۔ وہ چاہتیں تو ان سے ڈھیروں باتیں کر لیتی۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر وقت گزارتی۔ ان کے ساتھ کھانا کھاتی چائے پیتی۔ جب ان کا مزاج اچھا نہ ہوتا تو وہ اس سے بات نہ کرتیں۔ کوئی کام نہ بتاتیں۔ اکثر تو کھانا اور چائے بھی الگ بیٹھ کر پی لیتیں۔ وہ برا نہ مانتی اکثر برا بھی نہ کرتی کیونکہ یہ سب کچھ رو حیل کی بتائی ہوئی اور سمجھائی ہوئی باتیں تھیں۔

اب ان کا مزاج اچھا بلکہ اسے لگا بہت دنوں بعد کچھ زیادہ اچھا ہو گیا تھا تو وہ بھی ان کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ آخر وہ بھی تنہائی کی ماری تھی۔ اپنے شوہر' میکے دوستوں سب سے دور۔

سچ تو یہ ہے کہ نا کہ انسان ہی انسان کا دوست' ساتھی' رفیق اور وقت پڑنے پر وقت گزار اس سے بہتر کوئی ہو ہی نہیں سکتا' سمیعہ بھی یہی سمجھ کر ان کی باتوں اور لہجے میں پھنس گئی۔

اس نے بات بات میں انہیں ہمدرد تو بنا لیا لیکن عالیہ بیگم الجھ رہی تھیں کہ اچانک ایک سرا سجھائی دیا۔

صبح وہ ہلکے ہلکے پیٹ میں درد کا ذکر کر رہی تھی۔ پھر ناشتہ بھی ڈھنگ سے نہ کیا۔ دوپہر تک وہ پیٹ کے درد سے اتنا بلبلائی کہ گھبرا کر عالیہ بیگم کی دی ہوئی دو گولیاں پانی کے ساتھ نگل لیں۔

"پھر بھی طبیعت ٹھیک نہ ہوئی تو شام کو ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔" عالیہ بیگم نے اس سے ہمدردی ظاہر کی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی تھیں' اس دوا سے مجھے کچھ فائدہ ہوا ہے۔" سمیعہ کچھ سمجھ نہ سکی پھر عالیہ بیگم نے اتنا اچھا کردار ادا کیا چند میٹھی باتیں اور کیں۔ رات تک اس کے پاس بیٹھی رہیں کہ اگلی صبح اس نے پھر ذرا سے پیٹ درد پر دو گولیاں اور کھالیں۔

اور دوپہر تک اسے ڈاکٹر کے پاس بھاگنا ہی پڑا۔ اس کا پیٹ قطعی طور پر ٹھیک ہو گیا' قے اتنی ہوئی اور بوجھ جو ہلکا ہو گیا۔

ڈاکٹر کے پاس عالیہ بیگم لے گئی تھیں۔ اس نے کچھ بتایا لیکن اگلے دن اپنے ڈاکٹر سے تصدیق کروا کر سمیعہ کو بات سمجھ میں آگئی۔

اس کو اپنی بے وقوفی اور عالیہ بیگم کی بے وردی پر شدید صدمہ ہوا لیکن صحیح معنوں میں وہ اس وقت مکمل طور پر بے بس تھی۔

آخری قسط آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

تنہائی بچھ گئی تھی سبھی راستوں کے بیچ
اک شخص کھو گیا تھا کہیں قافلوں کے بیچ

وہ آخری وصال تھا اور شام تھی اُداس
پھر چاند چھپ گیا تھا کہیں بادلوں کے بیچ

آہٹ بھی گھر میں ہوتی رہی اور وہ دُور تھا
کوئی چھپا ہوا تھا میری دھڑکنوں کے بیچ

سوچتی ہوئی دُعاؤں کو خوابوں کو کیا کریں
بچھڑے ہوئے ملے ہوں اگر محفلوں کے بیچ

آنکھوں میں جل اُٹھے کئی جگنو شبِ فراق
اور چہرے چھپ گئے تھے انہی جگنوؤں کے بیچ

ہم تم اَنا پرست تھے زندہ ہی مر گئے
کس کا قصور تھا نہ کھلا فیصلوں کے بیچ

آؤ یہیں پہ ختم کریں سب معاملے
چھوٹا سا اک گریز ہے اب چاہتوں کے بیچ

تاجدار عادل

مسافر اب لوٹ بھی آئے اگر

خوابوں کے نگر کو کھو کر
اک محبت بھرا دل
ہجر کے درد میں ڈبو کر
دور دیس کو جانے والا
وہ مسافر اب لوٹ بھی آئے اگر
تو محبت کی بستی میں اجنبی ہی رہے گا
جو دردِ نارسائی کسی کو بخش گیا تھا
اُسی درد کو اب خود بھی سہے گا

انیلا شمیم کرن

ملے ہو جب سے تم سب دُکھ فسانے ہو گئے ہیں
ہماری زندگی کے دن سُہانے ہو گئے ہیں

بہت دُھندلا گئے اس کے بدن کے زاویے بھی
اسے دیکھے ہوئے اب تو زمانے ہو گئے ہیں

جہاں پر سادہ لوگوں کی کچی بستیاں تھیں
وہاں اب دُور تک بس کارخانے ہو گئے ہیں

بہت مصروف ہو کر رہ گئی ہے زندگی بھی
نہ ملنے کے بھی اب لاکھوں بہانے ہو گئے ہیں

چلو تجدید کر لیں پھر سے ہم نایابؔ مل کر
محبت کے سبھی قصّے پُرانے ہو گئے ہیں

سیّد اطہر علی نایابؔ

قرض

کچھ خواب ہیں جن کو لکھنا ہے
تعبیر کی صورت دینی ہے
کچھ لوگ ہیں اُجڑے دل والے
جنہیں اپنی محبّت دینی ہے
کچھ پھُول ہیں جن کو چُننا ہے
اور ہار کی صورت دینی ہے
کچھ اپنی نیندیں باقی ہیں
جنہیں بانٹنا ہے کچھ لوگوں میں
اُن کو بھی تو راحت دینی ہے
اے عمرِ رواں!
آہستہ چل
ابھی خاصا قرض چُکانا ہے

اعتبار ساجدؔ

شگفتہ جاہ

رنگا رنگ پھول

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جو شخص محتاج ہو کر اپنی ضرورت کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی لیکن جو شخص اس کو اللہ کے سامنے پیش کرتا ہے تو ممکن ہے اللہ اس کو بے نیاز کردے، خواہ مرگ ناگہانی کے ذریعے خواہ فوری مال کے ذریعے سے۔"

(ابوداؤد)

خلیل اللہ بننے کا سبب،

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا گیا "اللہ نے آپ کو کس سبب سے خلیل بنایا۔؟"

آپ نے جواباً فرمایا۔ "تین باتوں کی وجہ سے۔

1۔ میں نے ہمیشہ اللہ کے حکم کو دوسروں کے حکم پر ترجیح دی جہاں کہیں اللہ اور غیر اللہ کے مابین تصادم ہوا تو اس وقت میں نے اللہ ہی کو اختیار کیا۔

2۔ جس چیز کی خود اللہ تعالیٰ نے ضمانت لی ہے، اس کے متعلق میں نے کبھی فکر و تردد نہیں کیا۔

3۔ کبھی مہمان کو ساتھ لیے بغیر میں نے کبھی کھانا نہیں کھایا۔"

نسیم ناز۔ ڈوگہ

حروف دانش،

- جو لوگ آپ سے اختلاف رکھتے ہیں ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں، پریشان تو ان لوگوں کے بارے میں ہوں، جو آپ سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن ان میں یہ بتلانے کی جسارت نہیں ہوتی۔
- گمنامی کو پسند کرو اس میں ناموری کی نسبت بہت امن ہے۔
- اپنی زبان سے اپنی تعریف کرنا اپنی طرف سے لوگوں کا خیال خراب کرنا ہے۔
- اگر تنقید اصلاح کی غرض سے ہو تو وہ قابل تقلید ہوتی ہے۔
- ضرورت میں انسان جو وعدہ کرتا ہے، وہ بہت کم پورا کرتا ہے۔
- کام کو جلد کرنے کے بجائے بہتر سے بہتر انجام دینے کی کوشش کرو۔ لوگ یہ نہیں پوچھیں گے کہ کتنے وقت میں کام کیا ہے۔ وہ تمہارے کام کی عمدگی کو دیکھیں گے۔
- یہ ہماری آنکھیں نہیں بلکہ دوسروں کی آنکھیں ہیں، جو ہمیں برباد کرتی ہیں۔ اگر سوائے آپ کے دنیا کے تمام لوگ اندھے ہوتے تو آپ کبھی بھی عمدہ لباس اور خوشنما سامان کی پروا نہ کرتے۔

آصفہ عنبرین قاضی۔ سرگودھا

پریشانی،

"بدقسمتی اور پریشانی کبھی کبھی بڑے عجیب انداز میں انسان پر حملہ آور ہوتی ہے۔" ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔

"کیوں۔ کیا ہوا۔؟" دوست نے دریافت کیا۔

"کل میں دس ہزار روپے کا ایک چیک کیش کرانے بینک گیا۔ بینک والوں نے کہا کہ اپنی شناخت کے لیے میں کسی سے گواہی دلوادوں کہ چیک پر جو نام لکھا ہے، وہ میرا ہی ہے۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ مجھے بینک میں شمیم صاحب نظر آگئے جو مجھے جانتے تھے۔"

"لیکن اس میں پریشانی اور بدقسمتی کی کیا بات ہے؟"

"میں شمیم صاحب کا دس ہزار روپے کا مقروض تھا اور گزشتہ ایک سال سے ان سے منہ چھپائے پھر رہا تھا۔"

حنا ممتاز صدیقی۔ کراچی

مت کرنا،

دشت عبرت سرا میں رہنا تو، سر سے سودا نکال کر رہنا
لوگ دشمن کہیں نہ ہو جائیں، کوئی ایسا کمال مت کرنا
رتجگوں کی رتیں تو خیر یونہی آتی جاتی ہیں پر یہ دھیان رہے
جاگنا بھی تو اس سلیقے سے اپنی آنکھوں کو لال مت کرنا

شنیلا رانی۔ واہ کینٹ

زیادہ سریلا،

جارج برنارڈ شا کے زمانے میں مشہور موسیقار لوئی آرمسٹرانگ کی بہت شہرت تھی۔ اور جارج اس سے جلتا تھا۔ ایک دن لوئی نے سوچا کہ جارج سے ملاقات کرنی چاہیے۔ چنانچہ وہ اس کے گھر پہنچا۔

اسے دیکھتے ہی جارج نے اپنا سر پکڑ لیا اور بہانا بنانے لگا کہ میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ لوئی آرمسٹرانگ نے ہمدردی سے کہا۔

"کیا میں آپ کے سر درد کو دور کرنے کے لیے کوئی دھن سناؤں؟"

"نہیں نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری دھن سے زیادہ سریلا تو میرا سر درد ہے۔"

صائمہ سلیم۔ کراچی

کلام معتبر،

☆ مذاق کا لطف کہنے والے کی بات سے زیادہ سننے والے کے کان میں ہوتا ہے۔

☆ محبت کی شناخت یہ ہے کہ ہر اس چیز سے دور ہو جو دوست سے جدا کرنے والی ہے۔

☆ اگر تم اپنے دوست کی امداد یا اس کے دکھ کو برداشت نہیں کرنا چاہتے تو دوست سے اس کی حالت ہرگز دریافت نہ کرو کیونکہ یہ منافقت ہے۔

☆ سچا دوست وہ ہے جو آپ کی کمزوریوں سے واقف ہے لیکن آپ سے محبت کرتا ہے۔

☆ ضروری نہیں کہ چھوڑ کر جانے والے بے وفا ہوں اور جو آپ کے پاس ہے وہ آپ کا اپنا ہو۔

☆ لوگ ہمیں تکلیف نہیں دیتے۔ ان سے وابستہ ہماری امیدیں ہمیں دکھ دیتی ہیں۔

☆ انا ایسی چیز ہے جو ان لوگوں سے جدا کر دیتی ہے جو ہمیں بہت عزیز ہوتے ہیں۔

آصفہ۔ سرگودھا

مشکل شلث،

ہالی ووڈ کی سب سے مشکل شلث جو ابھی تک حل نہیں ہو سکی۔ وہ یہ ہے کہ وہاں کی ایکٹریس لباس، کار، اور شوہر میں سے کون سی چیز سب سے پہلے تبدیل کرتی ہے۔

ندا یوسف۔ کراچی

جواب،

ناصر زیدی ایک محفل میں افتخار مجاہد کے کان کھا رہا تھا۔

"فلاں صحافی بک گیا۔ فلاں نے اپنے قلم کی حرمت کا سودا کیا۔ اس نے فلاں منفعت کے بدلے اپنا قلم فروخت کر دیا۔ غرض ہر صحافی اور ادیب بک گیا ہے لیکن میں کبھی فروخت نہیں ہوا۔"

"یار! تم جس پرچے میں لکھتے ہو، وہ پرچا کبھی فروخت نہیں ہوا۔ پھر تم کیسے فروخت ہو سکتے ہو۔" افتخار مجاہد نے برجستہ جواب دیا۔

صائمہ جبیں۔ کراچی

سچ کہہ رہے ہیں،

- ہر نوجوان شاعر ہوتا ہے۔ اصول پرست، راست باز تصورات پر مرمٹنے والا اگر بدقسمتی سے دنیا کا نظام شاعر نہیں سیاست دان چلا رہے ہیں۔
- سب اپنے اپنے نقطہ نظر سے حق بجانب ہوتے ہیں۔ یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔
- امن کی یادگار قائم کرنے کے لیے جنگ ضروری ہے۔
- کاش میرا بیٹا غبی اور کند ذہن نکلے تاکہ کسی صوبے کا گورنر یا وزیر بن جائے۔ میں تو اپنی قابلیت اور ذہانت کے باعث مفلس اور ذلیل ہوں۔

(چینی عالم)

- مجھے اعتدال پسندوں سے نفرت ہے اور انتہا پسندوں سے محبت۔ اعتدال پسندوں نے کامیابی اور ناکامی کے درمیان وہ راہیں تلاش کر رکھی ہیں جو گمنامی کے گڑھے میں لے جاتی ہیں۔

(خلیل جبران)

نرگس غزل۔ کوٹلہ ادب علی خان

حق اور خونی رشتہ

مدینہ منورہ کی شام تھی۔ چند ایک صحابہ کرامؓ آپس میں بیٹھے جنگِ بدر کے واقعات دہرا رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور اُن کے بیٹے عبدالرحمٰن بھی تشریف فرما تھے۔ بدر کی لڑائی میں بیٹا کفار کی جانب سے لڑا تھا۔

عبدالرحمٰنؓ نے کہا۔

"ابا! کئی دفعہ آپ میری تلوار کی زد میں آئے مگر میں گھوڑے کی باگ موڑ لیتا اور دوسری طرف چلا جاتا۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جوش میں آکر فرمایا۔

"بیٹا! اگر تم میری تلوار کی زد میں آتے تو والد میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا۔ ہم حق پر تھے اور تم باطل پر تھے۔ حق کو خونی رشتے پر فوقیت حاصل ہے۔"

نسیم ناز۔ ڈوگہ

فرار

جب بھی گئے عذاب در و بام تھے وہی
آخر کو کتنی دیر سے گھر جانا چاہیے

قرۃ العین کیانی۔ لاہور

وجہ

مشہور فلم ڈائریکٹر ولیم وائلر سے کسی نے پوچھا۔

"آپ کو سب سے زیادہ کس چیز نے فلموں کی طرف راغب کیا؟"

"فلم ایکٹرسوں نے۔" ولیم وائلر نے جواب دیا۔

کرن شفیق۔ کراچی

پختہ عزم

اسٹاک ہوم میں سرکاری اسپتال کا سرجن جنرل کئی آپریشنوں کے بعد ایک مریض کے پیٹ سے چائے کے انتالیس چمچ اور دو پنسلیں نکال چکا تو اسے پتا چلا کہ اس کا مریض پیٹ کے پچاس آپریشن کرانے کا ریکارڈ قائم کرنے کے چکر میں ہے۔ اس وقت وہ بتیس آپریشن کرا چکا ہے۔

نیلب مغل۔ کھاریاں

دُنیا

حضرت جبرائیلؑ نے حضرت نوحؑ سے پوچھا۔

"اس طویل و دراز عمر کے دوران آپؑ نے دُنیا کو کیسا پایا؟"

آپؑ نے جواب دیا۔ "میرے نزدیک دُنیا اس گھر کی مانند تھی جس کے دو دروازے ہوں کہ ایک سے داخل ہوا اور دوسرے سے باہر نکل آیا۔"

ایک مرتبہ حضرت عیسیٰؑ سے درخواست کی گئی۔

"ہمیں کوئی ایسی بات سمجھا دیں کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔"

فرمایا۔ "دُنیا کو دُشمن رکھو۔ اللہ تعالیٰ خود بخود تمہارا دوست بن جائے گا۔"

عنبر نوشین۔ گوجرانوالہ

اندازِ بیاں

مصر کے ایک بادشاہ کو کبوتر بازی کا بہت شوق تھا۔ ہر سال اُڑان کا مقابلہ ہوتا تھا۔ مگر خوف کے مارے کوئی شخص مقابلے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک سال ایک باہمت کبوتر باز نے دائمی مصر سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ بادشاہ کو یہ بات ناگوار گزری۔ مگر اصولی طور پر اسے مقابلے کے لیے آمادہ ہونا پڑا۔ مقابلے کی شرط یہ تھی کہ جس کا کبوتر طے شدہ مقام پر پہلے پہنچے گا وہی بازی جیت جائے گا۔

دائمی مصر نے مقابلے کی نگرانی کے لیے اپنے وزیر کو بھیجا اور ساتھ یہ حکم بھی صادر کر دیا کہ وہ جلد از جلد ستاروں سے آگاہ کرے۔

مقابلہ شروع ہوا۔ مصر کے گمنام باشندے کا کبوتر بہت زیادہ تیز رفتار تھا۔ اس لیے وہ بادشاہ کے کبوتر سے پہلے منزلِ مقصود تک پہنچ گیا۔ وزیر بہت پریشان ہوا۔ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ بادشاہ کو شکست کی خبر کیسے دے۔ اتفاق سے وہاں ایک ذہین شخص بھی موجود تھا۔ اس نے وزیر سے کہا کہ بادشاہ کو نتیجے سے آگاہ کرنے کے لیے یہ عبارت لکھ کر بھیج دی جائے۔

"آپ وہ بادشاہ ہیں، جس کی خوش قسمتی ہر شخص کی تقدیر پر غالب رہتی ہے۔ اس مقابلے میں آپ ہی کا پرندہ فاتح قرار پایا اور وہ اس طرح اپنی منزل تک پہنچا کہ اس کے آگے ایک خدمت گزار کبوتر نقیبِ شاہی کی مانند آواز دیتا ہوا

چل رہا تھا۔"

نمرا اقراء۔ کراچی

اقوالِ شیخ سعدیؒ

- عالم بے تقویٰ ایسے ہے جیسے مشعل ہاتھ میں رکھتا ہو لیکن اندھا ہے
- وہ جھوٹ جس میں صلح اور اصلاح کی آمیزش ہو اُس سچ سے بہتر ہے جو فساد برپا کرے۔
- دُنیا سے نابود بھی ہو جائے تو پھر بھی کوئی اُترکے سائے تلے آنا پسند نہ کرے گا۔
- کانٹا لاکھ پھولوں میں رہے پھول نہیں بن سکتا۔ یعنی بداصل سے بھلائی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔
- میٹھے پانی کے چشمے پر چرند پرند، جانور اور انسان سب ہی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔
- طاقت کسی قانون اور قاعدے کی پابند نہیں ہوتی نہ آگے دیکھتی ہے اور نہ ہی پیچھے دیکھتی ہے۔
- عود کی خوشبو ڈبے میں بند رکھنے سے نہیں جلانے سے پھیلتی ہے۔
- شیر چاہے کتنا ہی بھوکا کیوں نہ ہو گھاس نہیں کھاتا۔ کوتر کینی۔

امّی

شکیلہ اسکول میں بس اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ ایک خوبرو نوجوان آیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھ سے اظہارِ عشق کرنے لگا۔"

جمیلہ! "ہائے اللہ تم نے اسے ڈانٹا نہیں۔ خاموش ہونے کے لیے نہیں کہا۔"

شکیلہ: "نہیں تمہیں تو معلوم ہے امّی نے مجھے اجنبی لڑکوں سے بات کرنے سے سختی سے منع کیا ہوا ہے۔"

رمشاہ روشن۔ کراچی

قوتِ ارادی

دو دوستوں کی کافی عرصے بعد ملاقات ہوئی تو ایک نے دوسرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ بدلے بدلے سے دکھائی دے رہے ہو۔ کیا بات ہے؟"

"دراصل میں نے شراب، جوا اور عورتوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیا ہے۔" دوسرے دوست نے جواب دیا۔

"اوہ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم زبردست قوتِ ارادی کے مالک ہو۔" پہلے دوست نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ حرکتیں چھوڑنے کے لیے بڑی قوتِ ارادی کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"قوتِ ارادی کا تو مجھے پتا نہیں۔ مجھے تو یہ حرکتیں اس لیے چھوڑنی پڑیں کہ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔" پہلے دوست نے سادگی سے جواب دیا۔

فوزیہ۔ نادیہ۔ کراچی

امریکی طریقہ

جب اوپیک نے تیل کی قیمتوں میں اضافہ کیا تو ایک امریکی ان کے ہیڈ کوارٹر پہنچا اور قیمت بڑھانے پر سخت احتجاج کیا۔ اوپیک کے ترجمان نے دلائل دے کر بتایا کہ ترقی یافتہ ممالک نے اپنی مصنوعات میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے اس لیے تیل کی قیمت میں اضافہ ناگزیر تھا۔"

امریکی نے ساری تقریر سننے کے بعد کہا۔

"آپ کو امریکی طریقہ استعمال کرنا چاہیے تھا۔"

"وہ کیا؟" اوپیک کے ترجمان نے کہا۔

"تیل کی قیمت وہی رکھتے اور لیٹر کے سائز میں کمی کر دیتے۔"

بینش۔ کراچی

وجہِ گریہ

دُلہن کی رُخصتی کے موقع پر ایک لڑکی بُری طرح رو رہی تھی۔ شادی میں موجود ایک عمر رسیدہ خاتون سے اس کا رونا نہ دیکھا گیا تو اُسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"ارے تم کیوں رو رہی ہو۔ شادی تمہاری تو نہیں ہو رہی ہے۔"

"اسی وجہ سے تو رو رہی ہوں۔" لڑکی نے جل کر جواب دیا۔

مدیحہ یوسف۔ کراچی

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

انعم خان لاشاری ______ اوکاڑہ
اب نہ ہم میں ہمت ہے نہ بازوؤں میں سکت
اب کے مقابلے میں میرے یار آ گئے

صائمہ جبیں ______ کراچی
چشم تم محو اس کی زیارتوں میں ہے
اک شبیہہ محفوظ مری بصارتوں میں ہے
یاد ہے آج تک اس کی پہلی گفتگو بھی
لہجے کی بازگشت ان سماعتوں میں ہے

مریم سلیم ______ خانیوال
نہ میرے قلم سے لکھی گئی نہ میری زباں سے ادا ہوئی
جو نظر سے کہنے کی بات ہے کسی حرف میں نہ سمائے گی
کوئی پھول چنتا ہے کس طرح، کوئی دھول ہوتا ہے کس طرح
یہ وقت وقت کی بات ہے تجھے زندگی بتائے گی

کوثر کیفی ______ کراچی
روح جلتی ہے مگر تیری انا کی خاطر
ہم نے فرقت میں تیری زخم بہت کھائے ہیں
زندگی بوجھ ہے، سانسوں میں تھکن ہے پھر بھی
سر جھکائے تیرے در پہ ہمدرد چلے آئے ہیں

شائستہ جبیں ______ کراچی
کسی اور کو میرے حال سے کوئی غرض ہے نہ کوئی واسطہ
میں بکھر گیا ہوں سمیٹ لو، میں بگڑ گیا ہوں سنوار دو
تمہیں صبح کیسی لگی کہو میرے خواہشوں کے دیار کی
جو بھلی لگی تو یہیں رہو، اسے چاہتوں سے نکھار دو

دیویا سوتی ______ ٹنڈوالٰہیار
وہ نہیں ملتا ایک بار نہیں
اور یہ زندگی دوبارہ نہیں

فوزیہ ثمر ______ گجرات
جو میرا نصیب تھا مل گیا، جو چھنا ہے مجھ سے میرا نہ گیا
تیرا دل یہ رمز سمجھ گیا تو کوئی کمی نہ رلائے گی

ارم شمس ______ خانیوال
اسی آسماں کی چھت تلے
میرا آشیاں بھی اڑان بھی
تیری چشم خوش کی پناہ میں
میرے خواب بھی میرے مان بھی

انیس فاطمہ ______ پسرور
لوٹ آؤ اپنے شہر میں تاخیر نہ کرو
بچپن کی یادگار کی تحقیر نہ کرو
ان سے فضا میں رنگ ہوا میں کھنک سی ہے
اڑتے ہوئے پرندوں کو زنجیر نہ کرو

شمو ملتانی ______ لورالائی
کم نظروں کی اس دنیا میں دیر بھی ہے اندھیر بھی ہے
پتھرایا ہر دیدۂ پرنم دیکھنے والے دیکھتا جا

شگفتہ قاضی ______ چویلیاں
یہ خاموشی بھی ہماری انا کا پردہ ہے
سوال کرتے رہو اور جواب رہنے دو
سفر کا ساتھ ہے یہ منزلوں کا ساتھ نہیں
گزر ہی جائیں گے لمحے حساب رہنے دو

فرح تبسم ______ ٹوبہ ٹیک سنگھ
کیسے نکالیں سوچ سے خواب جسم کا حصہ ہے!!
وہ برسوں میں دھیرے دھیرے آنکھ سے دل میں اترا ہے
اس کے جانے سے تو سارا کھیل ہی ختم ہوا
اس نے پیار میں ساتھ ہمارے کیسا کھیل کھیلا ہے

فاخرہ طفیل ______ رحیم یار خان
اتنی کڑی مسافتوں کے بعد یہ کھلا
ہم جس طرف رواں تھے ادھر راستہ نہ تھا

فوزیہ فیض ______ سرگودھا
اے عدم تم کہاں سے سیکھے یہ جذبات کے آداب
تم تو ہر رنگ میں لگتے تھے بکھرنے والے

یاسمین نازش ______ چک نمبر 156 ش شاہ نکڈر
صبر کرتے تو لبِ یار کو وا ہونا تھا
حرفِ انکار سہی کچھ تو عطا ہونا تھا
اب یہی سوچ کر بربادیٔ دل پر چپ ہوں
رنگ تو اڑنا تھا، خوشبو کو ہوا ہونا تھا

سعدیہ ارشد ______ لاہور
تمہارے ہجر کی صدیاں تمہارے وصل کے دن
میں اس شمار سے نکلوں تو اور کچھ سوچوں
رچا ہوا ہے تیرا عشق میری پوروں میں
میں اس خمار سے نکلوں تو اور کچھ سوچوں

سعدیہ سرور خان ______ فیصل آباد
اے دوست کبھی نہ بھول سکی میں صلہ تیری بستی کا
میں تجھ سے دور رہوں کیسے تو حصہ میری ہستی کا
اے لوگو! نہ اصرار کرو، وہ مجھ سے مل نہ پلٹے گا
وہ چاند زمیں پر کیوں اترے وہ عادی ہے کب پستی کا

شائستہ الیاس ______ نیو ملتان
وہ شہسوار بڑا رحم دل تھا میرے لیے
بڑھا کے نیزہ زمین سے اٹھا لیا مجھ کو
مکان، کھیت سب ہی آگ کی لپیٹ میں تھے
سنہری گھاس میں اس نے چھپا دیا مجھ کو

شگفتہ ارم اعوان ______ سکندر پور
جو کو نہیں تو تجھ سے کیے ہوئے وعدے
ہم اپنے آپ سے اکثر نبھانے لگتے ہیں
عجیب کھیل ہے جلتے ہیں اپنی آگ میں ہم
پھر اپنی راکھ خود ہی اڑانے لگتے ہیں

عذرا سحر گیلانی ______ کراچی
اک عمر ہو گئی کہ دل کی کتاب میں
کچھ خشک پتیوں کے سوا کچھ نہیں رہا
جذبے تمام کھو گئے لمحوں کی دھول میں
اب دل میں دھڑکنوں کے سوا کچھ نہیں رہا

فوزیہ ثمر ______ گجرات
خوب ہوتا وہ اگر مجھ سے جدا ہو جاتا
بابِ فرقت کا نیا کھلتا، کیا ہو جاتا
کس قدر اس کے میں اوصاف لکھوں
وہ اگر مہرباں ہوتا تو خدا ہو جاتا

خالدانا ______ کراچی

ستم گر وقت کا چہرہ بہت ہے
جسے دیکھو، وہی تنہا بہت ہے
تمہیں آ کر بڑی وحشت ہو گی
میرے آنگن میں سناٹا بہت ہے

فریدہ فیض مغل ______ سیالکوٹ

شب اُترتی ہے تو یادیں بھی اُتر آتی ہیں
جس طرح چڑیاں کہیں دُور سے گھر آتی ہیں
روز لے جاتی ہیں اک خواب ہوائیں پھر
ایک ہی شخص کی دہلیز پہ دھر آتی ہیں

آصفہ عنبرین قاضی ______ سرگودھا

کیا بتاؤں تجھے کیسا ہے بچھڑنے والا
اک جھونکا ہے جو خوشبو سی اُڑا جاتا ہے
سعد اس سے میں گریزاں ہی رہا ہوں اکثر
وہ جو ملتا ہے تو امکان بڑھا جاتا ہے

ادم قیوم چودھری ______ حافظ آباد

پتا نہیں کہ جُدا ہو کے کیسے زندہ ہیں
ہمارا اس کا تعلق تو جسم و جاں کا تھا
ہم اپنے نام کے حصّے کو ڈھونڈتے ہی رہے
زمین کے پاس تو جو کچھ تھا، آسماں کا تھا

نوقیہ رباب چیمہ ______ بورے والا

میں تمام دن کا تھکا ہوا، تو تمام شب کا جگا ہوا
ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پر تیرے ساتھ شام گزار لوں
کئی اجنبی تیری راہ میں میرے پاس سے یوں گزر گئے
جنہیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی تیرا نام لے کے پکار لوں

اِرَم شہلا ______ لاہور

پلکوں کی باڑھ کے اُس طرف
نگاہوں کو لگا وہ اَن کہی کی طرح
پرت در پرت کھولنے پر بھی
محسوس ہوا وہ بند گلی کی طرح

ربیعہ ______ پونچھ آزاد کشمیر

پہلو میں ہم دل کو یوں شاد نہ رکھتے
کچھ لوگ جو محبت کا نگر آباد نہ رکھتے
کیسے ممکن تھا شب و روز کے جھمیلوں میں
اس یوم کی خاصیت ہم یاد نہ رکھتے

عظمیٰ، فوزیہ، نادیہ ______ کورنگی کراچی

میں خوش ہوا کہ لوگ اکٹھے ہیں شہر کے
باہر گلی میں شور تھا لیکن ہوا کا تھا
اُس کو غلافِ روح میں رکھا سنبھال کر
محسنؔ وہ زخم بھی تو کسی آشنا کا تھا

صائمہ بشیر ______ لاہور

اندھیری رات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
ہم اپنی ذات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
دُکھوں نے بانٹ لیا ہے تمہارے بعد ہمیں

فرزانہ سہیل ______ میاں چنوں

بھلا محبوب سو پردوں میں بھی کیونکر نمایاں ہے
ازل سے تا ابد دل کے، وہ کعبے کا خدا ٹھہرا
پلٹ کر ہر طرف سے کیوں نظر اس شخص پر ٹھہری
وفا کے سلسلوں کی وہ، مسلسل انتہا ٹھہرا!

صدف عمران ______ کے ڈی اے کراچی

تیری قربت میں گزرا ہوا ایک لمحہ ہے
اس لمحے سے زمانوں کا پتا چلتا ہے
دستکیں دے کے پلٹ جاتی ہیں کتنی یادیں
دل وہ دروازہ کہ برسوں میں کہیں کھلتا ہے

حمیرہ نبدین ______ ربوہ

آنکھوں میں ان کی ڈوب کے دیکھا ہے بارہا
جن کی تھی آرزو نہ وہ گہرائیاں ملیں
ناصر دلِ تباہ نہ ان کو دکھا سکا
ملنے کو بارہا اُسے تنہائیاں ملیں

دُرِ حنا شاہ ______ میانوالی

چلو اپنی بھی جانب اب چلیں ہم
یہ رستہ دیر سے سُونا پڑا ہے

صائمہ جیمی ______ کراچی

یہ نہ ہو کر شہر میں تنہائی کے مجرم ٹھہرو
دل ملے نہ ملے، ہاتھ ملاتے رہنا

فرحت اِشتیاق

اِدارہ

امتل کے اصرار پر اپنی گزشتہ اور موجودہ زندگی کا احوال لکھنے بیٹھی ہوں تو مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اپنے بارے میں کچھ لکھنا افسانہ اور ناول لکھنے سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ پھر بھی اس مشکل کام کو کسی نہ کسی طرح کر گزرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

میرے بچپن کا دور میری زندگی کا سب سے خوب صورت دور ہے۔ بچپن میں، میں بہت شرارتی اور لاابالی سی تھی۔ لڑکوں والے کھیل کھیلتی تھی، لڑکوں کی طرح کی شرارتیں کرتی تھیں۔ بہت موڈی اور غیر مستقل مزاج قسم کی لڑکی تھی۔ گھر کے کاموں اور ذمہ داریوں سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ امی میری شرارتوں، لاپروائیوں اور لاابالی پن سے عاجز رہا کرتی تھیں۔

ابو کی جاب اس قسم کی تھی کہ ان کی مختلف ممالک میں پوسٹنگ ہوتی رہتی تھی۔ اسی وجہ سے بچپن میں بہت سے ممالک میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ میری اسکولنگ تقریباً ساری ٹوکیو میں ہوئی۔ گھر کے کاموں میں جتنی نکمی، نالائق اور پھوہڑ تھی، پڑھائی میں اتنی ہی اچھی تھی۔ اپنے اسکول کے آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹس میں میرا شمار ہوتا تھا۔ اسکول میں ہمیشہ پہلی تین پوزیشنز میں سے ایک میری ہوا کرتی تھی۔

اسکول میں انگلش، باقی تمام جگہ Japanese، لیکن گھر پر ہم سب بہن بھائی اس بات کے پابند تھے کہ ہمیں آپس میں اردو میں بات کرنی ہے۔ اسکول سے آنے کے بعد روزانہ پابندی سے امی خود ہمیں قرآن شریف اور اردو پڑھایا کرتی تھیں۔

اپنے ملک اور رسم و رواج سے دور ہونے کے باوجود ہمیں ہمارے والدین نے کبھی ان سب سے دور نہیں ہونے دیا۔ بہت چھوٹی عمر میں ہمیں نماز کی عادت ڈلوائی گئی۔ نماز نہ پڑھنے پر امی، ابو سے سخت ڈانٹ پڑتی تھی۔ پاکستان سے ہر ماہ بڑی پابندی سے ہمارے پاس اردو کے مختلف رسائل آیا کرتے تھے۔ بچپن میں "ماہنامہ نونہال" میں سے خوب کہانیاں پڑھی ہیں۔ مطالعہ کا شوق امی، ابو سے وراثت میں ملا ہے۔ باقی تمام شوق وقت کے ساتھ بدلتے رہے مگر پڑھنے کا شوق زندگی میں کبھی کم نہیں ہوا۔

پہلی مرتبہ نو سال کی عمر میں، میں نے ایک کہانی لکھی تھی۔ اپنی وہ کہانی مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ کہانی وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی اس عمر میں لکھی جا سکتی تھی۔ نیک دل پری، خوب صورت شہزادی اور بہادر شہزادے والی کہانی۔ اپنی وہ کہانی میں بڑے شوق سے گھر والوں کو اور پھر اپنے دوستوں کو بھی پڑھوائی تھی۔

پھر اسی ایک کہانی پر بس نہیں کیا تھا۔ میں اکثر فارغ اوقات میں کہانیاں لکھا کرتی تھی۔ پھر اپنی لکھی ہوئی بہت ساری کہانیوں کو جمع کر کے میں نے انہیں ایک رسالے کی شکل دی تھی۔ ہر کہانی کے ساتھ اس سے مطابقت اور مناسبت رکھتی ہوئی رنگین تصاویر بنائی تھیں۔ بیچ میں نظمیں وغیرہ بھی خود لکھی تھیں۔

گیارہ سال کی عمر میں یہ میرا، میرے حساب سے بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اپنے اس رسالے کی شاعر، ادیب، ایڈیٹر اور پبلشر وغیرہ وغیرہ سب کچھ میں خود ہی تھی۔ اپنے اس کارنامے پر میں نے امی، ابو اور اپنے ٹیچرز سے بہت ساری شاباش وصول کی تھی۔

میرے میٹرک کرنے سے پہلے ہم کراچی واپس آگئے تھے۔ میٹرک میں نے کراچی سے کیا ہے۔ اسکول کے ان آخری سالوں ہی میں ڈائجسٹ پڑھنے کا چسکہ بھی پڑ چکا تھا۔ اخبار بھی بہت توجہ اور دلچسپی سے پڑھنے لگی تھی۔ ساتھ ساتھ موقع ملنے پر لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا تھا۔ اس وقت خود بھی نہیں پتا تھا کہ میں اس طرح سے کہانیاں کیوں لکھتی ہوں۔ بس لکھنے کو دل چاہتا اور میں کہانی لکھ لیتی۔

انٹر میں' میں نے اپنے لیے پری انجینئرنگ کا انتخاب کیا تھا۔ ہم بہن بھائیوں کا ہمارے والدین کے ساتھ ہمیشہ دوستوں جیسا تعلق رہا ہے۔ ہمیں اچھا' برا' صحیح اور غلط بتانے کے بعد ہمارے والدین نے یہ فیصلہ ہم پر چھوڑ دیا کہ ہم کس پروفیشن کی طرف جائیں گے۔ کس فیلڈ میں اپنا کیریئر بنائیں گے۔ باوجود اس کے کہ میں ایک ایسی فیلڈ کا انتخاب کر رہی تھی جس کی طرف لڑکیاں ذرا کم جاتی ہیں' پھر بھی امی ابو نے مجھے میری پسند کے مضامین اختیار کرنے کی مکمل آزادی دی۔

انٹر کے دو سالوں میں' میں نے بے تحاشا محنت کی۔ میری تعلیمی زندگی کے باقی تمام سال ایک طرف ہیں اور انٹر کے دو سال ایک طرف۔ اتنی بے تحاشا محنت صرف ایک مقصد کی خاطر تھی۔ NED یونیورسٹی میں ایڈمشن کی خاطر۔ NED میں ایڈمشن میری زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا۔ پھر وہ وقت آیا جب میرا یہ خواب پورا ہوا۔ میری بے تحاشا محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ انٹر میں میں نے اپنے پورے کالج میں ٹاپ کیا تھا۔

یونیورسٹی جا کر زندگی بالکل بدل گئی تھی۔ یونیورسٹی میں ہمارا چار دوستوں کا گروپ تھا۔ ہر اسائنمنٹ اور ہر پروجیکٹ ہم لوگ ساتھ مل کر کرتے تھے۔ ان چار سالوں میں ہم چاروں نے کراچی کی خاک بھی خوب چھانی۔ اپنے اسائنمنٹس اور پروجیکٹس کے لیے خوب مارا مارا پھرنا پڑتا تھا۔ کبھی Theory of structures اور RCC کے اسائنمنٹ کے لیے کسی کنسلٹنگ فرم میں جا رہے ہیں' کبھی Transportation پروجیکٹ کے لیے شاہراہ فیصل اور جناح ٹرمینل کے آس پاس بسوں' گاڑیوں' ٹیکسیوں اور موٹر بائیکس کی گنتی کر رہے ہیں' کبھی Engineering Construction کے پروجیکٹ کے لیے بھری دھوپ اور گرمی میں روڈ بنواتے پھر رہے ہیں' کبھی Town Planning Architectuer کے اسائنمنٹ کے لیے کراچی کی قدیم عمارتوں کا سروے کرتے پھر رہے ہیں۔

ان سب مصروفیات کے ساتھ کچھ دیر کی فراغت ملنے پر کبھی کبھار پڑوس میں (کراچی یونیورسٹی) کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی چاٹ کھانے چلے جاتے تھے۔ کلاس میں ہم سب لڑکیوں کا ایک اور پسندیدہ کام ون ڈش پارٹیاں کرنا تھا۔ ہم ساری لڑکیاں یونیورسٹی کے لان میں بیٹھ کر ایسی پارٹیوں کو خوب انجوائے کرتے تھے۔ یونیورسٹی کی اتنی ساری خوب صورت یادیں ہیں کہ دل چاہ رہا ہے سب لکھتی چلی جاؤں۔ امتل کہیں کی کہ یا تو سرے سے لکھنے ہی سے انکار کر رہی تھی اور اب لکھنے پر آئی ہے تو بس ہی نہیں کر رہی' لہٰذا بات کو مختصر کرتی ہوں۔ مختصراً" یہ کہ یونیورسٹی کے چار سالوں میں اسائنمنٹس' ٹیسٹس' پروجیکٹس' Surprise quizzes اور Marks Sessiond کی فکر کرنے کے علاوہ دوسری کوئی فکر کرنے کا نہ ہوش تھا نہ وقت۔ ان سالوں میں سول انجینئرنگ سے متعلق کتابوں کے علاوہ دوسری کوئی کتاب نہیں پڑھی۔

فائنل ایئر کا امتحان دینے کے بعد میں نے Cad Auto 2D اور 3D کے کورسز کیے اس کے ساتھ ہی ایک مدرسہ سے تجوید کا کورس بھی کیا۔ تجوید سیکھنے

کے لیے جانے سے میری شخصیت میں بہت سی مثبت تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اپنے دین کی بہت سی ایسی باتیں وہاں جا کر پتا چلیں جن سے میں پہلے آگاہ نہیں تھی' قرآن شریف کو صحیح عربی تلفظ میں پڑھنا سیکھا۔ وہاں ایک بہت پیاری استاد سے ملی۔ ان سے بہت کچھ سیکھا۔

فردوس جہاں میری انتہائی قابل احترام استاد۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی پڑھی ہوئی' بے تحاشا علم اور ذہانت کے ساتھ ساتھ بہت خوب صورت دل کی مالک۔ جیسی اردو وہ بولتی ہیں کاش ویسی اردو مجھے لکھنی آجائے۔ اپنے اساتذہ کے ساتھ میرا ہمیشہ ایسا تعلق رہا کہ میں ان کی لاڈلی' چہیتی اور عزیز ترین شاگرد رہی ہوں۔ اسکول' کالج اور یونیورسٹی میں ہر جگہ مجھے میرے اساتذہ نے بہت چاہا' میری بہت حوصلہ افزائی کی' مجھے بے حد عزیز رکھا' مگر مس فردوس کے ساتھ میرا تعلق کچھ اور بھی گہرا اور مضبوط ہے۔ کتابوں کا ان کے پاس ایسا ذخیرہ ہے کہ کیا کسی اچھی سے اچھی لائبریری میں ہوگا۔ گھر پر ابو کے پاس کتابوں کا زبردست انتخاب ہے تو گھر سے باہر مس فردوس میرے مطالعہ کے شوق کو پورا کرنے کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

اس تمام عرصہ میں' میں اپنے بچپن کے لکھنے کے شوق کو بالکل بھول ہی گئی تھی۔ اور میں اپنے اس شوق کو بھولی ہی رہتی اگر "شعاع" میں افسانہ نگاری کے مقابلے کا اعلان نہ ہوتا۔ لکھنے کا شوق میرا بچپن کا شوق تھا مگر میں نے اسے کبھی اس انداز سے اہمیت دے کر نہیں سوچا تھا کہ مجھے باقاعدگی سے لکھنا اور اپنی تحریروں کو چھپوانا چاہیے۔ "شعاع" میں افسانہ نگاری کے مقابلے کے بارے میں پڑھ کر ایک دم ہی میرا دل چاہنے لگا کہ مجھے بھی اس مقابلے میں شرکت کرنی چاہیے۔ اپنا پہلا ناولٹ "خوشبو' بادل' چاند' ہوا" شعاع میں کیا پوسٹ کیا۔ میرا بچپن کا بچھڑا اور بھولا ہوا شوق یک دم ہی پوری طرح بیدار ہو گیا۔

اس ایک کہانی کو لکھنے کی دیر تھی۔ میں نے دھڑا دھڑ کتنی ہی کہانیاں لکھ ڈالی تھیں۔ "خوشبو' بادل' چاند' ہوا" شعاع کے بجائے خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔

پہلی تحریر شائع ہونے کی خوشی کیسی تھی؟

بہت سچی' بڑی بے ساختہ اور بالکل بچوں جیسی۔

میں نے زندگی میں دو ہی مرتبہ اتنے بچکانہ انداز میں خوشی کا بے ساختہ اظہار کیا ہے۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب NED میں ایڈمشن کے وقت میرٹ لسٹ میں اپنا نام دیکھا تھا اور دوسری مرتبہ خواتین ڈائجسٹ میں اپنی تحریر چھپی دیکھ کر۔ پھر لکھنے کا یہ شوق ہر گزرتے دن کے ساتھ بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی چلا گیا۔

B.E(civil) فرسٹ ڈویژن میں کرنے کے بعد مجھے ایک کنسلٹنگ فرم میں بطور جونیئر اسٹرکچرل انجینئر جاب مل گئی۔

پہلی ہی جگہ انٹرویو دینے گئی اور پہلی ہی جگہ جاب بھی مل گئی۔ مگر افسوس کہ میری غیر مستقل مزاجی نے مجھے زیادہ عرصہ ٹک کر جاب نہیں کرنے دی۔ بچپن کی سب بری عادتیں بڑے ہونے پر ختم ہو گئیں۔ نہیں ختم ہوئی تو میری غیر مستقل مزاجی' میری موڈی طبیعت جو یکسانیت سے بہت جلدی اکتا جاتی ہے۔ اپنی اس نیچر کے ساتھ میں اتنی پابندی اور مستقل مزاجی سے کیسے لکھ رہی ہوں' اس پر خود مجھے بھی بہت حیرت ہے۔

ابتدا میں جب میں نے لکھنا اور اپنی تحریریں شائع کروانا شروع کیا تھا تو میرا خیال تھا کہ یہ کچھ دنوں کا شوق ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں' میں اس کام سے بور ہو کر اسے چھوڑ دوں گی۔ مگر اب تک تو ایسا ہوا نہیں ہے۔ فی الحال تو بڑی مستقل مزاجی سے لکھتی چلی جا رہی ہوں۔ ان دنوں زندگی کا محور لکھنا اور پڑھنا ہی بنا ہوا ہے۔ مستقبل کی کچھ پلاننگز ہیں۔ مثلاً یہ کہ میں ایم بی اے کرنا چاہتی ہوں اور بھی کچھ کام ہیں جو میں کرنا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے پتا ہے کہ اگر میں نے آگے

پڑھنا یا کچھ اور کام کرنا شروع کیا تو لکھنا فوراً" چھوٹ جائے گا۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو ایک ہی وقت میں بہت سارے کام بہت اچھی طرح کر لیتے ہیں۔ اور ابھی میں لکھنا چھوڑنا نہیں چاہتی۔ میں اپنے لکھنے کو انجوائے کر رہی ہوں اور ابھی چند سالوں تک اسے اسی طرح انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ اسی لیے مزید تعلیم حاصل کرنے کے ارادے کو کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کر دیا ہے۔

میری صبح کا آغاز نماز سے ہوتا ہے۔ لکھنے کے لیے رات کا وقت میرے لیے بہترین وقت ہوتا ہے۔ بعض اوقات لکھتے لکھتے فجر ہو جاتی ہے۔ پھر نماز پڑھ کر سو جاتی ہوں۔

آپ اچانک میرے گھر آ جائیں تو آپ کو فرحت باورچن، فرحت ماسی، فرحت رائٹر، فرحت ٹیچر، فرحت انجینئر کسی سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔ میں کچن میں کچھ پکاتے ہوئے بھی نظر آ سکتی ہوں، گھر کو صاف کرتے اور سجاتے بھی نظر آ سکتی ہوں، کچھ لکھتے اور پڑھتے بھی نظر آ سکتی ہوں، چھوٹے بھائی اور بہن کی پڑھائی میں مدد کرتے ہوئے بھی نظر آ سکتی ہوں، کمپیوٹر پر کسی گھر یا بلڈنگ کی 2D یا 3D ڈرائنگ بناتے ہوئے بھی نظر آ سکتی ہوں۔ کھانا پکانے کا یہ حال ہے کہ کوکنگ کو اب میں باقاعدہ انجوائے کر رہی ہوں۔ پاکستانی کھانوں کے ساتھ ساتھ چائنیز اور اٹالین کھانے بنانے بھی سیکھ لیے ہیں، بیکنگ بھی سیکھ لی ہے۔ ابو کو میرے علاوہ کسی اور کے ہاتھ کی بنی کافی پسند نہیں آتی۔ اس عید پر شاہی ٹکڑے بنائے تھے اور وہ ایسے بنے تھے کہ ابو تک بھی نہیں بتا پائے تھے کہ یہ امی نے بنائے ہیں یا میں نے۔

مشاغل فی الحال تو میرے یہی ہیں کہ یا کچھ لکھوں گی یا کچھ پڑھوں گی۔ ایسا لگتا ہے کہ پڑھنے کے لیے اتنا کچھ ہے اور میں نے اب تک کچھ بھی نہیں پڑھا ہے۔ کتابوں کی دکان پر جانا، لائبریریوں میں جانا، بک فیئر میں جانا آج کل میری ہابی بنا ہوا ہے۔ کتابیں خریدنے کے لیے دل کھول کر پیسے خرچ کرتی ہوں۔ موضوعات کی کوئی قید نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں صرف فکشن پڑھوں گی، یا صرف کلاسک لٹریچر یا صرف انٹرنیشنل افیئرز یا صرف ہسٹری یا صرف انجینئرنگ سے متعلق کتابیں۔ میں ان سب موضوعات سے متعلق کتابیں یکساں دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ بس یوں سمجھیں کہ جو ہاتھ لگ جائے پڑھ لیتی ہوں۔

آج کل "حمیدہ اختر حسین رائے پوری اور Noam Chomsky" زیر مطالعہ ہیں میں نے اپنے گرد دوستوں کا ڈھیر نہیں لگا رکھا۔ میرے چند ہی دوست ہیں مگر وہ سب میرے بچپن کے اور نہایت مخلص دوست ہیں۔ میرے دکھ پر دکھی ہونے والے اور میری خوشی پر مجھ سے بھی زیادہ خوش ہونے والے دوست۔ کسی بھی مشکل میں ہر طرح میرے کام آنے والے دوست۔ اور یہ میری بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔

شاپنگز پر جانے اور شادیوں اور فنکشنز پر جانے کی میں اچھی خاصی چور ہوں۔ اکثر امی زبردستی ان جگہوں پر لے کر جاتی ہیں۔ ٹی وی بہت زیادہ نہیں دیکھتی۔ بس شام میں تھوڑی سی دیر۔ اچھی اور معیاری فلمیں دیکھنا پسند ہے۔ اسی وجہ سے نئی انڈین اور پاکستانی فلموں سے سخت قسم کی چڑ ہے۔ کسی کی وجہ سے مجبوراً" دیکھنی پڑ جائے تو بات دوسری ہے اپنی خوشی سے ایسی فلمیں کبھی نہیں دیکھتی۔

ہاں کرنٹ افیئرز سے متعلق پروگرام دیکھنا بہت پسند ہے۔ خاص طور پر ابو کے ساتھ بیٹھ کر۔ ابو اور میں اخبار کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد باقاعدہ مختلف خبروں اور آرٹیکلز پر تبصرہ کرتے ہیں۔

امی کے ساتھ روزانہ رات میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ واک ضرور کرتی ہوں۔ روز رات میں امی کے ساتھ واک کرنا میری بڑی پرانی عادت ہے۔ اس ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہم دنیا زمانے کا کوئی موضوع نہیں

چھوڑتے۔ امی کے ساتھ میری بے تحاشا انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ گھر سے باہر کہیں جاؤں تو گھر سے باہر پہلا قدم نکالنے سے لے کر واپس گھر میں قدم رکھنے تک کے دوران ہونے والی تمام باتیں جب تک من و عن امی کو نہ بتا دوں مجھے چین نہیں ملتا۔ امی کے ساتھ میں اپنی ہر بات شیئر کرتی ہوں۔

ابو کا رویہ ہم بہنوں کے ساتھ ایسا ہے کہ انہوں نے کبھی ہم سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی ہے۔ بیٹوں کے ساتھ وہ کبھی سخت لہجے میں بازپرس کر سکتے ہیں مگر ہم بہنوں کے ساتھ کبھی نہیں۔ ہم سے بات کرتے وقت ان کا ہر جملہ "بیٹا" سے شروع ہوتا ہے۔

رات میں میرا کچھ وقت انٹرنیٹ کے لیے ہوتا ہے۔ اس وقت دوسرے ممالک میں رہنے والے اپنے دوستوں کو E-Mails بھیجتی ہوں۔ اپنے لیے آئی تمام میلز پڑھتی ہوں۔ اس کے بعد پھر لکھنے بیٹھ جاتی ہوں اور اگر لکھنا نہ ہو تو کچھ پڑھتی ہوں۔

لکھنے کے سلسلے میں امی، ابو اور میری بڑی بہن نے میری سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ کسی بھی کام کو کامیابی کے ساتھ کرنے کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ کے قریب ترین آپ کی ہمت بڑھائیں اور حوصلہ دیں۔ میں اس معاملے میں بے حد خوش قسمت ہوں۔ مجھے میرے گھر پر وہ ماحول میسر ہے جو لکھنے کے لیے مجھے درکار ہوتا ہے۔

تو قارئین! یہ ہوں میں اور یہ ہے میری زندگی۔ خواتین ڈائجسٹ کے ان صفحات کے ذریعے جو مجھے آپ کے ساتھ مخاطب ہونے کا موقع فراہم کیا گیا ہے تو ان کے ذریعے میں آپ کے ساتھ چند باتیں اور بھی کرنا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ ابھی تک اپنی تحریروں کے حوالے سے میں نے کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام نہیں دیا ہے۔ میں نے اب تک ایسا کچھ نہیں لکھا جسے بہترین قرار دیا جا سکے۔ یہ انکساری ہے نہ کسر نفسی۔ یہ صرف اور صرف سچائی ہے۔ اس سب کے باوجود آپ سب جس طرح میری تحریروں کو سراہتے ہیں، مجھے اتنے خوب صورت تعریفی جملوں سے نوازتے ہیں تو یہ صرف آپ لوگوں کی محبت اور حوصلہ افزائی ہے۔ مجھ جیسی غیر مستقل مزاج لڑکی اگر اتنی مستقل مزاجی سے لکھے چلی جا رہی ہے تو اس میں مجھ سے زیادہ کمال آپ لوگوں کی اس محبت اور حوصلہ افزائی کا ہے۔ یہ پیار بھرے تبصرے اور یہ حوصلہ افزا آرا مجھے مزید لکھنے پر اکساتے ہیں۔ آپ سب کی یہ محبت میرے لیے بہت قیمتی ہے۔ ہمیشہ خوش رہیں اور مجھے بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ ☼

اس ماہ میں

سائرہ غلام نبی

اس ماہ کی غزل

دھوپ کی شدّت نے بدن کو جھلسا رکھا ہے' حلق خارزار بنا ہوا ہے۔ ان موسموں میں زندگی تپتی ہوئی ریت اور جھلسے ہوئے منظر میں تبدیل ہو گئی ہے۔ یہ شدّتیں' یہ تپش' ایک گہری معنویت کا استعارہ بھی ہیں اور پھر ان جھلستے ہوئے دنوں کے بعد ایک خوشگوار ٹھنڈک روح تک کو سرشار کردینے کو ہے۔ یہی اُمید اور خواب تو انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ دیکھیے اس موسم کو مظفر حنفی نے کیسا محسوس کیا ہے۔

اور کچھ دور پرِ ناں کر دھوپ میں
سایہ کرنے لگا ہے سفر دھوپ میں
میں مسافر نوازوں کا مارا ہوا
بیج بوتا رہا عمر بھر دھوپ میں
ایک دیوار پرچھائیاں کھا گئی
ہم بھٹکتے رہے دربدر دھوپ میں
اس نے اپنے لیے چاندنی کھینچ لی
اور مجھ سے کہا' عیش کر دھوپ میں
اوس ہے یا گہر خود ہی کھل جائے گا
ہم نے رکھ دی متاعِ ہنر دھوپ میں
ایک دریا تھا بہتا رہا سامنے
تشنگی کو نہ آیا نظر دھوپ میں
ہم کہ سورج زمیں پر لگاتے رہے
آخرش جل گئے بال و پَر دھوپ میں
اے مظفر یہ مقطع ردیفوں پہ ہے
بس اسی آنچ کی تھی کسر دھوپ میں

اس ماہ کا اقتباس

تاج محل کے بارے میں اتنا لکھا گیا ہے' ایسے ایسے انداز میں اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے' اتنی جزئیات' اتنی تفصیلات کے ساتھ اس کا منظرنامہ بنایا گیا ہے' اس کی تصویریں اتاری جاچکی ہیں۔ دیکھے بغیر اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔ سنا ہے' اس کو دیکھ لیا جائے تو بار بار دیکھنے کو جی کرتا ہے۔ بھارت میں لوگ اس عمارت کے ماڈل اور تصویریں بنا بنا کے بیچتے ہیں اور امیر کبیر بن گئے ہیں۔ محبوب کے مرقد پر بنے ہوئے اس مقبرے کی بہت صفات محبوبوں جیسی ہیں۔ نہ دیکھیں تو نہ دیکھیں' دیکھ لیں تو پھر بار بار بھی دیکھے بغیر جی نہ بھرے۔ میں اپنی کتنی جاننے والی لڑکیوں کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ تاج محل کی طرح ہیں۔ دیکھنے میں دلربائی کی آخری حد پر مگر اندر سے ایک قبر' جس پر ہر وقت تازہ قبر کا گماں لگے۔ اب جبکہ میں تاج محل دیکھے بغیر آگیا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ تاج محل دیکھنے کے لیے بار بار آگرہ جانے کی ضرورت نہ تھی۔ ایک نہیں' دو نہیں' کئی زندہ قبروں پر میرے خیالوں نے تاج محل تعمیر ہوتے دیکھا ہے۔ تاج محل بھی تو انجینئر بادشاہ شاہجہاں اور عظیم معماروں کے خیال کی تجسیم ہے۔ مزدوروں نے بھی یقیناً" بڑے شوق سے کام کیا ہوگا۔ یہ فن اور محبت کا مجسّمہ ہے۔ اس کے نظارے سے بھی وہی ترفع ملتا ہے جو کسی خوبصورت جسم کو دیکھ کر ملتا ہے۔ جسم جس میں روح بھی ہو۔ جس طرح تاج محل کے سینے میں ایک محبوب قبر ہے۔ قبریں دو ہیں جو دراصل ایک ہی قبر ہے۔ یہ قبر تاج محل کی روح ہے۔ صاحبہ قبر کی لافانی اور لاثانی محبت اس زندہ جاوید عمارت کا سبب بنی۔ ہر محبت جس طرح لافانی ہوتی ہے' لاثانی بھی ہوتی ہے۔ اس کی کیفیات اور اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ جس طرح آدمی دوسروں جیسا ہو کر بھی ان سے یکسر مختلف ہے' یہ شاہجہاں کی محبت کا کرشمہ بھی ہے۔ صرف یہ نہیں کہ اسے عمارتیں بنانے کی دھن لگی ہوئی تھی۔ رفیقِ حیات کی موت زندگی کی غلامی میں آئے ہوئے لوگوں کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دوسری'

تیسری' چوتھی شادی' بلکہ شادیاں۔ راجوں کے محل سراؤں میں رانیوں کی کمی نہ ہوتی تھی جو اپنی لونڈیوں سے بدتر زندگی بسر کرتی تھیں۔ حکمرانوں کے لیے خوبصورت عورتوں کی کمی نہ تھی پھر کوئی ایک چہرہ بادشاہ کی زندگی پر کیسے محیط ہو گیا۔ محبت جو کچھ بھی ہے بہت طاقت ور شے ہے۔ ہمارے ایک انقلابی شاعر تاج محل کو محبت کرنے والوں سے مذاق قرار دیتے ہیں مگر اس لازوال محبت کا خیال نہیں کرتے جس کی مثال کم کم ملتی ہے۔ کیا محبت اور وفا کوئی غیر انقلابی ادا ہے۔

(مندر میں محراب..... اجمل نیازی)

اس ماہ کا مجموعہ کلام

شعلۂ زن تھی آگ پر چلتی ہوئی
میں نے دیکھی روشنی جلتی ہوئی
خواب میں صورت گری کا اک سفر
آئینے میں شاعری پلتی ہوئی

معنی آفرینی' تہہ داری' ہم رنگی اور پھر زندگی کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کی خواہش مندی۔ غالب عرفان کی غزلیات میں صرف یہی نہیں بلکہ خواب' امید اور تمناؤں کا بحرِ بیکراں ان کے اشعار میں ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ زندگی کو براہ راست دیکھتے ہیں' مشاہدات سے تجربات تک پہنچتے ہیں' اپنے حساس دل میں لہو روتے ہیں اور پھر خواب کی دنیا میں اُمید کا ہاتھ تھامے نکل جاتے ہیں۔ یہی حساسیت' خواہشات اور تمنائیں ان کے اشعار میں جابجا نظر آتی ہیں۔ غالب عرفان کے تازہ ترین مجموعے "روشنی جلتی ہوئی" میں ان کا شعری سفر' مسافرت کے دکھ بھوگتا' آگے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے اور غالب عرفان اس مجموعے سے اپنی شناخت مستحکم کرتے نظر آتے ہیں۔

اس ماہ کا کالم

عالمی شہرت یافتہ فرانسیسی محقق ایلین بیلا فونٹے کے سنسنی خیز انکشاف نے دنیا میں تھرتھلی مچادی ہے کہ اگر گدھوں کی تین ٹانگیں ہوتیں تو اس سے یقیناً" ان کے دولتی مارتے وقت کنفیوژن پیدا ہوتا کہ اس عمل کے لیے وہ کون سی دو ٹانگیں استعمال کریں' اس لیے قدرت نے گدھے کو ایک ایکسٹرا ٹانگ دے کر چوپایہ بنادیا۔ البتہ کہیں کہیں دو ٹانگوں والے گدھے دیکھے جانے کی بھی اطلاعات ملی ہیں۔ اس بیان سے پاکستان دشمنی صاف عیاں ہے۔ ہمارے مبصرین کا خیال ہے کہ مذکورہ پروفیسر دراصل یہود و ہنود کی سازش کا آلۂ کار ہے۔ ایک صاحب نے ایک مقامی ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے واشگاف انداز میں متنبہ کیا کہ ہوسکتا ہے فرانسیسی انجینئروں کی دوسری ٹیم جو آبدوزیں بنانے میں پاکستان کی مدد کررہی ہے' اس کا بھی وہی حشر ہو جو پہلی کا ہوا تھا۔ سرحد اور بلوچستان کی اسمبلیوں نے بھی آئندہ فرانسیسی زبان میں کارروائی نہ کرنے کا متفقہ فیصلہ کیا ہے۔ کوفی عنان عنقریب پاکستان آکر اس کرائسس کو جو یورپ کی مکمل اقتصادی تباہی کا باعث بن سکتا ہے' سلجھانے کی کوشش کرے گا۔ آئی ایم ایف اور جی ایٹ کے ممبر ممالک خوف سے تھر تھر کانپ رہے ہیں کہ پاکستان غصہ میں آکر کہیں قرضے مانگنا بند نہ کردے۔

"کالم: یہ گدھے" (سرور سکھیرا)

اس ماہ کی کتاب

خواتین ڈائجسٹ اور شعاع میں شائع ہونے والے سلسلہ وار ناول قارئین میں بے حد مقبول ہوتے ہیں۔ سلسلہ وار ناولوں کی فضا و ماحول سے قارئین اس حد تک مانوس ہوجاتے ہیں کہ اس گھر اور کرداروں کو اپنے اردگرد دیکھنے لگتے ہیں اور جب یہ ناول اختتام کو پہنچتے ہیں تو ان کا اصرار ہوتا ہے کہ انہیں کتابی شکل میں شائع کیا جائے تاکہ وہ اس کو اپنے پاس محفوظ کرلیں۔ عاصمہ شاہد ڈائجسٹ کے حلقے میں بے حد معروف نام ہے۔ ان کا سلسلہ وار ناول "خوشبو ہے ہم سفر" کے نام سے "شعاع" میں شائع ہوتا رہا اور اسے بے حد پسند کیا گیا۔ یوں بھی عاصمہ شاہد عام گھریلو موضوعات کو نہایت دلچسپ اور شوخ انداز میں پیش کرتی ہیں کہ قارئین ان کی تحریر میں کھو جاتا ہے۔ قارئین کے ہی اصرار پر اس ناول کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے جو مکتبۂ عمران اردو بازار کراچی میں دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے شہروں کے بک اسٹالز سے مل سکتا ہے۔

آج کا مصروف ترین فنکار

نوید رانا سے ملاقات

شاہین رشید

انسان کی ایک پہچان اس کے والدین ہوتے ہیں اور دوسری پہچان اس کی ذاتی خصوصیات ہوتی ہیں۔ کئی ڈراموں میں ایک نام تواتر کے ساتھ پڑھ رہے تھے، پھر ان کا کام بھی دیکھ رہے تھے، نوید رانا کو مسلسل کئی ڈراموں میں دیکھ کر ہم نے "جیت" سیریل کے پروڈیوسر محمد بخش سمیجو کو فون کیا اور ان سے نوید رانا کا نمبر حاصل کیا۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ نوید رانا معمر رانا کے بھائی ہیں۔ یہ پہچان ہم تک تو دیر میں پہنچی مگر اس بات سے انکار نہیں کہ نوید رانا نے اپنی پہچان، عام حلقوں اپنی بہترین پرفارمنس کی وجہ سے کرائی ہے۔ آج کل ہر چینل سے آپ ان کے ڈرامے دیکھ رہے ہیں اور ابھی تو انہوں نے اپنی فنی زندگی کا آغاز کیا ہے۔ اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ آئندہ چند سال نوید رانا کے ہیں، اسکرین پر وہی، وہ ہوں گے۔

"کیسے ہیں نوید رانا اور کیسی گزر رہی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے اور اچھی گزر رہی ہے۔"

"آج کل تو ماشاء اللہ آپ ہر چینل پر نظر آرہے ہیں۔"

"بس جی اللہ کا شکر ہے۔ اس نے عزت دی ہوئی ہے اور یہ جو لگاتار سیریل آرہے ہیں ایسا ہونا نہیں تھا ۔۔ لیکن ورلڈ کپ کی وجہ سے ایسا ہوا کہ سب ڈرامے روک لیے گئے اور پھر ورلڈ کپ کے بعد انہیں آن ایئر کیا گیا اور جب تینوں ڈرامے ایک ہی ہفتے میں آن ایئر آئے تو میرے فادر نے اور دیگر لوگوں نے مبارکباد کے فون کیے، تب مجھے معلوم ہوا کہ میرے ڈرامے چل رہے ہیں۔"

"آپ بہت اچھے پرفارمر ہیں لیکن کیا آپ کچھ لیٹ نہیں آئے اس فیلڈ میں؟"

"اصل میں، میں پہلے والد کے ساتھ کام کرتا تھا۔ جبکہ میرا شوق کرکٹ کی طرف اور شوبز کی طرف زیادہ تھا اور خاص طور پر فلموں میں آنے کا شوق تھا۔ والد کے ساتھ کام کرتا رہا لیکن دل مطمئن نہیں تھا لہٰذا پھر شوق کی خاطر اس فیلڈ میں آگیا۔"

"تو پھر آج کل انڈر پروڈکشن کتنا کام ہے؟"

"انڈر پروڈکشن دو کام ہیں۔ ایک تو فاروق پریو کا "فاصلے اگر ہوں گے درمیان" ایک کامیڈی سیریل ہے جو عبید فہد کی ہے اور اس کے علاوہ دو تین اور پروجیکٹ ہیں جو جلد ہی شروع ہو جائیں گے۔

"ان سب میں رول کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے جی کہ سب میں رول بہت اچھے ہیں۔ بہت جلد میرا سیریل "فاصلے اگر ہوں گے درمیاں" آن ایئر آنے والا ہے اس میں بھی میرا رول بہت اچھا ہے اور دیگر کاسٹ بھی بہت اچھی ہے اور اب زیادہ تر میرے رول لیڈنگ ہی ہوں گے۔"

"آج کل جو تین سیریلز پی ٹی وی سے آن ایئر آ رہے ہیں "انجانے راستے، جیت اور سنگم" اس میں آپ کے لیڈنگ رول نہیں ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟"

"ایک چیز ہوتی ہے شارٹ اینڈ سوئیٹ اگر آپ باصلاحیت ہیں تو اپنے چھوٹے کردار میں بھی ایسے ایکسپریشن چھوڑ دیں گے کہ لوگ آپ کو پسند کریں گے اور اگر آپ اچھے اور باصلاحیت اداکار نہیں ہیں تو بڑے کردار کو بھی ایسے کریں گے کہ سیریل تباہ ہو جائے گی۔ اب ہمایوں سعید، تنویر جمال بھائی یہ سب بڑے

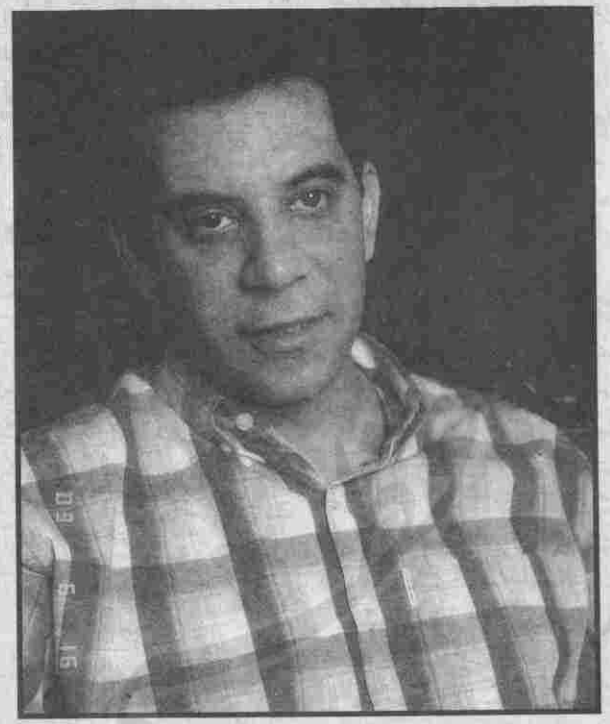

نام ہیں اب ان لوگوں کے سامنے یہ سوچنا کہ مجھے مین رول ملے تو یہ بے وقوفی والی بات ہوگی۔ آپ کو ایک اچھا کردار ملے اور اسے آپ اپنی محنت سے اور اچھا کر لیں تو یہ آپ کی کامیابی ہے۔ ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ہمیں لیڈنگ رول ہی ملے بلکہ ہمیں اچھے رول کی تلاش جاری رکھنی چاہیے۔"

"ویسے بھی ڈرامے کی فیلڈ میں وہی ہیرو ہوتا ہے جو اچھا پرفارم کرتا ہے، کیا خیال ہے آپ کا؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ ڈراموں میں ایکٹنگ دیکھی جاتی ہے۔ ہیرو تو فلموں میں ہوتا ہے۔ تو ڈراموں میں کام دیکھا جاتا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو دیا۔ ماشاء اللہ بہت جلدی دے دیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر انسان سیڑھی پہ سیڑھی آگے بڑھے تو اس کی کامیابی دیرپا ہوتی ہے اور اگر چھلانگ لگا کر آگے بڑھیں گے تو ممکن ہے کامیابی وقتی ہو۔"

"آپ کامیڈی سیریل بھی کر رہے ہیں اور سنجیدہ رول بھی پھر۔ بھی کسی رول کے لیے کوئی خاص خواہش یا ڈیمانڈ ہوگی؟"

"وہ کردار کرنا چاہوں گا کہ جو پرفارمنس مانگے۔ کسی خاص کردار کی خواہش نہیں ہے کیونکہ اگر آپ ایک کردار کی خواہش کریں گے تو پھر ساری زندگی اسی کردار کی طرف آپ کا ذہن لگا رہے گا کہ میں نے یہی کردار کرنا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ کو جو کردار ہے اسے چیلنج سمجھ کر کرنا چاہیے۔ جو کردار کرنا ہیں اسی کو دیرینہ خواب سمجھ کریں اور یہ سوچ کر کریں کہ مجھے اس کردار کی تو خواہش تھی۔"

"ویسے آپ کے خیال میں سنجیدہ رول کرنے آسان ہیں یا کامیڈی؟"

"کامیڈی رول اور سنجیدہ رول کا موازنہ کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ سیریس رول کرنا بہت آسان ہیں بہ نسبت کامیڈی کے۔ آج کل میرا کامیڈی سیریل اے آر وائی سے "انجوائے کر" ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہے آپ یقین کریں کہ مجھے اتنی مشکل پیش آئی اس رول کو کرنے میں کہ بتا نہیں سکتا۔ انسان کو ہنسانا اس دنیا کا سب سے مشکل کام ہے اور ایسے ہی رول چیلنجنگ رول ہوتے ہیں جن کو کرنے میں مزہ بھی بہت آتا ہے۔"

"کامیڈی رول کرتے وقت کس بات کو خاص طور پر مد نظر رکھتے ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ جس کی ٹائمنگ اچھی ہے وہ کامیڈی میں کامیاب ہے اور جس کی ٹائمنگ اچھی نہیں ہے وہ اپنی لائنیں (مکالموں کی) ضائع کر دیتا ہے اور جس کی لائنیں اچھی نہیں ہیں لیکن اس کی کامیڈی ٹائمنگ اچھی ہے تو وہ پھر بہت نکھر کر سامنے آتا ہے۔"

"آپ کی ایک پہچان آپ کے والد شفقت رانا صاحب ہیں' دوسری پہچان آپ کے بھائی معمر رانا ہیں۔ آپ کو اپنی پہچان کروانے میں مشکل تو پیش نہیں آ رہی"

"نہیں جی! اللہ کا شکر ہے میں بنیادی طور پر لاہور کا رہنے والا ہوں لیکن اب کراچی شفٹ ہو گیا ہوں اور کراچی اس لیے شفٹ ہوا ہوں کہ یہ دیکھوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اپنے آپ کو کتنا اسٹیبلش کر سکتا ہوں۔ آپ یقین کریں کہ جب میں کراچی آیا ہوں اور لوگ میرا نام پوچھتے تھے تو میں صرف نوید بتاتا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں اپنے طور پر اپنے آپ کو کتنا منوا سکتا ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنے آپ کو منوایا ہے۔ "کراچی اور لاہور میں ہی کام زیادہ ہو رہا ہے آپ لاہور میں رہ کر بھی تو اپنے آپ کو منوا سکتے تھے؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کراچی اور لاہور میں ہی کام زیادہ ہو رہا ہے اور اگر میں لاہور میں رہ کر کام کرتا تو پھر وہی بات ہو جاتی کہ والد اور بھائی کا نام آتا اور مجھے خود یہ پتہ نہ چلتا کہ مجھ میں خود کتنی صلاحیت ہے کتنی گنجائش ہے اپنے آپ کو منوانے کی۔ اس لیے میں کراچی آ گیا اور یہاں اللہ کا کرم اور ماں باپ کی دعائیں کام آئیں اور مجھے میرا مقام ملا۔

"آپ نے شروع میں کہا کہ میرے دو ہی شوق تھے ایک کرکٹ کھیلنا اور دوسرا فلموں ہی کام کرنا تو پھر آپ فلموں میں کیوں نہیں آئے۔؟"

"آج کل جس طرح کی فلمیں بن رہی ہیں ان کے بارے میں آپ سب کو پتہ ہی ہے۔ فلموں میں اداکاری تو رہی ہی نہیں ہے اور آرٹسٹ کی تو خواہش ہوتی ہے کہ اسے کوئی تخلیقی کام کرنے کا موقع ملے۔ آج کل کی فلموں کا تو یہ حال ہے کہ ایک ہی ڈائیلاگ بولنا ہوتا ہے۔ ایک دن میں پانچ مختلف سیٹ پر تو ایک ہی ڈائیلاگ کے لیے آپ کیا بھی ورائٹی دے سکیں گے۔ سوائے اس کے کہ ایک سیٹ پہ آپ سیدھا ہاتھ اوپر کر کے وہی ڈائیلاگ بول دیں گے۔ دوسرے سیٹ پر الٹا ہاتھ آگے کر کے وہی ڈائیلاگ بول دیں گے۔ ہاں جب اچھی فلمیں بنیں گی اچھا پروجیکٹ ہو گا' اچھا پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ہو گا تو میں ضرور کام کروں گا بشرطیکہ میرا رول بھی اچھا ہو۔

"تو پھر معمر رانا کو بھی تو مشکل ہوتی ہو گی ایک جیسے ڈائیلاگ کو بولنے میں!"

"ہاں کیوں نہیں لیکن اسے تو اب فلمی دنیا میں آئے ہوئے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ اسے تو ایک عادت سی پڑ گئی ہے۔ وہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ یار کیا کریں.... اگر پنجابی فلمیں نہیں کریں گے تو کیا سال میں دو ہی فلمیں کریں گے۔ بلکہ اس نے تو مجھ سے خود کہا ہے کہ اچھا ہے تم ٹی وی کی طرف آ گئے یہاں کچھ کر دکھانے کا موقعہ تو ملے گا۔"

"گزشتہ دنوں معمر رانا نے اخباری بیان دیا تھا کہ میں اب فلموں میں کام نہیں کروں گا۔ تو اس کی کیا وجہ ہے؟"

"میں نے بھی اتنی ہی خبر پڑھی ہے جتنی آپ نے پڑھی ہے اور اس سلسلے میں میری موی سے کوئی تفصیلی بات نہیں ہوئی ہے اور ویسے اس نے ابھی باقاعدگی کے ساتھ یہ اعلان نہیں کیا کہ میں کام کروں گا یا نہیں۔"

"آپ کے خیال میں معمر رانا کو ایسی دھمکیاں کیوں ملیں کہ جس کی وجہ سے انہیں یہ بیان دینا پڑا؟"

"اس کی سب سے بڑی وجہ تعلیم کی کمی ہے ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ہی تعلیم ہے۔ اگر تعلیم ہو تو ساری نہیں تو آدھی برائیاں تو دور ہو ہی جاتی ہیں۔ تو جن کے پاس تعلیم نہیں ہوتی پھر وہی ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔"

"آپ کو یہ فیلڈ کیسی لگ رہی ہے کیونکہ اس میں تو اسکینڈلز بھی بنتے ہیں اور خواری بھی ہوتی ہے۔ وقت بھی بہت ضائع ہوتا ہے؟"

"پہلے میں بات کروں گا وقت کی پابندی کی۔ اب آپ کا اور میرا ٹائم فکس ہوا تھا گیارہ بجے آپ نے بھی وقت کی پابندی کی اور میں نے بھی۔ تو وقت کی بچت ہو گئی۔ اس فیلڈ میں وقت کی پابندی بہت اہمیت رکھتی ہے' علی رضوی محمد بخش سیجو اور دیگر سینئرز کو میرے ساتھ کام کر کے اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ بندہ وقت کا کتنا پابند ہے۔ تو میں نے دیکھا ہے کہ ڈائریکٹر اپنے معاون ڈائریکٹر سے یہی کہتے ہیں کہ کل کتنے بجے ریکارڈنگ کرنی ہے۔ جواب ملتا ہے چار بجے تو ڈائریکٹر پوچھتے ہیں کہ نوید کو کتنے بجے کا وقت دیں تو کہتے ہیں کہ چار بجے کا ہی وقت دیں۔ اس پر وہ پھر پوچھتے ہیں کہ آپ نے ریکارڈنگ کرنی کتنے بجے ہے تو وہ کہتے ہیں کہ پانچ بجے تو پھر ڈائریکٹر مجھے کہتے ہیں کہ پھر آپ پانچ بجے ہی آئیے گا۔ کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ نوید نے نہ ایک منٹ آگے کرنا ہے نہ ایک منٹ پیچھے۔ پانچ بجے کا مطلب ہے پانچ بجے چونکہ ڈائریکٹر کے آنے سے پہلے ساری سیٹنگ معاون کو ہی کرنا ہوتی ہے۔ اس لیے ان ہی سے پوچھ کر ریکارڈنگ کا وقت رکھا جاتا ہے۔"

"آپ بتا رہے ہیں کہ آپ نے کرکٹ بھی کھیلی۔ تو کس لیول تک اور پھر اس فیلڈ کو کیوں چھوڑ دیا۔؟"

"کرکٹ میں نے کالج لیول تک کھیلی اور میں لیفٹ آرم باؤلر تھا یعنی بائیں بازو سے باؤلنگ کرواتا تھا۔ میں کرکٹ میں شاید بہت آگے تک جا سکتا تھا لیکن میری بدقسمتی کہ میرا زبردست بلکہ شدید قسم کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور سیدھے ہاتھ کی ہڈیاں ایک جگہ سے نہیں بلکہ تقریباً سترہ اٹھارہ جگہ سے ٹوٹ گئیں اور میری بہت ہی سرجری ہوئی تو میں آپ کو یہ بتاؤں کہ میں الٹے ہاتھ سے باؤلنگ کراتا تھا اور سیدھے ہاتھ سے بیٹنگ کرتا تھا تو سرجری ہونے کے بعد سارا زور الٹے ہاتھ پر پڑنے لگا تو میں نے کرکٹ چھوڑ دی اور والد کے ساتھ بزنس میں آ گیا ورنہ جب تک کرکٹ کھیلتا تھا زندگی میں سکون تھا اور جب میں نے بزنس شروع کیا تو زندگی میں بے سکونی ہو گئی۔ تو پھر میں نے سوچا کہ کام وہ کرنا چاہیے جس کے ساتھ ہم پورا انصاف کر سکیں۔"

"اس فیلڈ میں آئے ہوئے بھی آپ کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا' اور آپ تین بھائی ہیں۔ تیسرے کیا کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں! ابھی صرف دس مہینے ہی ہوئے ہیں اور کراچی والوں نے بہت سپورٹ کیا ہے اور سب لوگ ہی تعریف کر رہے ہیں اور تیسرے بھائی بھی بہت جلد اس فیلڈ میں آ جائیں گے۔"

"آپ کے خیال میں پرائیویٹ پروڈکشن کی وجہ سے گلیمر میں کچھ اضافہ نہیں ہو گیا؟"

"جی ہاں گلیمر میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔"

"تو کیا یہ اچھی علامت ہے۔ جبکہ ہمارا ملک تو بہت غریب ہے۔"

"میں اس معاملے میں زیادہ معلومات تو نہیں رکھتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ملک غریب تو ہے لیکن مجھے یاد ہے کہ جاپان میں ایک اسٹیٹمنٹ جاری ہوا تھا اور اس میں بتایا گیا تھا کہ جتنی گاڑیاں پاکستان میں ہیں انہیں اگر ہم جاپان میں کھڑی کر دیں تو شاید ہمارے پاس جگہ کم ہو جائے۔"

"نوید رانا' آپ سے باتیں تو ہوتی رہیں گی پہلے

تھوڑا سا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے؟"

"میرے والدین کی پیدائش انڈیا کی ہے لیکن ہم پکے لاہوری پنجابی ہیں۔ میں ۸ جولائی کو لاہور میں پیدا ہوا۔ میری والدہ کا تعلق کراچی سے ہے' جبکہ والد کا تعلق لاہور سے ہے۔ والد کی سائیڈ کے زیادہ تر لوگ کراچی میں رہتے ہیں۔ میرے لیے لاہور اور کراچی میں کوئی فرق نہیں ہے اور ہم تین بھائی ہیں۔"

"تعلیم آپ کی۔؟"

"گورنمنٹ کالج لاہور سے میں نے گریجویشن کیا' پھر ڈپلومہ کیا سیلز مارکیٹنگ میں' اس کے بعد والد کے ساتھ کام میں لگ گیا اور اب آپ کو پتہ ہی ہے کہ میں اس فیلڈ میں آگیا ہوں۔"

"آپ تین بھائی ہیں' بہن کوئی نہیں ہے... کمی محسوس ہوتی ہے؟"

"جی بالکل ہوتی ہے اور کہتے ہیں کہ جس گھر میں بہن ہوتی ہے اس گھر میں لڑائی تھوڑی کم ہوتی ہے۔ جب تین بھائی ایک جگہ ہوتے تھے تو خوب شرارتیں بھی ہوتی تھیں اور لڑائیاں بھی' مگر یہ سب بچپن کی بات ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور ایک آواز پر سب ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ یعنی ہم میں اتنا اتفاق ہے۔"

"جس گھر میں لڑکیاں نہیں ہوتیں' اس گھر میں پھر لڑکوں کو ہی گھر کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ آپ بھائیوں کے ساتھ بھی ایسا ہوا؟"

"نہیں جی ایسا نہیں ہوا... ہمارے بچپن سے ہی ایک فیملی ہمارے ساتھ رہتی ہے جو بالکل ہماری فیملی کی ہی طرح سے ہے تو انہوں نے ہی سارے کام سنبھالے ہوئے ہیں' ہمارا کام تو یہ ہوتا تھا کہ اٹھنا' کھانا پینا' کھیلنا کودنا اور سو جانا۔"

"رومینٹک مزاج ہیں۔"

"میرا نہیں خیال کہ میں رومینٹک مزاج ہوں۔"

"تو پھر اس قسم کے رول کیسے کر لیتے ہیں۔"

"وہ اس طرح کر لیتا ہوں کہ اس وقت نوید رانا نہیں ہوتا بلکہ ڈرامے کا کردار ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے کوئی پرابلم نہیں ہوتی اور میں با آسانی اپنا کردار ادا کر لیتا ہوں۔"

"ویسے مزاج کے کیسے ہیں۔ غصے کے تیز ہیں یا نرم"

"پہلے تو غصے کا بہت تیز تھا۔ مگر اب کافی فرق پڑ گیا ہے اور خاص طور پر اس فیلڈ میں آنے کے بعد تو غصہ خاصا کم ہو گیا ہے کیونکہ سمجھتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ کا آپ پر کرم ہو جائے تو پھر آپ کو جھک جانا چاہیے اور پھر ہم لوگ تو سوسائٹی کے لیے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں' اگر میں آج سے دو سال قبل سڑک پر لڑتا تو مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔ لیکن آج اگر میں تو تو میں میں بھی کروں گا تو میری شخصیت پر بہت برا اثر پڑے گا اور امیج خراب ہو گا۔ اس لیے میں نے اپنی اس خامی پر کافی حد تک قابو پا لیا ہے کیونکہ اب مجھ پر کافی ذمہ داری عائد ہو گئی ہے۔"

"یہ بتائیں کہ آپ شادی کب کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں اور کب ہوئی۔"

"الحمد اللہ میں شادی شدہ ہوں اور میری بیگم کا نام صائمہ ہے اور وہ ہاؤس وائف ہیں اور شادی کو ابھی تھوڑا ہی ٹائم ہوا ہے۔"

"پھر بھی سال دو سال یا مہینے دو مہینے..."

ہنستے ہوئے۔ "ہماری شادی کو ماشاء اللہ تین سال ہو گئے ہیں اور ابھی صاحب اولاد نہیں ہوئے۔"

"شادی آپ کی پسند سے ہوئی؟"

"جی ہاں شادی میری پسند سے ہوئی' ویسے ہم اپنی شادی کو ارینج کہہ سکتے ہیں کیونکہ دونوں گھروں کی رضا مندی سے ہی سارے کام ہوئے۔"

"بیگم آئیڈیل کے قریب ہیں؟"

"جی ہاں آئیڈیل کے قریب ہیں۔ مشرقیت کا نمونہ ہیں اور بہت اچھی ہیں۔ کئی خوبیاں ہیں ان میں۔"

"آپ نے بتایا تھا کہ آپ تین بھائی ہیں آپ کا نمبر کون سا ہے؟"

"میرا نمبر پہلا ہے یعنی میں' موی اور عامر ہم تین بھائی ہیں اور والدین ہیں۔ بہت مختصر سی فیملی ہے ہماری۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نوید رانا سے اجازت چاہی ان سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا۔

صدا باقی ہے

غزل ______ سراج اورنگ آبادی

انتخاب ______ سائرہ غلام نبی

خبرِ تحیرِ عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شہہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سیں اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سیں کروں بیاں
کہ شرابِ صد قدح آرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی تیوں دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں عیاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جِلا رہی' نہ پری کوں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کوں
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

سراج اورنگ آبادی کی یہ غزل یوں تو کلاسیکی اہمیت کی حامل ہے۔ نہ صرف اپنی لفظیات' تراکیب کے لحاظ سے' بلکہ اپنے مضامین کے اعتبار سے بھی' اس غزل میں خاصا تنوع ہے۔ اس غزل میں عشق کی عجیب کیفیات رچی بسی ہیں' جو ہر دور میں' کسی بھی شخص پر وارد ہو سکتی ہیں۔ اس غزل کے بارے میں مشہور شاعر جناب سحر انصاری سے بات ہوئی تو انہوں نے اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا۔

"یہ غزل مجھے اپنے طالب علمی کے زمانے سے بہت پسند ہے' اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ میرا اپنا تعلق اورنگ آباد سے ہے' دوسرے یہ کہ اس غزل میں بحر اور لفظوں کا عجب دروبست ہے۔ ایک قسم کی بڑی سرشار انگیز ترنم اور عنائیت ملتی ہے۔ ویسے ہی بڑا لطف ملتا ہے۔ پوری غزل کی شاعری دیکھیں خود سراج سمیت ایسی غزل نہیں آئی ہے۔ اس غزل میں نئی تراکیب' نئے مضامین' کیفیات بہت اچھی طرح آئی ہیں۔ جنہیں وجدانی کیفیات سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس غزل کا اثر آنے والے بہت سے شعراء پہ ہوا۔ اس زمین میں بہت غزلیں کہی گئیں۔ اور بہت سے فکشن لکھنے والوں نے اس کے مصرعوں سے افسانوں کے عنوان تک اخذ کیے ہیں۔"

یہ غزل آپ بھی پڑھیے اور اس سے لطف لیجیے کہ ایسی شاعری بہت کم کم غزلوں میں نظر آتی ہے۔

خاص کی ڈائری

امت الصبور

ریحانہ ملک — کی ڈائری سے

بلاشبہ محبت روشنیوں کی پیمبر ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ محبت بربادیوں اور اندھیروں کی وہ نامہرباں دیوی بھی ہے کہ جس کی زد میں آنے والے لوگ زندہ تو رہتے ہیں مگر تاعمر دل و جاں کا نشاں نہیں پاسکتے نہ جانے کتنی آنکھیں کھنڈر ہوئیں۔ کتنے دل صحرا ہوئے۔ کتنے ہنستے ہوئے ہونٹ اجڑے اور نہ جانے اس بلائے محبت نے اور کتنی روحوں کے تبسم چرانے ہیں۔ اسی بے رحم جذبے سے احتیاط کی خبر دیتی شاہ زیب نوید کی یہ نظم۔

پاگل لڑکی

گہری گہری آنکھوں والی
اُلجھی اُلجھی پاگل لڑکی
تو یہ کس کی دُھن میں آخر، لمبی لمبی پلکوں اوپر
موٹے موٹے آنسو لے کر
سُندر کومل پیروں نیچے، جلتی بلتی دھرتی دے کر
قریہ قریہ بھاگ رہی ہے، کس کی خاطر جاگ رہی ہے
تجھ کو یہ معلوم نہیں کیا
تجھ جیسی نہ جانے کتنی گہری گہری آنکھوں والی
کیسی کیسی سُندرتا کے ڈھیر خزانے لے کر نکلیں
لیکن پھر بھی اس رستے سے منزل تک پہنچانے والا
ہر اک ساتھی جھوٹا نکلا
اک اک آشا دُشمن نکلی اک اک سپنا دھوکا نکلا
سچا ہر اک خدشہ نکلا
دیکھو! تم بھی جانتے دو اب
نادانی کا جتنا رستہ تم نے اب تک طے کر ڈالا
اُس رستے سے گھر کی منزل
اب بھی اتنی دُور نہیں ہے
اب بھی واپس جاسکتی ہو، سب کچھ واپس پاسکتی ہو
اب بھی گر تم نادانی کے اس رستے سے گھر نہ پلٹیں
تو پھر اک دن ایسا نہ ہوگا
سُندر آنکھیں مرجائیں گی
پلکیں خون سے بھر جائیں گی
جان بہوں پر آجائے گی
تن کے سارے اُجلے پن کو گھور مسافت کھا جائے گی
اُس دن پھر تم چلاؤ گی، لیکن کچھ نہ حاصل ہوگا
سارے ملس کے بھوکے ساتھی پنکھ لگا کے اُڑ جائیں گے
تم رستے میں رہ جاؤ گی، رستہ بھی وہ جس کے پیچھے
ڈر کی گہری دلدل ہوگی، آگے غم کا جنگل ہوگا، سر پر
گہرا بادل ہوگا
اُس دن کے آنے سے پہلے، اُس دن تک جانے سے پہلے
وقت ملے تو ڈھلنے والے
ہر لمحے کی ذات پہ سوچو
دُنیا کی باریک نظر سے، دُنیا کی ہر بات پہ سوچو
جذبوں کی اوقات ہی کیا ہے
جذبوں کی اوقات پہ سوچو
وہ دیکھو! اک سائے پر پھر ویرانے میں بجلی کڑکی
گہری گہری آنکھوں والی، اُلجھی اُلجھی پاگل لڑکی

ارم قیوم چودھری — کی ڈائری سے

جذبوں سے گندھی ہوئی ایک ایسی غزل جو جاگتی آنکھوں میں خواب سجا کر ٹھنڈی میٹھی ہواؤں میں جھلاتی، پلکوں کو خمار سے بوجھل کرتی ہے۔ بعض اوقات کچھ جذبے یوں بھی عیاں ہوتے ہیں کہ خود ہی بیاں ہوجاتے ہیں۔ جو ہم کسی کو سمجھانا چاہتے ہیں وہ یوں ہی بغیر کہے سمجھ جائے تو اپنے جذبوں کی صداقت پہ یقین آنے لگتا ہے۔ میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ غزل آپ سب کے نام۔

جو دیکھنے کا تمہیں اہتمام کرتے ہیں
زمیں سے جھک کے ستارے کلام کرتے ہیں

تو آؤ آج سے ہم ایک کام کرتے ہیں
وفا کے نام سبھی صبح و شام کرتے ہیں

یہ راستہ ہے مگر ہجرتی پرندوں کا
یہاں سمے کے مسافر قیام کرتے ہیں

وفا کی قبر پہ کب تک اسے جلا رکھیں
سو یہ چراغ ہواؤں کے نام کرتے ہیں

کبھی جو بام پہ ٹھہرے تو چاند رُک جائے
غزال دیکھ کے اس کو خرام کرتے ہیں

یہ اہل دل کی بستی ہے، زرگروں کی نہیں
یہاں دلوں کا بہت احترام کرتے ہیں

جہاں پناہوں کی جانب نظر نہیں کرتے
غریب شہر کو جھک کر سلام کرتے ہیں

شوقیہ اسحاق — کی ڈائری سے

موسم آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں مگر کچھ کیفیات ایسی ہوتی ہیں جنہیں موسم بھی بدل نہیں سکتے اور وہ کیفیت ہوتی ہے دل کی۔ اور تنہا رہتے رہتے کبھی بے اختیار ایسی حالت ہوتی ہے جسے لفظوں کے روپ میں نجانے کس شاعر نے ڈھالا ہے۔

کوئی ابر اُڑے کسی قلزم سے
اور رس برسے میرے ویرانے پر
کوئی جلتا ہو کوئی کڑھتا ہو
میرے دیر سے واپس آنے پر
کوئی بیٹھے میرے پہلو میں
کوئی ہاتھ دھرے میرے شانے پر
اور دبے لہجے میں مجھ سے کہے
تنہا چلنا کھیل نہیں
چلو تمہارے ساتھ چلتے ہیں

فریدہ فیض — کی ڈائری سے

امجد اسلام امجد کی شاعری روح تک کا سفر طے کرتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ہمارے جذبات بیان کر رہے ہوں۔ ان کی شاعری میں پھول، ہوا، خوشبو، چاند اور سپنوں کی باتیں ہیں۔ یہ نظم بھی ہمارے جذبات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

سپنے کیسے بات کریں

خدشوں کی زنجیر پڑی ہے نیند بھری سب آنکھوں میں
سپنے کیسے بات کریں، سپنے کس سے بات کریں
جن لوگوں کا رستہ تکتے عمریں رزق خاک ہوئیں
اب وہ لوگ اور ان کے سپنے دیکھنے والی
آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں
راکھ کے اس انبار میں ہوں گے کیسے کیسے زندہ خواب
خوابوں کی اس راکھ کو لیکن چھیڑے کون
جس رستے پر چھاؤں نہ پانی، اُس پر ڈیرے ڈالے کون
جس مٹی میں ریت ملی ہو، اس میں کیسے باغ لگائیں
دریا ہی پایاب ہو جب تو، اس میں کشتی کیسے لے جائیں
خوشبو اک آوارہ جھونکا، اس جھونکے کو گھیرے کون
کیسے دُنیا کو بتلاؤں تم ہوتے، ہو میرے کون؟

نادرہ خاتون

رابعہ ضیاء........لاہور

یہ خط لکھنے پر مجبور کرنے والی تحریر نگہت سیما کی تھی۔ اتنے حساس موضوع پر ایک لاجواب ناول لکھنے پر انہیں بہت مبارکباد۔

ٹائٹل نے بھی بہت متاثر کیا۔ کرن کرن روشنی نے دل کو پرنور کردیا۔ ارجمند رحیم ،فیصل قریشی۔ ڈاکٹر یونس بٹ کے انٹرویو پڑھ کردل نے بے اختیار آپ لوگوں کو داد دی۔ "شریک سفر" میں شکر ہے کہ آصفہ کو بھی عقل آئی۔ فاخرہ جبیں، رخسانہ نگار کے ناولٹ بے حد دلچسپ تھے۔ "ست پھلاں دی رانی" عالیہ بخاری نے جس خوبی سے ہمارے معاشرے کے المیے کو— قلم بند کیا اس کا کوئی جواب نہیں۔ افسانے 'ان روز و شب میں' آپ کی بیاض سے تمام سلسلے بہت دلفریب تھے جنہوں نے جون کے شمارے کو منفرد بنادیا۔

فرزانہ اقبال........گھنوں بالاکوٹ

گاؤں دور ہونے کی وجہ سے مجھے ڈائجسٹ بہت دیر سے ملتے ہیں لیکن میں ایک ہفتہ میں ختم کرلیتی ہوں۔ نگہت عبداللہ کا ناول "کوئی لمحہ گلاب ہو" بہت ہی اچھا جا رہا ہے۔ فائزہ افتخار کا مکمل ناول "سارے گلاب لے جانا" مارچ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ بہت ہی عمدہ لکھا ہے دل کو چھو لینے والا تھا۔ اسی طرح فاخرہ جبیں، نگہت سیما اور عمیرہ احمد، رخسانہ نگار سب ہی بہت خوب لکھتی ہیں۔

ام شہلا........لاہور

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ٹائٹل بے حد اچھا رہا۔ اندر کے صفحات میں سب سے خوب صورت صفحہ "کرن کرن روشنی" لگتا ہے جس کو پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ اس بار جس ناولٹ کا سب سے زیادہ انتظار تھا۔ وہ تھا زہرہ ممتاز جی کا "شریک سفر" بے حد شاندار اور زبردست تحریر ہے۔ آپی آپ علی سلمان کا انٹرویو بھی ضرور لیں بمع تصویر کے اور ضرور شائع کریں۔

سعدیہ شریف........سیالکوٹ

جس کہانی نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ وہ محترمہ نگہت سیما کی "رقص طاؤس" ہے۔ نگہت سیما نے انتہائی حساس موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو کہ ہماری دکھتی رگ ہے۔ امریکہ نے افغانستان کو نیست و نابود کیا۔ ہم تماشہ دیکھتے رہے، 'ملا عبدالسلام ضعیف جو کہ پاکستان میں طالبان کے سفیر تھے۔ انہوں نے پاکستان سے سیاسی پناہ مانگی مگر ہم نے امریکہ سے کہا کہ مائی باپ عبدالسلام تمہارا ہے اسے لے جاؤ۔"

عراق میں کیا کچھ نہیں ہوا مگر ہم صرف انگشت بدنداں دیکھتے ہی رہے۔ امریکہ کے نام۔

رقص شعلوں کا اگر اتنا پسند ہے۔
کبھی اپنے گھر کو بھی آگ لگا کر دیکھو
اب تو یہ صرف خواب ہی بن کر رہ گیا ہے
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر
حضرت اقبال ایک اور جگہ فرماتے ہیں
اخوت اس کو کہتے ہیں چبھے کانٹا جو کابل میں
تو ہندوستان کا ہر پیرو جواں۔ بے تاب ہو جائے

کابل میں تو میزائل چھبوئے گئے مگر ہم صرف واویلا کر کے ہی چپ ہو گئے اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ امریکی ناخدا ناراض نہ ہو جائے۔ ڈاکٹر ابراہیم رقص طاؤس کا ایک کردار نہیں بلکہ لاہور کے ڈاکٹر عامر عزیز (غالباً" یہی نام ہے ان کا) جن پر القاعدہ کے کرتا دھرتا رکن ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔ خاصی مدت گرفتار رہنے کے بعد اپنے گھر واپس آئے تھے اور پچھلے دنوں ان کا چھوٹا سا انٹرویو پی ٹی وی کے خبرنامے میں نشر ہوا تھا۔ ہمارے اپنوں نے ہی ڈاکٹر عامر کو ایف بی آئی کے حوالے کیا تھا۔ وہ انسانیت کی خدمت کرنے اور جذبۂ ایمانی سے سرشار ہو کر اپنے فرض کی تکمیل کے لیے افغانستان گئے تھے مگر انہیں وہاں دھرلیا گیا۔

نسرین اختر........شورکوٹ

ٹائٹل گرل بہت پسند آئی مجھے ،نگہت عبداللہ کا "کوئی لمحہ گلاب ہو" بے حد پسند ہے۔

یوں تو ۱۹۹۵ء سے ریگولر خواتین پڑھتی آ رہی ہوں۔ اس کا ثبوت میرے پاس خواتین ڈائجسٹوں کا ذخیرہ ہے۔ اس ڈائجسٹ نے میری زندگی بدل دی میں ایک حادثے کا شکار ہو گئی تھی اور زندگی سے مایوس۔ کسی نے مجھے خواتین ڈائجسٹ ۱۹۹۵ء پڑھنے کے لیے دیا۔ اس وقت سے آج تک خواتین پڑھتی رہی ہوں۔ آپ کو میری چاہت کا اندازہ نہیں۔ خواتین ڈائجسٹ نے مجھے زندہ کردیا ہے۔

صنم لاکھو........گوٹھ عمر لاکھو

خواتین ڈائجسٹ کا جون کا شمارہ بہت پسند آیا۔ خاص طور پر شریک سفر کی یہ قسط بہت اچھی لگی۔ میں عموماً" ایسی کہانیاں یا ناول کبھی پڑھتی نہیں ہوں جس میں ایک حد سے زیادہ طاقتور اور دوسرا حد سے زیادہ کمزور ہو۔ لیکن شریک سفر اس لیے پڑھتی ہوں کہ یہ سب میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ پلیز زہرہ ممتاز سے کہیں عالیہ بیگم کو ایسی سزا دینا کہ ہمارا یقین پختہ ہو جائے 'اللہ سائیں ظلم کرنے والوں کو دنیا میں ان کے جرم کی سزا دے دیتا ہے۔ اگر آپ کی آصفہ نے عالیہ بیگم کو معاف کردیا تو پھر میں آپ کی لکھی ہوئی کوئی تحریر نہیں پڑھوں گی۔ چاہے ساری دنیا اس کی تعریف کیوں نہ کرے۔ شرجیل آصفہ کا بے حس اور بے ہمت شوہر ہے لیکن ہے تو شوہر اس لیے آصفہ نے اگر اسے معاف کردیا یا سزا میں نرمی کی تو میں برداشت کرسکتی ہوں لیکن عالیہ بیگم کو صرف یہ سزا نہ دیجیے گا کہ وہ پاگل ہو گئیں یہ زندہ جل گئیں 'یا سزا بہت کم ہے عالیہ بیگم کے لیے۔ عالیہ بیگم کا جو عبرت ناک حشر ہو۔ آپ ضرور لکھیے گا کہ عالیہ بیگم نے کس طرح در در کی ٹھوکریں کھائیں اور اللہ سائیں نے کس طرح اس کا عبرت ناک انجام کیا کہ جب یہ مریں تو کوئی اسے دو گھونٹ پانی تک پلانے والا نہ تھا اور کسی کی آنکھ سے ایک آنسو بھی اس ظالم عورت کے لیے نہیں نکلا۔

گڑیا........کراچی

ٹائٹل گرل پھیکا شلجم تھی، بچی لڑکی کے چہرے پہ ذرا نمک نہیں تھا ہاں البتہ ہلدی تھی۔ ویسے ایک بات تو ماننا پڑے گی، ماڈل کی رنگت اچھی تھی۔ اپنی زہرہ ممتاز "شریک سفر" میں کیسی گھمسان کی جنگ کروا رہی ہیں۔ ظالم ساس اور شوہر بھی ایسا بے حس شخص اور شرمین جیسی نند اور یہ شرجیل اللہ تو بہ کیسا شخص ہے۔ زہرہ جی آصفہ کیا پتھر کی ہے۔ اس کی پریشانیاں ختم کردیں۔ نگہت عبداللہ جی! فائقہ کی دوسری شادی اگر ہو تو عظام سے ہرگز نہ ہو۔ یہ جو راحل ہے مجھے تو اسفندیار لگتا ہے۔ ایسا ہو جائے تو برا بھی نہیں اور ہاں میرے علم اور ثقیل اردو کے مطابق علیشبہ الف سے نہیں عین سے لکھتے ہیں۔

نگہت سیما نے تو کمال بلکہ جمال کردیا، رقص طاؤس لکھ کر۔ رخسانہ جی نے پتہ نہیں دنیا کے کس کونے میں اسپتال قائم کیا تھا کہ میاں بیوی نے راستے دنیا جہان کی برائیاں کرلیں مگر اسپتال نہ آ کردیا۔ شب و روز میں شازیہ چوہدری کی پوری تحریر میں سب سے اچھا ان کے بیٹے کا نام لگا "تیمور" عرصہ ہوا فرحت اشتیاق غائب ہیں، ظالم

خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کی کسی بھی حصے کی اشاعت یا الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے کسی بھی انداز میں پیش کرنے سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

حسینہ کیوں اپنی اس فین بلکہ اے سی کو تڑپاتی ہو' کود پڑو میدان میں' زبردست ناول کے ساتھ۔

فوزیہ شاہین.....بھلوال

امتحان سے فارغ ہو کر پچھلے پرچے اٹھائے تو پتا چلا کہ ہمارا فروری کے شمارہ میں گم ہو گیا ہے اور اس میں اللہ یار والی کہانی کا دوسرا حصہ تھا۔ اس کا دوسرا حصہ پڑھے بنا چین بھی نہیں آرہا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اس کا دوسرا حصہ پھر سے شائع کر دیں؟

جون کا پورا شمارہ پڑھ لیا ہے۔ بہت زبردست رہا۔ خاص طور پر نگہت سیما کا رقص طاؤس پڑھ کے لگا جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔ اس کہانی کے اختتام پہ دل میں عجیب سا سکون اور طمانیت اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ناولٹ میں فاخرہ جبیں صاحبہ کا بخت آور اچھا لگا اور رخسانہ نگار "کا محبت ہے خوشبو" سے بہت کچھ سیکھا۔ عالیہ بخاری نے بھی اچھا لکھا۔ زہرہ ممتاز کا شریک سفر بہت اچھا جا رہا ہے اب تو ایک ہی خواہش ہے کہ عالیہ آنٹی اور شرمین کو سزا ملے۔ افسانے دونوں ہی اچھے تھے لیکن متاع عروج کا "عکس خوشبو ہوں" میں موضوع بہت اچھا تھا انداز تحریر بھی بہت دل فریب "کوئی لمحہ گلاب ہو" میں فائقہ کی جرات پہ حیرت ہو رہی ہے اور بیگم آفندی کی جھنجلاہٹ بہت تقویت دیتی ہے۔ انٹرویو میں یوکس بٹ کا گھر اور فیصل قریشی سے ملاقات اچھی رہی۔ ان شب و روز میں شازیہ چوہدری کے بارے میں پڑھ کر بہت مزا آیا۔ میں فرحت اشتیاق کی شدت سے منتظر ہوں' آپ جلدی سے شب و روز میں ان سے ملاقات کروائیں۔

ج۔ پیاری فوزیہ! آپ کا فروری کا شمارہ گم ہو گیا ہے لیکن ہماری بقیہ قارئین نے فروری کے شمارے میں پچاس صفحات پر مشتمل دوسری اور آخری قسط پڑھی ہے۔ اور ان کے پاس یہ شمارہ محفوظ بھی ہے اب آپ ہی بتائیں ہم اسے دوبارہ کیسے شائع کر سکتے ہیں۔

عظمیٰ تحسین بیگ.....ساہیوال

"کرن کرن روشنی" انوکھا مزہ لیے ہوئے تھا۔ فیصل قریشی اور بھابھی دلہن سے ملاقات خوب رہی۔ "رقص طاؤس" نگہت سیما کا مکمل ناول پڑھ کر مزا آیا۔ واقعی سب ہی جانتے ہیں کہ اصل دہشت گرد کون ہے؟ پھر بھی مسلمان ہی دھر لیے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں ہمارے حکمرانوں کا رقص طاؤس کب ختم ہو گا؟ طاغوتی قوتوں کے سامنے۔ ناولٹوں میں عالیہ بخاری کا "ست پھلاں دی رانی" ہمارے معاشرے کی سچائی پر مبنی پسند آیا۔ افسانوں میں متاع عروج کا "عکس خوشبو ہے" جیسے میرے خیالات وجذبات اس افسانے کے اندر جذب کیے گئے ہوں۔ آپی! میں اپنی کوئی تحریر کردہ کہانی خواتین ڈائجسٹ' شعاع یا کرن میں بھیجنا چاہتی ہوں۔ مگر طریقہ تحریر نہیں معلوم کہ اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر کیسے ابھاروں کہ وہ افسانہ' ناولٹ یا ناول بن جائے۔

ج: عظمیٰ بہن! آپ صفحے کے ایک جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں۔

ملک فوزیہ رسول.....ساہیوال

آٹھویں کلاس سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ اب تو میں خود ایک رائٹر ہوں اور بچوں کے لیے لکھ رہی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں خواتین ڈائجسٹ میں بھی کہانیاں لکھ کر بھیجوں۔ مجھے خواتین کے تمام سلسلے اچھے لگتے ہیں خاص طور پر "کرن کرن روشنی" اور سب سے بڑھ کر "ان روز وشب میں" کا سلسلہ بہت ہی اچھا ہے۔ راحت جبیں اور فاخرہ جبیں کا بھی انٹرویو "ان روز وشب میں" دیں۔ نگہت عبداللہ کا کوئی لمحہ گلاب ہو اچھا جا رہا ہے۔ رقص طاؤس نگہت سیما کا بھی بہت اچھا رہا اور زہرہ ممتاز سے یہ کہنا ہے کہ وہ شریک سفر میں شرجیل کو آصفہ کی طرف لوٹا دیں۔

ج: فوزیہ بہن! آپ خواتین ڈائجسٹ کے لیے کہانیاں ضرور لکھیں ہم آپ کی تحریروں کے منتظر ہیں۔

ماہم خالد.....فیصل آباد

جون کے شمارے کے سرورق پر نظر پڑی اور ٹھہر گئی۔ بہت عمدہ اور فریش ٹائٹل تھا۔ اشتہارات کے پل کو پار کر کے جگمگاتی فہرست پر نگاہ ڈالی سب سے پہلے "کوئی لمحہ گلاب ہو" کی قسط پڑھی۔ نگہت جی! پلیز فائقہ کو مزید پریشانی مت دیں اور بیگم آفندی کو بھی ہدایت دیں۔ "شریک سفر" تو رسالے کی جان تھا۔ دعا ہے کہ اب سمیعہ ہی اس چنگیز خان کی پھپھو (عالیہ بیگم) کو درست کر دے۔ نگہت سیما اپنے مخصوص انداز میں جلوہ افروز ہوئیں اور "رقص طاؤس" سے رسالے کو چار چاند لگا دیئے۔ فاخرہ جبیں اور رخسانہ نگار کی تحریریں پسند آئیں' خاص طور پر "بخاور" بہت اچھی لگی۔ بہرحال راحت جبیں اور فرحت اشتیاق کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ یونس بٹ کی باتیں بھی کافی مزے دار تھیں۔ "ان روز وشب میں" شازیہ چوہدری سے ملاقات اور خاص طور پر ان کی تصویر بہت زبردست تھی۔ ان کا بے بی ماشاء اللہ بہت پیارا ہے۔

مسز نور جہاں.....یو۔اے۔ای

آپ کا ڈائجسٹ میں 1980ء سے پڑھ رہی ہوں' بہت ہی اچھی کہانیاں' افسانے' ناول وغیرہ ہوتے ہیں۔ انڈیا بمبئی کی رہنے والی ہوں۔ جب بھی بمبئی جاتی ہوں یہاں سے تھوڑے ڈائجسٹ لے جاتی ہوں اور میری اردو پڑھنے کی شوقین سہیلیوں میں بانٹ آتی ہوں۔ جون کا خواتین مل گیا۔ سلسلے وار کہانیاں "کوئی لمحہ گلاب ہو" اور "تھوڑا سا آسماں" بہت ہی اچھے جا رہے ہیں۔ اور عینی عمران صاحبہ اور آپ سے درخواست ہے کہ جب بھی کوئی تصویر "خبریں وبریں" یا کسی اور سلسلے میں دیں۔ پلیز اس کے نیچے نام دیں۔ ہم انڈیا کے لوگ پاکستان کی فلم انڈسٹری کی ہیروئین اور ہیرو کو نہیں پہچانتے ہیں۔ ہمارا عمرے کو انشاء اللہ اگلے ماہ جانے کا ارادہ ہے دعا کریں خیر سے جائیں اور اللہ تعالیٰ ہر عبادت قبول کرے' آمین۔

ج: نور جہاں بہن! ہماری جانب سے عمرے کی دلی مبارک باد قبول کریں۔ دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھیے گا۔ مئی کا خواتین آپ کو روانہ کر دیا ہے' مل گیا ہو گا۔

عطیہ بخاری.....قائد آباد

خواتین ڈائجسٹ آج کے زمانے کا معتبر نام اور ایک باوقار پرچہ ہے لیکن ایک بات ہمیشہ پریشان کرتی ہے کہ ٹائٹل پر ایک خوبصورت ماڈل لڑکی یا خاتون کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ٹائٹل کسی آرٹسٹ سے بنوائیں ایسا ٹائٹل جو پاکستان کے تمام علاقوں اور طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین کی ثقافت رہن سہن اور مسائل کو اجاگر کرتا ہو۔ اگر تجویز پسند نہ آئے تو معذرت۔

خواتین کے اس شمارے میں جو تحریر باقی تمام تحریروں پر سبقت لے گئی (میرے خیال میں) وہ عالیہ بخاری کی "ست پھلاں رانی" تھی' ناولٹ کے کردار اور مکالمے سب کچھ حقیقی محسوس ہو رہا تھا مرکزی خیال بہت زبردست اور حساس تھا۔

فاخرہ جبیں کی بخاور نے "بخت آور" بننے میں صرف ایک جست لگائی اور بس! متاع عروج کے افسانے کا مرکزی خیال بہت اچھوتا تھا لیکن موضوع پلاٹ پر اپنی گرفت مضبوط نہیں کر سکیں کہیں کہیں افسانہ جاسوسی یا پراسرار فلم یا ناول کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سعدیہ آفریدی نے ہر باشعور لڑکی کے ضمیر کو "ذات سہیلی" کے انداز میں بہت اچھے طریقے سے پیش کیا۔ اس شمارے کی ایک اہم بات شازیہ چوہدری سے ملاقات بھی تھی۔ یونس بٹ سے ملاقات بھی ان کی تحریروں کی طرح دلچسپ رہی۔

فہمیدہ ناز اعظمی.....سوہیہ

ٹائٹل دیکھنے کو ملا۔ ارجمند رحیم اور فیصل قریشی کے متعلق پڑھ کر خوشی ہوئی۔ "کوئی لمحہ گلاب ہو" نے اپنی پوزیشن برقرار رکھی۔ نگہت عبداللہ کا ناول "رقص طاؤس" اے ون رہا۔ "شریک سفر" اور "تھوڑا سا آسماں" ٹھیک جا رہی ہے۔ اس دفعہ افسانے کچھ خاص نہ تھے۔ باقی تمام سلسلے حسب معمول بہت اچھے لگے۔ روز وشب میں اپنی پسندیدہ رائٹر "شازیہ چوہدری" کے متعلق پڑھ کر بہت اچھا لگا۔

سرورق

ماڈل ---------- ثنا ریاض

ٹرانسپرنسی ---------- موسیٰ رضا

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

کلیاں اور شگوفے

ہاجرہ عبدالقہار

ویرانے پر کیا گزری

راجہ رام نرائن موزوں شیخ علی حزیں کے شاگرد اور فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ اردو میں کم کہتے تھے بلکہ نہ کہنے کے برابر کہتے تھے' لیکن جب سراج الدولہ کی شہادت کی خبر شہر میں پہنچی تو بے ساختہ یہ شعر نازل ہو گیا۔ شعر پڑھتے جاتے تھے اور رو رو کر خبر لانے والوں سے خیریت پوچھتے جاتے تھے۔

غزالاں! تم تو واقف ہو' کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا۔ آخر کو ویرانے پر کیا گزری

اس شعر کا تعلق ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ آزادی اور نواب سراج الدولہ کی شکست و شہادت سے ہے۔

(میر حسن دہلوی..... از تذکرہ الشعراء)
عظمیٰ..... لاہور

تب ہی

گیلی مٹی کو سانتے گوندھتے ہاتھ بے شکل کو شکل دیتے دیتے اپنی عمر بھی انہیں لگا جاتے ہیں اور دھوپ میں سوکھتے کچے کوزے جب پڑاوے کی پوری تمازت جھیل جائیں تب ہی ان کی ساکھ بنتی ہے' تب ہی ان کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔

(ادا جعفری..... جو رہی سو بے خبری رہی)

امید

ہمیشہ ظلمتوں کی کوکھ سے دمکتا ہوا آفتاب جنم لیتا ہے اور اجالا باغ و راغ کو نہیں دیکھتا اور آنکھیں اجالوں کا انتظار کرنا جانتی ہیں۔

(ادا جعفری..... جو رہی سو بے خبری رہی)
صاعقہ..... کراچی

فہمیدہ ریاض

فہمیدہ ریاض جب پہلے پہل بھارت پہنچی تو اسے گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔ بعد میں اس کی آنر کے لیے بہت سے گارڈ بدلے گئے۔ تقریباً" سب قابل ذکر بھارتی شاعر و ادیب یہ ڈیوٹی بھگت چکے ہیں۔ اب فہمیدہ ریاض کی حالت مہاجرہ سے زیادہ نہیں۔ ایک محفل میں عجیب صورت حال ہوئی کہ فہمیدہ ریاض پاکستان کی دل کھول کر اور پیٹ بھر کر مخالفت کر رہی تھی۔ ایک بھارتی خاتون پاکستان کی حمایت میں لگی ہوئی تھیں۔

(اجمل نیازی کے انڈیا کے سفرنامے' مندر میں محراب سے)

ربیعہ..... کراچی

اقبال کی برکتیں

"ارے میاں ضرب کلیم! بھئی کہاں ہو ضرب کلیم۔"

"میاں ضرب کلیم..... ابھی تک زبور عجم کو اسکول لے کر نہیں گئے۔ جاؤ اور ذرا پیام مشرق کو میرے پاس بھیج دو۔"

"مولوی صاحب یہ کیا؟" میں نے حیرت زدگی کے عالم میں پوچھا۔ "یہ ضرب کلیم' یہ زبور عجم۔"

"ہاں میاں' مولوی عبدالصمد خان نے فخر سے اپنی گنجی چندیا کھجاتے ہوئے کہا۔ مجھے اقبال سے بڑی عقیدت ہے' وہ میرے محسن ہیں' وہ میرے رزاق ہیں۔ انہوں نے میرا گھر بھر دیا۔ میں ان کا معتقد ہوں۔ میں نے اظہار عقیدت کے طور پر اپنے سب بچوں

کے نام ان کی تصانیف پر رکھ دیے ہیں۔"

"ضرب کلیم چھٹی کلاس میں پڑھتا ہے۔ بی بی زبور عجم دوسری جماعت کی طالبہ ہے۔ پیام مشرق گھڑی ساز کی دوکان پر کام سیکھ رہا ہے اور کلام جبریل قرآن پاک حفظ کر رہا ہے اور میری بڑی بیٹی اسرار خودی کالج کی طالبہ ہے اور میں نے اپنی بیوی کا نام بھی غفورن بی بی چھوڑ کر بانگ درا رکھ چھوڑا ہے۔"

اتنے میں اندر سے دستک ہوئی۔ "ذرا سنیے مولوی صاحب!"

مولوی صاحب دروازے کی طرف لپکے۔ "ہاں پھوپھی فاطمہ! کوئی خوشخبری ہے کیا۔"

"ہاں مولوی صاحب! مبارک ہو' خدا نے آپ کو جڑواں بچے دیے ہیں اور دونوں ہی لڑکے ہیں۔"

مولوی صاحب آ کر بیٹھ گئے۔ خوشی سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"خدا نے دو بچے ایک دم عطا کیے ہیں میاں۔"

"مبارک باد قبول کریں مولوی صاحب!"

"ہاں میاں! خدا کا احسان ہے۔ اچھا میاں! خدا تمہاری خیر کرے۔ ان کے نام تو بتاؤ۔ اقبال کی کتابوں کے نام تو قریب قریب ختم ہو گئے ہیں۔ تاہم دماغ لڑاؤ اور کوئی اچھے سے دو نام سوچو۔"

"سوچ لیے' مولوی صاحب! سوچ لیے۔"

"ہاں' ہاں بتاؤ۔"

"شکوہ اور جواب شکوہ۔"

(ڈاکٹر صفدر محمود کی کتاب "سدا بہار" سے اقتباس)
رمشاہ روشن..... کراچی

مسجد قرطبہ

عربوں کے زمانے میں مسجد اور شاہی القصر کے درمیان ایک زیر زمین گزرگاہ تھی' جس کے راستے خلیفہ وقت یہاں نماز کے لیے آتا تھا۔ اس محراب کے دائیں ہاتھ کا حصہ خلیفہ کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ وہ لوگ علم و ہنر کے ماہر تھے۔ محراب کی چھت میں قوس کمانداز ابھرے ہوئے خطوط اور گہرائیاں ایسی ہندسی ترتیب سے تعمیر کی گئی تھیں کہ خلیفہ وقت خطبہ جمعہ پڑھتا تو اس کی آواز ان قوسوں سے ٹکرا کر گہرائیوں میں اترتی دو چند ہو کر کمانداز خطوط سے چھوتی اور پھر محراب میں متعدد بار گردش کرنے کے بعد کئی سو گنا بلند ہو کر باہر نکلتی اور پوری عمارت میں پھیل جاتی۔ مسجد میں بیٹھے ہوئے تیس ہزار سے زائد عبادت گزار چاہے وہ المنصور کے حصے میں ہی کیوں نہ بیٹھے ہوں' اس گونجتی آواز کو بخوبی سن لیتے۔

(اندلس میں اجنبی..... از مستنصر حسین تارڑ)
حنا ممتاز صدیقی..... کراچی

مدر ٹریسا

اس چھوٹی سی ناتواں عورت کے ساتھ بیٹھ کر میں نے خود کو بہت بونا محسوس کیا مگر عجیب بات یہ تھی کہ ٹریسا کے انداز میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے یوں لگے کہ وہ خود کو بالاتر یا بے حد مقدس ثابت کر رہی ہے۔ صحافیوں سے وہ یوں ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے جیسے چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیل رہی ہو۔ ساتھ ہی وہ اپنی اخلاقی قوت سے بھی پوری طرح آشنا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ وہ جب چاہے ایئرپورٹ جا کر کسی بھی ایرلائن سے کہہ سکتی ہے کہ وہ ابھی اسی وقت واشنگٹن جانا چاہتی ہے اور واشنگٹن پہنچ کر وہ فوری طور پر امریکی صدر سے ملاقات کی فرمائش کر سکتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ کسی امریکی صدر میں بھی اتنی جرات نہیں ہے کہ اس کی بات ٹال سکے۔

(باب گیلڈوف کی کتاب "از ڈیٹ اٹ" سے اقتباس)

زرمت ناز..... کراچی

ہے۔"

س "کیا آپ کو سالگرہ کا دن یاد رہتا ہے؟"

ج "زارا کی ناراضی کے بعد تو اچھی طرح سے یاد رہنے لگا ہے۔"

س "تحفہ کیا دیتے ہیں؟"

ج "پھول پرفیوم کتاب وغیرہ زارا ابھی میری ضرورت کی چیزیں دیتی ہے۔"

س "غصہ کن باتوں پر آتا ہے۔ غصے کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟ منانے میں پہل کون کرتا ہے۔"

ج "اصولوں کے خلاف جو بات ہوتی ہے۔ اس پر غصہ آتا ہے اس کا اظہار کبھی بول کر کرتا ہوں۔ کبھی چپ رہ کر اور کبھی درگزر کر کے۔ منانے کی ذمہ داری وہی نبھاتی ہے کیونکہ میں ناجائز غصہ کبھی نہیں کرتا میں تو ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہوں۔"

س "کیوں زارا کیا یہ سچ ہے؟"

ج "(مسکراہٹ) وصی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

س "اپنی کتاب پر سولہ سال کے نوجوان کی تصویر چھاپ کر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

ج "وہ تصویر جو میری کتاب کے ٹائٹل پر چھپی چھ سال پرانی ہے اس وقت میں انیس سال کا تھا اور اب (قہقہہ) مشکل سے پچیس سال کا ہوا ہوں۔ آپ کے پاس پرانا ایڈیشن ہوگا۔ نیا ایڈیشن دیکھیں اس میں اپنی تصویر بدل ڈالی ہے یعنی چوبیس سال کے وصی کی لگادی ہے اب جب مجھے "صندل" کرلو آئے گی تو اس پر فریش تصویر لگوادوں گا میرا آپ کے ساتھ یہ پکا وعدہ ہے۔"

س "آپ کے تمام تر سیریلز پرائیویٹ پروڈکشن تیار کر رہی ہے سرکاری اور پرائیویٹ کام کرنے میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟"

ج "پرائیویٹ طور پر کام کرنے میں کافی آزادی ہے اور آزاد ماحول میں کام کرنا بہت بڑی نعمت ہے، سرکاری سطح پر بہت پابندی میں رہ کر کام کرنا پڑتا ہے ایک اسکرپٹ کے لیے یہاں دس بار سنسر ہوتے ہیں۔ ایک ایک لائن پر لوگوں کا شدید ردعمل سامنے آنے کے خطرے گلے پڑ جاتے ہیں۔ ہر بات میں اجازت کی ضرورت پڑتی ہے۔ تخلیقی کاموں کے لیے یہ پابندی بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ مصنف اگر کچھ لکھتا ہے ذہن کی کسی خرابی کی وجہ سے نہیں لکھتا۔ یہ تو اس کا عام سا ایکسپریشن ہوتا ہے، وہ کسی کو بھڑکانا نہیں چاہتا بلکہ اپنے اردگرد کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے تو اس پر سنسر لگا دیا جاتا ہے۔ لیکن میں ایسا فلم کار ہوں جو اپنے من کی بات ہی کہہ دینے میں سکون محسوس کرتا ہے خواہ اس کے لیے مجھے شکایت کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"

س "آپ کی شاعری میں فیورٹ نظم؟"

ج "سب ہی پسند ہیں لیکن جو نظم "ماں" کے عنوان سے لکھی ہے وہ میری پسندیدہ نظم ہے۔"

س "آپ نے زندگی سے کیا سبق حاصل کیا؟"

ج "میں نے زندگی سے مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرنا سیکھا ہے۔ جدوجہد پر یقین رکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں آپ کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ ہر کام مثبت جذبے کے ساتھ کرتا ہوں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر قسم کے اچھے برے حالات کا سامنا کیا جائے۔"

س "وصی کچھ اپنے بارے میں بتائیں اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں اپنے بزنس کے بارے میں؟"

ج "میری پیدائش سرگودھا کی ہے۔ وہیں سے میں نے تعلیم حاصل کی نویں میں تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کا چھوٹا سا کاروبار تھا جو ان کی وفات کے بعد مجھے سنبھالنا پڑا۔ مجھے اور میری بہن کو پروان چڑھانے پڑھانے لکھانے اور اس قابل بنانے کے لیے ہماری ماں نے بہت محنت کی۔ جدوجہد کا یہ سبق مجھے ماں کی طرف سے وراثت میں ملا، جب میں اس قابل ہوا تو میں نے اپنی تمام محبت اور توجہ ماں کی طرف مرکوز کر دی۔ میں بامقصد زندگی گزارنا چاہتا ہوں اور ماں کی خدمت میری زندگی کا مقصد ہے، میں پبلشنگ کا کام کرتا ہوں۔ کتابیں چھاپتا ہوں اور لکھتا ہوں۔ دونوں کام تخلیقی ہیں۔ مزے کے ساتھ زندگی گزر رہی ہے۔ شوبز اور فنون لطیفہ کے ہر شعبے میں اپنے من کی تسکین کے لیے کام کرتا ہوں۔ ورنہ معاشی خوشحالی کے لیے میرا کاروبار کافی ہے میں قناعت پسند ہوں۔"

س "ایک حلقہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس پروفیشن میں اسکینڈلز ضرور بنتے ہیں؟"

ج "جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ اس پروفیشن کے ساتھ مخلص نہیں، ویسے اللہ کا شکر ہے کہ میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں ایسے اتفاقات پر یقین نہیں رکھتا ہوں۔"

س "کوئی پلان، کوئی مشن، مستقبل کے لیے کوئی خواب؟"

ج "کام تو انسان ساری زندگی کرتا ہے اور میں جو کام بھی شروع کرتا ہوں۔ دل لگا کر اور سچی لگن کے ساتھ کرتا ہوں۔ شوبز میں اپنے طور پر ہی آگے بڑھ رہا ہوں اور پبلشر کی حیثیت سے بھی کچھ منصوبے ہیں جن کا ذکر قبل از وقت نہیں کرنا چاہتا۔"

س "کبھی کسی سے انسپائر ہوئے؟"

ج "میں ماں کے علاوہ کبھی کسی سے انسپائر نہیں ہوا۔"

س "اچھے فنکار میں کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے؟"

ج "اول آواز دوم اعتماد اور سوئم اپنے تاثرات کو صحیح طور پر پیش کرنا۔ اچھے فنکار میں پہلی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ احساس برتری اور احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اس فیلڈ میں متوازن رہ کر ہی صحیح طریقے سے اپنی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔"

س "کبھی جھوٹ بولا؟"

ج "کرائم والا نہیں مصلحتاً بول لیتا ہوں۔"

س "خوشی کب ہوتے ہیں؟"

ج "دوسروں کو آسودگی پہنچا کر۔"

س "کبھی چالان ہوا؟"

ج "جب گاڑی لی تھی تو لین پر کھڑا ہونے کی وجہ سے پولیس والا چالان کرنے لگا تھا لیکن مجھے پہچان کر چالان ہوتے ہوتے رہ گیا۔ کہنے لگا۔ اگر آپ جیسے پڑھے لکھے لوگوں کا یہ حال ہے تو پھر ہم عام لوگوں سے کیا توقع رکھیں؟ آج بھی اس کی بات یاد کر کے سخت شرمندگی ہوتی ہے اور اکثر سوچتا ہوں ہمیں قانون کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ عام لوگوں سے بھی زیادہ۔"

س "کبھی رشوت دے کر کوئی کام کروایا؟"

ج "مجھے والدہ کے ساتھ حج پر جانا تھا کسی وجہ سے ہمارا نام نہیں آسکا۔ کسی نے کہا پانچ ہزار روپے بطور رشوت دے دیں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔ میں نے انکار کر دیا اور سوچا کہ اگر حج پر جانے کے لیے رشوت ہی دینی ہے تو نہیں جاتا۔ دوبارہ ٹرائی کروں گا اور رشوت دیے بغیر ہی اللہ تعالیٰ کے گھر حاضری دوں گا۔"

ایک نظم "کسک"

مجھ سے وہ اکثر کہتی تھی
میری بس اتنی خواہش ہے
کچھ ایسی پہچانی جاؤں
آپ کے نام سے جانی جاؤں

وصی شاہ نہایت سادہ اور نفیس طبیعت کے مالک ہیں، لباس اور خوراک کے معاملے میں جو ملتا ہے۔ پہن لیتے ہیں، کھا لیتے ہیں۔ کبھی نخرے نہیں دکھاتے۔ موسیقی سننے اور کتابیں پڑھنے سے لگاؤ ہے۔ وصی کی ایک نظم سپردگی حاضر ہے۔

"آج وہ مدت بعد آئی تھی
بس یہ کہنے جاناں!
میرے سارے خط لوٹا دو
سب تصویریں، قلم، کتابیں
واپس کر دو سارے تحفے
مجھ سے سب کچھ مانگنے والی
جاتے جاتے
میرے کمرے کی چوکھٹ پر
چھوڑ گئی اپنا آپ!"

☆

خبریں تو خبریں

عینی عمران

مقام حاصل کرنا ہے

اپنے بے تحاشا وزن سمیت مدیحہ شاہ فلموں سے آوٹ ہو گئی تھیں اور اس دوران فارغ بیٹھے بیٹھے فیصلہ کیا کہ شادی کرلی جائے اور انہوں نے عدنان سے شادی کرلی پھر شوبز سے بھی ہمیشہ کے لیے علیحدگی اختیار کرلی۔ یہ شادی کچھ عرصہ تک تو چلتی رہی۔ پھر شاید دونوں ایک دوسرے سے اکتا گئے۔ بقول مدیحہ' عدنان کچھ عرصہ میرے ساتھ ٹھیک رہا۔ لیکن بعد ازاں اس کی بدتمیزیاں بڑھ گئیں۔ میں نے گھر کو ٹوٹنے سے بچایا۔ لیکن اس نے میری ایک نہ مانی اور مار پیٹ پر اتر آیا۔ اس کے ساتھ رہنا میرے لیے دوبھر ہوچکا تھا۔ میں ذہنی طور پر بہت زیادہ ڈسٹرب

اب گلوکاری بھی

زارا شیخ فوٹو سیشن کروانے اسٹوڈیو آئی تھیں۔ پھر وہ اسی دنیا کی ہو کر رہ گئیں۔ فوٹو سیشن ان کا اتنا کامیاب گیا کہ وہ ایک فلم میں بطور ہیروئن جلوہ گر ہوئیں اور انہوں نے میدان مار لیا۔ مگر ایک آدھ فلموں کے بعد صورت حال مختلف ہو گئی۔ اور وہ رفتہ رفتہ فلموں سے دور ہوتی گئیں۔ مسلسل ناکامی کے بعد اپنا کیریئر مخدوش دیکھ کر زارا نے باقاعدہ گلوکاری کا فیصلہ کرلیا (میں نہ مانوں ہار)۔ اب سننے میں آیا ہے کہ وہ باقاعدہ اسٹیج پر بطور گلوکارہ گانے کے لیے مختلف پروگراموں میں حصہ لینے کی منصوبہ بندی کررہی ہیں۔

اب ان کی ایکٹنگ سے اکتائے ہوئے لوگ جلد ہی ان کی گلوکاری سے اکتانے کی تیاری کررہے ہیں۔

ہو گئی۔ اب جبکہ میں نے اس بدتمیز شخص سے طلاق حاصل کرلی ہے۔ پرسکون ہوں اور دوبارہ شوبز کی دنیا میں آکر پہلے سے زیادہ مصروف ہوں۔ حتیٰ کہ اب میں نے فلم انڈسٹری میں مقام حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرلیا ہے۔

(اب فلم کے ناظرین خود کو ذہنی طور پر تیار کریں ان کو اسکرین پر دیکھنے کے لیے)

دیکھنے کی چیز

مہناز نے انتہائی خوش گلو گلوکارہ کے طور پر اپنی شناخت بنائی ہے۔ ایک وقت تھا کہ فلم انڈسٹری میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ مگر آج صورت حال موسیقی کے حوالے سے کیا ہے۔ وہ آپ کو بھی پتہ ہے۔ مہناز ان ہی باتوں پر دل گرفتہ وافسردہ ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔

"آج کی لڑکیاں اسٹیج پر گانا گاتے ہوئے ناچتی ہیں' جو کہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم تو گلوکار ہیں۔ ہمارا کیا کام کہ ناچ ناچ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ اپنی آواز سے پہچان کرائی ہے اور اس دور میں شہرت پائی جب میڈم نور جہاں کا طوطی بولتا تھا۔ اب تو جدید موسیقی اور آلات نے ہر اس آدمی کو گلوکار بنا دیا ہے جس کی جیب میں نوٹ ہیں۔ ان ہی نوٹوں سے ان کی ویڈیو بنتی ہے جس میں آواز کم اور گلیمر زیادہ ہوتا ہے۔ لڑکیاں لڑکے ریگستان' سمندر کے کنارے' بڑی بڑی شاہراہوں پر کاروں میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے میں تو یہ ہی کہوں گی کہ اب گانا سننے کی نہیں دیکھنے کی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔" (سچ کہا ہے)

کم کھانا

جویریہ جلیل نہایت اسمارٹ ہیں' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اسمارٹ رکھتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا کہ اپنے آپ کو دل کش رکھنے کے لیے کیا جتن کرتی ہیں تو یہ ہی کہتی ہیں۔

"بھئی! سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود کو دل کش بنانے کے لیے کوئی جتن نہیں کرتی۔ کیونکہ مجھے اس کا

وقت ہی نہیں ملتا۔ کوئی مانے یا نہ مانے' لیکن یہی سچ ہے۔ بس یہ ہے کہ میں کھانا بہت کم کھاتی ہوں اور ہمیشہ بھوک رکھ کر کھاتی ہوں یہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی ہے کہ کھانا ہمیشہ بھوک رکھ کر کھاؤ' لہٰذا میری خوراک بہت کم ہے ایک تو میں کم کھاتی ہوں' دوسرے یہ کہ ہمیشہ سادہ غذا کھاتی ہوں' وہی مجھے پسند ہے۔ زیادہ تر دال چاول' اچار' چٹنی سبزی اور سلاد میری مرغوب غذائیں ہیں۔ یہی غذائیں انسان کے جسمانی نظام کو بہتر بھی رکھتی ہیں اور اسے فائدہ بھی پہنچاتی ہیں۔ مرغن غذا بھی کھالیتی ہوں مگر کبھی کبھار دعوت یا تقریبات میں یا پھر گھر میں ہفتہ پندرہ روز میں یا چھٹی کے دن اس طرح کے کھانے بنتے ہیں تو میں کھالیتی ہوں۔ مگر شوق سے نہیں کھاتی بس پیٹ بھرنے کو تھوڑا بہت کھالیتی ہوں۔ مجھے تو مرغن غذا پسند نہیں' اس لیے میں نہیں کھاتی' مگر جسے مرغن غذائیں پسند بھی ہیں۔ اسے بھی اس طرح کے کھانے سے احتیاط کرنا چاہیے۔ کیونکہ مرغن غذائیں آپ کو اندرونی طور پر نقصان پہنچاتی ہیں۔ آپ کے نظام ہاضمہ کو خراب کرتی ہیں۔ اور نظام ہاضمہ کی خرابی سے آپ کے چہرے پر دانے اور کیل مہاسے نکلتے ہیں۔"

زوردار ناشتہ

شوبز سے وابستہ لوگوں کی صبح عموماً" دوپہر کے وقت ہوتی ہے۔ گویا ناشتہ تو ان کی زندگی سے خارج ہی ہوتا ہے۔ مگر ہمایوں سعید ناشتہ بہت زوردار کرتے ہیں' اس بارے میں انہوں نے بتایا۔

"میری صبح کا آغاز عموماً" نو بجے تک ہوتا ہے' اٹھنے کے بعد کچھ دیر سستاتا ہوں' اخبار وغیرہ سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں' کبھی کبھار خاص موقع یا حالات کی وجہ سے دیکھ لیا تو دیکھ لیا' ورنہ میں صبح ہی صبح اخبار پڑھ کر اپنا سارا دن خراب نہیں کرنا چاہتا' لہٰذا سو کر اٹھنے کے بعد..... کر فریش ہو کر اور چینج کر کے ناشتہ کرتا ہوں'

ناشتے کا وقت عموماً" دس بجے ہوتا ہے۔ ناشتے میں ہائی پروٹین غذائیں لیتا ہوں (صحت سے تو نہیں لگتا) جیسا کہ انڈے' سلائس' بٹر' جام' پراٹھے دودھ یا جوس وغیرہ' مگر یہ سارا کچھ اکٹھے نہیں لیتا' میرا مطلب ہے کہ ان تمام چیزوں کو میں باری باری لیتا رہتا ہوں' یعنی کبھی انڈا پراٹھا' تو کبھی سلائس' بٹر اور جام ویسے انڈہ روزانہ ضرور کھاتا ہوں۔"

جھوٹا اسکینڈل

حدیقہ کیانی نے اپنے عروج کے دور میں شادی کی اور کراچی شفٹ ہو گئیں۔ یہاں جی بھر کر کنسرٹ کئے' خوب پیسہ کمایا' نام کمایا اور عروج کا دور چل ہی رہا ہے کہ انہوں نے طلاق بھی لے لی ہے۔ کچھ اس ہاتھ کسی اور کا بھی نظر آتا ہے۔ جبکہ اسکینڈل کے حوالے سے علی حیدر سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا۔

"مجھے اس سے شدید اختلاف ہے کہ ہمارے ہاں جھوٹے اسکینڈل سے فنکاروں کو بدنام کیا جاتا ہے۔ میں اور حدیقہ ایک ساتھ چائے کے اشتہار میں آئے اور چند کنسرٹ کئے۔ یار لوگوں نے نہ جانے کیا کیا شائع کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ حدیقہ میری اچھی دوست ہے۔ ہم دونوں کے مشترکہ کنسرٹ عوام نے پسند کئے۔ اور بس خوامخواہ اسکینڈل مشہور کر دیا گیا۔ (آہم..... خوامخواہ)

خلائی وائرس

چین میں سارس کے وائرس نے تباہی مچا رکھی ہے۔ اس وائرس کے بارے میں تحقیقاتی اداروں نے اپنی کئی رپورٹ میں اہم باتیں بتائیں۔ جبکہ ماہرین خلائی حیاتیات نے دعوا کیا ہے کہ سارس کا وائرس خلا سے زمین پر آیا ہے۔ برطانوی طبی جریدے میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ سارس کا وائرس زمین سے تعلق نہیں رکھتا' بلکہ یہ خلا سے آیا ہے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ان ماہرین نے

جنوری 2001ء میں کئے گئے ایک تجربے کا حوالہ دیا ہے جس میں ان کے مطابق یہ ثابت ہو گیا تھا کہ کرۂ قائمہ میں بڑی تعداد میں ایسے جراثیم موجود ہیں۔ جو زندہ رہنے کے علاوہ اپنی نسل بڑھانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق یہ جرثومے روزانہ بڑی تعداد میں زمین پر گرتے ہیں۔ جن میں کچھ بیکٹیریا اور وائرس زمین پر بھی زندہ رہنے اور مختلف قسم کی بیماریاں پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ مذکورہ ماہرین کے مطابق 1918 میں بھی فلو کی ایک بڑی وبا پھیل گئی تھی جس سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ متاثر ہوئے تھے۔ یہ بیماری بھی دراصل کرۂ قائمہ سے زمین پر گرنے والے جراثیم کی وجہ سے پھیلی تھی' ماہرین کے مطابق چین کے جس علاقے سے "سارس" کی بیماری پھیلی ہے وہاں کرۂ قائمہ کا کم حفاظتی غلاف قدرے چھدرا اور کم موٹا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حصے سے گرنے والے خلائی جرثوموں نے اس علاقے میں سارس کی بیماری پھیلا دی۔ جو بعد ازاں دیگر علاقوں تک بھی پھیل گئی۔

نفسیاتی الجھنیں اور آپ

عدنان

کوئی بڑا عہدہ۔
کوئی اونچی کرسی۔
دولت کے انبار۔
سب بے معنی ہیں اگر ہم خوش نہ ہوں۔
لیکن،
اگر آپ کا ضمیر مطمئن ہے تو اس سے بڑی کوئی خوشی کی بات نہیں۔

ویسے میں ایک بات یہاں اور عرض کردوں کہ خوش رہنا یا نہ رہنا بھی انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے "قناعت' صبر بڑی چیز ہیں۔ لیکن صبر اور قناعت یہ نہیں کہ ہم جدوجہد نہ کریں۔ صبر اور قناعت یہ ہے کہ جدوجہد کے بعد جو ملے' اسے خوشی سے قبول کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں' خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اور زندگی میں دوسروں کی طرف دیکھنے کے بجائے' دوسروں سے توقع رکھنے کے بجائے جو کچھ اللہ نے ہمیں دیا ہے اس پر شکر ادا کریں' اور جو کمی ہے' اللہ تعالیٰ سے مانگیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کے لیے محنت اور کوشش ضرور کریں۔ میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ محنت کا صلہ ضرور دیتا ہے' خواہ دیر سے سہی' شرط یہی ہے کہ آپ مایوس نہ ہوں اور کوشش جاری رکھیں۔

✲ ✲ ✲

ہمارے اردگرد بہت سے لوگ ایسے نظر آتے ہیں جو آگے بڑھنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ترقی کرنا اور آگے بڑھنا عین فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن اس تقاضے کے لیے تحمل اور سکون بہت ضروری ہے' لیکن لوگ بے تاب ہوتے ہیں' ان کی حرکات میں اضطراب ہوتا ہے۔ بظاہر وہ دکھاتے ہیں جیسے کوئی اہم کام کر رہے ہوں' حالانکہ کوئی کام اہم نہیں ہوتا بلکہ اپنے کم تر پہلو کا احساس ان سے ایسے افعال کراتا ہے اور وہ یوں سمجھتے ہیں گویا وہ دوسروں سے برتر ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ بے قرار رہتے ہیں اور نتیجے کے طور پر بے خوابی کا شکار رہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں کمتری کا احساس اس قدر بے چینی پیدا کیے رہتا ہے کہ وہ مجبوراً" اسے چھپانے کے لیے عمل پیرا ہوتے اور بے چین رہتے ہیں۔

یہ بے چینی کسی ایسے خوف کی وجہ ہوتی ہے جو ان پر بھی عیاں نہیں ہوتا۔ اپنی صحت یا کسی دوست کی فکر یا کسی ناکامی کا خوف ان کے لاشعور میں ایک خوف پیدا کر دیتا ہے' کسی غلطی کے عیاں ہو جانے کا خدشہ بھی یہ حالت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں مگر ان پر خوف اور تشویش کے آثار نمایاں ہوں اور بے چینی' بے قراری کی وجہ سے ایسی حرکات سرزد ہونے لگیں تو سمجھ لیں کہ یہ شخص نفسیاتی طور پر کسی نقص یا خوف کو محسوس کر رہا ہے جس کا بعض اوقات اسے خود بھی علم نہیں ہوتا۔ اگر آپ کسی شخص میں ایسی صورت حال دیکھیں تو کسی ماہر نفسیات سے مشورہ کریں' اس کا علاج بہت آسان اور سہل ہے۔

م۔خ۔
آپ اسے پسند کرتی ہیں۔ وہ آپ کا کزن بھی ہے۔ اگر وہ رشتہ بھجوا دے تو اس سے شادی کر لیں۔ ضروری نہیں ہے کہ پسند کی شادی ناکام ہی ثابت ہو۔ لیکن اگر وہ رشتہ نہیں بھجواتا تو پھر اس سے کوئی تعلق نہ رکھیں کیونکہ اس صورت میں آپ کے ہاتھ بدنامی اور رسوائی کے سوا کچھ نہ آئے گا۔ آپ کو اسے اتنی ہمت نہیں دینی چاہیے تھی کہ وہ ایسی حرکت کرتا۔ آئندہ اسے ایسی حرکت کا موقع ہرگز نہ دیں اور وہ ایسی کوئی کوشش کرے تو گھر والوں کو بتا دیں۔

م۔ا
یہ صرف آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات پر کنٹرول نہیں کر پاتے۔ اس کا حل یہ ہے کہ آپ خیالات کو روکنے کی کوشش نہ کریں جو خیال ذہن میں آئے اسے گزر جانے دیں اور کوئی ایک بات اپنے ذہن میں رکھ کر اپنی توجہ اسی جانب رکھنے کی کوشش کریں۔ کتاب کا جو صفحہ پڑھ رہی ہیں۔ اسے بار بار دہرائیں۔ یہاں تک کہ وہ آپ کے ذہن نشین ہو جائے۔ بار بار کی اس مشق سے ذہن یکسو ہونے لگے گا۔

ایک نادان لڑکی
اچھی بہن! جس عمر میں آپ ہیں' اس عمر میں عقل پر جذبات حاوی ہوتے ہیں۔ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش شدید ہوتی ہے اسی وجہ سے ہماری عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں اور ہم ایسا قدم اٹھا بیٹھتے ہیں جو عمر بھر کے لیے پچھتاوا بن جاتا ہے۔ اس شخص نے فون پر آپ سے محبت کا اظہار کیا تو آپ اس سے متاثر ہو گئیں۔ جبکہ نہ آپ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہیں نہ وہ آپ کے بارے میں جانتا ہے آپ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں ہے صرف فون پر بات کی ہے۔ آواز سے عمر کا بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ پھر آپ کا معاملہ تو یکسر مختلف ہے۔ وہ دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور ایک بات یاد رکھیں۔ محبت کے جذبات زیادہ تر حالات میں وقتی ہوتے ہیں۔ محبت کے لیے کوئی اپنا مذہب نہیں بدلتا اور اس کے گھر والوں کے مسلمان ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ نے بہت سمجھ داری سے کام لیا کہ اس سے تعلق منقطع کر لیا ورنہ آپ کے ہاتھ کچھ نہ آتا اور بدنامی اور رسوائی گلے پڑ جاتی۔ آپ اچھی کتابوں میں دل لگائیں' مطالعہ کریں۔ کچھ عرصہ میں یہ سب بھول جائیں گی۔

وائی۔ ایس۔ کے
آپ سے جو بے وقوفی سرزد ہوئی۔ اب اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ آپ کو چاہیے تھا کہ اسی وقت گھر میں سے کسی کو بتا دیتیں۔ اب بھی بہتر یہی ہے کہ گھر میں اپنی والدہ یا بڑی بہن کو بتا دیں تاکہ اگر بعد میں کوئی مشکل حالات پیش آئیں تو وہ سنبھال سکیں۔ یہ خیال رکھیں کہ آپ کی بڑی بہن یا والدہ متحمل مزاج اور بردبار ہوں ورنہ خاموشی میں ہی عافیت ہے۔ ان حالات میں صرف یہی مشورہ دیا جا سکتا ہے اللہ پر بھروسا کر کے شادی کر لیں اور دعا کریں۔ وہ آپ کی عزت رکھے' منگیتر کو کچھ بتانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

بیوٹی بکس

اَمت الصبور

نیناں......مانسہرہ

السلام علیکم باجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ہاتھوں اور پاؤں کا رنگ کالا ہے۔ حالانکہ میرا رنگ سانولا ہے۔ میں عرقِ گلاب' عرقِ بادام اور گلیسرین کا مکسچر ہاتھوں اور پاؤں پر لگاتی ہوں اگر یہ مکسچر لگانا چھوڑ دوں تو میرے ہاتھوں اور پاؤں پر سفید خشکی سی ابھر جاتی ہے۔

میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں میرے چہرے پر دانے ہو گئے تھے اور میرے بھانجے نے کھیلتے ہوئے میرے چہرے پر ناخن بھی مار دیئے تھے جس کی وجہ سے دانوں اور ناخن کے نشان میرے چہرے پر رہ گئے ہیں جو بہت برے لگتے ہیں۔ پلیز کوئی آسان نسخہ بتائیں کہ میرے چہرے سے داغ ختم ہو جائیں۔

ج آپ رات کو سوتے وقت دودھ کی بالائی میں تھوڑا سا لیموں کا رس اور گلیسرین چند قطرے ملا کر اسے ہاتھوں اور پاؤں پر لگا کر کچھ دیر مالش کریں۔ ان کا رنگ نکھر جائے گا اور جلد ملائم ہونے سے خوبصورت ہو جائے گی۔

2۔ چہرے کے یہ نشان وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود ہلکے ہو جائیں گے۔ آپ درج ذیل نسخے استعمال کریں۔

ملتانی مٹی میں تھوڑا سا عرقِ گلاب ملا کر پیسٹ بنا لیں اور اسے چہرے پر لگائیں۔ پندرہ منٹ بعد منہ دھو ڈالیں۔ ہفتے میں ایک بار یہ عمل کریں۔

پسی ہوئی ہلدی میں تھوڑا سا بیسن اور دودھ ملا کر پیسٹ بنا لیں اور چہرے پر لیپ کر لیں۔ پندرہ منٹ بعد چہرہ دھو ڈالیں۔ ہفتے میں دو بار یہ عمل کرنے سے داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں۔

مشعال شاہ۔ جیکب آباد سندھ

س میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میں بہت موٹی ہوں۔ کولہے پیٹ اور ٹانگیں بہت موٹی ہیں میری عمر سولہ سال ہے قد پانچ فٹ دو انچ ہے اور وزن 65 کلو ہے۔ پلیز مجھے کوئی حل بتائیں کہ میں اسمارٹ ہو جاؤں۔

2۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ گرمیوں میں میرا رنگ چہرے کا بالکل کالا ہو جاتا ہے۔ اب گرمیاں آگئی ہیں اور ہم جیکب آباد جیسے گرم علاقے میں رہتے ہیں۔

3۔ میرا تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بازو بالکل کالے ہیں اس کے لیے کوئی آسان طریقہ بتائیں اور میں جس ڈیزائن کے جوتے پہنتی ہوں وہ میرے پاؤں پر بن جاتے ہیں۔ ایسا نسخہ بتائیں میرے پاؤں گورے ہو جائیں۔

4۔ میری آنکھوں کے گرد بہت کالے حلقے ہیں اور آنکھیں بھی اندر کو دھنسی ہوئی اور بالکل چھوٹی ہیں۔ آنکھوں کے لیے کوئی ایسا میک اپ یا آئی لائنر کا استعمال ایسا بتائیں کہ آنکھیں تھوڑی بڑی لگیں۔

ج مشعال بہن! آپ کا وزن بہت زیادہ ہے' آپ کو ڈائٹنگ کے ساتھ ورزش بھی کرنا پڑے گی۔ سب سے پہلے آپ اپنی خوراک پر توجہ دیں۔

صبح نہار منہ نیم گرم پانی میں ایک لیموں نچوڑ کر پئیں یا ایک چمچہ شہد ملا لیں۔

ناشتہ۔ ایک اُبلا ہوا انڈا' ایک کپ چائے' چینی کے بغیر۔

دوپہر کا کھانا۔ ایک پلیٹ سلاد' ایک سیب یا موسم کا

کوئی بھی پھل گاجر وغیرہ ایک چھٹانک دہی' اگر بھوک زیادہ محسوس ہو تو اُبلے ہوئے چاول ایک پلیٹ لے سکتی ہیں۔

شام کی چائے۔ قہوہ میں ایک چمچہ شہد ملا کر پئیں۔

رات کا کھانا۔ ایک چپاتی۔ ایک پیالہ دہی' بغیر چکنائی کے پکی ہوئی چکن یا گوشت۔ کم چکنائی میں پکی ہوئی سبزی یا ابلے ہوئے چاول بھی لیے جاسکتے ہیں۔ ناشتے میں تبدیلی کے لیے آپ کسی دن جوس کا گلاس بھی لے سکتی ہیں۔

گھی' چینی' مٹھائیاں' چاکلیٹ' بیکری کی اشیاء سے مکمل پرہیز کریں۔

اس کے علاوہ درج ذیل ورزش کریں۔

سیدھی کھڑی ہو جائیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو کولہوں پر رکھیں اب آہستہ آہستہ آگے کی جانب جھکیں۔ پھر سیدھی کھڑی ہو جائیں اور دائیں طرف جھکیں اور پھر بائیں جانب جھکیں۔ اب آپ دھڑ کو پیچھے کی جانب جھکائیں۔ لیکن ہاتھ بدستور کولہوں پر ہی رہنے چاہئیں۔ ٹانگیں سیدھی ہوں۔ ان میں کوئی خم نہیں ہونا چاہیے۔ یہ عمل آپ پانچ پانچ مرتبہ دہرائیں اور کوشش کریں کہ آپ کمر کو زیادہ سے زیادہ حرکت دے سکیں۔ اس سے آپ کی کمر کی چربی کم' کولہوں کا بھاری پن ختم اور جسم سڈول ہو گا۔

چہل قدمی سے اچھی ورزش کوئی نہیں ہے۔ روزانہ کم از کم چالیس منٹ تک چہل قدمی ضرور کریں۔

2۔ بازوؤں کو دھوپ سے بچائیں اور لمبی آستینوں والی قمیص پہنیں اور رنگ گورا کرنے کے لیے بازوؤں پر جو کے آٹے میں دودھ ملا کر پیسٹ بنا کر لگائیں۔ خشک ہو جائے تو رگڑ کر اتار دیں۔

3۔ چہرے پر کھیرے کا عرق لگائیں۔ اس سے آپ کے چہرے پر گرمی کے اثرات نہیں ہوں گے۔

4۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں کے لیے روغنِ بادام سے مالش کریں مالش کا رخ باہر سے اندر کی طرف رکھیں۔

تھوڑی سی تازہ گاجر کدوکش کر لیں۔ اس میں انڈے کی زردی ملا کر ان دائروں پر دن میں دو بار آہستہ آہستہ لگائیں۔ کالے حلقوں کے فوری علاج کے لیے ایک تازہ آلو کو دو ٹکڑوں میں کاٹ لیں اور آنکھ کے اردگرد کے حصے کو ان ٹکڑوں سے ڈھانپ لیں۔ تقریباً" پندرہ منٹ بعد ان ٹکڑوں کو ہٹا دیں۔ آنکھوں کے حلقے تقریباً" تین گھنٹے تک نظر نہیں آئیں گے۔

آنکھوں کو میک اپ کے ذریعے بڑا اور خوبصورت دکھایا جاسکتا ہے۔

آنکھوں کے اوپر لائن یا لکیر کھینچنے سے آنکھیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ آئی لائنر کا استعمال اسی کام کے لیے کیا جاتا ہے۔ آئی لائنر کے بجائے کاجل کا استعمال زیادہ اچھا ہے۔

آئی شیڈو کا استعمال بھی اسی مقصد کے لیے کیا جاتا ہے۔ آئی شیڈو کو پہلے آنکھوں کے اوپر اور پلکوں کے درمیانی حصے میں بند نقطے کی صورت میں لگانا چاہیے۔ اس کے بعد اسے ہاتھوں کی انگلی کی پور سے آئی برش سے اچھی طرح پھیلا لینا چاہیے۔

پلکوں کو خوبصورت واضح پر کشش اور گھنا بنانے کے لیے مسکارا کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مسکارا برش کے ذریعے ہی استعمال کریں۔ ایک گہری کوٹنگ کے بجائے دو ہلکی کوٹنگ کرنا زیادہ اچھا رہتا ہے۔ مسکارا اوپر اور نیچے کی پلکوں پر استعمال کریں۔

آنکھوں پر اس میک اپ سے آپ کی آنکھیں بڑی اور نمایاں نظر آئیں گی۔